A contact loved ones.
ایک رابطہ اپنوں سے
Aik Rabta Apno Se.
پاکستانی پوائنٹ

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

جلد نمبر 18 شمارہ نمبر 8 مئی 2017ء

ای میل ایڈریس: Dardigesto1@gmail.com

مینیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

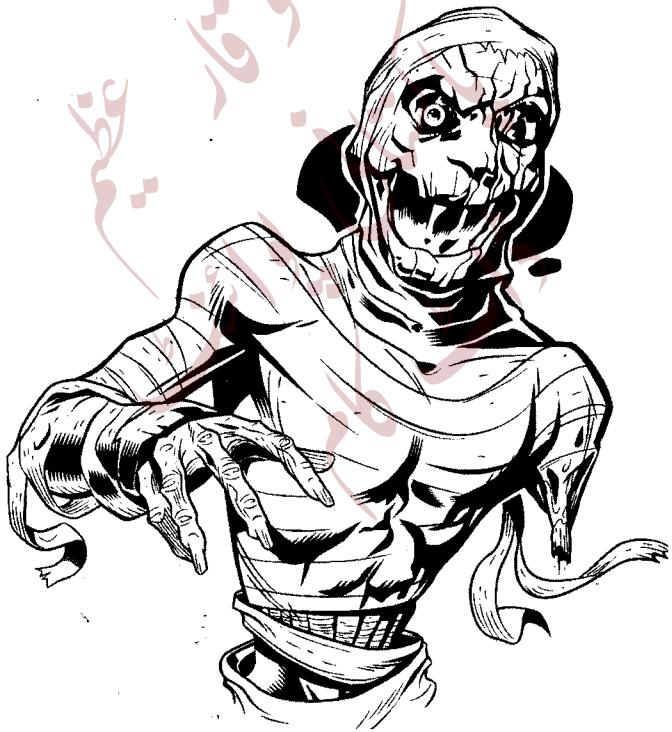

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہو سکتی ہے

تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمے دار نہ ہوگا۔

مصنف	کہانی	صفحہ	تعارف
احسان الحق	محقق	18	ایک ذہین خوش اخلاق اور خوش گفتار پروفیسر کی کتھا جسے کشف ہونے لگ گیا تھا
ساحل ابڑو	سگ آوارہ	39	کیا یہ حقیقت ہے کہ مردہ ضمیر لوگوں کا حشر ناقابل یقین ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں
اے وحید	رولوکا	52	وہ حقیقی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی
عثمان غنی	نادیدہ طاقت	85	سنسان ویران اور خوفناک اندھیرے میں جنم لینے والی دل گرفتہ اور دل شکستہ کہانی
احسان سحر	گلاب چہرے	101	نیک خواہشات اور اچھی یادیں انسانی زندگی کی سرمایہ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں
مریم فاطمہ	قبر کے قیدی	33	ایک نوجوان کی حقیقی روداد جسے اپنی جوانی عقلمندی اور طاقت پر ناز تھا......مگر
ملک این اے کاوش	خونی خزانہ	47	حرص و لالچ کے گرداب میں ڈولتی اور دماغ پر سکتہ طاری کرتی......حیرت انگیز کہانی
ایس امتیاز احمد	شیطان کی بیٹی	77	اوہ خدایا!......اس کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوگیا، حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے
طارق محمود	انسانی درندے	97	حقیقت سے چشم پوشی کرنے والے لوگوں کے لئے لرزہ براندام کرتی سبق آموز کہانی
ایم الیاس	خونی جزیرہ	106	مشہور و معروف رائٹر کے زور قلم کی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران کردے گی
رضوان قیوم	آتشی لہو	133	صدیوں پرانی پراسرار، ناقابل یقین، دل دہلاتی اور لرزہ براندام کرتی خوفناک کہانی
محمد قاسم رحمان	محبت کے قاتل	142	ایک خوبرو حسینہ کی دل دہلاتی خوفناک داستان حیرت جس نے لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا
محمد خالد شاہان	اسرار	160	صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی
شہزاد چاند زیب عباسی	شیش محل	190	دل و دماغ کو مبہوت کرتی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی
ایس حبیب خان	خضر راہ	219	ٹھوکریں لگتی ہیں تو انسان سنبھل جاتا ہے اس کے مصداق دلکش و دلنشین......حقیقی روداد
گلاب خان سولنگی	ڈیتھ سٹی	137	نیک خواہشات اور اچھی یادیں انسانی زندگی کی سرمایہ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں
اقراء قریشی	خبیث چڑیل	155	رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک، دہشت ناک، ڈراؤنی کہانی
پرویز احمد دولو	اجلا من	186	جو لطف و مزہ نیک پارسائی اور پاکیزہ زندگی میں ہے وہ برائی میں نہیں......حقیقی کہانی
ادارہ	قوس قزح	214	قارئین کے بھیجے گئے اشعار جنہیں قارئین بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں......
محمد شعیب	طاق راتیں	228	جادوئی عمل کی اپنی نوعیت کی بے مثال کہانی، اس کہانی کو پڑھنے والے عش عش کر اٹھیں گے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔
خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

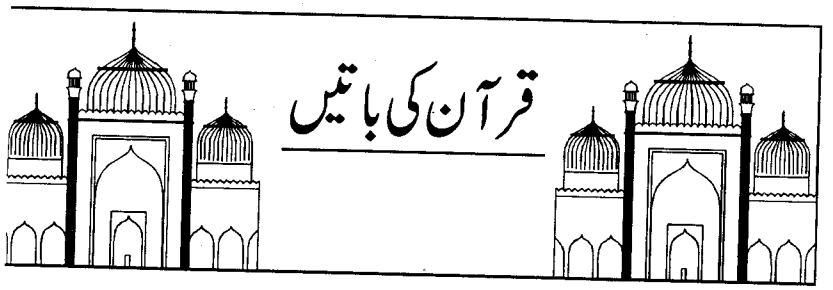

☆ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا تو جو اپنے آپ کو پاکیزہ کہتے ہیں (نہیں) بلکہ اللہ ہی جس کو چاہتا ہے پاکیزہ کرتا ہے۔ اور ان پر دھاگے برابر بھی ظلم نہیں ہوگا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 49)

☆ جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں، جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں، ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 19)

☆ (اے محمد) عفو اختیار کرو اور نیک کام کرنے کا حکم دو اور جاہلوں سے کنارہ کرلو۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 199

☆ اس کے پیچھے دوزخ ہے اور اسے پیپ کا پانی پلایا جائے گا وہ اس کو گھونٹ گھونٹ پیئے گا اور گلے سے نہیں اتار سکے گا اور ہر طرف سے اسے موت آرہی ہوگی مگر وہ مرنے میں نہیں آئے گا اور اس کے پیچھے سخت عذاب ہوگا۔ (سورۃ ابراہیم 14 آیت 16 سے 17)

☆ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی حدود سے نکل جائے گا اس کو اللہ دوزخ میں ڈالے گا جہاں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کو ذلت کا عذاب ہوگا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 14)

☆ بلکہ ان کو تم اور لوگوں سے زندگی کے کہیں حریص دیکھو گے تک کہ مشرکوں سے بھی۔ ان میں سے ہر ایک خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ ہزار برس جیتا رہے مگر اتنی لمبی عمر اس کو مل بھی جائے تو اسے عذاب سے تو نہیں چھ سکتی اور جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 96)

☆ اے اہل کتاب تم سچ کو جھوٹ کے ساتھ خلط ملط کیوں کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو اور تم جانتے بھی ہو (سورۃ آل عمران 3 آیت 71)

☆ پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا حصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت (ہفتہ) کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پڑتی رہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 65)

☆ اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے۔ اور باتیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔ (سورۃ حشر 59 آیت 21)

☆ کہہ دو کہ تم اللہ کو اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، جس نام سے پکارو اس کے سب نام اچھے ہیں اور نماز بلند آواز سے پڑھو اور نہ آہستہ بلکہ اس کے بیچ کا طریقہ اختیار کرو۔ (سورۃ بنی اسرائیل 17 آیت 110)

(کتاب کا نام ''قرآن مجید کے روشن موتی''، بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! دعا ہے اس رب کائنات سے کہ ڈر کے ایڈیٹرز اور تمام چاہنے والوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے (آمین) اپریل کا شمارہ موصول ہوا۔ سرورق حسب روایت بہت اعلیٰ معیار کا تھا۔ خطوط کی بزم میں نئے و پرانے دوست بہترین تبصروں کے ساتھ موجود تھے۔ جنہیں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ امید ہے کہ آپ سب خیر و عافیت سے ہوں گے۔ اس بار کے شمارے میں خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ جناب ایس امتیاز احمد صاحب بہترین تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ بہت بہت مبارکباد۔ ایس امتیاز صاحب امید کرتی ہوں کہ آپ مستقل تبصرہ کریں گے کیونکہ آپ جیسے رائٹر کے اصلاحی مشورے و تنقید نو آموز رائٹرز کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اب آیئے جناب کہانیوں کی جانب سب سے پہلے یہ کہنا چاہوں گی کہ اس مرتبہ ڈر میں ہارر سے زیادہ سسپنس وایڈونچر کا عنصر زیادہ تھا۔ سب سے پہلے ''خزانے کی تلاش'' (ضرغام محمود) پڑھی۔ رائٹر نے ایکشن، تھرل، سسپنس کا جس طرح احاطہ کیا، یہ صرف انہی کا کام ہے ویلڈن! ''ممی'' (ناصر محمود فرہاد) دلچسپ، سیر حاصل، معلومات کا خزانہ لئے، اس تحریر نے یوں محسوس کرایا مانو ہم بذات خود سرزمین مصر پر موجود ہر چیز آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ (Awesome!) ''انوکھا فرار'' (احسان الحق) کیا لاجواب اسٹوری تھی۔ ''محافظ'' (ایس امتیاز احمد) رائیٹر کے قلم کا جادو جگاتی عمدہ تحریر تھی۔ ''اسرار'' دلچسپ انداز میں اپنے سفر کی جانب رواں دواں ہے۔ ''خونی جزیرہ'' ابھی تو ابتداء ہے۔ آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ محفل شعر وسخن کا سلسلہ بھی زبردست جارہا ہے۔ شکریہ کے ساتھ میں اپنے خط کے اس حصے کا آغاز کروں گی مئی کا مہینہ میرے لئے اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ ''مئی 2009ء'' میں پہلی تحریر بعنوان ''کالا رنگ'' ڈر میں شائع ہوئی۔ اسکول کی طالب علم ہوتے ہوئے کم عمری کی اس تحریر کو یقین و بے یقینی کی کیفیت میں ارسال کیا تھا کہ جانے یہ ڈر کے معیار پر پوری اترتی ہے بھی یا نہیں! لیکن میری تحریر کو آپ کے بڑے پن نے پذیرائی بخشی۔ آپ کی قدر افزائی اور حوصلہ افزائی نے ہی مجھے مزید لکھنے کی ہمت دی اور گھر والوں کی اجازت بھی مل گئی۔ ورنہ مجھے ہارر ڈائجسٹ کی اجازت نہیں تھی۔ پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا اور آج مئی 2017ء آگیا اور لکھنے کا یہ سلسلہ ''آٹھ برس'' پر محیط ہو چکا ہے۔ تمنا ہے کہ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے۔ ڈر اور میرا ساتھ سدا قائم رہے۔ میں آج بھی طفل مکتب سمجھتی ہوں اپنے آپ کو، آخر میں ڈر کے لئے ڈھیروں دعائیں!!

☆☆ ایس حبیب صاحبہ: آپ کے دل میں ڈر کی چاہت قابل دید ہے جس طرح ہم نے آپ کی حوصلہ افزائی کی اسی طرح ہر رائٹر کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، بہت سے لکھنے والے آئے اور رائٹر بن گئے۔ ہم کسی کی محنت کو رائیگاں نہیں جانے دیتے۔ خیر ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور زیادہ زور قلم عطا کرے اور زندگی کے ہر جائز کام میں کامیاب و کامران کرے اور پل پل خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

رابعہ عباس بستی فتے والی سے، السلام علیکم، امید ہے کہ آپ سب ہنستے مسکراتے اور اپنی اپنی لائف کو گزار رہے ہوں گے۔ میرے ہاتھ صبح شام تمام مسلمانوں کے لئے دعا گو رہتے ہیں۔ ہم لیٹ ہوگئے۔ ارے بتاتی ہوں لیٹ کیوں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ ڈر 13 تاریخ کو ملا۔ اتنا انتظار کروایا۔ سب سے پہلے خطوط پڑھے Top of the month کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ پھر ایس حبیب خان بجی سنوری اپنی مخصوص کرسی سنبھالے بیٹھی تھیں۔ I Love you سسٹر۔ فلک زاہد سسٹر آپ نے خط نہیں لکھا، ہے ناں بری بات۔ میں نے آپ کو مس کیا خطوط کی محفل میں اب ایسا نہیں کرنا۔ خدیجہ فاطمہ اللہ آپ کو اچھے نمبروں سے پاس کرے۔ جن جن کے پیپر ہو رہے ہیں اللہ سب کو کامیاب کرے۔ (آمین) محسن بھائی آپ بھی اچھا لکھتے ہیں۔ اللہ آپ کو بھی ہر میدان میں کامیاب کرے۔ (آمین) ڈاکٹر طارق خط کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ۔ تو اب بات کی جائے شاعری کی، حکیم خان حکیم، ریاض حسین، قاسم رضا، عامر زمان، آصفہ سراج، عابد علی، قدیر رانا، محسن عزیز، شہریار عزیز ان سب کے کلام پسند آئے۔ میں بھی ایک کہانی بھیج رہی ہوں۔ مایوس مت کرنا پلیز، امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔ اللہ حافظ۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: کہانی بھیجے اور خط کے لئے بہت بہت شکریہ، کہانی اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی ویسے مایوسی سے بچنے کا آسان طریقہ ہے کہ کہانیاں لکھتی رہا کریں۔ اس طرح آپ کو لکھنا آجائے گا۔ امید ہے اس مشورے پر ضرور عمل کریں گی۔ Thanks۔

مریم فاطمہ کراچی سے،السلام علیکم!میری کہانی ’’قاتل پنچھی‘‘ شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ،اپنی دونئی تحریریں ’’پراسرار ڈمی‘‘ اور ’’چار دشمن‘‘ بھیج رہی ہوں۔امید ہے کہ ڈر میں جگہ دیں گے۔کہانیوں میں ’’خواہش ناتمام‘‘ ’’خزانے کی تلاش‘‘ ’’ممی‘‘ ’’آئی کیو لیول‘‘ ’’روح کی حاضری اور ’’قلعے کا عفریت‘‘ زبردست رہیں۔باقی رائٹرز نے بھی اچھا لکھا۔اور اتنا اچھا لکھا کہ دل خوشی سے اچھلنے لگا۔میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام رائٹروں کو زور قلم اور دے تا کہ اچھی اچھی کہانیاں لکھتے رہیں۔شعروشاعری بھی اپنی اپنی جگہ بہت اچھی رہی۔

☆☆مریم صاحبہ:خوش ہو جائیں اب تو ہر ماہ آپ کی کہانی شائع ہو رہی ہے۔اس طرح محنت کرتی رہیں،ایک دن آپ بھی بڑے رائٹروں میں شمار ہونے لگیں گی۔کیونکہ محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے،مدیر محترم ڈر ڈائجسٹ،سلام مسنون!امید واثق ہے کہ آپ مع ڈر ڈائجسٹ کے محنتی عملہ کے خیریت سے ہوں گے۔20 مارچ 2017ء کو مجھے اور میری فیملی کو ایک سانحہ ارتحال پیش آیا کہ اس دن پینتالیس سال سات ماہ اور بارہ دن میرا ساتھ نبھانے والی میری زوجہ محترمہ صابرہ رانی پوری فیملی کو روتا چھوڑ کر اس دار فانی سے رحلت فرما گئیں۔ پوری فیملی کے دلوں کے بہت ہی قریب رہنے والی اس ہستی کو ہم نے اپنے ہاتھوں منوں مٹی کے نیچے دفن کر دیا کہ یہی مشیت ایزدی ہے اور یہی قانون قدرت ہے۔ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ہم سب کی منزل قبر ہے۔خونی رشتوں کے بچھڑنے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اسے پر کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔وہ نہایت نیک اور پارسا خاتون تھیں۔انہوں نے زندگی بھر کسی کا دل نہیں دکھایا وہ دل کی اس قدر صاف تھیں کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔غسل دینے کے بعد ان کے چہرے کا اطمینان اور نور دیدنی تھا اور چہرے پر مسکراہٹ واضح تھی۔یوں لگتا تھا جیسے مدت کے جگراتے کے بعد سکون کی نیند سوئی ہوں۔آپ سے استدعا ہے کہ آپ اور ڈر ڈائجسٹ کے معزز قارئین ان کی بخشش،بلندی درجات اور ہماری پوری فیملی کے لئے صبر کی دعا فرمائیں۔ان کی شان میں چند اشعار لکھے ہیں۔ڈر کے مئی کے شمارہ میں شائع فرما کر شکریہ کا موقع عطا فرمائیں۔

☆☆ریاض صاحب:افسوسناک خبر پڑھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔خیر یہی قانون قدرت ہے،جانے والے جا رہے ہیں۔ ایک روز ہم بھی چلے جائیں گے۔ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی زوجہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ سب تمام اہل خانہ و قلبی رشتوں کو صبر جمیل عطا کرے اور اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے تا کہ آپ رفیق حیات کے لئے دعائے مغفرت کرتے رہیں۔

مہر پرویز احمد دولو میاں چنوں سے،السلام علیکم!سرورق دیکھ کر خوشی ہوئی،قرآن کے فرمودات پڑھ کر ایمان کو تازہ کرتے ہوئے خطوط کی نگری میں داخل ہوا۔محترم ایس حبیب خان کا تبصرہ سونے کی شیلڈ سے کم اعزاز نہیں۔محبتوں کے گلدستے پیش کرنے پر مشکور ہوں،محترم طارق محمود کے خیالات پڑھ کر خوشیوں کی فضاؤں میں اڑان بھر رہا ہوں۔بہت ہی ممنون ہوں جناب کا،احسان الحق کے تبصرے نے سر فخر سے بلند کر دیا،آپ تمام دوستوں کے تبصرے میرے لئے اعزاز سے کم نہیں۔مدثر بخاری بزرگوں کی کرامات پر خوب صورت انداز میں روشنی ڈال رہے تھے۔مریم فاطمہ کا قاتل پنچھی زبردست لگی۔ایم الیاس کی پہلی قسط معلومات کا خزانہ تھا۔ممی کے بارے میں ناصر محمود کا مضمون معلومات اور تاریخ کا خزانہ تھا۔احسان الحق کی کہانی انوکھا فرار بھی اچھی تھی۔جناب اے وحید کی ’’رولوکا‘‘ سبق آموز تحریر ہے جسے پڑھ کر احساس ہوا کہ جو کوئی زنا اور قتل جیسا ظلم اس دھرتی پر برپا کرے گا اسے دنیا کی کوئی طاقت انتقام سے نہیں بچا سکتی۔دیر سویر ہو جاتی ہے۔بلرام کے ظلم و زیادتی کی پہلے تو خاندان والوں نے حساب چکایا اور پھر خود انتقام کا نشانہ بنا۔عثمان غنی کی تحریر روح کا وعدہ بھی اچھی لگی۔آئی کیو لیول شکیل نیازی کی لازوال تحریر تھی۔خالد شاہان کے اسرار آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔اقرا قریشی کی روح کی حاضری دل کو بھا گئی۔گلاب خان نے جیٹ لی کی ذرا سی حکم عدولی کی سزا پر خوب روشنی ڈالی۔محمد شعیب اور طارق محمود کا جنون انتقام پر مبنی تحریر تھی۔چاند زیب کا شیش محل بھی تعریف کے قابل ہے۔

☆☆مہر پرویز صاحب:نئی کہانی بھیجئے،خط میں شائع شدہ کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ قبول کریں۔چونکہ آپ اچھی کہانیاں لکھ رہے ہیں اس لئے آپ کی تعریف ہو رہی ہے۔آپ بھی اب اچھے لکھنے والوں میں شامل ہو گئے ہیں۔اس کے لئے ویری ویری تھینکس۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے،السلام علیکم تمام ڈر اسٹاف،ریڈرز اور رائٹرز کو میری طرف سے چاہت بھرا اسلام۔

پچھلے ماہ میں نے خط کچھ زیادہ ہی لیٹ ارسال کیا تھا اس لئے شامل اشاعت نہیں ہو سکا۔خیر اس دفعہ اپریل کا شمارہ بہت جلدی مل گیا۔جسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔اپریل کے شمارے میں خزانے کی تلاش ضرغام بھائی لائے جو کہ میرے مطابق تھی۔ویری نائس،تابع جنات بھائی مدثر بخاری لائے حقیقی واقعات اور وہ بھی پراسرار ویری گڈ،قاتل پنچھی مریم فاطمہ سسٹر لائیں،گزشتہ کہانیوں کی طرح یہ کہانی بھی Best رہی،ممی ناصر محمود فرہاد نے ممیوں کے متعلق بہت سی معلومات فراہم کیں۔ویری گڈ،انوکھا فرار احسان الحق لائے،ہارر تو نہیں تھی مگر کہانی لرزا دینے والی تھی۔خواہش ناتمام عمران قریشی ویسے اپ کی ہر کہانی کسی نہ کسی طرح لڑکیوں پر مشتمل ہوتی ہے۔یہ کہانی بھی لاجواب تھی،محافظ ایس امتیاز احمد لائے۔Small کہانی اچھی رہی،شاید آپ نے ہارر لکھنا بند کر دیا ہے۔ رولوکا قسط نمبر 143 بھی بیسٹ رہی۔روح کا وعدہ عثمان غنی لائے ویری نائس،آئی کیو لیول شکیل نیازی واؤ زبردست کمال کر دیا۔ ارے اس بار تو آپ نے میرے دل کو چھو لیا ویری گڈ،اسرار قسط نمبر 9 اس کہانی کے تو کیا کہنے بھائی خالد شاہان آپ واقعی تعریف کے قابل ہیں۔روح کی حاضری آپی اقرا قریشی لائیں جو کہ واقعی ڈر کے عین مطابق تھی۔ویری نائس،قلعے کا عفریت گلاب خان سولنگی آپ کے کیا کہنے کمال کا لکھتے ہیں آپ،آکٹوپس محمد شعیب چھپکلی کا پاٹ ٹو بہت اچھی رہی پاٹ تھری کا انتظار ہے،جنون طارق محمود ایک قابل ستائش کہانی بہت اچھے،قوس قزح کا بھی جواب نہیں۔

☆☆محسن صاحب:آپ کی کہانی بھی چھپے گی،ذرا صبر کریں۔آپ کو کہانیاں اچھی لگیں اس کے لئے شکریہ،پچھلے ماہ واقعی آپ کا خط لیٹ ہو گیا تھا،دراصل 10 تاریخ کو کاپیاں پریس میں چلی جاتی ہیں۔جو خطوط آٹھ تاریخ تک آ جاتے ہیں وہ شامل اشاعت ہوتے ہیں۔پلیز خیال رکھئے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے،السلام علیکم!امید ہے مزاج گرامی بخیر ہو گا!ماہ اپریل 2017ء کا خوب صورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔لہٰذا حاضر ہیں۔اس ماہ کے تجزیے کے ساتھ...... ٹائٹل دلفریب رہا۔’’قرآن کی باتیں‘‘ ایک خوب صورت سلسلہ جو ہم سب کے لئے مشعل راہ بھی ہے۔’’خطوط‘‘ ڈر کے خوب صورت رائٹرز اور وویورز کے دلچسپ خطوط جن کا ہم سب انتظار کرتے ہیں۔’’خزانے کی تلاش‘‘ ضرغام محمود کراچی سے خوب صورت اور ایڈونچر سے بھرپور Story لائے،نام گو کہ بچوں کی اسٹوری کا سا ہے مگر کہانی خوب لے کر چلے،گڈ کیا بات ہے ضرغام جی!’’تابع جنات‘‘ مدثر بخاری شہر سلطان سے اپنی کہانی میں اپنے ابو کی Story پیش کی!کوئی نیا پن نہیں تھوڑی محنت اور کر لیتے تو کہانی خوب ہوتی۔مگر بری بھی نہیں۔’’قاتل پنچھی‘‘ آپ کی Story اچھی رہی،مغرب زدہ ماحول میں لکھی گئی کہانی مریم فاطمہ اچھا لکھ رہی ہیں۔ایک انگلش موی سے متاثر لگتی ہے۔ ’’خونی جزیرہ‘‘ ایم الیاس کی نئی سلسلے وار کہانی کی پہلی قسط ابھی ڈر کے وویورز کو اپنے حصار میں نہ لے سکی؟ مگر لگتا ہے اگلی قسطوں میں ہم سب ’’خونی جزیرہ‘‘ کے حصار میں ہوں گے؟’’ممی‘‘ ناصر محمود فرہاد فیصل آباد کے 3 نامور والے رائٹر کی ’’ممی‘‘ واجبی سی رہی۔مگر ناصر صاحب کی ایک اچھی کوشش۔’’انوکھا فرار‘‘ ہارر کم اور سسپنس زیادہ سمندر پار کی خوب صورت Story جسے ’’احسان الحق‘‘ نے بڑی خوب صورتی سے ترتیب دی۔ خوب بلکہ بہت خوب احسان الحق۔’’خواہش ناتمام‘‘ عمران قریشی،کوئٹہ سے لائے،صحیح کہا،عمران جی!خواہش تو بہت کہ ہر خواہش پر دم نکلے،ہارر،ایڈونچر،سسپنس کا خوب صورت امتزاج،آج کل آپ خوب لکھ رہے ہیں۔’’محافظ‘‘ جسے ہم نے لکھا۔مگر یہ قارئین کو بتانا ہے کہ Story مختصر مگر کیسی رہی؟’’رولوکا‘‘ اے وحید کی سلسلے وار Story کی 143 قسط بڑی تیزی سے رواں دواں ہے۔پراسرار قوتیں اپنی جادوئی کرشمہ سازی میں آگے ہی آگے ہر قسط ایک نئے موڑ پر آ کر ہم سب کو حیران کئے ہوئے ہے۔اے وحید صاحب!جواب نہیں آپ کا۔خدا کرے اور ہو زور قلم زیادہ۔’’روح کا وعدہ‘‘ عثمان غنی صاحب پشاور سے لے کر آئے۔آپ کی کہانی کوئی چارم نہ پیدا کر سکی۔عثمان صاحب!تھوڑی سی محنت آپ کی کہانی میں جان ڈال سکتی تھی مگر آپ نے فوراً End کر دیا۔’’آئی کیو لیول‘‘ مغربی پس منظر میں کھیلا جانے والا دلچسپ ڈرامہ بہت اچھی تحریر رہی۔بہت اچھا لکھا آپ نے ’’شکیل نیازی‘‘ صاحب!’’اسرار‘‘ ’’خالد شاہان‘‘ صادق آباد سے اسٹوری ایڈونچر اور سسپنس سے بھرپور خوف کا لبادہ اوڑھے تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔آپ کی محنت کا جواب نہیں!’’روح کی حاضری‘‘ اقراء قریشی ’’راولاکوٹ‘‘ سے Best Story لائیں،Story عمدہ اور اچھی لکھی ہے۔آپ اسے تھوڑی طویل کر سکتی تھیں۔’’قلعے کا عفریت‘‘ گلاب خان سولنگی کشمور سے لائے۔پڑھنے والوں کے لئے آپ سسپنس اور ہارر سے بھرپور کہانی اچھی لگی۔’’آکٹوپس‘‘ کہانی واجبی سی رہی۔تھوڑی سی محنت اگر اور ہو جاتی تو محمد شعیب

صاحب! آپ کی کہانی زبردست ہوجاتی......! ''جنون'' بالکل صحیح دوسروں کو دکھ اور اذیت دینے والے اکثر خود بھی اذیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک سبق آموز Story طارق محمود صاحب جواب نہیں آپ کا! اور آپ کا طرز تحریر کا۔ ''قوس قزح'' ڈر کے وویورز کے بھیجے گئے خوب صورت اشعار انتخاب کا جواب نہیں۔ غزلیں۔ ''ڈر'' کے خوب صورت قارئین کی بھیجی گئی خوب صورت دل میں اتر جانے والی شاعری۔ ''پراسرار تعویذ'' بلیک میجک پر مبنی سسپنس سے بھرپور دلچسپ کہانی اپنی تمام تر خوفناکی کے ساتھ رواں دواں تھی کہ کہانی کا اینڈ ہوگیا۔ ڈاکٹر طارق صاحب تھوڑی Story کو بڑھا دیتے۔ آپ کے لئے یہی کہوں گا اچھا لکھتے ہیں۔ ''شیش محل'' دل میں اتر جانے والی خوب صورت Story جواب نہیں۔ شہزادہ چاندزیب عباسی صاحب آپ کی اسٹوری کے اگلے اور آخری حصے کا انتظار ہے۔ یہ تھا ماہ اپریل پر تجزیہ ہم پھر یہی کہیں گے ہمارے تنقید کرنے کا مقصد کسی کی دل آزاری نہیں۔ اس کی تحریر کو نکھارنا ہے تاکہ آپ خوب سے خوب تر لکھیں تاکہ آپ کا ایک حلقہ احباب اور خوب صورت وویورز ہوں جو آپ کی تحریر کا ہر ماہ انتظار کریں۔ پھر بھی ہم سب سے معذرت خواہ ہیں۔ اگر لکھنے میں کچھ برا لگا ہو۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر'' کے خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے وویورز کو دعا سلام۔

☆☆ ایس امتیاز صاحب: بہت خوب یہ ہوئی ناں بات کہ اب آپ دل لگا کر تجزیہ لکھ کر سب کو خوش کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو بھی خوش و خرم رکھے تاکہ اپنی اچھی اچھی تحریریں بھیجتے رہیں۔ Thanks۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ موسم بہار کا آغاز ہو چکا ہے۔ ہر طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہیں۔ کام سے فرصت ملی تو شہر جانا پڑا۔ جب بکسٹال پر پہنچا تو ماہ اپریل 2017ء کے تازہ پرچے نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم دیکھ کے مسکرا دیئے۔ اس بار سرورق بڑے کمال کا تھا اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی۔ ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر بہتر تھے۔ جیسے انگوٹھی میں نگینہ ہو۔ خط اور غزل کے ساتھ یاد کرنے پر میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ جن محبت بھرے جذبات سے آپ ہمیں یاد کرتے ہیں ان کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ ایک معیاری پرچہ ہے اس کا اپنا ہی الگ رنگ ہے۔ میں اس کا بہت پرانا قاری ہوں۔ آپ ہم سے ہزاروں میل دور ہیں تو کوئی بات نہیں۔ خط اور ڈر ڈائجسٹ کے ذریعے آدھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ قرآن کی باتیں ہمارے لئے مشعل راہ ہے مسلمان ہونیکے ناطے سے قوس قزح کے اشعار خوب تھے، غزلیں سبھی کی اچھی تھیں۔ ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی، مثلاً روح کا وعدہ، اسرار، جنون، محافظ، خزانے کی تلاش، خواہش ناتمام، انوکھا فرار وغیرہ، خطوط قارئین کے پڑھ کے ڈر ڈائجسٹ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے ہر انسان کی اپنی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ صبح سے شام ہوتی ہے زندگی تمام ہوتی ہے۔ یہی نظام قدرت ہے ہماری دعا ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام لوگ دکھ، مصیبت اور پریشانیوں سے دور رہیں، اللہ تعالیٰ سب پر اپنا رحم و کرم کرے۔ (آمین)

☆☆ اسلم صاحب: ہماری اور قارین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر بھی اپنا رحم و کرم کرے اور زندگی میں خوشحالی کا دور دورہ کر دے، اور ہاں اگلے ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولئے گا مت۔ شکریہ۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، السلام علیکم! اپریل 2017ء کا ڈر ڈائجسٹ ملا تو بڑی خوشی ہوئی، کہانیوں سے جگمگاتا ڈر مطالعے میں ہے۔ میری دعا ہے کہ ڈر ترقی کی منزلیں طے کرتا رہے۔ شادیوں کا سیزن ہے اس کے لئے دوست احباب اور خاندان والوں کے لئے سفر پر سفر، وقت بہت کم مل رہا ہے۔ ہر ماہ کراچی کے کئی چکر لگتے ہیں اور پروگرام بناتا ہوں کہ ڈر والوں سے ضرور ملاقات کروں گا مگر دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ خیر آئندہ کوشش ضرور کروں گا۔ زندہ رہنے پر لوگ پوچھتے نہیں تو جب مٹی کے ڈھیر رہ جائیں گے تو کون یاد کر کے دعا کرے گا۔ ارادہ ہے کہ 2018ء میں تاحیات تبلیغ کے لئے نکل جاؤں۔ حج اور عمرہ کا بھی ارادہ ہے۔ دعا کیجئے گا۔

☆☆ شرف الدین صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد از جلد آپ کو عمرہ و حج سے سرفراز کرے، آپ کا ارادہ ہے کہ تاحیات تبلیغ کے لئے نکل جاؤں گا۔ تو آپ غور کیجئے گا کہ بہت سے لوگ ہوں گے جن کو آپ کی ضرورت ہوگی، دنیا کے جھمیلوں میں پڑ کر بھی عبادت ہو جاتی ہے اور وہ عبادت جلدی قبول ہوتی ہے۔ خیر اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی دے۔ اور جائز مقاصد میں کامیاب و کامران کرے۔ اور ہاں اب جب کراچی آئیں تو ہم سے ملاقات ضرور کیجئے گا۔ اس کے لئے پیشگی شکریہ۔

محمد سفیان اسلم بھکر سے، السلام علیکم! سب سے پہلے ڈر کے تمام قارئین اور اسٹاف کو میری طرف سے محبت

بھرا سلام قبول ہو۔ اپریل کا ڈر 28 مارچ کو ملا۔ ٹائٹل کافی شاندار تھا۔ خرید کر گھر لائے اور کہانیوں پر ایک نظر ڈالی۔ تمام کی تمام کہانیاں بہت اچھی لگیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کون سی کہانی پڑھوں، بالآخر رولوکا پر آ کر سوچ مکمل ہوئی۔ رولوکا اس بار کافی اچھی تھی۔ اس کے علاوہ معروف رائٹر ایم الیاس کی خونی جزیرہ بھی بہت اچھی کہانی تھی، شیش محل بھی زبردست ہے اور اس کے علاوہ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں جس میں قلعہ کا عفریت قابل دید ہے۔ مختصراً اب اگلے ماہ ایک نئے خط کے ساتھ ملاقات ہوگی۔ تب تک کے لئے اجازت دیں۔

☆☆ سفیان صاحب: خط بھیجنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ، امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی ضرور نوازش نامہ بھیجیں گے۔

عبدالعزیز بلوچ کراچی سے، میری طرف سے سب سے پہلے ڈر سے وابستہ تمام لوگوں کو السلام علیکم اپریل کا شمارہ بہت شاندار رہا، خطوط بھی سب کے خوب تھے۔ کہانیوں کی فہرست میں خزانے کی تلاش، ضرغام محمود نے اچھے انداز میں تحریر کیا، اسی طرح مدثر بخاری نے بھی تابع جنات اچھا لکھا، مریم فاطمہ کا آسیبی کار کی طرح قاتل پنچھی بھی خوب رہا۔ ایم الیاس صاحب کی خونی جزیرہ نے بہت متاثر کیا۔ ناصر محمود فرہاد، ممی میں مصری تاریخ پڑھ کر اچھی لگی۔ رولوکا، انوکھا فرار، روح کا وعدہ، اسرار، شیش محل بہت ہی زبردست کہانیاں تھیں۔ قوس قزح میں سب کے اشعار عمدہ تھے۔ اور میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ بہت زیادہ ترقی کرے۔

☆☆ عبدالعزیز صاحب: قلبی لگاؤ سے لکھا خط اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

خضر حیات روڑہ تھل سے، السلام علیکم! پیارے انکل جی آپ کیسے ہیں امید ہے خیر خیریت سے اور ٹھیک ٹھاک ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پورے اسٹاف کو سدا خوش و سلامت رکھے اور لمبی عمر دے۔ ڈر کے سب قارئین اور رائٹرز کو میرا ڈھیروں پیار بھرا سلام۔ اپریل کا شمارہ ایک خوب صورت اور دلکش ٹائٹل کے ساتھ ٹھیک 25 مارچ کو مل گیا۔ ٹائٹل بہت ہی دلکش تھا۔ شمارے میں جتنی بھی کہانیاں شامل تھیں۔ سب ہی بہت عمدہ اور اچھی تھیں۔ جو کہ ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ اگر یہ کہوں کہ فلاں کی اچھی تھیں فلاں کی بری تھیں تو یہ سراسر غلط ہوگا۔ قوس قزح اور غزلوں نے تو پورے شمارے کا مزہ ہی دوبالا کر دیا۔ سب کی سب غزلیں بہت اچھی تھیں۔ اپنی غزل اور شعر دیکھ کر دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ مزید کچھ تحریریں بھیج رہا ہوں۔ امید ہے اپریل کی طرح مئی میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری دعا ہے کہ ڈر دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرے۔ (آمین)

☆☆ خضر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر اچھا لگا، کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ قبول کریں۔ اور آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولئے گا مت۔

گلاب خان سولنگی کشمور سے، السلام علیکم! سر ماہ اپریل کا شمارہ ایک شاندار سا سرورق لئے ہمیں موصول ہوا۔ قرآن کی باتوں سے دل منور ہوا۔ خطوط کی محفل بھی خوب جمی تھی۔ پچھلے ماہ میرا تجزیہ والا خط غائب تھا، لیکن خوشی ہوئی کہ چند نئے لکھنے والوں کو جگہ ملی، میری چند کہانیاں آپ کو موصول ہو چکی ہیں جبکہ آج کل کچھ شعر و شاعری پر طبع آزمائی کی جا رہی ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور نثری نظم پیش خدمت ہے۔ شاعر لوگوں سے گزارش ہے کہ شعر و شاعری پر بھی اپنی قیمتی آراء اور تجزیے سے ادارہ کو ضرور نوازیں گے۔ شاہد بھائی! قبل ازیں ڈر میں کچھ اسلامی ادب کے لئے کچھ صفحات مخصوص کرنے کے لئے میں نے آپ کو کچھ تجاویز پیش کی تھیں، امید ہے کہ وہ بھی زیر غور ہوں گی تاکہ قارئین کرام کو خوفناک ادب کے ساتھ اسلامی معلوماتی ادب بھی پڑھنے کو ملے گا۔ حسب سابق کہانیاں خوب سے خوب تر تھیں۔ جبکہ مستقل سلسلے بھی خوب رہے۔ اس مرتبہ شاعری نے تو کمال کر دیا۔ بڑے ہی باذوق قارئین ڈر کی تعمیر و ترقی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ کہانی زیر قلم ہے جونہی مکمل ہوگی، پہلی فرصت میں آپ کو ارسال کر دوں گا، فی الحال اپنی تازہ شاعری اور کچھ مواد آپ کو ارسال کر رہا ہوں، میری شاعری اور کہانیاں پسند کرنے پر قارئین کا شکر گزار ہوں۔ مزید ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں؟

☆☆ گلاب خان صاحب: دراصل پچھلے ماہ آپ کا خط بہت لیٹ موصول ہوا تھا، 8 تاریخ تک جو خط آتے ہیں وہ شامل اشاعت ہوتے ہیں۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔ خوش ہو جائیں۔

طارق محمود آکاش ڈسکہ سے، ڈر کی محفل میں تمام دوستوں کو خلوص، محبت، چاہت کے ساتھ آداب عرض ہے! خداوند کریم سے دعا اور امید ہے کہ میرے وطن میں بسنے والا ہر بندہ خیریت سے ہو۔ مصروفیت کے اس دور میں جب لوگ اپنا ایک ایک لمحہ موبائل کے ساتھ گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں "ڈر" کی محفل میں شامل خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ کتنی محبت سے ڈر پڑھتے ہیں۔ اور پھر اس پر اپنی رائے کا اظہار بذریعہ خطوط کرتے ہیں۔ یقین جانئے بہت اچھا لگتا ہے۔ رحیم یار خان سے ہماری کولیگ ڈاکٹر انمول کا خط سرفہرست دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ میری بیٹی کا نام بھی انمول شہزادی ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کی ایوارڈ تجویز پسند آئی۔ ایس حبیب صاحبہ آپ کی تحریریں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ خوش رہئے۔ ارم اصغر علی سمزین، خدیجہ فاطمہ، طارق محمود، ضرغام محمود، خضر حیات، احسان الحق، رنجل ساحل، بھائی مہر پرویز، محمد اسلم جاوید آپ سب کی تحریریں اچھی تھیں۔ مدثر بخاری آپ لکھئے نیک دعائیں، نماز اور قرآن میں باقاعدگی رکھیں، خدا آپ کو سلامت رکھے۔ زبردست ٹائٹل کے ساتھ اپریل کا شمارہ 25 مارچ کو مل گیا تھا۔ فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر آپ کی توجہ کے لئے مشکور ہوں کہ آپ نے ہماری تحریر کو جگہ دی۔ کچھ نئی تحریریں بھجوا رہا ہوں۔ پیارے بھائی ایس امتیاز احمد ہمیشہ کی طرح عمدہ تحریر کے ساتھ آئے۔ اقراء قریشی کی "روح کی حاضری" بہت پسند آئی۔ گلاب خان سولنگی آپ کا نام بہت خوب صورت ہے، "قلعے کا عفریت" زبردست تحریر تھی۔ ضرغام محمود، مدثر بخاری اور مریم فاطمہ کی تحریریں اپنی مثال آپ تھیں۔ ایم الیاس ایک منجھے ہوئے رائٹر ہیں۔ ان کی سلسلہ وار کہانی شروع ہوئی۔ بہت اچھا لگا۔ ڈر کی ہر تحریر اپنی مثال آپ ہوتی ہے۔ خدا کرے۔ ڈر مزید ترقی کی منازل طے کرے۔ خوش رہئے۔ خوش رکھئے۔ اپنا اور اپنے چاہنے والوں کا خیال رکھئے۔ دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔ زندگی نے وفا کی تو آئندہ ماہ پھر ملیں گے۔

☆☆ طارق محمود صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، پہلی کہانی اچھی تھی اور شائع ہوگئی۔ ارسال کردہ کہانیاں بہت لیٹ موصول ہوئیں۔ آئندہ ماہ ضرور شامل اشاعت ہوں گی۔ آئندہ بھی تجزیہ کے لئے شکریہ قبول کریں۔

اظہر علی مغل نصیر پور کلاں سرگودھا سے، السلام علیکم! امید ہے سب کے مزاج بخیر ہوں گے۔ ہم جولائی 2014ء سے ڈر ڈائجسٹ پڑھ رہے ہیں۔ بچپن ہی سے ہمیں لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ ڈر ڈائجسٹ سے ملاقات اتفاقاً تھی جو بعد میں عادت اور اب ضرورت بن گئی ہے۔ ڈر ڈائجسٹ کے رائٹر ماشاء اللہ کمال کا لکھتے ہیں۔ ایم اے راحت، ملک این اے کاوش، احسان سحر، شہزادہ چاند زیب عباسی ہماری پسند کے لکھاری ہیں۔ ہم نے بہت سی کہانیاں لکھی لیکن لکھ کر پھاڑ دیں کہ پتہ نہیں ڈر ڈائجسٹ کے معیار پر پورا نہ اتریں۔ ڈر ڈائجسٹ میں یہ ہمارا پہلا خط ہے اس لئے اجازت لینا چاہتے ہیں کہ کیا ہم اپنی اسٹوری ڈر ڈائجسٹ کو بھیج سکتے ہیں۔

☆☆ اظہر علی صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، آپ بصد شوق اپنی کہانی بھیج دیں۔ اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ ویسے لکھتے لکھتے آدمی رائٹر بن جاتا ہے۔

عبدالجبار رومی انصاری لاہور سے، ماہنامہ ڈر کا شمارہ اپنے وقت پر ہی مل گیا تھا، قرآن کی باتیں پڑھ کر بہت اچھا لگا، ہر بات حکمت سے بھرپور اور انسانیت کی اصلاح کے لئے عمدہ ترین جسے پڑھ کر دنیا و آخرت میں کامیابیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ خطوط کی محفل سے ٹاپ آف منتھ ایس امتیاز احمد قرار پائے۔ جو اپنی کہانیوں کی طرح خط میں بھی زبردست تجزیے کے ساتھ موجود تھے۔ اس کے علاوہ خاموش قاری ڈاکٹر انمول، رنجل ساحل، عجب گل اداسی کی شرکت اچھی لگی، باقی ایس حبیب خان، مسز زینت، ضرغام محمود، احسان الحق اور محمد اسلم جاوید کے خطوط بھی اچھے تھے۔ اب کہانیوں میں خزانے کی تلاش پڑھی جو کہ بہت اچھی لگی۔ "روح کی حاضری" بھی بہت خوب رہی۔ "ممی" بہت اچھی اور معلومات افزا تحریر تھی، پتہ چلا کہ قدیم مصری مردہ اجسام کو کیسے حنوط کرتے تھے۔ آئی کیو لیول معلومات سے بھرپور تو تھی ہی مگر فل سائنس فکشن فلم کی طرح تحریر بہت اچھی لگی۔ پراسرار تعویذ نے تو فقیر محمد کو اور اس کی گھر والی کو بھی ہلاک کر دیا۔ سبق آموز کہانی تھی۔ اس دفعہ ڈر میں بہت ہی خاص قسم کی کہانیاں تھیں جو بہت پسند آئیں اور مجموعی طور پر اس ماہ میں کہانیوں کے اعتبار سے بہت ہی خاص اور زبردست رہا۔

☆☆ عبدالجبار صاحب: ارسال کردہ خط اور وہ بھی کہانیوں کی تعریف کے ساتھ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا، خیر یہ امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ساحل ابڑو بلوچستان سے، السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج بخیر ہونگے۔ اپریل کا تازہ شمارہ ڈر میرے ہاتھوں میں ہے۔ شاہد صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ جو اس ناچیز کی تحریروں کو زینت بناتے آرہے ہیں۔ ایک بار پھر بہت بہت شکریہ۔ خوب صورت ٹائٹل پر بیٹھی عورت دو انگلیوں سے مجھے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے بتا رہی تھی وہ دیکھ میری تصویر کے نیچے خون شفق میں ڈوبی یہ شام اور موت کی آخری ہچکی، میں یقیناً سمجھ گیا کہ اس بار تمام کی تمام کہانیاں دل ہلانے والی ثابت ہوں گی۔ تو میں سب سے پہلے اسلامی صفحہ پڑھ کر ایمان کو تازہ کیا اس کے بعد تھوڑی سی ملاقات خطوطوں سے کرتے ہوئے سیدھا کراچی چلا گیا۔ جی ہاں ضرغام محمود (خزانے کی تلاش) پڑھ کر میرے اندر ادب شناس کی مہک جاگ اٹھی کیونکہ ادب کی تاریخ کے جھرنوں میں رکھا جائے تو ایسی کہانیاں کم لکھی گئی ہیں، میں ضرغام محمود کو اچھی کہانیاں لکھنے پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ مدثر بخاری (تابع جنات) حقیقت پر مبنی یہ تحریر جناتوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مدثر بخاری بھی بہترین رائٹر میں سے ایک ہیں۔ مریم فاطمہ (قاتل پنچھی) خوفناک دل ہلانے والی تحریر ثابت ہوئی۔ ایم الیاس (خونی جزیرہ) پہلی قسط تو زبردست ثابت ہوئی۔ باقی قسطیں پڑھ کر ہی کچھ لکھا جائے گا۔ ایم الیاس کو اردو ادب کا مایہ ناز ادیب کہا جاتا ہے۔ ناصر محمود فرہاد (ممی) میں خوب صورت لفظوں کا چناؤ کیا گیا ہے۔ اس تحریر میں ناصر صاحب نے کمال کر دیا۔ احسان الحق (انوکھا فرار) خوب صورت تحریر تھی۔ احسان بھائی ہمیشہ خوش رہو اور خوشیاں پاؤ۔ عمران قریشی (خواہش ناتمام) حقیقت کے قریب اور تمام معلومات سے نوازا گیا۔ عمران کی تخلیق نوجوان نسل کے لئے ادب مطالعہ و ذوق و شوق رکھتی ہے۔ ایس امتیاز احمد (محافظ) ہر انسانیت کے اندر کسک ضمیر جھنجھوڑنے والی تحریر تخلیق کی گئی ہے۔ امتیاز ادب کی وہ زمزمہ پرواز ہیں۔ جن کی پیاس بجھتی ہی نہیں۔ اے وحید (روبوکا) اس تحریر پر تو میں کچھ لکھ نہیں سکتا جس کی وجہ ہے کہ اس کی تمام قسطیں میری نظروں سے گزری نہیں۔ عثمان غنی (روح کا وعدہ) عشق محبت پر لکھی گئی یہ تحریر بھی ڈر کی جان بنی۔ شکیل نیازی (آئی کیو لیول) معاشرے کی عکاسی کرتی ہوئی حقیقت کے قریب محسوس ہوئی، شکیل بھائی آپ بہت اچھے رائٹر ہیں، محمد خالد شاہان (اسرار) زبردست چل رہی ہے۔ آگے کیا ہوگا آنے والے حصے میں پتہ چلے گا۔ اقرا قریشی (روح کی حاضری دل کو اچھی لگی بہت خوب اقراء باجی۔ گلاب خان سولنگی (قلعے کا عفریت) ناقابل فراموش بھرپور مرکزی کرداروں کو خوب صورت انداز کے ساتھ ترتیب دے کر ایک تحریر کا روپ دیا گیا۔ محمد شعیب (آکٹوپس) دل میں گھر کر گئی۔ طارق محمود آکاش (پراسرار تعویذ) آپ بیتی کے لفظوں کو ڈھال کر سطروں میں تخلیق کرنا بہت بڑا ادب کا کام ہے۔ طارق محمود (جنون) سب سے اچھی تحریر پڑھنے کو ملی۔ ویلڈن طارق محمود، شہزادہ چاند زیب عباسی (شیش محل) خوب صورت حصہ باری باری پڑھنے کو ملتی ہے۔ شہزادہ صاحب بھی میرے فیورٹ رائٹر ہیں۔ شاہد صاحب آپ کی محبت نے آخر مجھے پورا تبصرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ سو میں نے کر دیا۔ میں یہاں صرف دو باتیں ضرور لکھوں گا کہ پاکستان کی سطح پر حقیقی مظلوم اور گمنام رائٹرز شعر و ادب کے لئے تقریب ایوارڈ کا انعقاد کرنے والی ادبی تنظیم (ملی ادبی فاؤنڈیشن) کی مرکزی کابینہ تشکیل عمل میں لائی گئی ہے۔ جس کا وائس چیئرمین راقم الحروف خود ہے۔ اگر کوئی دوست اس تنظیم میں حصہ لینا چاہتا ہے تو وہ مجھ سے ضرور رابطہ کرے! دوسری بات یہ کہ میں نے اپنی محنت اپنے تحت طارق اسماعیل ساگر لائبریری جعفر آباد کی بنیاد ڈالی ہے۔ اگر کوئی مصنف یا ادب رائٹرز اپنی کتاب لائبریری کے لئے بطور تحفہ بھیج دیں تو میں اس کا احسان مند رہوں گا کیونکہ ہمارا شہر پسماندہ علاقہ ہے یہاں اچھی اچھی کتابوں سے تمام نوجوان نسل محروم ہے۔ آپ کا تعاون میرے لئے استاد محترم کا درجہ رکھتا ہے۔

☆☆ ساحل صاحب: قلمی لگاؤ سے لکھا گیا تجزیہ بہت اچھا لگا۔ اپنی کہانی پر غور کیجئے گا۔ اگر کوئی بات رہ گئی ہے تو فون پر کر لیجئے گا۔ Thanks۔

☆☆

تمام رائٹرز سے التماس ہے کہ آپ کے ارسال کردہ خطوط 8 تاریخ تک ہمیں لازمی موصول ہوجائیں تاکہ شامل اشاعت ہوسکیں؟ اور پلیز! اپنا فون نمبر ضرور ارسال کریں کیونکہ وقت ضرورت اس کی ضرورت پڑتی ہے، ویسے بھی ادارہ ڈر ڈائجسٹ تمام ایڈریس اور فون نمبرز کا امین ہے۔ تمام رائٹرز کا ایڈریس اور کال نمبر پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔ شکریہ۔ ادارہ۔

محقق

احسان الحق

اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قانون اور فیصلے سے ہم سب تقریباً غافل ہیں۔ یہ کہانی اس خواب غفلت سے جگانے کے لئے لکھی گئی ہے ہمیں حالات واقعات سے سبق حاصل کرکے احکام خداوندی پر عمل پیرا ہونا چاہئے۔

ایک ذہین خوش اخلاق اور خوش گفتار پروفیسر کی کتھا جسے کشف ہونے لگ گیا تھا

پروفیسر درانی جب لیکچر سے فارغ ہوکر کمرہ جماعت سے نکلا تو نہایت عجلت میں، اور پھر یونیورسٹی کے کیمپس سے باہر نکلتے ہوئے سیدھا اپنی سوزوکی ایف ایکس کی جانب بڑھا اور گاڑی کا دروازہ چابی گھماتے ہوئے کھولا لیکن ابھی وہ گاڑی میں بیٹھنے ہی کو تھے کہ اس کی نظر سامنے دو نوجوان لڑکوں کی جانب اٹھی اور وہ ان دونوں کی طرف یک ٹک لگائے گھورتا رہا۔ اس کی ایک ٹانگ گاڑی کے اندر ڈرائیونگ سیٹ کی جگہ پر تھی تو دوسری زمین پر۔ پھر وہ کچھ سوچتا ہوا گاڑی سے اپنے بائیں ٹانگ باہر نکال کر گاڑی کے دروازے کے سہارے سے اپنے ایک بازو کی کہنی ٹکائے نوجوان لڑکوں کو گھورنے لگ گیا۔ دونوں اسی یونیورسٹی کے طالب علم تھے جس یونیورسٹی میں پروفیسر درانی ایم اے نفسیات والوں کو درس دیا کرتا تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے انہیں سر ہلا کر رکنے کا اشارہ کیا۔ ”السلام علیکم سر!“ دونوں نے ایک زبان ہوکر اسے سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام آپ دونوں کس کلاس کے طالب علم ہیں؟“

”سر ہم اکنامکس کے اسٹوڈنٹس ہیں۔“ ان لڑکوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ پروفیسر نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ویری گڈ! آپ کا نام کیا ہے؟“ اس نے پاس کھڑے دوسرے خاموش لڑکے سے پوچھا تو اس لڑکے نے سنجیدگی سے کیف عجیب انداز میں کھویا ہوا ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”سر! اکرم!“

”ہونہہ۔“

”اور سر میرا نام جمیل احمد ہے۔“ دوسرے نے بہت پرجوش انداز میں کہا۔ وہ اکرم نامی طالب علم سے زیادہ خوش اخلاق اور جوشیلا نظر آ رہا تھا۔ پروفیسر نے دونوں کو مسکراتے ہوئے ایک بار دیکھا اور دعائیہ جملے ادا کرتے ہوئے انہیں رخصت کیا۔ وہ دونوں یونہی آپس میں باتیں کرتے ہوئے اپنے راستے آگے کو چل دیئے لیکن پروفیسر درانی انہیں عقب سے دیکھتا ہی رہا۔ یہاں تک کہ سامنے سڑک پر نصب اشاروں سے وہ دائیں جانب مڑ گئے لیکن پروفیسر ہنوز انہیں دیکھتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنے قدموں کی جانب سر کیا اور زیر لب کچھ بڑبڑایا۔ پھر اپنے سر کو جھٹکا اور تیزی سے اپنی ایف ایکس میں سوار ہوکر گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ گاڑی اس نے اسی راستے پر ڈال دی تھی جہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ لڑکے دائیں جانب مڑے تھے۔

جونہی پروفیسر درانی نے گاڑی کو اس سڑک پر دائیں جانب موڑا جہاں تھوڑی دیر پہلے جمیل احمد اور اکرم نامی طالب علم گئے تھے تو وہ یک دم چونک گیا وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو چکا تھا۔ نہ جانے کس بدنصیب کے ساتھ وہاں کون سی ان ہونی ہوگئی تھی پروفیسر نے اپنی گاڑی کی رفتار آہستہ کردی لیکن جونہی

وہ اس جمگھٹے کے قریب سے گزرا یہ یک دم دھک سے رہ گیا کہ جس لڑکے نے اپنا نام اکرم بتایا تھا وہ سڑک پر سیدھا چت لیٹا ہوا تھا اور دوسرا لڑکا جمیل احمد اس پر اوپر سے جھکا ہوا اسے ہوش دلانے کی کوشش کرر ہا تھا۔

پروفیسر کی گاڑی کو آتا دیکھ کر کچھ اور راہ گیروں نے راستہ روک لیا اور اس سے درخواست کی کہ بے ہوش لڑکے کو گاڑی میں سوار کر کے فوری اسپتال پہنچایا جائے۔ پروفیسر نے فوری بریک لگائی اور اپنی گاڑی سے اتر کر اکرم کی جانب بڑھا۔ ''اسے فوری پچھلی نشست پر ڈالو جمیل احمد۔'' اس نے کہا اور خود بھی اکرم کو اٹھانے میں مدد دیتا ہوا اسے گاڑی کی پچھلی نشست میں ڈال دیا۔ ایک راہ گیر بھی ہمراہ ہولیا اور یوں یہ تینوں یعنی پروفیسر، جمیل احمد اور وہ راہ گیر جس نے بعد میں اپنا نام فضل الٰہی بتایا تھا اکرم کو بے ہوشی کی حالت میں لئے اسپتال کی جانب بھاگے۔

''اسے کیا ہوا تھا جمیل؟'' پروفیسر نے اپنی گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے جمیل سے پوچھا جو اکرم کے سر کو اپنی گود میں لئے روہانسی صورت بنائے بیٹھا تھا۔ اس کا رنگ اکرم کے چہرے سے زیادہ ہی زرد پڑ رہا تھا۔

''سر! ہم باتیں کرتے ہوئے جارہے تھے پھر اچانک یہ رک گیا اس نے دو ہچکیاں لیں اور زمین پر ڈھیر ہوگیا۔'' اس نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا یہ باتیں کرر ہا تھا؟'' پروفیسر نے گاڑی کے عقبی شیشے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''نو سر! میں باتیں کرر ہا تھا۔ یہ بے چارہ تو مجھے سن رہا تھا۔'' جمیل نے واضح کیا۔

''منڈا ٹھیک آکھ رہا ہے۔'' ساتھ بیٹھے فضل الٰہی نے بھی جمیل کی بات کی تصدیق کردی۔ پروفیسر نے گاڑی چلاتے ہوئے ایک سرسری نظر اس کی جانب ڈالی اور دل ہی دل میں خیال کیا کہ لباس و شکل و صورت سے یہ شخص فضل الٰہی اسے پہلی آن میں ایک تعلیم یافتہ انسان معلوم ہوا تھا لیکن لوگوں نے وقت کے ساتھ ایسی پلٹی کھائی تھی کہ جاہل اور پڑھے لکھے کا فرق اب مٹنا شروع ہو چکا تھا۔ بہر حال یہی احسان بہت تھا کہ وہ اس برے وقت میں ان کا مددگار بن گیا تھا۔

''آپ ان کے عزیز ہیں؟'' پروفیسر نے یونہی تصدیق کی غرض سے دریافت کیا۔

''او نئیں جی! عزیز وزیز کوئی نہیں۔ میں تے بس ایوئیں وہاں ان کے سامنے سے ٹپی آر ہا تھا تو یہ وقوعہ ہوگیا۔''

''وقوعہ؟'' پروفیسر نے عجیب انداز سے پوچھا......

تو فضل الٰہی نے ٹھپاک کر کے جواب دیا۔ ''اوہ میرا مطبل اے نڈا اڈزن کردے ہوئے زمین پر ڈگ گیا۔ آہو جی۔''

''اچھا...... جمیل اسپتال آگیا ہے۔ تم سب سے پہلے اسٹریچر لانا اور پھر ہم اسے اس پر لٹا کر اندر لے چلیں گے۔'' جمیل نے سر ہلاتے ہوئے پروفیسر کی جانب دیکھا اور پھر جونہی شعبہ حادثات کا مرکزی دروازے کے سامنے پروفیسر نے گاڑی روکی جمیل پھرتی سے باہر نکلا اور ایک اسٹریچر کھینچ کر گاڑی کے نزدیک لے آیا تینوں نے مل کر اکرم کو اس پر لٹایا اور فوری شعبہ حادثات کے مرکزی دروازے کی جانب اسٹریچر کو گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

☆......☆......☆

اکرم کے جنازے میں بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ عزیز واقارب دور پار کے تمام جان پہچان والے ہمسائے اور یونیورسٹی کے لاتعداد طلباء یونیورسٹی کی طالبات بھی گھر پر اس کے لواحقین کے سوگ میں برابر کی شریک تھیں۔ اکرم کا باپ مولوی نذیر ساغر دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا اکرم اس کا اکلوتا بیٹا تھا اکرم کے سوا اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

''مجھے دلی افسوس ہے کہ آپ کا بیٹا داغ مفارقت دے گیا لیکن اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے سامنے ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ نذیر صاحب!'' پروفیسر درانی نے اکرم کے باپ کے ہاتھ کو دلاسہ دینے کی نیت سے تھام لیا تھا۔ وہ پروفیسر درانی کی جانب اشک بار نگاہیں ڈالتا ہوا دیکھا اور ہولے سے بولا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ ''میری زندگی کے سارے خواب چکنا چور ہو چکے۔ میں نے ساری عمر اللہ کو یاد رکھا۔ دیکھیں

پروفیسر صاحب! مجھے اس نے کیسا صلہ دیا؟''

''میں سمجھ سکتا ہوں۔ لیکن آپ صبر کیجیے! اللہ صبر کرنے والوں کے......'' پروفیسر کی آواز کہیں حلق میں بیچ راستے میں ہی گنگ ہوگئی۔ وہ اکرم کے والد کو یک ٹک گھورنے لگ گیا تھا لیکن دراصل اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں۔ وہ اکرم کے والد کی جانب چہرہ ضرور کئے ہوئے تھا۔ اکرم کا سوگوار باپ اپنی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''میری تو دنیا ویران ہوگئی ہے پروفیسر صاحب صبر مل گیا تو ٹھیک ہے ورنہ اب مجھے بھی زندہ رہنے کی کوئی آرزو نہیں۔'' وہ اور نہ جانے کیا کیا دل برداشتگی اور ناامیدی کے عالم میں کہتا رہا لیکن پروفیسر درانی کو تو جیسے سکتے کے عالم نے گھیر لیا تھا پھر وہ وہاں سے دبے قدموں علیحدہ ہوتے ہوئے کھسکتا ہوا جنازے کے ہجوم سے پرے ہٹ گیا۔ اسے نہ جانے کن خیالات نے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔ اس نے اپنے قدموں کی جانب ایک نظر دوڑائی اور پھر سر جھٹکتے ہوئے اپنی سوزوکی کی جانب آیا۔ وہ اب تیزی میں لگ رہا تھا نہ جانے اسے کیا جلدی آپڑی تھی۔ اکرم کی تدفین پر بھی نہ رک سکا اور فوری گاڑی اسٹارٹ کر کے وہ مرکزی سڑک پر آگیا تھا۔

اب اس کی گاڑی سڑک پر تیزی سے بھاگی چلی جارہی تھی۔

☆......☆......☆

''مے آئی کم ان سر؟''

''یس...... کم ان!'' پروفیسر درانی نے سر اٹھا کر سامنے دیکھتے ہوئے کہا، جہاں جمیل احمد اس سے اس کے یونیورسٹی کے ذاتی کمرے میں آنے کی اجازت طلب کرر ہا تھا۔ پروفیسر درانی اس وقت اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کو تیار کرنے کی غرض سے ایک کتاب کا مطالعہ کرر ہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تمہیں غالباً دیکھا ہے میں نے؟''

''جی سر! میں جمیل احمد ہوں دو ہفتے پہلے میرے دوست اکرم کی ڈیتھ ہوگئی تھی اور وہاں سڑک پر سے آپ نے ہی اسے اسپتال پہنچایا تھا۔''

''اوہ یس! یاد آگیا۔''

''سر! وہ آپ کو بتانا تھا کہ اکرم کے والد بھی آج صبح فوت ہوگئے ہیں۔''

''اوہ...... یہ تو افسوس ناک خبر ہے۔'' پروفیسر نے اپنی میز پر رکھی کتاب کو بند کرتے ہوئے کہا۔ جمیل احمد نے کتاب کے بند ہوتے ہی اس کے سرورق پر اچٹتی نگاہ ڈالی تھی۔ زیر لب اس نے سرورق پر کتاب کا عنوان بھی پڑھا تھا۔ کتاب کا عنوان تھا۔ موت کے چہرے!

''سر! بس آپ کو یہی بتانا تھا کیونکہ آپ اکرم کی ڈیتھ پر بھی سوگوار خاندان کے سوگ میں برابر کے شریک تھے اور اب اکرم کے ابو جان بھی فوت ہوگئے ہیں۔''

''انہیں ہوا کیا تھا؟''

''سر! اکرم کی موت کے غم میں وہ دنیا سے دل ہار بیٹھے تھے اور اپنے معمولات زندگی میں متحرک رہے تھے۔ پریشانی کی بنا پر شوگر بھی ہوگئی تھی اور بلڈ پریشر بھی۔ کل رات کو ان کے دماغ کی شریان سوتے میں ہی پھٹ گئی۔ صبح دیکھا تو وہ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔'' جمیل احمد نے انتہائی سوگوار انداز میں تفصیل بتائی۔

''اوہو...... اس خاندان کے اوپر بہت بھاری آزمائش آگئی۔'' پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''سر! نماز جنازہ رات عشاء کے بعد ہے۔'' جمیل نے مطلع کیا۔

''اوکے۔ تھینکس!''

''سر آپ آئیں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''دیکھوں گا اگر کوئی اور مخمصہ نہ ہوا تو۔''

جمیل احمد پھر وہاں رکا نہیں جس مقصد کے لئے وہ پروفیسر درانی کے پاس آیا تھا وہ مقصد پورا ہو چکا تھا لیکن پروفیسر درانی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ واقعی جب آخری مرتبہ اس نے اکرم کے والد سے ملاقات کی تھی تو اس وقت مولوی نذیر ساغر دنیاوی زندگی سے بددل ہو چکا تھا شاید وہ اسی روز مر گیا تھا جب اس کے جواں سال بیٹے کی میت کو چھ فٹ زمین میں دبایا جار ہا تھا۔ لیکن پروفیسر درانی کی

سوچ میں وہ شخص بار بار نمودار ہورہا تھا جو اس روز اکرم کے والد کے عقب میں آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ شخص جو کہ تمام لوگوں سے اونچا قد آور، چوڑا، طاقتور اور عجیب کرخت نظر آنے والا تھا۔ وہ مولوی نذیر ساغر کو عقب سے یک ٹک گھور رہا تھا۔ اس نے مولوی صاحب کو گھورتے ہوئے ایک بار بھی اپنی پلکیں نہیں جھپکائی تھیں۔ وہ شخص ابھی بھی پروفیسر کو یاد آرہا تھا۔ اس کا حلیہ وہ کیونکر بھول سکتا تھا۔ وہی شخص تو تھا جو اکرم کے تعاقب میں نپے تلے قدموں کے ساتھ اس وقت بھی وہاں موجود تھا جب پروفیسر نے اکرم اور جمیل احمد کو پہلی مرتبہ یونیورسٹی کے باہر روک کر ان سے تعارف کیا تھا۔ وہ جب جمیل احمد اور اکرم سے باتیں کررہا تھا تو وہ شخص یکدم پیچھے کھڑا ہو کر اکرم کی جانب گھورنے لگ گیا تھا اس شخص نے ایک مرتبہ بھی پروفیسر کی جانب نہیں دیکھا تھا۔

''ضرور ان لوگوں کے پیچھے کوئی دشمن لگ گیا ہے۔'' پروفیسر نے سوچا وہ شخص کوئی کالے جادو کا ماہر ہوگا۔ یا پھر ٹیلی پیتھی کا..... کسی نے کرائے کا قاتل کروایا ہوگا کہ ان باپ بیٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔'' پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ اپنی نشست سے اٹھا اپنا کوٹ زیب تن کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر طارق ربانی ملک کا سب سے بڑا روحانی عامل ہونے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سطح پر لیکچرار بھی تھا۔ پروفیسر درانی کا دوست بھی تھا اور پروفیسر کو اس کی پی ایچ ڈی کے مقالوں میں کافی مدد دے چکا تھا۔ اس وقت وہ دونوں دوست طارق ربانی کے گھر اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''ایک شخص باپ اور بیٹے کو قتل کرتا ہے لیکن ان دونوں کی موت بالکل طبعی طریقے پر ہوتی ہے، کیا یہ ممکن ہے؟''

''یار! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر طارق نے اپنے دوست پروفیسر کی طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پروفیسر درانی نے بے چینی سے صوفے پر بیٹھ کر اپنی ایک ٹانگ دوسری پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے اگر کوئی شخص، کسی روحانی علم یا کالے علم کا ماہر ہو اور وہ اپنے دشمن کو ہلاک کرنا چاہے تو کیا یہ مابعد النفسیات کے علم کی روشنی میں ممکن ہے؟'' اس بات کو سن کر ڈاکٹر نے متحیر نگاہوں سے پروفیسر کی جانب دیکھا اور بولا۔

''دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے۔ ہاں! اگر وہ کالے جادو کا ماہر ہے اور اس نے اپنے اس فن میں کامیابی حاصل کر رکھی ہے تو عین ممکن ہے وہ کالے جادو کا ماہر ایسا کرسکتا ہے لوگوں کی نگاہوں میں آئے بغیر وہ ایسا کرسکتا ہے بالکل ممکن ہے۔''

پروفیسر بے چینی کے عالم میں صوفے کے کشن سے سہارا لے کر بولا۔ ''لیکن اگر وہ لوگوں کی نظروں میں بھی ہو اور ایسا کر جائے یا آنے والے دنوں میں ایسا کر گزرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو وہ اپنے خلاف وار کیسے کرے گا۔ ظاہر ایا چھپ کر؟''

''میں تمہاری کسی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم بے چین ہوئے جارہے ہو۔ پہلے اپنے آپ کو سنبھالو۔ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ڈاکٹر طارق نے پروفیسر کو چائے کا ایک کپ بنا کر دیا جو اس کا نوکر تھوڑی دیر قبل ان دونوں کے سامنے موجود میز پر رکھ گیا تھا۔

پروفیسر نے شکریہ کے ساتھ کپ ہاتھ میں تھامتے ہوئے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ ''کچھ دن پہلے کی بات ہے۔ غالباً دو ہفتے سے زیادہ ہو چکے ہیں اس بات کو۔ دو لڑکے آپس میں باتیں کرتے ہوئے یونیورسٹی سے باہر نکل رہے تھے۔'' اور یوں پروفیسر نے پوری تفصیل ڈاکٹر کو بتائی۔ اور آخر میں اس پراسرار آدمی کے متعلق بھی بتایا جو اسے اکرم اور اکرم کے والد کا تعاقب کرتے ہوئے دکھائی دیا تھا۔

تفصیل سن کر ڈاکٹر نے پروفیسر کی طرف عجیب نظروں سے دیکھا۔ پروفیسر اس کی جانب اب منتظر نگاہوں سے گھور رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کا محسن، استاد اور دوست ڈاکٹر اس معاملہ میں اس کی رہنمائی ضرور کرے گا۔ تھوڑی دیر کے لئے تو ڈاکٹر خود محو حیرت رہا پھر کچھ دیر کے توقف کے بعد گویا ہوا۔ ''پروفیسر! بات یہ ہے کہ جیسا تم بتا رہے ہو کہ وہ شخص پہلے اکرم کو یک ٹک

گھورتے ہوئے اس کے تعاقب میں چلا جارہا تھا اور بعد میں اکرم کے جنازے پر اس کے باپ کے عقب میں کھڑا اسے بھی متواتر گھور رہا تھا تو یہ معاملہ ٹیلی پیتھی کا لگتا ہے اور تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔''

''ٹیلی پیتھی؟'' پروفیسر نے متحیر نگاہوں سے اپنے دوست ڈاکٹر طارق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن یہ ٹیلی پیتھی کی کون سی قسم ہے؟ جس میں ایک انسان کو اکسایا جاسکے کہ اب اسے مرجانا چاہئے۔''

''اس میں ایسی اچنبھے والی بات بھی نہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ دنیا میں یہ سب ممکن ہے۔''

''لیکن..... میرے لئے یہ سب بہت نیا ہے اور چونکہ میں نے یہ سب ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ خود اپنی آنکھوں سے..... یہ دو مشاہدے اکرم کی موت اور پھر اس کے باپ کی موت۔ یہ دونوں اموات اس پراسرار آدمی کی وجہ سے ہوئی ہیں میں اس کے متعلق جاننا چاہتا ہوں مجھے سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کوئی اور شخص میرے شعور پر گرفت حاصل کر کے میرے لاشعور تک یہ پیغام پہنچا سکتا ہے کہ میں مرجاؤں یا مجھے مرجانا چاہئے؟''

''بالکل! ایسا کیا جاسکتا ہے!'' ڈاکٹر نے جیب سے اپنا پائپ نکالتے ہوئے کہا اور اپنی کوٹ کی دوسری جیب سے تمباکو نکال کر پائپ میں بھرنے کے بعد اسے ماچس سے سلگا لیا۔ اب تمباکو کی بھینی بھینی مہک پورے ڈرائنگ روم میں پھیلنے لگی تھی۔ پھر وہ پروفیسر درانی سے مخاطب ہوا۔

''بات یہ ہے پروفیسر! ٹیلی پیتھی ایک بہت وسیع علم ہے اور اس میں آئے روز نئے سے نئی تحقیقات جاری ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اگر آسان الفاظ میں ٹیلی پیتھی کو مجھے الفاظ کا جامع پہنانا پڑے تو میں یوں کہوں گا کہ لاشعوری طاقتوں کو اجاگر کر کے انہیں شعور پر حاوی کردینے کا نام ٹیلی پیتھی ہے۔ اور یہ علم کوئی آج سے نہیں ہے۔'' پھر ڈاکٹر رہانی نے بات کرتے ہوئے توقف کیا اور ایک طویل کش اپنے سموکنگ پائپ سے لیتے ہوئے گفتگو کو جاری رکھا۔ ''ہزاروں سالوں سے دنیائے آب وگل میں انسان کے پاس پایا جاتا ہے تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کتے اور بلیوں میں یہ علم زیادہ ترقی یافتہ صورت میں موجود ہے۔ وہ اپنے لاشعور کو اپنے شعور میں زیادہ تصرف کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور پھر ان دیکھی مخلوق جنات کا لاشعور اور شعور ہم انسان سے کہیں زیادہ طاقتور ہے انسانوں میں کس انسان نے اپنے لاشعور کو اپنے شعور پر حاوی کر رکھا ہے اور اسے اپنی گرفت میں کیا ہوا ہے البتہ یہ بات کہنا قدرے مشکل ہے۔ کیونکہ اگر ہم میں سے کوئی انسان ایسا کرسکتا ہے تو وہ عوام الناس کے سامنے نہیں آئے گا ہمیشہ پوشیدہ رہنا پسند کرے گا۔''

''لیکن ایسا وہ کیوں کرے گا؟''

''سمپل..... وہ ایسا اس لئے کرے گا کہ یوں اسے دنیا والوں سے خطرات لاحق ہوجائیں گے۔''

''کیسے خطرات؟'' پروفیسر نے متجسس ہوکر دریافت کیا۔

''بھئی! سیدھی سی بات ہے ہمارے معاشرے میں اگر کسی کے پاس یہ علم اپنی ترقی یافتہ صورت میں موجود ہو تو لوگوں کا ایک جم غفیر اس کے گرد اکٹھا ہوجائے گا اور اسے اوتار، داتا، روحانی پیشوا ٹائپ کی کوئی ہستی سمجھنا شروع کردے گا۔ یا پھر مخفی خیالات رکھنے والے پیشہ ور اور طاقتور، دولت مند مجرم اس سے رابطہ کر کے خطرناک جرائم میں اسے پھنسا دیں اور یوں اس کا جینا حرام کردیں گے۔ یہاں غربت عام ہے فی کس آمدنی کا تناسب کم ہے دوسرا اس ملک کی معیشت کے حقیقی اعداد وشمار انتہائی خطرناک حد تک گرے ہوئے ہیں۔

اگلی صبح پورے دس بجے پروفیسر درانی نے اپنی کار میں سوار ہو کر گاڑی کا رخ اکرم اور مولوی نذیر ساغر کی رہائش گاہ کی جانب کرلیا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ان کے گھر کے مرکزی دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے دروازے سے منسلک کال بیل کا بٹن دبایا تو اندر سے قدموں کی آواز سنائی دی پھر تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی وہاں کھڑا تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔ ''جی فرمایئے۔'' وہ نہایت شائستگی سے پروفیسر کو دیکھ کر مخاطب ہوا تھا۔ ''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

پروفیسر نے اپنا تعارف کروایا تو اس آدمی نے جو مرکزی دروازے پر کھڑا تھا انتہائی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے گھر کے مہمان خانے میں لے جا کر بیٹھا دیا۔

"ارے نہیں..... وہ تو یونیورسٹی میں معاشیات کا طالب علم تھا جبکہ میں وہاں نفسیات پڑھاتا ہوں۔" پھر پروفیسر نے تفصیلاً اس روز کی روداد اس اجنبی آدمی کو بتائی تو وہ یہ سب سن کر تشکرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "آج کل ایسے محسنین بھی ڈھونڈے نہیں ملتے۔"

"یہ تو ہر ہم وطن کا فرض ہے کہ جہاں مصیبت میں دیکھے تو اپنے ہم وطن کے کام آئے۔ اس میں کسی احسان والی کوئی بات نہیں۔" پھر پروفیسر نے کچھ سوچتے ہوئے اس اجنبی آدمی سے دریافت کیا۔ "آپ کا اکرم سے کیا رشتہ ہے؟" وہ اپنی نماز والی ٹوپی سر سے اتار کر دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے پر اخلاق لہجے میں بولا۔ "جی! محترم میں اس بچے کا بڑا ماموں ہوں جب سے میری چھوٹی بہن یعنی اکرم کی والدہ پر یہ افتاد آن پڑی ہے تب سے ہی میں یہیں پر مقیم ہوں۔ میرے بال بچے تو ہیں نہیں۔ مجرد زندگی گزاری ہے۔ پھر بھائی مولوی نذیر ساغر مرحوم بیمار اتنے ہوئے تھے تو مجھے اپنی بہن کے قریب رہنا پڑا۔ اور بالآخر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بس! اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا ہے آناً فاناً چند دنوں میں ہی میری بہن کی پوری دنیا تباہ ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ غمگین ہو گیا تھا۔ "یہ سب انتہائی دردناک ہے لیکن جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ سب اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے مطابق ہوا ہے تو..... اب کیا ہو سکتا ہے..... آپ کا اسم گرامی؟" پروفیسر نے نہایت تکلف سے دریافت کیا۔

"میرا نام صفدر حسین ہے۔ آپ مجھے صفدر کہہ سکتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا میں اکرم کی والدہ سے مل سکتا ہوں؟" پروفیسر نے جھجکتے ہوئے پوچھا کیونکہ یہ خاندان اسے دیندار گھرانہ معلوم ہو رہا تھا۔

"جی ہاں..... ضرور..... لیکن! ابھی تو وہ عدت میں ہیں۔"

"اوہ ہاں..... سچ! یاد آیا۔" پروفیسر درانی کا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ "اچھا آپ ان سے بہت زیادہ قریبی ہیں۔ میرا مطلب! مولوی مرحوم سے آپ کے اتنے قریبی مراسم ہیں تو کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ مولوی مرحوم کی زندگی میں کسی سے ذاتی چپقلش یا دشمنی رہی ہو یا پھر کسی نے بھی انہیں اپنا حریف سمجھ رکھا ہو؟" پروفیسر مطلب پر آتے ہوئے کہا کیونکہ وہ انہیں باتوں کی تحقیق کی غرض سے یہاں تک پہنچا تھا۔

"نہیں..... میرے بہنوئی مرحوم مولوی نذیر ساغر صاحب بہت دین دار، ایماندار اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ انہوں نے کبھی کسی دوسرے شخص کو اپنے ہاتھ و زبان سے گزند نہیں پہنچائی۔ وہ اس بات کا نہ صرف خود اپنی ذات میں خیال رکھتے تھے بلکہ اپنی بیوی اور بچے اور اقارب کو بھی اس کی تلقین کیا کرتے تھے۔ کبھی بھی ان کا کوئی حریف نہیں ہوا۔ بلکہ لوگ تو ان کے گرویدہ تھے۔"

وہ سچ ہی کہہ رہا تھا کیونکہ جب اکرم کے جنازے پر پروفیسر درانی نے اس کے باپ سے ملاقات کی تھی تو پہلی ملاقات میں ہی وہ اسے نہایت بھلا شخص دکھائی دیا تھا۔ پر افسردگی کی بات یہ تھی کہ وہی پہلی ملاقات دراصل پروفیسر درانی کے ساتھ مولوی نذیر ساغر کی آخری ملاقات ثابت ہوئی تھی۔

"آپ ٹھیک فرما رہے ہیں وہ واقعی ایک نیک انسان تھے۔" پروفیسر نے خیالات میں کھوئے ہوئے کہا تھا۔ پھر یکا یک ایک اور خیال اس کے ذہن پر ابھرا۔

"اچھا! یہ بتائیں کہ آپ کی بہن اور مولوی نذیر ساغر صاحب آپس میں رشتہ دار ہیں یا یہ غیروں میں سے تھے اور رشتہ ہوا تھا۔"

"یہ ماموں زاد ہیں۔ بہت قریبی رشتے دار ہیں۔ ہم لوگ برادری سے باہر لڑکا اور لڑکی کا نکاح نہیں کرتے..... ہاں! بہت مجبوری ہو تو پھر دیکھ داکھ کر ہی ایسے رشتے طے پاتے ہیں۔"

"تو پھر آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ مولوی صاحب کے والد صاحب کی کسی سے ذاتی چپقلش رہی ہو یا آپ کے والد صاحب کی؟"

"لیکن آپ یہ سوال کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس مرتبہ اکرم کے بڑے ماموں صفدر حسین نے حیران ہوتے ہوئے پروفیسر سے دریافت کیا۔

"دراصل! بات یوں ہے کہ یہ دونوں اموات اچانک ہوئی ہیں۔ اور پھر آگے پیچھے ہوئی ہیں۔ بظاہر اکرم نوجوان اور صحت مند لڑکا تھا۔"

"جی ہاں..... اکرم کو کوئی ایسی بیماری نہیں تھی جو اچانک موت کا سبب بن جاتی۔" صفدر حسین نے پروفیسر کی بات پر لقمہ دیا۔

"اور مولوی صاحب بھی کوئی ادھیڑ عمر انسان نہ تھے؟"

"جی بالکل! لیکن وہ تو اپنے اکلوتے بچے کی بے وقت داغ مفارقت دینے کے غم میں ہی نڈھال ہو چکے تھے اور پھر صدمہ اتنا گہرا تھا کہ وہ اسے برداشت نہ کر پائے ذہن پر خیالات کا اتنا بوجھ تھا کہ برین ہیمرج سے فوت ہو گئے۔" صفدر حسین نے واضح کیا۔

"جی ہاں..... اور اکرم کو آخری وقت میں دو مرتبہ ہچکی آئی تھی اور میڈیکل رپورٹ میں یہ واضح ہے کہ موت حرکت قلب کے بند ہونے کے سبب سے واقع ہوئی تھی۔" پروفیسر نے اپنی معلومات کو صفدر حسین سے شیئر کیا تو صفدر حسین اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

"لیکن آپ ذاتی دشمنی والا جو سوال کر رہے ہیں اس کا ان دونوں مرحومین کی اموات سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" اس نے اپنے ذہنی خدشے کو پروفیسر درانی کے سامنے ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ پروفیسر درانی نے اب اس سے ساری تفصیل کہہ دینے میں ہی عافیت جانی۔

"سب سے پہلے آج میری قلبی تشفی کر دیجیے کہ نہ تو مولوی صاحب! نہ ہی ان کے والد صاحب اور نہ ہی آپ کے والد صاحب کی کسی سے ذاتی چپقلش تھی تو پھر میں آپ کو اپنے قلبی خدشات سے آگاہ کر سکتا ہوں۔"

صفدر حسین نے پروفیسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "جی نہیں..... نہ ہی مرحوم مولوی صاحب اور نہ ہی ہم دونوں کے والد صاحبان کی کسی سے کبھی تو تڑاک ہی ہوئی انہیں تو لوگ مصلحین کا خطاب دیا کرتے تھے۔"

"دراصل میرے ذہن میں خدشات نے سر ابھارا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عین ممکن ہے کسی نے تعویز، گنڈوں، جادو ٹونوں اور جنتر منتر سے یہ سب کیا ہو۔ اور عموماً ایسا اسی وقت ہوا کرتا ہے جب دو افراد یا خاندانوں میں کوئی ذاتی چپقلش ہو جاتی ہے۔ اور آپ کو تو اندازہ ہو گا ہی کہ آج کل یہ بہت عام ہوتا جا رہا ہے جگہ جگہ جعلی عاملوں نے اپنا کاروبار روشن کر رکھا ہے اور اندر خانے کالے گناہ بھی اسی لئے معاشرے میں عام ہو چکے ہیں۔" پروفیسر درانی نے بات کا رخ جان بوجھ کر دانستہ طور پر بدلا تھا کیونکہ اس نے صفدر حسین کی سادگی اور شرافت و اخلاق سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ لوگ شاید پروفیسر درانی کی دقیق عملی بات کو پوری طرح سے سمجھ نہ سکیں گے۔

وہاں سے پروفیسر درانی اپنی قلبی تسلی کر کے لوٹ رہا تھا وہ گاڑی کو اب ڈرائیو کرتا ہوا علاقے کے مرکزی پارک کی جانب جا رہا تھا۔ اس کی سوچوں کا مرکز صرف وہ پراسرار شخص تھا۔ وہی اونچے قد کاٹھ والا مضبوط جسم والا، وہی پراسرار شخص جو اکرم کا تعاقب کر رہا تھا اور مولوی نذیر ساغر صاحب کو عقب سے گھور رہا تھا اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی تاثیر تھی جو کسی کو بھی خاموش کروا دے۔ ایسی سحر انگیز آنکھیں پروفیسر نے عمر بھر میں کسی آدمی کی نہ دیکھی تھیں۔ وہ کس انداز بے باکی سے بھرے مجمے کے ہوتے ہوئے اکرم کے جنازے پر اس کے ستم رسیدہ ٹوٹے ہوئے باپ کو عقب سے گھورتا چلا جا رہا تھا۔ "کاش! مجھے وہ آدمی دوبارہ دکھ جائے تو میں اس سے ضرور پوچھوں کہ تو ہے کون اور تو ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کس کے کہنے پر تو یہ سارا کھیل کھیل رہا ہے؟"

پروفیسر سوچوں میں محو تھا۔ وہ اس وقت پارک کے ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ اچانک سامنے کی جانب ایک شور سا اٹھا پروفیسر درانی کے سامنے کی جانب بچوں کے کھیلنے کا چھوٹا سا میدان تھا جس میں سرکار نے بچوں کی تفریح طبع کی غرض سے پینگیں لگا رکھی تھیں۔ وہاں بچوں کی مائیں اور خادمائیں انہیں لے آتیں اور یوں بچوں کی خوشی کا ایک ساماں

ہوجاتا۔ وہ شور کیا یک بھیانک ہوتا جارہا تھا بہت سی عورتیں ایک جانب جمگھٹا لگانا شروع ہوچکی تھیں پروفیسر درانی نے اس جانب اپنی نگاہیں دوڑائیں تو وہاں ایک خاتون مٹی بھری زمین پر چت لیٹی ہوئی تھی اور اس کے گرد دیگر خواتین مدد کے لئے شور مچارہی تھیں۔ بہت سے نوجوان اور آدمی ان کی جانب بھاگتے ہوئے پہنچ گئے تھے انہیں میں دو پولیس اہلکار بھی وہاں تک پہنچے تھے۔ اور یوں ان کی مدد سے ایک گاڑی میں اس خاتون کو ڈال کر لے جایا جارہا تھا جو وہاں پر کسی وجہ سے زمین بوس ہوگئی تھی۔

پروفیسر درانی بہت غور سے یہ سارا احوال دیکھتا رہا لیکن جونہی خاتون کو گاڑی میں ڈالا گیا وہ یکدم حیرت وخوف سے چونک گیا تھا۔ وہی پراسرار شخص اسے وہاں دوبارہ دکھائی دیا۔ اس مرتبہ پروفیسر درانی نے موقع ضائع کئے بغیر بینچ سے اٹھتے ہوئے اس پراسرار آدمی کی جانب دوڑ لگادی۔ پروفیسر کو اب اس آدمی کے سوا اس سارے ماحول میں کسی سے دلچسپی نہ رہی تھی۔

''ارے دیکھ کر بھائی!'' وہ جب ایک آدمی سے ٹکرایا تو اس آدمی نے ناگواری سے کہا تھا لیکن پروفیسر نے اسے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ اسے تو ہر حال میں اس پراسرار آدمی کو جالینا تھا۔ کیونکہ پروفیسر درانی کو مکمل یقین تھا کہ وہ پراسرار آدمی ہی کرائے کا وہ قاتل ہے جس نے مظلوم اکرم اور مولوی نذیر ساغر کو بے موت ماردیا تھا۔ اب وہ اس ٹیلی پیتھسٹ کو یوں ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے یوں آزاد چھوڑ دیتا۔ لیکن جونہی پروفیسر درانی اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر پہنچا اس آدمی نے ایک جانب بھاگنا شروع کردیا۔ پروفیسر درانی نے اپنی نگاہیں اس پر جماتے ہوئے اپنے بھاگنے کی رفتار مزید زیادہ تیز رفتار بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے سامنے جیسے ہی پارک کے گھنے درختوں والا سلسلہ شروع ہوا تو اس شخص نے ایک طویل جست لگائی اور جھاڑیوں کے اوپر سے چھ فٹ کی بلندی سے پرواز کرتا جھاڑیوں کی دوسری جانب جاگرا۔ پروفیسر درانی نے بھی اس کی اقتداء میں ایک جست لگائی اور جھاڑیوں کی دوسری جانب جاکر کچی مٹی پر جاگرا۔ لیکن آگے بے تحاشہ گھنی جھاڑیاں اور درخت تھے اور اس موقع مناسبت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پروفیسر درانی کی نگاہوں سے وہ شخص اب اوجھل ہوچکا تھا۔

پروفیسر زمین سے کھڑا ہوکر سامنے جھاڑیوں اور درختوں کی جانب بغور گھورتا رہا۔ وہ منہ ہی منہ میں اس قاتل کو گالم گلوچ بھی بکتا رہا۔ آج موقع ہاتھ آیا تھا لیکن پروفیسر درانی اس پراسرار آدمی کے بیس فٹ تک قریب پہنچ کر بھی اسے نہ پکڑ سکا تھا۔ یہ بہت تھکا دینے والی دوڑ تھی لیکن وہ اپنا لباس جھاڑتا رہ گیا تھا۔

''خبردار! کوئی حرکت مت کرنا!'' اچانک پروفیسر کو اپنے عقب سے ایک رعب دار آواز سنائی دی۔ پروفیسر درانی نے گھوم کر دیکھا تو اس کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی گئیں۔

☆......☆......☆

پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر تجمل حسین نے چائے کا کپ پروفیسر درانی کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری پروفیسر صاحب! میرے محکمے کے ایک آدمی کی وجہ سے آپ کو ہزیمت اٹھانا پڑی۔'' پروفیسر انسپکٹر تجمل حسین کی میز کے دوسری جانب رکھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ایک بار چائے کے کپ کی طرف دیکھا اور پھر دوسری نگاہ انسپکٹر کی جانب ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اٹس اوکے۔''

''لیکن سر......! آپ نے یہ بتایا نہیں کہ آپ تن تنہا ان جنگلی جھاڑیوں اور درختوں کی جانب اس طرح کیوں بھاگے چلے جارہے تھے؟ پھر آپ نے ہوا میں ایسی چھلانگ لگائی جیسے نہ جانے کوئی آپ کے تعاقب میں ہو۔'' انسپکٹر نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجاتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ پولیس والا تھا یہ اس کے فرائض کا حصہ تھا۔ اسے اس کے ماتحت نے ساری آنکھوں دیکھی روداد کہہ سنائی تھی۔ لیکن اب وہ ایک مخصوص طریقے سے جسے باادب طریقہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ پروفیسر درانی سے تفتیش کررہا تھا۔

''دیکھئے میں کسی کا تعاقب کررہا تھا۔ کوئی میرا تعاقب نہیں کررہا تھا۔'' پروفیسر نے چڑتے ہوئے جواب

...مان پھر فوری اسے یہ خیال آگیا تھا کہ وہ تھانے میں ... ہے۔ اور کوتوالی کا تو کتا بھی شیر ہوتا ہے اسے یہاں ... انتہا احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ اسے ایسے شیروں ...ر بھی لگتا تھا۔

''آپ کس کا تعاقب کررہے تھے؟'' اس مرتبہ ...ٹر کا لہجہ سپاٹ بھی تھا اور اس کی بھنویں بھی سکڑ چکی ...یں گویا اب وہ ٹھیٹھ پولیس تفتیش کے سے انداز میں ...طب تھا۔ ''میں......'' اب پروفیسر درانی کی سمجھ میں ...نہ آرہا تھا کہ وہ کیا بتائے کہ پولیس کے اس انسپکٹر کی ...لی کرسکے۔ ''میں نے پارک میں ایک چور کو دیکھا ...ا۔'' اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ایسا اس نے ...سیہ طور سے کیا تھا۔

''اچھا......!'' انسپکٹر نے بھی سرسری طور سے ...اب دیا۔ یہ پولیس والوں کا مخصوص طریقہ تھا کہ سامنے ...لے شخص کو مزید بات کرنے کا موقع فراہم کرکے کسی حتمی ...ے تک یوں وہ با آسانی پہنچ جایا کرتے تھے۔

''جی!'' پروفیسر درانی نے بھی مختصراً جی کہنے ...اکتفا کیا تھا۔ انسپکٹر نے ایک مسکراہٹ چہرے پر ...بکھیرتے ہوئے سوال کیا۔ ''پروفیسر صاحب! آپ ...ے ایک چور کو دیکھا تھا۔ تو یہ بھی تو فرمادیں کہ اس نے کیا ...ری کیا تھا آپ کا؟''

''میرا پرس......! والٹ۔'' پروفیسر درانی نے ...ت بتاتے ہوئے کہا تھا حالانکہ اس کا بٹوہ اس کی جیب ...ہی تھا۔

''اچھا......! یہ کب کی بات ہے؟'' انسپکٹر نے دانت ...لتے ہوئے کہا۔ تو پروفیسر نے اس کی جانب سنجیدگی سے ...یکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''ادھر ہی پارک میں!''

''لیکن! آپ کو وہ چور نہیں ملا اور آپ وہاں اتنے ...ے دتاریک گھنے جنگل اور جھاڑیوں میں اپنے کپڑے ...الاتے رہے۔'' پولیس انسپکٹر نے اس مرتبہ سنجیدگی ...ے لہجے میں کہا۔ ''اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب ...پ کی جیبوں کی تفصیلی تلاشی لی گئی تو آپ کا والٹ آپ ...ی کی عقبی جیب میں جوں کا توں پڑا ہوا تھا۔ ابھی بھی آپ اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالیں، اسے وہیں پر پائیں گے۔ پلیز چیک اٹ!''

پروفیسر درانی کے علم میں تھا کہ جب وہ پارک میں اس علاقے میں کھڑا اپنی جینز کو جھاڑ رہا تھا تو عقب سے ایک پولیس اہلکار نے اسے دھرلیا تھا۔ اسی اہلکار نے ہی تو وہاں اسے یہ کہہ کر متنبہ کیا تھا کہ خبردار کوئی حرکت مت کرنا۔ اب درانی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے جھوٹ کو مزید کتنے پردوں میں چھپائے۔ اس نے اپنی جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنا بٹوہ وہاں محسوس کرکے اس نے انسپکٹر سے کہا۔ ''دیکھئے! میں پی ایچ ڈی کے تھیسز لکھتا ہوں اور رات رات بھر جاگتا ہوں یہ میرا کارڈ ہے۔ مقامی یونیورسٹی کا شعبہ نفسیات کا پروفیسر ہوں اور آج کل ذہنی طور سے بہت زیادہ دباؤ میں ہوں۔ مجھے غلط فہمی ہوگئی ہوگی معلوم نہیں لیکن مجھے یونہی محسوس ہوا کہ کسی نے میرا بٹوہ مار لیا ہے اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ آدمی ان جھاڑیوں کی سمت بھاگا ہے اور یوں میں بھی اس جانب بھاگ نکلا اور اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں یقین کیجیے۔ میں ایک ایک لفظ سچ کہہ رہا ہوں۔''

''مان لیتے ہیں پروفیسر صاحب! بس! ہم بھی مجبور ہیں۔ آمریت کا زمانہ ہے۔ ہم پر اوپر سے دباؤ رہتا ہے۔ سچ پوچھیں تو ہر ایک پر سرکاری نوکری میں دباؤ رہتا ہے۔ ہمیں ایک ایک شہری پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ ہر حرکت پر نظر!'' وہ بولتا رہا۔ ''آپ واقعی دباؤ میں لگتے ہیں آپ جیسا پڑھا لکھا آدمی جو بذات خود شعبہ نفسیات کی تعلیم اتنی مصروف درس گاہ میں دیتا ہے، وہ دباؤ میں ہے۔ خود نفسیات پڑھانے والا نفسیاتی دباؤ کا شکار ہو تو قانون کو حیرت تو ہوگی نا؟''

''اس میں کون سی اچنبھے کی بات ہے انسپکٹر صاحب؟'' پروفیسر درانی نے قدرے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ بھی اپنی آنکھوں کا چیک اپ کروانے ماہر امراض چشم کے پاس جائیے گا۔ آپ مشاہدہ کرلیجیے گا۔ اس کو خود موٹے عدسے والا چشمہ لگا ہوگا۔'' پروفیسر درانی نے اپنی بات کچھ اس طور سے کہی تھی کہ انسپکٹر کے پورے

دانت نکل گئے پروفیسر نے اسے ایک نظر ڈال کر ہی اندازہ لگالیا تھا کہ وہ اپنے دانتوں کے معاملہ میں بہت غافل تھا۔

انسپکٹر کافی دیر تک پروفیسر کی جانب اپنے غلیظ دانت نکالتا رہا تھا۔

جان چھٹی سو لاکھوں پائے۔ تھانے سے فارغ ہو کر پروفیسر درانی سیدھا پارک گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر پھر گھر۔ یہ دن اس کی زندگی کا ایک تھکا دینے والا دن تھا۔ ایک تو اس پراسرار قاتل کو دیکھ کر اس نے جو بھاگ دوڑ کی تھی اس کی تھکاوٹ اور دوسرا تھانے سے جو اپنی جان چھڑوائی تھی اس کی ذہنی تھکاوٹ دونوں جسمانی و ذہنی تھکاوٹوں نے اسے نڈھال کردیا تھا۔ اس نے انسپکٹر کو دو سو روپے دے کر جان چھڑائی تھی۔ اکثر نوجوانی میں وہ اور اس کے دوست یہ مذاق کیا کرتے تھے کہ بیوی اور پولیس سے جان چھڑوالینا گویا دوسری زندگی حاصل کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اور اس کی شادی تو ہوئی نہیں تھی لیکن آج پولیس سے جان چھڑانی پڑی تو وہ جوانی کا مذاق بھی اسے یاد آ گیا تھا جیسے کسی کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔

وہ گھر آتے ہی دھڑام سے اپنے آرام دہ بستر پر لیٹ گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر اب صرف اس پراسرار آدمی کی ہیئت اور حلیہ یاد آرہا تھا۔ وہ آج نہایت خوف ناک حلیے میں اسے دکھائی دیا تھا۔ اس پراسرار شخص کے سر کے بال کتنے لمبے اور بکھرے ہوئے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ حجام سے اپنی حجامت بھی نہیں کرواسکا تھا۔ اس کے وجود سے جلنے جیسی سڑاند اٹھ رہی تھی۔ وہ ٹھیک سے اس کی صورت اس مرتبہ دیکھ نہ پایا تھا۔ لیکن جب ایک نظر اس کی آنکھوں پر اس نے ڈالی تھی تو وہ ایک لمحہ کے لئے ڈر گیا تھا۔ آج اس کی آنکھیں پہلی دو مرتبہ کی دفعہ سے زیادہ بڑی بڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ میک اپ کرنے کا ماہر تھا۔ اپنا حلیہ بدلنے میں وہ بہت ماہر تھا۔ لیکن افسوس پروفیسر درانی کو ایک بات کا تھا کہ ہاتھ آتے آتے وہ پراسرار آدمی اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ نہ جانے وہ کس درخت کی اوٹ میں پناہ لے کر چھپ گیا تھا۔ اگر پولیس والا پروفیسر کو اسی وقت دھر نہ لیتا تو پروفیسر درانی آج اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہ تھا۔ پھر یکا یک پروفیسر درانی کے ذہن میں ایک خیال برقی رو کی مانند کوندا۔ اس نے سوچنا شروع کیا کہ پبلک پارک میں کسی کا قتل نہ ہوا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم پولیس میں اسے اسی سلسلے میں شامل تفتیش کیا جاتا لیکن انسپکٹر نے عوامی پارک میں ایسے کسی قتل کا ذکر بھی اس سے نہیں کیا تھا۔ تو گویا یہ پراسرار آدمی اس عوامی پارک کے اردگرد کے رہائشی علاقوں کا مکین تھا جو اس پارک میں پایا گیا تھا۔ اس بات کا قوی گمان تھا اور اپنے اس قیاس کی صداقت کو پرکھنے کے لئے پروفیسر درانی نے بھی ایک فیصلہ کرلیا اس نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ اس نامعلوم قاتل تک پہنچنے کے لئے خود حلیہ بدل کر پارک میں جایا کرے گا اور جاسوسی کیا کرے گا تاکہ کسی نہ کسی دن اس پراسرار قاتل تک پہنچ سکے۔ انہیں خیالات کے ساتھ اسے نیند کے غلبے نے آلیا اور وہ پھر دنیا و مافیا سے بے خبر نیند کی پرسکون وادیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

☆.....☆.....☆

"مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس ٹیلی پیتھسٹ کے علاقے کا کھوج اتنی آسانی سے لگا بھی لیا ہے۔"

"بس! تقدیر نے ساتھ دیا، ورنہ تو میں سوچ رہا تھا کہ اب شاید ہی زندگی میں میرا اس سے آمنا سامنا ہوگا۔ کل اتفاقاً وہ وہاں پر مجھے دکھائی دیا اور بعد میں تو میں نے ایک سیکنڈ بھی ضائع نہ کیا اور اس کا فوری تعاقب شروع کردیا۔ بٹ ان فورچیونیٹلی وہ میرے ہاتھ نہیں آیا۔" پروفیسر نے ڈاکٹر ربانی کو کل کی ساری روداد پھر کہہ سنائی۔

وہ ڈاکٹر ربانی کو اس کے گھر سے پک کرکے اس عوامی پارک میں لے آیا تھا۔ یوں وہ تنہائی کے شر سے بھی بچا رہا اور ایک عملی صحبت سے بھی بہرہ مند ہوتا رہا ڈاکٹر ربانی اس کا بہترین دوست بھی تھا وہ اس سے اپنی ہر دل کی بات کرسکتا تھا۔ "تو تمہارا یہ خیال ہے کہ ہمارا مطلوب ملزم اسی علاقے کے گرد ملحقہ رہائشی آبادی میں کہیں مکین ہے اور کسی نہ کسی وقت وہ پارک میں ہوا خوری کی غرض سے ضرور آئے گا؟" ڈاکٹر ربانی نے سوال کیا۔

"ہاں! ایسا ہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اسی علاقے میں کہیں مکین ہے۔ یہیں کہیں گرد و پیش کی مقامی رہائش آبادی میں۔" پروفیسر نے جواباً کہا۔

"اور اگر میں یہ کہوں کہ آج وہ یہاں نہیں آئے گا..... بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت سارے دنوں تک یہاں نظر نہ آئے تو؟"

"یہ نہیں ہوسکتا۔" پروفیسر نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

"پروفیسر درانی! ذرا عقل سے سوچ کر جواب دو۔ اگر تم اس کی جگہ پر ہوتے۔ اور وہ تمہارا تعاقب کررہا ہوتا۔ مطلب وہ تمہاری جگہ پر ہوتا۔ اور کل جس طرح تم نے اس کا پیچھا کیا، وہ تمہارا پیچھا کررہا ہوتا تو کیا تم یہ حماقت کرتے کہ اگلے روز دوبارہ اسی جگہ پر جاتے؟" اس مرتبہ پروفیسر درانی کو ایک چپ لگ گئی۔ وہ خاموشی سے اپنے دوست ڈاکٹر طارق ربانی کی بات پر غور کرنے لگا۔ ڈاکٹر ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ اس کی بات میں وزن تھا۔ اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگ گیا تھا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر سٹپٹا کر رہ گیا تھا۔ بھلا ایک قاتل اب سرعام کیونکر گھوم سکتا تھا جبکہ اسے معلوم ہوچکا تھا کہ کوئی اب اس کے تعاقب میں ہے۔ اس کا مطلب اسے اب احتیاط کے تمام تقاضوں کو مدنظر رکھنا تھا۔ پروفیسر سے ایک حماقت سرزد ہوچکی تھی وہ قدرے فاصلے میں رہ کر بھی اس پر اپنی نگاہیں جمائے رکھ سکتا تھا۔ لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"ہاں تو پھر میری بات تمہاری عقل میں فٹ ہو رہی ہے یا ابھی بھی تمہیں ایک ایسی ان ہونی کا انتظار ہے جو شاید اب ہو کر کبھی نہ رہے؟"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو ڈاکٹر! کل مجھ سے ایک حماقت سرزد ہوئی ہے۔" پروفیسر زیر لب بڑبڑایا تھا لیکن اس کی بڑبڑاہٹ ڈاکٹر کے کانوں تک پہنچ چکی تھی۔

"مجھے واقعی میں اس کا تعاقب رازداری کے ساتھ کرنا چاہئے تھا لیکن میں آپے سے باہر ہوگیا اور اسی جذباتی پن میں حماقت کر بیٹھا۔

"Exactely! یہی تو بات ہے ہم بحیثیت قوم جذباتی ہیں۔ Cool Down نہیں رہتے ورنہ بہت سے معاملات ہماری گرفت میں ہوں۔"

"آئی ایم سوری! میں آئندہ محتاط رہوں گا۔" پروفیسر نے ندامت سے کہا اور ڈاکٹر نے بینچ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اجازت دو۔ میں چلتا ہوں اگلے ہفتے سنگار پور کا ایک لیکچر ہے جو مجھے تیار کرنا ہے اور تمہیں اچھی صلاح دوں تو تم بھی اپنا "موت" والا تھیسس مکمل کرلو۔ اب وقت کو ضائع نہ کرو۔ بعض مجرم دنیا میں دندناتے پھرتے ہیں۔

مظلوم کو کبھی انصاف نہیں ملتا لیکن ایسے مجرم اور قاتل آخرت میں اللہ کی عدالت میں ہی پکڑے جائیں گے۔ بعض باتیں کسی خاص حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ دنیا میں ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ وقت قیمتی ہے تم اسے ضائع مت کرو۔ اور تھیسس پر دھیان دو۔" یہ پند و نصائح کرتا ہوا وہ وہاں سے رخصت ہوگیا۔

لیکن پروفیسر کا دماغ کہیں اور ہی گھوم رہا تھا۔ وہ ہار ماننے کو قطعی تیار نہ تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس کا پی ایچ ڈی کا مقالہ چند ہفتوں میں اگر مکمل نہ ہوتا تو اسے ڈگری حاصل کرنے میں وقت لگ جاتا لیکن وہ اس مقالے کی فکر میں نہیں تھا۔ اسے پی ایچ ڈی کے لئے یہ مقالہ بعنوان۔ "موت" تیار کرنا تھا۔ لیکن وہ اس قاتل کی تلاش میں سرگرداں تھا جو دوسروں کی موت کا سبب بن رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر وں کو وہاں سے جاتا دیکھتا رہا۔ اس نے بینچ پر ٹیک لگالی۔ ایک گہرا سانس لیا پھر یکا یک اسے طبیعت میں بوجھل پن کا..... احساس ہوا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں کسی نے خنجر گھونپ دیا ہے۔ وہ زور سے چلایا۔ "طارق" اس کی چیخ بہت اونچی تھی اس کا دوست طارق ربانی اس کے بینچ سے ابھی چالیس قدموں کے فاصلے پر ہی چلتا ہوا اپنے گھر کی جانب جارہا تھا لیکن وہ جونہی پروفیسر کی چیخ سن کر مڑا تو اس کی صورت یکسر بدل چکی تھی۔ ڈاکٹر طارق ربانی نے اس پراسرار قاتل کا حلیہ اپنا لیا تھا۔ وہ حیرت اور خوف کے عالم میں اپنا سینہ ہاتھ میں پکڑے اس پراسرار قاتل کو اپنی جانب بڑھتا ہوا دیکھتا رہا۔ وہ پراسرار آدمی جوں جوں اس کی جانب بڑھتا آرہا تھا۔ پروفیسر کی آنکھیں خوف سے پھیلتی چلی جارہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

جب پروفیسر درانی کی آنکھ کھلی تو وہ مقامی نجی اسپتال کے ایک کمرے میں موجود تھا اس کے گرد ڈاکٹر طارق ربانی اور اسپتال کے عملے کے کچھ لوگ تھے۔

"ڈاکٹر طارق!" پروفیسر کے نحیف لہجے نے سب کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ ایک خاتون پروفیسر کی جانب جھکی اور چہرے کے سامنے آکر اس نے پروفیسر سے کہا۔ "آپ اس وقت اسپتال میں ہیں۔ میرا نام ڈاکٹر بشریٰ گیلانی ہے۔ آپ کوئی موومنٹ نہ کیجیے۔"

"مجھے کیا ہوا تھا؟"

"یار، خاموش رہو۔ تمہیں ہلکا سا دل کا دورہ پڑا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔" اس مرتبہ ڈاکٹر طارق ربانی نے پروفیسر درانی کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ اس پر پروفیسر نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسے آرام سے ڈاکٹر نے تھام کر اس کو بستر پر رکھ دیا تھا۔ وہ اپنے پروفیسر دوست کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس نے اس کے ہاتھ پر نہایت نرمی اور شفقت سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"مجھے کیا ہوگیا تھا؟" پروفیسر درانی نے ڈاکٹر طارق سے دریافت کیا۔ اس پر ڈاکٹر طارق نے مسکرا کر کہا۔ "میں تو گھر کی جانب چلا جارہا تھا۔ پھر اچانک عقب سے تمہاری چیخ سنائی دی۔ اور میں بھاگتا ہوا تمہاری طرف لوٹ آیا۔ وہاں تم بینچ پر ڈھیر ہوئے جارہے تھے میں نے مدد کے لئے شور مچادیا۔ لوگ پارک سے بھاگے آئے۔ پھر ایک ہجوم کی مدد سے اپنی گاڑی میں ڈال کر میں تمہیں اس اسپتال کی ایمرجنسی میں لے آیا۔ انہوں نے فوری علاج و معالجہ شروع کردیا اور یوں تین چار گھنٹے بعد اب تمہیں ہوش و حواس میں دیکھ کر دل کو خوشی ہورہی ہے۔ اوپر والے کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہاری جان بچ گئی۔ ویسے میری بات مان لو تو اس میں تمہاری بہتری ہے۔"

"کون سی بات؟"

"اپنے تھیسس پر دھیان دو۔" "ہونہہ!"

"چھوڑو اس پراسرار قاتل کو۔" ڈاکٹر نے پروفیسر کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ یہاں ڈاکٹروں کی رائے میں تمہارے دماغ پر اتنے گہرے دباؤ کے اثرات ہیں کہ اس نوجوانی میں بھی تمہیں دل کا حملہ ہوا ہے یعنی Heart Attack"

"میں اب اپنا تھیسس ہی مکمل کروں گا۔" پروفیسر نے ایک مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرتے ہوئے اپنے دیرینہ دوست طارق ربانی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں صداقت کی چمک دیکھ کر ڈاکٹر ربانی بھی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"پرومس؟ (Promise)

"پرومس بائی ہارٹ (Promise by Heart) پروفیسر درانی نے اپنا دل تھامتے ہوئے کہا اور دونوں بے اختیار ہنسنے لگے۔ ڈاکٹر بشریٰ گیلانی نے بھی ان دونوں کی جانب مسکرا کر دیکھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر طارق ربانی جب عوامی پارک سے رخصت ہوا تو پروفیسر درانی نے بینچ کے ساتھ اپنی کمر ٹکاتے ہوئے ایک طویل آہ بھری تھی۔ اس گہرے سانس کے بعد اسے اچانک سینے میں شدید جلن کا سا احساس ہوا تھا۔ اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کا بایاں بازو اور کاندھے ٹیسوں کی وجہ سے سن ہوتے جارہے ہیں۔ اس نے اپنی کل توانائیوں کو مجتمع کیا اور زوردار چیخ ماری تھی۔ اس نے چیختے ہوئے اپنے دوست ڈاکٹر طارق ربانی کو آواز دی تھی۔ آواز دے کر وہ ایک نظر اپنے جاتے ہوئے دوست کی جانب دیکھا تھا جو بمشکل اس سے چالیس قدموں کے فاصلے پر پیٹھ کئے اپنے گھر کی جانب واپس چلا جارہا تھا۔ لیکن جونہی ڈاکٹر کو پروفیسر درانی کی ہولناک چیخ سنائی دی تو اس نے فوری گھوم کر پروفیسر کی جانب دیکھا تھا۔ پروفیسر درانی اب بھی اپنے دوست ڈاکٹر کی جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ لیکن اگلے لمحے جیسے اس کی اپنی ہوائیاں اڑنے لگ گئی تھیں۔ اس کا دیرینہ دوست ایک آن میں بدلنے لگ گیا تھا۔ ڈاکٹر طارق ربانی کے بال یک دم لانبے ہوچکے تھے اس کی آنکھیں گول نما ہوتی جارہی تھیں اور پھیل کر خوف ناک انداز میں بڑی ہوگئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں پروفیسر نے اک عجیب سی کشش کو محسوس کیا تھا۔ ڈاکٹر درانی نے اب اس پراسرار قاتل کی صورت اختیار کرلی تھی جس کی تلاش میں پروفیسر تب سے سرگرداں تھا جب سے اکرم کی موت واقع ہوئی تھی وہ اس پراسرار صورت کو لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ اس پراسرار قاتل نے قریب پہنچ کر اس کی آنکھوں میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں ڈال دیں۔

"نہیں..... مجھے چھوڑ دو..... آئندہ میں تمہارا تعاقب نہیں کروں گا۔" پروفیسر کی آواز حلق میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ یہ تو اس کے اندر کی آواز تھی۔ یک دم پارک کا ماحول تبدیل ہونا شروع ہوگیا تھا۔ وہ پراسرار آدمی اب اس کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر اپنا چہرہ لاچکا تھا اب اس نے پہلی مرتبہ اپنا پورا منہ کھول کر زبان نکالی تھی یہ زبان جس کے ایک ایک ذرے پر نوکیلے کانٹے اگے ہوئے تھے۔ یہ کانٹے ہولے ہولے سے یوں متحرک دکھائی دے رہے تھے جیسے ان کانٹوں میں بھی جان ہو۔ پھر اس کے حلق کی گہرائیاں پروفیسر نے دیکھنا شروع کردی تھیں۔ کیونکہ جیسے ہی پروفیسر نے اپنی نگاہیں اس پراسرار قاتل کے حلق کی جانب مرکوز کی تھیں تو وہاں حلق میں ایک گہری سرنگ دکھائی دی تھی جہاں حلق کے گرد ہڈیاں بنی ہوئی تھیں اور اندر کی جانب چلی جارہی تھیں پروفیسر کا گمان تھا کہ وہ پراسرار شخص اسے اب ایک ہی آن میں لقمہ بنا کر ہڑپ کرجائے گا۔ لیکن نہیں ایسا تو کچھ نہیں تھا۔ وہ تو چند انچ کے فاصلے پر ٹھہر گیا تھا۔ اب اس نے اپنی آنکھوں کو پروفیسر کی آنکھوں میں پیوست کردیا تھا۔ "میری طرف دیکھ! میری آنکھوں میں!" وہ بے انتہا ڈراؤنی بھاری آواز میں بولا۔ اس کی آواز میں ایک ایسا سحر تھا کہ اس کی ہر بات مان لینے کا جی کرتا تھا۔ اور یہی احساس پروفیسر کو بھی ہوا وہ اس کی بات کو بادل ناخواستہ مان رہا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اندر ہی اندر سے اس کا دل کرتا تھا کہ اس کی ایک بھی نہ مانے، ایک بھی نہ سنے، وہ مکمل گنگ ہوچکا تھا۔ وہ تو اب صرف اس پراسرار خوف ناک اور ڈراؤنے شخص کے شکنجے میں تھا جو اسے ہر آن اپنے ہی بس میں کسے چلا جارہا تھا۔ پروفیسر کے وجود میں سوئیاں چبھتی سی محسوس ہورہی تھیں۔ پھر جب پروفیسر نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو اس کے رونگٹے کھڑے ہونے شروع ہوگئے تھے۔ اس پراسرار آدمی کی بڑی بڑی آنکھیں مزید پھیلی تھیں۔ ان آنکھوں میں اک عجب سحر تھا۔ پروفیسر اپنی آنکھیں پھاڑے اسے بے بسی سے دیکھتا جارہا تھا۔ اور پھر وہ پراسرار شخص وہاں تک رکا نہیں تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون سے زیادہ سرخ اور آگ سے زیادہ زرد رنگت نمایاں ہوئی اور پھر اس نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھ کو پروفیسر درانی کی نگاہوں کے سامنے کیا۔ پہلے وہ پانچوں انگلیاں اس کی نگاہوں کے سامنے ہلاتا رہا پھر اس کی انگلیوں کی ہیئت تبدیل ہونی شروع ہوگئی۔ وہ اپنی اصل ہیئت سے دوگنی لمبی ہوتی چلی گئیں۔ ان انگلیوں کے ناخن چھریوں کی مانند باہر نکلنے شروع ہوگئے تھے۔ ان انگلیوں سے گوشت اور ماس بوٹی یوں بہنا شروع ہوگیا تھا جیسے بارش کی وجہ سے تر و تازہ مٹی کی دیوار سے مٹی دلدل نما ہوکر بہہ جاتی ہے۔ اب وہاں سوکھی سیاہ جھاڑیوں کی مانند ہڈیاں نمودار ہوچکی تھیں اور ہڈیوں بھری انگلیوں سے اس نے ہلا کر آواز پیدا کی۔ جوں جوں وہ پروفیسر کے سامنے اپنی یہ بے گوشت پوست کی بڑے بڑے ناخنوں والی انگلیاں ہلاتا، اسی وقت عجیب سے دھماکوں کی آوازیں پیدا ہوتی جاتیں جو پروفیسر درانی کو مزید اندر ہی اندر سے کھائے چلی جاتی تھیں۔ اگلا لمحہ پروفیسر کے لئے قیامت خیز ثابت ہوا۔ اس نے جو منظر دیکھا اسے مارڈالنے کے لئے کافی تھا۔ اس پراسرار قاتل نے پروفیسر کی زبان پر ہاتھ رکھا۔ اس کے ناخنوں سے اٹھتی ہوئی جلن کو پروفیسر نے شدت سے محسوس کیا..... آہ..... ہ..... خ..... خ!" کی آواز بمشکل پروفیسر کے حلق سے نکلی۔

اس ظالم، بے درد شخص نے اپنے لانبے ناخنوں والے پنجے پروفیسر کی زبان سے گزارتے ہوئے حلق تک پہنچائے اور یوں ہولے ہولے سے اس ظالم نے پروفیسر کی شہ رگ پر اپنا قبضہ جمالیا۔ پروفیسر نے اب کانپنا شروع کردیا تھا۔ اس کے پورے وجود میں آگ کے کانٹے چبھنے لگ گئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے کانٹے دار جھاڑیاں اس کے وجود میں ہر جگہ گھسیڑ دی ہیں اور اب ان جھاڑیوں کو کسی نے زور زور سے جھنجھوڑنا شروع

کردیا ہو۔ وہ چیخنا چاہتا تھا لیکن چیخ نہ پارہا تھا۔ وہ آزادی وفرار چاہتا تھا مگر اس سارے شکنجے سے نہ اسے آزادی ہی میسر تھی اور نہ فرار۔ اس نے زبان سے بولنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ زبان تو پہلے سے ہی اس پراسرار شخص نے اپنے قبضہ قدرت میں کررکھی تھی۔

پروفیسر کو اپنے اندر دل ہی دل میں کراہتے ہوئے اپنی ہی آواز سنائی دے رہی تھی وہ آخری دم میں آخری امید کے ساتھ چیخا تھا۔ ”اے میرے اللہ! مجھے بچالے۔ مالک میری مدد کر۔ یا اللہ میں تجھے ہمیشہ یاد رکھوں گا! اب میں تجھے کبھی نہ بھولوں گا۔ میں تجھ سے مدد مانگ رہا ہوں مالک میری مدد کردے۔ تیری شان کی قسم! میں ساری عمر تیرے راستے پر گزاردوں گا۔“ اور پھر جیسے اس پراسرار آدمی نے اپنی آخری شعلہ باز نگاہیں پروفیسر پر گاڑتے ہوئے اپنے خونیں دانت نکالے یوں لگتا تھا کہ اب وہ پروفیسر کو ایک جھٹکے سے ہلاک کرنے والا تھا۔

کہ اچانک ایک بہت پراثر ورعب دار آواز نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے لیا یہ آواز ہر جانب سے آئی تھی کہنے والے نے بے انتہا رعب دار انداز میں اس پراسرار آدمی سے مخاطب ہو کر کہا تھا۔

”اسے چھوڑ دے..... ابھی اس کا وقت پورا نہیں ہوا۔ چھوڑ دے اسے..... عزائیل!“ اور اس آواز کے ساتھ ہی پروفیسر کو ایک آن میں یہ محسوس ہوا کہ سارا منظر بدل گیا ہے۔ وہ پراسرار شخص سفید بادل بن کر ہوا میں کہیں تحلیل ہو چکا تھا۔

اب جو پروفیسر کی آنکھ کھلی اور اسے قدرے ہوش آیا اس کے ہوش وحواس جو نہی بحال ہوئے تو اس نے اپنے آپ کو ایک نجی اسپتال کے بستر پر پایا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے گرد اس کا دوست ڈاکٹر طارق ربانی اور اسپتال کے عملے کے کچھ لوگ تھے۔ بہت نحیف لہجے میں اس نے اپنے دوست کو پکارا تھا۔ ”ڈاکٹر طارق!“

یہ سن کر ڈاکٹر اور اسپتال کے عملے کے لوگ اس کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ عملے کے افراد میں سے ایک خاتون اس کے چہرے سے قدرے اپنا چہرہ قریب کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”آپ اس وقت اسپتال میں ہیں میرا نام ڈاکٹر بشریٰ گیلانی ہے۔ آپ ابھی کوئی موومنٹ مت کیجیے۔ You are in safe hands آپ محفوظ ہیں۔“

”مجھے کیا ہوا تھا؟“ پروفیسر نے دوبارہ نحیف لہجے میں سوال کیا تھا۔ وہ ساری صورت حال پر اللہ تعالیٰ کا دل وجان سے مشکور تھا وہ زندہ تھا وہ اپنوں میں تھا اور اپنوں کے ساتھ تھا وہ پراسرار مخلوق جس کا نام عذرائیل تھا اس کے سامنے سے نہ جانے کہاں جاچکا تھا اب اس کے سامنے اس کا دوست ڈاکٹر ربانی کھڑا تھا اس نے اس کے پاس اسپتال کے بستر پر بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔ ”یار خاموش رہو..... تمہیں ہلکا سا دل کا دورہ پڑا تھا لیکن اب سب ٹھیک ہے۔“ آگے بھی کچھ باتیں ہوئیں تھیں لیکن سب سے اہم بات جو ڈاکٹر ربانی نے اس سے کی تھی وہ یہ تھی۔

”اپنے تھیسس پر دھیان دو۔“ اور پھر پروفیسر درانی نے دو وعدے کیے تھے، ایک وعدہ اپنے دوست سے کیا تھا کہ وہ اپنی پی ایچ ڈی کو لازمی مکمل کرے گا اور اس آخری تھیسس پر سیر حاصل تحقیق کرکے اسے چند دنوں میں مکمل کرے گا اور عظیم محقق بنے گا اس تھیسس پر اب اس کے پاس عملی تجربہ بھی تھا۔ اور اس کے تھیسس بعنوان ”موت“ پر قلم اٹھانے سے اب اسے کوئی پراسرار طاقتوں کا حامل نہیں روک سکتا تھا۔ دوسرا وعدہ اس نے اپنے پالنے والے رب تعالیٰ سے کیا تھا کہ وہ تادم مرگ اب کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرے گا اور اس کو دیئے گئے اس وقت کی، اس مہلت کی ہر ہر لمحہ قدر کرے گا۔

”پرومس؟“ ڈاکٹر ربانی نے پروفیسر درانی کا ہاتھ تھامے ہوئے پوچھا تھا۔ اور پروفیسر درانی نے اپنا دل تھامتے ہوئے کہا تھا۔ ”پرومس مائی ہارٹ یعنی تہہ دل سے وعدہ کرتا ہوں۔“ اور دونوں بے اختیار ہنس دیئے تھے ڈاکٹر بشریٰ گیلانی نے بھی ان دونوں کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔

قبر کے قیدی

مریم فاطمہ۔ کراچی

سنسان ویران اور اندھیری رات وہ بھی قبرستان کے درمیان کھڑے نوجوان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس کے سامنے اچانک قبر پھٹی اور قبر کے اندر سے روشنی برآمد ہوئی تو.....

ایک نوجوان کی حقیقی روداد جسے اپنی جوانی..... عقلمندی اور طاقت پر ناز تھا..... مگر

ولیم اور مائیکل انگلینڈ کے ایک بہت بڑے قبرستان کے باہر کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دوست جوزف اور انتھونی بھی تھے۔ اس قبرستان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ آسیبی ہے۔ اور اس کے متعلق دیگر بڑی بھیانک باتیں بھی سننے میں آتی تھیں۔

سخت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ چاروں دوستوں نے اوور کوٹ پہن رکھے تھے، اور یوں لگتا تھا کسی بھی پل تیز موسلا دھار بارش شروع ہوجائے گی۔ یخ بستہ تیز سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ اور اس وقت اتنی ٹھنڈ میں گھر سے باہر نکل کر قبرستان کے باہر کھڑے ہونے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان چاروں نے آپس میں شرط لگائی تھی کہ وہ قبرستان کے اندر جا کر دکھائیں گے۔ مگر یہاں پہنچ کر ان میں سے کسی کی بھی ہمت نہیں پڑ رہی تھی سوائے ولیم

کے۔ وہ ویسے بھی بہت بہادر تھا۔ اسے اندھیرے سے خوف نہیں آرہا تھا۔

لیکن سچ تو یہ تھا کہ رات کا بھیانک اور خوفناک اندھیرا پھر دل پر لرزہ طاری کرتی اندھیری رات کی خاموشی اسے بھی ڈرائے دے رہی تھی۔ پھر بھی وہ اپنا ڈر چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے بزدلو! نہ جاؤ اندر، میں ہی چلا جاؤں گا۔''

''ہاں ہاں ہم تو بزدل ہیں اور تم ہو جیمز بانڈ، خود ہیرو بن رہے ہو بلکہ تمہارا سارا وجود خوف سے کانپ رہا ہے۔''

اس نے اپنے وجود پر نگاہ ڈالی تو وہ واقعی کانپ رہا تھا۔ اسے سخت شرمندگی کا سامنا ہوا لیکن وہ جلدی سے اپنی شرمندگی دور کرنے کے لئے بولا۔ ''میں خوف سے نہیں بلکہ سردی سے کانپ رہا ہوں۔'' اس کے تینوں دوست اس جواب پر ہنس دیئے۔ ولیم کو بڑا طیش آیا اور بولا۔

''ارے بے وقوفو! ہنستے کیا ہو جب میں اس قبرستان سے زندہ سلامت باہر نکل کر تم لوگوں سے شرط کے مطابق پیسے وصول کروں گا ناں پھر دیکھتا ہوں کہ کیسے ہنستے ہو تم لوگ ابھی تو بڑی ہنسی آرہی ہے ناں؟

اس قبرستان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں جارج نامی ایک آدمی کی قبر ہے اور جو شخص بھی اس کی قبر کے پاس چلا جائے وہ زندہ واپس لوٹ کر نہیں آتا۔ اور چاروں دوستوں نے یہی شرط لگائی تھی کہ ''چلو دیکھیں کہ کون باہر آتا ہے اور کون نہیں۔ چلو دیکھیں اس بات میں کتنی سچائی ہے اور کتنا جھوٹ ہے۔ ایسی افواہیں تو بہت سنی ہیں مگر یہ بات کتنی سچ ہے اس کا تو وہاں جا کر ہی پتا چلے گا۔''

اچانک ہی زور سے بادل گرجے اور جوزف بری طرح ڈر گیا۔ اسے ایسے موسم سے شروع سے ہی بہت ڈر لگتا تھا۔ باقی کے تینوں دوست اس کی یہ حالت دیکھ کر وہ ہنس دیئے۔ ''تم لوگ اپنی بکواس بند کرو۔ اور ولیم تم اندر جاؤ اگر زیادہ ہی ہمت ہے تو ویسے بھی پھر جلد ہی بارش شروع ہو جائے گی۔ اور ہمارا سارا پروگرام دھرا کے دھرا رہ جائے گا اور پھر کسی جارج کو تمہیں مارنے کی ضرورت نہیں پڑے گی بلکہ میں ہی تم لوگوں کا خاتمہ کر دوں گا۔''

''بڑے آئے دھمکی دینے والے۔''

اچھا بابا ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں۔'' ولیم نے تھوڑا مسکرا کر اور تھوڑا گھبرا کر کہا اور اپنا اوور کوٹ درست کرتا ہوا قبرستان کے اندر کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

قبرستان میں قدم رکھتے ہی اسے وہاں بڑی شدت سے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ''کون ہے؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''ہم ہیں تمہارے دوست!'' باہر سے انتھونی نے ہانک لگائی۔

''ارے بکواس بند کرو۔'' ولیم جھنجھلا کر بولا اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کا دل ایک انجانے خوف سے لرز رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی پیچھے سے آ کر اسے دبوچ لے گا۔ اس نے واضح طور سے محسوس کر لیا تھا کہ یہاں پر کسی کی موجودگی ہے لیکن وہ وجود کس کا ہے۔'' یہ وہ سمجھ نہیں پایا تھا۔ اس نے سوچا کہ ''ایک بار پھر پوچھ کر دیکھا جائے۔'' لیکن پھر اسے خیال آ گیا کہ اس کے دوست پھر مذاق اڑائیں گے، اس لئے بہتر ہے کہ اپنا منہ بند ہی رکھا جائے۔''

وہ اب جارج کی قبر تلاش کرنے لگا۔ قبرستان بہت بڑا تھا۔ اور اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ انگلینڈ کے سب سے بڑے قبرستانوں میں سے ایک ہے اس لئے جارج کی قبر ڈھونڈنے میں بہت وقت لگ رہا تھا۔ اسے ساتھ ساتھ ڈر بھی بہت لگ رہا تھا کہ اگر اسے جارج کی قبر مل گئی تو وہ بھلا کرے گا کیا۔

اچانک اسے اپنے پیچھے کسی کے پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ خوف کی شدت سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر سامنے دیکھ کر چلنے لگا۔ لیکن اسے یقین ہو چلا تھا کہ ''شاید یہ اس کا کوئی دوست ہی ہے جو اسے ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید اس کے دوست

اسے یہاں لا کر بے وقوف بنا رہے ہیں۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہی تھا۔ کیا واقعی اس کے دوست اسے بے وقوف بنا رہے تھے۔ یا ماجرا کچھ اور ہی تھا۔''

اچانک بڑے زور کی بجلی کڑکی اور اس کی روشنی میں ولیم نے دیکھا کہ ایک ہیولہ جو کہ کسی بوڑھے آدمی کا لگ رہا تھا کیونکہ وہ کمر جھکا کر چل رہا تھا آگے آگے چل رہا ہے۔ ولیم پر پہلے تو خوف سے لرزہ طاری ہو گیا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ شاید وہ وہاں کا گورکن وغیرہ ہے۔ لیکن پھر اگلے ہی پل یہ سوال اس کے دماغ میں ہتھوڑے برسانے لگا کہ ''بھلا اتنی رات گئے ٹھنڈ میں گورکن کیا قبرستان کی سیر کرنے نکلے گا۔ یہ ضرور کوئی اور ہے لیکن کون؟ یا پھر جارج؟'' اس نے خیال کے آتے ہی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

لیکن پھر اس نے سوچا کہ ''وہ اپنے دوستوں پر ثابت کر کے دکھائے گا کہ بزدل وہ نہیں بلکہ وہ سارے خود ہیں جو اندر قبرستان میں قدم بھی نہ رکھ سکے۔''

''وہ اس جارج نامی آدمی کا بھید جان کر ہی رہے گا۔'' اس نے اس خیال کے آتے ہی اپنی تمام تر ہمت جمع کر کے پوچھا۔ ''کک کون ہو؟''

''تمہیں جس کی تلاش تھی وہ میں ہی ہوں۔'' آواز سے لگتا تھا کہ وہ صدیوں کا کوئی بوڑھا شخص ہے۔

ولیم پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حالت کٹے شہتیر کی طرح ہو گئی۔ ''تت تمہیں کیسے پتا کہ مجھے کس کی تلاش ہے؟''

''تمہیں جارج کی ہی تو تلاش ہے ناں، مانا کہ یہ قبرستان بہت بڑا ہے لیکن اس میں جارج نامی آدمی کی قبر صرف میری ہی ہے۔''

ولیم کو لگا کہ ہو نہ ہو یہ ضرور اس کے شریر اور شوخ و چنچل دوستوں کی شرارت ہے۔ انہوں نے اسے سیدھا جان کر کسی لڑکے کو جارج کا کردار ادا کرنے کے لئے بھیج دیا ہے اور جب ہی وہ خود اندر نہیں آئے۔ ولیم وہ مسکرا کر بولا۔ ''تو آخر ہم جا کہاں رہے ہیں؟''

''میری قبر پر۔''

ولیم نے ایک جاندار قہقہہ لگایا۔ ''ارے بڈھے یہ جو تو ایسے کمر جھکا کر چل رہا ہے ناں میرے سامنے زیادہ ایکٹنگ نہ کرو ورنہ ایسی مار لگاؤں گا کہ سرجری کروا کے بستر پر پڑا ہو گا۔''

''تمہیں کسی نے تمیز نہیں سکھائی کیا۔'' اس بڈھے نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ولیم نے ہنس کر جواب دیا۔

''گھبراؤ مت بچے میں سکھا دوں گا۔''

''ہاہاہا۔'' ولیم نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔

''زیادہ بکواس مت کر بڈھے اور سیدھی طرح بتا دے کہ کتنے پیسے دیئے ہیں میرے دوستوں نے تمہیں اس کام کے لئے۔''

''مجھے کسی نے پیسے نہیں دیئے۔''

اچھا ٹھیک ہے نہ بتاؤ۔ دیکھ لینا یہاں سے نکل کر ایسی مار لگاؤں گا ان سب کی کہ دس دن تک بستر پر پڑے ہائے ہائے کرتے رہیں گے۔

''تم تھوڑی دیر کے لئے چپ نہیں رہ سکتے۔'' اس بڈھے کے لہجے میں بے زاری تھی۔

ولیم نے بھی یہ بات محسوس کی۔ ''انتہا کیوں بے زار ہو رہے ہو۔'' اس نے چڑ کر پوچھا۔

''تم کچھ دیر کے لئے چپ ہو جاؤ، ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔''

''کہاں؟'' ولیم نے پوچھا۔

''میری قبر پر۔''

''اچھا اگر ایسی بات ہے تو آج میں تم کو یہیں تمہاری قبر میں دفنا کر جاؤں گا۔''

''ولیم اب زیادہ دور نہیں رہے لو آ ہی گئے۔'' بڈھا دبتے لہجے کو بارعب کر کے بولا۔

''کہاں آ گئے؟''

''اپنے سامنے دیکھ۔'' ولیم نے ڈرتے ڈرتے اپنے سامنے دیکھا۔ تو اسے بہت زیادہ ڈر لگا تھا۔ سامنے ایک قبر پر لکھا تھا۔ ''جارج اینڈریو 1789-1722۔''

ولیم نے گھبرا کر اس بڈھے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے بڑے زوروں کی بجلی چمکی۔ تو ولیم نے دیکھا کہ وہ بوڑھا تو صدیوں کا بوڑھا لگ رہا تھا۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے اور وہ بیچ میں سے گنجا تھا۔ اب وہ نہایت پراسرار انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اور ولیم کی چیخ نکل گئی۔

ٹھیک اسی لمحے وہ قبر بیچ میں سے پھٹی اور ولیم اندر گر گیا۔ قبر دوبارہ ایک بار پھر سے برابر ہوگئی۔ اندر پہنچ کر ولیم پر جو دہشت طاری تھی وہ حیرت میں بدل گئی کیونکہ اندر نہایت پرانے طرز کا مکان بنا ہوا تھا۔ وہ مکان نہایت خوب صورت اور بہت بڑا تھا۔ اس میں کئی کمرے تو ہوں گے ہی بڑے بڑے فانوس چھت سے لٹک رہے تھے۔ ولیم اپنے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ایک بات تو اس کی سمجھ میں آ گئی تھی وہ یہ کہ ''یہ اس کے دوستوں کی شرارت نہیں ہے بلکہ واقعی کسی آسیب کا چکر ہے۔''

ولیم نے گھبرا کر اپنے دوستوں کو آوازیں دینا شروع کیں۔ اس کے دوستوں میں سے تو کوئی نہ آیا لیکن بڑی دیر کے بعد اس نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین لڑکی بھاگی ہوئی جارج کے ساتھ اس کمرے میں آ رہی ہے وہ لڑکی اس گھر کی مالکن لگ رہی ہے اور جارج اپنے حلیے سے اس کا ملازم لگ رہا ہے۔ جارج بولا۔ ''ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔''

''نہیں ڈیڈ میری شادی اس امیر زادے سے کروادیں گے۔''

''اور میں تمہارے سوا کسی اور کا بننے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں نے ہمیشہ سے تمہیں چاہا ہے جارج تمہارے بغیر مرجاؤں گی۔''

''ہاں کیتھرین جانتا ہوں لیکن یہ بات تمہارا باپ بھی جانتا ہے کہ میں کتنا غریب ہوں۔ وہ ہرگز تم سے میری شادی نہیں کریں گے۔''

''تم کیوں ایسی باتیں کررہے ہو جارج، میں تمہارے بغیر ادھوری ہوں۔ نامکمل ہوں۔''

''ہاں لیکن شاید تم یہ بات اچھی طرح سے نہیں جانتیں کہ مجھے ایک لاعلاج بیماری ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ میں بوڑھا ہوتا جارہا ہوں۔ اور بہت جلد اپنی موت سے جا ملوں گا۔ میری موت ہی میری محبوبہ ہے۔'' جارج نے بہت افسوس سے کہا۔

''مجھے پرواہ نہیں ہے اگر موت تمہاری محبوبہ ہے تو تم بھی میرے محبوب ہو، میں تمہارے مرنے کے بعد اپنی جان دے دوں گی۔ آملوں گی تم سے جارج۔''

''ارے بس بس تم نے تو رونا شروع کردیا ہے۔ ذرا دیکھو تو پورا وجود کپکپا رہا ہے۔'' لیکن کیتھرین بہت جذباتی ہورہی تھی۔ وہ جارج سے گلے لگ کر سسکیاں لے کر رورہی تھی۔

''یہ کیا کررہی ہو تم الگ ہوجاؤ اس چھوت کی بیماری والے سے۔ وقت سے پہلے بوڑھا ہونے لگا۔ یہ ہمارا دو کوڑی کا ملازم اور تم اس پر جان چھڑکتی ہو۔ پاگل ہوگئی ہو تم تو۔ ملازموا ٹھاؤ اس کچرے کے ڈھیر کو اور باہر پھینک آؤ۔'' مسٹر جیمز جو کہ کیتھرین کے والد تھے گرجدار آواز میں بولے۔ انہوں نے اپنے بیٹوں کو بھی وہاں بلالیا۔ ''براؤن، مارک دونوں یہاں آجاؤ اور اس کچرے کو جلا کر راکھ کردو۔''

''خبردار اسے کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔'' کیتھرین آگے آ گئی۔

''کیتھرین میرے صبر کا امتحان مت لو۔ اور ہٹ جاؤ راستے سے۔''

''صبر آپ میں ہے کہاں جو امتحان لوں گی اور راستے سے میں ہٹنے والی نہیں ہوں۔''

''براؤن مارک ہٹاؤ اسے۔'' کیتھرین کے بھائیوں نے باپ کے حکم پر بہن کو پرے دھکا دیا۔ اور دونوں مل کر جارج پر ٹوٹ پڑے۔ ''ہماری بہن کی زندگی برباد کرنے چلا ہے۔ دو کوڑی کا ملازم، بھول گیا اپنی اوقات ارے سڑکوں پر بھیک مانگ رہا تھا تو، جب ہم لوگ تجھے اس گھر میں لے کر آئے یہاں پناہ دی۔''

☆.....☆.....☆

بڑی دیر سے ایک دوست جسے جیمز نے خاص طور سے اپنے گھر میں رکھا ہوا تھا یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔

آگے بڑھا اور بولا۔ ''جیمز ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جسے تم کوئلہ سمجھ رہے ہو وہ ہیرا نکل آئے۔''

''لیکن کیسے یہ تو عذاب ہے عذاب۔ پتا نہیں کیوں نازل ہوگیا ہم پر۔'' جیمز نے آگے بڑھ کر ایک تھپڑ جارج کے منہ پر مارا تو اس کے منہ سے خون نکل آیا۔ اور وہ تڑپ کر رہ گیا۔

''ارے بس بس کیا جان نکالو گے اس کی۔ جانتے ہو۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو تمہاری لاڈلی کیتھرین بھی خودکشی کرلے گی۔ تم ٹھہرو مجھے اس کا ہاتھ دیکھنے دو۔ اگر اس کی قسمت اچھی ہے تو تم اسے اپنی بیٹی سے بیاہ دینا ورنہ پھر تمہاری مرضی جو چاہو اس کے ساتھ سلوک کرو۔'' دراصل وہ شخص نجومی تھا۔

جیمز نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، ہاتھوں میں کیا ہوگا۔ یہ تو ایک فقیر کے ہاتھ ہیں۔''

''نجومی نے اس کا ہاتھ دیکھا اور پھر چیخ کر بولا۔ ''جیمز اسے مارنے کی غلطی نہ کرنا یہ تو صدیوں زندہ رہے گا۔''

''کیا؟''

''ہاں یہ تو صدیوں جوان رہے گا۔ اس کا ہاتھ کمال کا ہے۔ اس سے اپنی بیٹی کی شادی کردو گے تو تمہاری بیٹی بھی صدیوں زندہ رہے گی۔ اس کے بھی دن پھر جائیں گے۔''

''کیا بول رہے ہو۔ کہیں باؤلے تو نہیں ہوگئے تم؟''

''میں ہرگز باؤلا نہیں ہوا۔ بلکہ بڑی عقل کا مشورہ دے رہا ہوں۔ چلو میرے پاس ایک ترکیب ہے۔ جس سے یہ سب ممکن ہے۔''

''کیا ترکیب؟'' جیمز کی بے قراری بڑھ گئی تھی۔ ''ارے بتاتا ہوں بتاتا ہوں۔ پہلے اس بے چارے کی تو مرہم پٹی کردو۔ ذرا دیکھو تو مار مار کے کیا حالت بنادی ہے۔''

مارک اور براؤن جارج کو سنبھالنے لگے تو وہ قدرے بے چارگی سے ان کی طرف دیکھتا ہوا اپنے پیروں پر بمشکل کھڑا ہو پایا۔ اتنی مار کھانے کے باوجود بھی وہ مزید حوصلہ مند نظر آرہا تھا۔

براؤن اور مارک نے اسے بستر پر لٹایا۔ کیتھرین بھی دوڑی چلی آئی۔ ''آوہ! مائی ڈیئر جارج آخر ہم دونوں کی شادی ہو ہی جائے گی۔'' اس نے روتے ہوئے کہا۔ لیکن یہ آنسو خوشی کے تھے۔ وہ خوشی سے رو رہی تھی۔

ولیم چپ چاپ یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ ایک بات ولیم نے محسوس کی تھی کہ وہ تو ان لوگوں کو دیکھ سکتا تھا لیکن وہ لوگ ولیم کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

☆.....☆.....☆

اچانک ہی وہاں کا منظر بدل گیا۔ وہاں رات ہوگئی اور اس وقت ولیم ایسی قبرستان مین کھڑا تھا۔ جہاں وہ پہلے تھا لیکن ابھی وہ بالکل نئی حالت میں تھا اور کیتھرین جیمز براؤن اور مارک ایک لڑکے کو زبردستی اپنے ساتھ پکڑ کر لارہے ہیں اور قبر کھود کر اسے اندر دفنادیتے ہیں۔ اور قبر پر لکھا ہے۔ ''جارج اینڈریو 1722-1789۔'' لڑکے کو زندہ دفنادیا جاتا ہے۔

قیمتی باتیں

☆ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی دل کے سکون کو زیر و زبر کردیتی ہے۔

☆ ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرنا صالحین کا شیوہ ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کے محبوب بننے کا آسان طریقہ اتباع سنت ہے۔

☆ منافقت سے بچو کہ جہنم کی گہرائی میں منافقین کا ٹھکانہ ہوگا۔

☆ اچھے حکمران چاہتے ہو تو اللہ کو راضی کرنے کی فکر کرو۔

☆ نصیحت کا حسن یہ ہے کہ اس میں تحقیر کا شائبہ بھی نہ ہو

☆ ہدایت، اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

اس کے بعد قبر کھود کر دوبارہ دیکھا جاتا ہے تو اندر اجنبی لڑکے کے بجائے جارج نکلتا ہے بالکل زندہ سلامت۔ اور جوان حالت میں۔ ولیم یہ منظر دیکھ کر بری طرح سہم گیا۔ اس نے سوچا کہ کسی طرح اس قبرستان سے باہر نکلا جائے۔

لہٰذا ولیم اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنے لگا۔ لیکن بھاگتے بھاگتے اچانک ہی اس کا پیر مڑا اور وہ ایک قبر میں گرا، یہ قبر جارج کی تھی۔ قبر میں گرتے ہی قبر اوپر سے بند ہوگئی۔ قبر میں اندر کئی خوب صورت اور نوجوان لڑکے لیٹے ہوئے تھے۔ یہ سب وہ تھے جنہیں جارج اب تک خود کو جوان رکھنے کے لئے زندہ دفناتا چلا آرہا تھا۔ وہ سب جارج کی طرف ایک دم سے آنکھیں کھول کر دیکھنے لگے۔ ان سب نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیئے اور بولے۔ ''ہم یہاں برسوں سے اکیلے ہیں ہم سے دوستی کرلو۔'' پھر اچانک ہی ان سب کے چہروں پر جھریاں پڑگئیں اور وہ بین کرنے لگے۔ ''ہم سب جوان ہیں خوب صورت ہیں ہمیں تو بس ایسا کردیا گیا ہے۔ پلیز ہمیں اکیلا نہ چھوڑو۔''

اور ولیم نے اپنے تئیں عہد کرلیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے اسے ان لوگوں کی بھی اور اپنی بھی مدد کرنی ہوگی۔ اس نے ان سب کو سانس بند کرنے کا اشارہ دیا۔ ان سب نے ولیم کے منصوبے کو سمجھتے ہوئے اپنی سانس روک لی۔ کہ تب ہی قبر پھٹ پڑی۔

جارج بڑھاپے کی حالت میں کمر جھکائے ان سب کو دیکھ کر چیخ رہا تھا۔ ''سانس لو۔ مرجاؤ گے ورنہ۔ جانتے نہیں کہ تم لوگوں کا زندہ رہنا میرے لئے کتنا ضروری ہے۔''

''تیرے لئے تو مرنا ضروری ہے بوڑھے۔'' ولیم چیخا اور اس نے باقی لڑکوں کو بھی اشارہ کیا تو سب نے مل کر جارج کو گلا دبا کر مار دیا اور اسی قبر میں دفنا دیا اور پھر قبر برابر کردی۔ تمام لڑکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا وہ سب پہلے کی طرح جوان اور حسین ہوگئے تھے۔

☆.....☆.....☆

اچانک چرچ میں لگا گھنٹہ بجنے لگا۔ ''معاف کرنا دوستو! اب ہمیں اپنی اپنی دنیا میں جانے کا وقت گیا ہے۔ میں نہیں جانتا تم کتنے سال پہلے اس دنیا میں آئے تھے۔'' ولیم نے باری باری ان لڑکوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں بس اتنا جانتا ہوں کہ میں آج سے 22 سال پہلے اس دنیا میں یہاں آیا تھا۔ میرے دوست باہر میرا انتظار کررہے ہوں گے۔ اب میں ان کے پاس جارہا ہوں۔'' اتنا کہہ کر ولیم نے باری باری سب سے مصافحہ کیا اور وہاں سے چل دیا۔ باہر نکل کر اس نے جوزف مائیکل اور انتھونی کو پیچھے سے ڈرادیا۔ ''بھو۔ آآآ۔'' تو ان سب کی چیخیں نکل گئیں۔ پھر وہ سب خوشی سے جھوم اٹھے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر ولیم کو گلے سے لگالیا۔ ''ولیم تم کہاں تھے۔ ہم اتنی دیر سے تمہارا انتظار کررہے ہیں۔ دیکھو اب صبح ہونے والی ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''ارے ہم بھی قبرستان کے اندر آنے کا سوچ رہے تھے۔ دوست۔'' جوزف بولا۔

''ہونہہ! بات ایسے بنے گی۔ پہلے تم لوگوں کو شرط کے سارے پیسے دینے ہوں گے۔'' ولیم مصنوعی خفگی سے بولا۔ ''شرط کے سارے پیسے تم رکھ لو۔'' انہوں نے اپنی جیبیں خالی کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اندر اتنی دیر کیوں لگ گئی۔ کیا اپنے لئے گرل فرینڈ ڈھونڈنے لگے تھے؟''

''میں تو نہیں جارج ڈھونڈ رہا تھا۔'' ولیم نے کہا تو انتھونی ہنس دیا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ بعد میں سناؤں گا۔''

''بعد میں کیوں ابھی سناؤ۔''

''ابھی تو بس اتنا ہی سناؤں گا کہ آئندہ وہاں تو کیا کسی بھی قبرستان میں جانے کی کوشش نہ کرنا۔'' اس کے بعد سے وہ لوگ ولیم کی ہدایت پر آئندہ کبھی قبرستان نہیں گئے۔

کہتے ہیں کہ اس کے بعد آئندہ اس قبرستان میں کوئی اور عجیب حادثہ بھی پیش نہیں آیا۔

☠

سگ آوارہ

ساحل ابڑو۔ بلوچستان

اور پھر آدھی رات کے وقت اچانک دل دھلاتی خوفناک، دہشت ناک، وحشت ناک، حیرت ناک اور لرزیدہ کرتی آوازوں کا سلسلہ شروع ہوا تو لوگوں کا پتا پانی ہونے لگا کہ پھر اچانک.....

کیا یہ حقیقت ہے کہ مردہ ضمیر لوگوں کا حشر نا قابل یقین ہوتا ہے، کہانی پڑھ کر دیکھیں

سورج کی بے رحم دھوپ نے چوک اور اس کے لوگوں کو جیسے بھون کر رکھ دیا تھا۔ ہر کوئی شام کی **ٹھنک** ہوا اور رات کے خنک سائے کا انتظار انتہائی **اشتیاق** اور بے چینی کے ساتھ کررہا تھا۔ کیا جاندار اور **کیا بے جان**، کیا انسان اور کیا حیوان، کیا مکان اور کیا **دکان**، کیا اشجار اور کیا کوچہ و بازار، سب گرمی کے ہاتھوں بے چین ہوکر رہ گئے تھے۔

لو نے سب کو بے حال کر رکھا تھا۔ آسمان کی فضائے لاجوردی غبار آلود ہورہی تھی اور چوک سے گزرنے والی موٹر کاریں اس گرد و غبار کی شدت کو اور بڑھا رہی تھیں۔

میدان و رامین کے ایک طرف چنار کا ایک بوڑھا درخت تھا۔ جس کا تنا درمیان سے گل سڑ چکا تھا۔ مگر اس کی ٹیڑھی میڑھی جھکی ہوئی شاخیں بڑی ڈھٹائی سے ارد

گرد پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے غبار آلود پتوں کے سائے میں ایک بڑے سے چبوترے پر دولڑکے بلند آواز سے ہانک لگاتے ہوئے کھیرا اور تخمہ کدو بیچتے تھے۔ گاڑھے، غلیظ اور گندے پانی کی ایک زمین دوز نالی قہوہ خانے کے سامنے سے گزرتی تھی۔ چوک کی واحد قابل توجہ عمارت وارمین کا معروف مینار تھا جس کا زیریں حصہ استوانہ نما اور بالائی حصہ مخروطی شکل کا تھا۔ اس کے زیریں حصے میں جگہ جگہ دراڑیں پڑ چکی تھیں۔ اور جہاں جہاں اینٹوں کے اکھڑنے سے گہرے شگاف پڑ گئے تھے۔ وہاں چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے تھے۔ یہ چڑیاں بھی گرمی کی شدت کے مارے خاموش اپنے گھونسلوں میں دبکی پڑی تھیں۔

ساری فضا پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف ایک کتے کے رونے کی آواز گاہے بگاہے خاموشی کے اس طلسم کو توڑ دیتی تھی۔ یہ اس کا چستانی نسل کا بوگید کتا تھا۔ اس کی تھوتھنی مٹیالی سیاہ تھی۔ اور اس کی ٹانگوں پر ایسے سیاہ دھبے تھے جیسے کیچڑ کے داغ ہوں۔ اس کے کان جھکے ہوئے، دم نوکیلی اور بدن غلیظ تھا۔ مگر اس کے بالوں بھرے چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھوں سے انسانی ذہانت نمایاں تھی۔ اس کی آنکھوں کی گہرائی میں ایک انسانی روح صاف طور پر دکھائی دیتی تھی۔

اس کی شب گرفتہ زندگی میں اس کی آنکھوں میں کوئی ابدی شے لہریں لیتی دکھائی دیتی تھی۔ اس میں کوئی ایسا پیغام تھا جو کسی کو سمجھایا نہ جاسکتا تھا کیونکہ یہ اس کے پپوٹوں کے پیچھے چھپ کر رہ گیا تھا۔ یہ نہ تو روشنی تھی اور نہ رنگ بلکہ کوئی اور ہی ناقابل یقین چیز تھی۔ جو مثلاً کسی زخمی ہرن کی آنکھوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی آنکھوں اور انسانی آنکھوں میں ایک طرح کی مشابہت ہی نہیں بلکہ یکسانی اور مساوات بھی محسوس ہوتی تھی۔ یہ وہ دو نیلگوں سبز آنکھیں تھیں جو درد و کرب سے پر تھیں اور جن سے ایک ایسا امید افزا انتظار جھانکتا تھا جو صرف ایک کھوئے ہوئے سرگرداں کتے کی آنکھوں ہی میں نظر آسکتا ہے۔ مگر اس کی دردناک اور سراپا التماس نگاہوں کی طرف نہ کوئی دیکھتا تھا اور نہ کوئی متوجہ ہوتا تھا۔

نانبائی کا ملازم اسے جب بھی دکان کے سامنے دیکھتا تو مارنے اٹھتا۔ قصاب کا شاگرد اگر اسے دکان کے آس پاس بھی دیکھ لیتا تو پتھروں سے اس کی تواضع کرتا۔ اگر وہ کسی کار کے سائے میں پناہ لیتا تو کار ڈرائیور اسے اپنے میخ دار جوتے کی ایک ٹھوکر رسید کردیتا۔ اور جب باقی سب کے سب اسے مارتے پیٹتے تھک جاتے تو کھیر بیچنے والے لڑکے کی باری آتی جو اسے ستانے اور ایذا دینے میں ایک خاص لذت محسوس کرتا تھا۔

کتے کے منہ سے نکلنے والی ہر درد کی درد بھری چیخ پر کھیر بیچنے والا لڑکا ایک اور پتھر پھینکتا جو لازماً عین نشانے پر بیٹھتا۔ کتے کی چیخ کے ساتھ اس لڑکے کے قہقہے بلند ہوتے اور وہ حقارت سے کہتا۔

''چل ناپاک کتا۔''

ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس ایذا رسانی کے کھیل میں دوسرے لوگ اس لڑکے کے دل سے معاون اور شریک تھے، کیونکہ وہ نہ صرف اس ایذا رسانی میں اس لڑکے کی خفیہ حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ کتے کی چیخیں بلند ہوتیں تو دل کھول کر قہقہے لگاتے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو کہ ہمدردی کے تحت کتے کے آگے کچھ پھینک دیتے تو اسے کھا کر ان لوگوں کی طرف ممنون نگاہوں سے دیکھتا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان چند کو اس کتے سے خدا واسطے کا بیر ہے اور وہ اسے ستا کر اپنے خدا کو خوش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک ایسے جانور کو ستانا اور ایذا دینا بالکل فطری ہے۔ جسے کچھ لوگوں نے ناپاک قرار دیا ہے۔

کھیر بیچنے والے لڑکے کی ایذا رسانی سے کتا بیچارہ آخر اس قدر تنگ آ گیا کہ وہ اس تنگ سی گلی کی طرف بھاگ نکلا جو مینار کی طرف جاتی تھی، اپنے بھوکے اور خالی پیٹ کے ساتھ اس نے بڑی دشواری سے اپنے وجود کو کھینچا اور پناہ لی۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے سر کو اگلے پنجوں پر ٹکایا اور ساتھ ہی اس کی لمبی سی بان باہر نکل آئی۔ نیم خواب اور نیم بیداری کے عالم میں وہ ان

ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھنے لگا جو ہوا کے ساتھ لہلہا رہے تھے۔ وہ خستہ دور ماندہ تھا، اور اس کے اعصاب درد کی شدت سے جھنجھنا رہے تھے۔ نالی کی نم آلود ہوا میں راحت و آرام کا ایک بے نام احساس اس کے سارے وجود میں سرایت کرگئی۔ مردہ اور زندہ مختلف اشیاء کی بو، اس کے نتھنوں میں تازہ ہونے لگیں۔ ان بوؤں نے اس کے دماغ میں وہ یادیں تازہ کردیں جو کہیں بہت دور رہ گئی تھیں۔

جو کبھی وہ ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھتا۔ اس کے اندر وجدانی طور پر کچھ ترنگیں جاگ اٹھتی تھیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے دماغ میں پرانی یادوں کا ایک طوفان امڈ آتا تھا۔ مگر اس بار یہ احساس قوی تھا کہ یوں لگتا جیسے کوئی نامعلوم آواز اسے حرکت پر ابھار رہی ہے۔ اچھل کود پر مجبور کررہی ہے۔ اس کی طبیعت بڑی شدت سے چاہ رہی تھی کہ وہ ان ہرے بھرے کھیتوں میں اچھلتا کودتا اور دوڑتا بھاگتا پھرے۔

اس کا یہ احساس موروثی تھا کیونکہ اس کے تمام اجداء نے اس کا چستانی چڑاگاہوں اور ہرے بھرے جنگلوں کی کھلی جگہوں میں پرورش پائی تھی۔ مگر اب اس کا سارا بدن اسی طرح دکھ رہا تھا کہ وہ حرکت بھی نہیں کرسکتا تھا۔ ایک کربناک احساس جس میں نقاہت و بے ہوشی کی آمیزش تھی۔ اس پر چھانے لگا۔ بھولے ہوئے اور گمشدہ احساسات کا ایک پورا سلسلہ اس کے تصور میں متحرک ہوگیا۔

کبھی اس کی زندگی کی حدود و قیود اور ضروریات و احتیاجات مختلف تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو اپنے آقا کی آواز اور بلاوے کا پابند کر رکھا تھا۔ اپنے آقا کے مکان سے اجنبی کتوں کو دور رکھنا اس کا کام تھا۔ اپنے آقا کے بچے کے ساتھ کھیلنا اس کا مشغلہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ شناسا اور معروف لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا ہے اور اجنبیوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے۔ اسے وقت پر خوراک ملتی تھی اور اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا آقا کب اسے پیار سے سہلائے گا!

لیکن اب یہ تمام حدود و قیود اٹھ چکی تھیں۔ اب اس کی تمام زندگی سمٹ کر خوراک کے لئے ایک جستجوئے مسلسل رہ گئی تھی۔ یہ خوراک اسے کوڑے کے ڈھیروں کی ارزاں و ترساں تلاش کے بعد ہاتھ آتی تھی۔

سارا دن مار کھاتے رہنا اس کا مقدر ہوگیا۔ روتے اور چیختے چلانے کے سوا اس کے پاس اپنے بچاؤ کا اور کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔

ایک وقت تھا جب وہ دلیر، بے خوف، صاف ستھرا اور زندگی سے بھرپور ہوتا تھا۔ مگر اب وہ زرد و لاغر، ڈرا سہما اور دوسروں کے لئے مشغلہ ایذا رسانی ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے اعصاب بے جان سے ہوگئے تھے۔ اگر وہ کوئی آواز سن لیتا یا اس کے قریب کوئی چیز حرکت کرتی تو وہ خوف سے تقریباً اچھل پڑتا تھا اور پھر اس کا کمزور وجود دیر تک کانپتا رہتا تھا۔

اسے تو اپنی آواز سے بھی خوف آنے لگا تھا۔ وہ غلاظت کا عادی اور کوڑے کرکٹ سے مانوس ہوگیا تھا۔ اس کے بدن میں خارش ہوئی تھی اور اس کے اندر یہ حوصلہ نہ تھا کہ جوؤں کا شکار کرسکے اور نہ اس کے اندر اتنی طاقت نفس ہی رہ گئی تھی کہ اپنے بدن کو اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کرلے۔ وہ تو یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کا ایک جزو بن گیا ہے۔ اس کے اندر کوئی چیز مرگئی تھی۔ خاموش ہوگئی تھی!

اسے اس جہنم زار میں آئے دو سردیاں ہوگئی تھیں اور اس تمام عرصے میں اسے ایک مرتبہ بھی پیٹ بھر کر خوراک کھانے کا موقع میسر نہیں آیا تھا اور نہ وہ آرام کی نیند سویا تھا۔ اس کے جذبات و احساسات کا جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔ کسی شخص نے اس کے سر پر محبت اور شفقت سے ہاتھ نہیں پھیرا تھا۔ کسی نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ اگرچہ اس جگہ کے لوگ ظاہری طور پر اس کے آقا سے مشابہت رکھتے تھے مگر اس کے آقا کے جذبات و احساسات اور اخلاق و کردار اور ان لوگوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جن لوگوں کو وہ قبل ازیں جانتا تھا وہ اس

کی اپنی دنیا سے نزدیک تر تھے۔ وہ اس کے درد و کرب اور جذبات، احساسات کو بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اور انہوں نے اسے اپنی حمایت اور پناہ میں لے رکھا تھا۔ ان بوؤں میں اسے جو اس کے نتھنوں تک پہنچتی تھیں، سب سے زیادہ وہ بو اس کے دماغ پر اثر انداز ہوتی تھی جو کبھی کھیر بیچنے والے لڑکے کے برتن سے اٹھتی تھی۔ وہ سفید سفید مائع اس کی ماں کے دودھ سے اس حد تک مشابہ تھا کہ اس سے اس کے ذہن میں اپنے زمانہ شیر خوارگی کی یادیں تازہ ہونے لگتی تھیں۔

یکا یک وہ جیسے سن ہو کر رہ گیا۔ اسے وہ وقت یاد آنے لگا جب وہ ایک چھوٹا سا پلا ہوتا تھا اور اپنی ماں کے پستانوں سے گرم گرم اور تقویت بخش مائع پیا کرتا تھا۔ اور اس کی ماں کی مضبوط زبان بدن کو چاٹ چاٹ کر صاف کیا کرتی تھی۔ اس کے نتھنوں میں وہ تند و تیز بو در آئی جو اس کی ماں کی آغوش سے اور اس کے بھائی کے جسم سے آتی تھی۔ جب وہ شکم سیر ہو کر دودھ پی چکتا تھا۔ تو اس کا بدن گرم اور سکون پذیر ہوتا تھا۔ ایک سیال حرارت اس کے رگ و پے میں دوڑنے لگتی تھی۔ ایسے میں اس کا سر بھاری ہو کر اپنی ماں کے پستانوں سے الگ ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد اس پر گہری نیند طاری ہو جاتی تھی۔ جو اپنے اندر ایک عجیب لذت بخش احساس لئے ہوتی تھی۔ اور یہ احساس اس بنا پر تھا کہ زندگی کا چشمہ اس کے قریب اور اس کی دسترس میں ہے اور یہ چشمہ کبھی ختم نہ ہونے والا ہے۔

اس کے بھائی کا کھریا مٹی کی سی رنگت کا بدن، اس کی ماں کی آواز یہ سب کچھ اس کے ذہن میں کسی قیمتی خزانے کی طرح محفوظ تھا۔ اسے اپنا پرانا چوبی تازہ خانہ بخوبی یاد تھا۔ وہ کھیل اچھی طرح یاد تھے۔ جو وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر اس باغیچے میں کھیلا کرتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کے جھکے ہوئے کانوں کے سرے اپنے دانتوں سے کاٹ کھاتا تھا۔ وہ دونوں زمین پر گر پڑتے تھے۔ اور دوبارا اٹھ کر پھر دوڑنے بھاگنے لگتے تھے۔ پھر اسے کھیلنے کے لئے ایک اور ساتھی مل گیا۔ یہ اس کے آقا کا بیٹا تھا۔ باغ کے سرے پر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا کرتا تھا۔ بھونکتا تھا اور اس کے لباس کو اپنے دانتوں سے پکڑ لیتا تھا۔

وہ اپنے آقا کا پیار اور شفقت سے سہلانا کبھی نہیں بھول سکتا تھا اور نہ اسے قند کی وہ ڈلیاں بھول سکتی تھیں۔ جو اس کے آقا نے اسے خود اپنے ہاتھ سے کھلائی تھیں۔ نہیں کبھی نہیں، مگر وہ اپنے آقا کے بیٹے کے ساتھ اور بھی زیادہ پیار کرتا تھا کیونکہ وہ اس کا کھیل کا ساتھی تھا اور کبھی اسے مارتا پیٹتا نہیں تھا۔

پھر کچھ عرصہ بعد اس کی ماں اور بھائی نہ جانے کدھر چلے گئے تھے اور وہاں صرف اس کا آقا، آقا کا بیٹا، آقا کی بیگم اور ان کا بوڑھا نوکر رہ گیا۔ وہ ان میں سے ہر ایک کی انفرادی جو کہ واضح طور پر پہچانتا تھا۔ اور ہر ایک کے قدموں کی چاپ کو دور ہی سے پہچان لیتا تھا۔

دوپہر یا شام کے وقت جب سب کھانے کی میز پر بیٹھتے تھے۔ تو وہ میز کے گرد چکر لگاتا مختلف کھانوں کی بو سونگھتا پھرتا تھا۔ اور بعض اوقات آقا کی بیگم آقا کی احتجاج کے باوجود کسی بہترین کھانے کا لقمہ اس کی طرف پھینک دیتی تھی۔ پھر بوڑھا نوکر آجاتا تھا، اسے ٹائیگر ٹائیگر کہہ کر پکارتا اور اس کی خوراک ایک خاص برتن میں ڈال دیتا تھا جو اس کے چوبی تازی خانہ کے قریب پڑی ہوتی تھی۔

ٹائیگر کی مصیبتوں کا آغاز اس وقت ہوا جب اس کے مستی کے دن آئے کیونکہ اس کا آقا اس بات کا روادار نہیں تھا کہ وہ گھر سے باہر جائے۔ ایک روز اس کا آقا دو دیگر افراد کے ساتھ جنہیں ٹائیگر بخوبی پہچانتا تھا اور جو اکثر اس کے آقا کے گھر آیا کرتے تھے۔ ایک کار میں بیٹھا اور کار میں ٹائیگر کو ان دونوں کے ساتھ بیٹھایا ٹائیگر قبل ازیں کئی مرتبہ اپنے آقا کے ساتھ کار میں بیٹھ چکا تھا مگر اس بار اس کی طبیعت ایک خاص ہیجان، ایک خاص اضطراب کی گرفت میں تھی۔

چند گھنٹے کے سفر کے بعد وہ عین اسی چوک میں اترے۔ اس کا آقا اور دونوں آدمی اسی گلی میں آئے جو

مینار کے قریب سے گزرتی تھی مگر اچانک ٹائیگر کے نتھنوں سے ایک بوٹکرائی اور اس بو نے اسے ایک بارگی دیوانہ سا کر دیا۔ اس نے اس بو کا پیچھا کیا اور اس بو کا پیچھا کرتے ہوئے بالآخر ایک نالی کے راستے ایک باغ میں جا پہنچا۔

شام کے قریب اس نے دوبارہ اپنے آقا کو اسے پکارتے سنا۔ ''ٹائیگر ٹائیگر'' کیا واقعی اس کے آقا کی آواز تھی۔ یا اس آواز کی صدائے بازگشت تھی۔ ٹائیگر یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کیونکہ وہ دل سے یہی چاہتا تھا کہ یہ آواز واقعتاً اس کے آقا کی آواز نہ ہو۔ اس کے آقا کی آواز اس کے لئے ہمیشہ عجیب و غریب اثر کی حامل ہوتی تھی۔ یہ ایک طرح سے اسے اس کے فرائض کی یاددہانی کراتی تھی۔

مگر ایک ایسی قوت جو اور سب قوتوں سے بالاتر تھی اسے ہر شے سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس کے کان تمام بیرونی آوازوں کے لئے جیسے بہرے ہو گئے تھے۔ وہ اندرونی طور پر شدید ہیجان محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اعصاب، اس کے عضلات، اس کے احساسات، اس کے اپنے تابع نہیں رہے تھے۔ زندگی کے اس نئے اور انوکھے تجربے کے سامنے وہ بے بس تھا، مگر یہ سب کچھ عارضی تھا۔ باغ کا مالک اور اس کے آدمی ڈنڈے اور بیلچوں کے دستوں کے ساتھ اس کی طرف لپکے اور اسے مار کر اسی نالی کی راہ سے باغ سے باہر نکال دیا جس سے وہ باغ میں داخل ہوا تھا۔ ٹائیگر باغ سے باہر آیا۔ اب وہ گھبرایا ہوا بھی تھا اور شرمندگی بھی محسوس کر رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی طبیعت ہلکی پھلکی تھی اور ایک طرح کی راحت کا احساس اس کے حواس پر چھا رہا تھا۔ وہ پھر حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا اور اپنے آقا کو تلاش کرنے لگا۔ بعض عقبی کوچوں میں اسے اپنے آقا کی خفیف سی بو محسوس ہوتی تھی۔ اس نے اس کا بڑی دقت سے معائنہ کیا اور فاصلے فاصلے پر خود اپنی بو بھی چھوڑتا تھا۔ اس نے آبادی کے باہر کھنڈرات کا بھی جائزہ لیا۔ پھر وہ دوبارہ واپس آ گیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کا آقا چوک

ڈاکٹروں، حکیموں اور ماہرین طب کی ہدایات سے لکھی گئی مفید کتاب

دل کی بیماریاں

قیمت -/100 روپے

اس کتاب میں، دل کی دھڑکن، خون کے دباؤ کی زیادتی، شریانوں کی سختی و ہائی بلڈ پریشر، غذائی 5 تبدیلیاں جو آپ کی زندگی بدل دیں گی، دل کی جڑیں دماغ میں ہیں، بچپن کی تلخیاں اور ہارٹ اٹیک، مرض دل کا سن کر اوسان خطا نہ کریں، دل کا دورہ زندگی بچائے، خواتین میں ہارٹ اٹیک کی علامات، غصے سے بچیں دل کے دورے سے بچیں بچوں میں دل کی بیماریاں، بائی پاس سرجری اور فرائیڈ چکن، ایمرجنسی تدابیر، صحت مند دل کے لئے دس قیمتی مشورے، امراض قلب کا نباتاتی علاج، پیدل چلنے کے فوائد، دل کی دھڑکن بڑھنے کا غذا سے علاج، دل کی جلن کا غذا سے علاج، دل کے غلاف کی سوجن، ورم غلاف القلب پیری کارڈائیس، دل کی سوجن، ورم قلب، دل کی عضلہ کی سوجن کارڈائیس۔ اور بہت سی دل کی بیماریوں کے بارے میں جانئے اور ان کا علاج گھر بیٹھے کیجئے۔

حکیم غلام مصطفےٰ

دعا بک کارنر نشی محلہ گلی نمبر 5 امین پور بازار فیصل آباد

میں واپس آ گیا ہوگا۔ مگر چوک میں اس کے آقا کی خفیف سی بو گم ہوچکی تھی۔

کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا آقا اسے یہاں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔ خوف آمیز اضطراب اس کے حواس پر چھانے لگے۔ وہ اپنے آقا کے بغیر۔ کیسے زندگی بسر کرسکتا ہے۔ اس کا آقا ایک طرح سے اس کا مسیحا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا آقا آئے گا اور تلاش کرے گا مگر خوف و ہراس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا خوفزدہ ہوکر اس نے کئی سڑکوں کے چکر لگائے مگر بے سود سب بے سود!

رات ہوئی تو تھکا ماندہ اور مایوس ٹائیگر چوک میں واپس آ گیا۔ اس کے آقا کا اب بھی کوئی پتا نہ تھا۔

اس نے آبادی کے کئی چکر اور لگائے اور بالآخر اس نالی تک پہنچا جو باغ کے اندر جاتی تھی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر اور زیادہ حیران اور مایوس ہوا کہ باغ کے مالی اور اس کے آدمیوں نے پتھر سے نالی کو بند کردیا ہے۔ اس نے جوش میں آ کر زمین کھودنا شروع کردی تا کہ باغ کے اندر جانے کے لئے کوئی سوراخ بنا سکے مگر یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اور جب اس نے دیکھا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے تو تھکا ماندہ وہیں پڑ کر سو رہا۔

آدھی رات کے وقت ٹائیگر کے اپنے خوابوں میں رونے کی آواز نے اسے جگادیا۔ ہراساں ہوکر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کئی گلی کوچوں کے چکر لگائے۔ دیواروں کو سونگھا اور ادھر ادھر سرگرداں پھرتا رہا۔

اسے سخت بھوک محسوس ہورہی تھی اور جب وہ چوک میں واپس آیا تو مختلف کھانوں کی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ رات کے بچے ہوئے گوشت کی بو تازہ نان کی بو۔ دہی کی بو اس پر مسلط ہوگئی تھیں۔

اس حال میں وہ سوچ رہا تھا کہ اسے ان لوگوں سے خوراک کی بھیک مانگنی چاہئے۔ جو ظاہراً اس کے آقا کی طرح نظر آتے ہیں۔ اور اگر خوش قسمتی سے اس کا کوئی رقیب کتا ایسا نہ ہوا جو اسے بھگادے تو شاید ان لوگوں میں سے کوئی جو اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں لئے ہوئے ہیں۔ اس کے حال پر ترس کھالے۔

بڑی احتیاط سے اور ڈرتے ڈرتے وہ نانبائی کی دکان کی طرف بڑھا جو ابھی تک کھلی تھی۔ پکے ہوئے خمیر کی تیز بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ایک آدمی جو بغل میں نان دبائے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر پکارا۔

''آؤ! آؤ۔''

یہ آواز اس کے کانوں کو کتنی عجیب معلوم ہورہی تھی، اجنبی نے گرم نان کا ایک ٹکڑا اس کی طرف پھینکا۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد ٹائیگر نے نان کا وہ ٹکڑا کھالیا۔ اور اس اجنبی کے سامنے دم ہلانے لگا۔ اس شخص نے اپنا نان دکان کے چبوترے پر رکھا اور پھر جھجکتے ڈرتے بڑی احتیاط سے ٹائیگر کا سر سہلایا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے گلے میں پڑا ہوا پٹا اتار لیا۔

ٹائیگر کو یوں لگا جیسے اس کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ جیسے اس پٹے کے اترنے کے ساتھ اس کی گردن تمام حدود و قیود تمام ذمہ داریوں اور تمام فرائض کے بار سے آزاد ہوگئی ہے مگر جب وہ دوبارہ دم ہلاتے ہوئے نانبائی کی دکان کی طرف بڑھا تو بھاری بوٹ کی ایک زوردار ٹھوکر نے اس کے پہلو کی تواضع کی اور بلبلاتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

ٹائیگر اپنے اس پٹے کو اب بھی پہچانتا تھا جو ہنوز اس دکان کے سامنے آویزاں تھا۔ اس روز کے بعد سے ٹھوکروں، پتھروں اور ڈنڈوں کی زوردار ضربوں کے سوا ٹائیگر کو ان لوگوں سے اور کچھ نہیں ملا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کے جانی دشمن ہیں اور اسے ستانے اور ایذا دینے میں خاص لطف محسوس کرتے ہیں۔

ٹائیگر کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک نئی دنیا میں آ گیا ہے۔ یہ دنیا اس کی اپنی دنیا نہیں تھی اور اس دنیا میں ایسا ایک بھی فرد نہیں تھا جسے ٹائیگر کے جذبات و احساسات اور افتادِ طبع کا ادنیٰ سا خیال بھی ہوتا۔

پہلے چند روز اس نے بڑی مشکل سے گزارے مگر وقت گزرنے کے ساتھ وہ عادی ہوتا گیا۔ علاوہ ازیں اس نے گلی کے موڑ پر دائیں طرف ایک جگہ بھی معلوم

کرلی تھی جہاں لوگ اپنے گھروں کا کوڑا کرکٹ پھینکتے تھے اور جہاں سے وہ کوڑے کو کرید کر بعض خوش ذائقہ چیزیں مثلاً ہڈیاں، چربی، کھال، مچھلیوں کے سر اور بہت سی ایسی دیگر اشیا حاصل کرلیتا تھا۔ جن کی اسے پہچان بھی نہیں تھی۔ باقی کا دن وہ نانبائی اور قصاب کی دکان کے سامنے گزارتا تھا۔ اس کی نگاہ قصاب کے ہاتھوں پر جمی رہتی تھیں مگر اسے گوشت کے ٹکڑے کم ملتے تھے۔ مار زیادہ پڑتی تھی۔ اور ہوتے ہوتے اس نے بھی اپنے نئے طریق زندگی سے سمجھوتہ کرلیا تھا۔

مگر جس ایک چیز نے ٹائیگر کو سب سے زیادہ مضطرب اور بے چین کر رکھا تھا وہ اس کی یہ خواہش تھی کہ کوئی اسے پیار کرے، پیار اور شفقت کے ساتھ اس کے سر اور بدن پر ہاتھ پھیرے۔ وہ ایک ایسے بچے کی مانند تھا جسے ہر وقت ڈانٹ پھٹکار پڑتی ہو، جو مسلسل گالیاں سنتا اور مار پیٹ سہتا ہو۔ مگر اس کے باوجود اس کے لطف و نازک احساسات زندہ ہوں۔ خاص طور پر اپنی اس درد و کرب سے لبریز زندگی میں اس کی یہ احتجاج کچھ اور شدت اختیار کرگئی تھی۔ وہ ایک محبت بھری نگاہ اور ایک شفقت بھرے ہاتھ کے لمس کے لئے مرا جارہا تھا۔

اس کی نگاہیں اس محبت و شفقت کے لئے سراپا سوال تھیں۔ اور وہ اس پہلے شخص کے لئے جان تک دینے کو تیار تھا۔ جو اس کے حال پر مہربان ہو۔ جو محبت و شفقت سے اس کے سر کو سہلائے۔ وہ اس بات کا شدت سے آرزومند تھا کہ کسی نہ کسی کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کرے۔ اور اس کے لئے اپنی جان تک قربان کردے۔ وہ پرستش اور وفاداری کے اس اظہار کے لئے بے تاب تھا مگر کسی کو اس کی ذرا پرواہ نہ تھی۔ وہ جن آنکھوں میں جھانکتا تھا۔ وہاں اپنے لئے عداوت اور کینہ و شرارت کے سوا کچھ نہ پاتا تھا۔ وہ ان لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لئے جو حرکت بھی کرتا تھا۔ وہ ان کے غیظ و غضب کو مزید دعوت دینے کا سبب بنتی تھی۔ جب ٹائیگر نالی کے اندر شب بسری کرتا رہا ہوتا تو بار بار روتا اور کراہتا۔ اس کے رونے کی آواز کئی بار خود اسے نیند سے یوں جگادیتی جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔

اس وقت ٹائیگر شدید بھوک محسوس کررہا تھا۔ فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی بو تیر رہی تھی۔ بھوک کی شدت سے اس کی انتڑیاں بل کھارہی تھیں۔ بھوک کا یہ احساس اس قدر شدید اور جان لیوا تھا کہ وہ اپنی نقاہت اور اپنے ہر درد و کرب کو بھول کر بصد وقت تمام اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور ایک ایک قدم بڑی زحمت سے اٹھاتا ہوا چوک کی طرف چل دیا۔

اور عین اس وقت ایسا ہوا کہ ایک کار شور مچاتی اور اپنے پیچھے گرد و غبار کا طوفان اٹھاتی میدان ورامین کے چوک میں داخل ہوئی۔

کار رکی تو اس میں سے ایک آدمی باہر آیا۔ ٹائیگر کی طرف بڑھا اور اس کا سر سہلانے لگا۔ یہ اس کا آقا نہیں تھا۔ ٹائیگر اتنی آسانی سے دھوکا کھانے والا نہیں تھا۔ وہ اپنے آقا کی بو کو اچھی طرح جانتا اور پہچانتا تھا۔

مگر یہ آدمی اسے پیار کیوں کررہا تھا۔ ٹائیگر نے اپنی دم ہلائی اور مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ کہیں اسے دھوکا نہیں دیا جارہا تھا۔ مگر نہیں، اب تو اس کی گردن میں ایسا کوئی پٹا نہیں تھا جسے اتارنے کی خاطر اس سے پیار کرنے کا ڈھونگ رچایا جاتا۔ وہ آدمی دیوار کے قریب ایک میز پر بیٹھ گیا۔ اس کے لئے تازہ نان، دہی، انڈے اور دیگر کھانے آ گئے۔ اس آدمی نے نان کے ٹکڑے دہی میں تر کئے اور اپنے سامنے نیچے پھینک دیا۔ پہلے تو ٹائیگر انہیں جلدی جلدی ہڑپ کرنے لگا مگر پھر سنبھل کر اطمینان سے کھانے لگا۔

اس کے ساتھ ہی اس کو خوب صورت سبز آنکھیں عجز و انکسار اور سپاس و تشکر کے جذبات سے لبریز اس آدمی کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ برابر دم ہلائے جارہا تھا۔

یہ خواب تھا یا عالم بیداری؟ ناقابل یقین طور پر اس نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا اور یہ ممکن تھا کہ اسے ایک نیا آقا مل گیا ہے۔ گرمی کے باوجود وہ آدمی اٹھا اور اس گلی میں ہولیا جو مینار کی طرف جاتی تھی۔ وہاں پہنچ کر

وہ پہلے تو کچھ جھجکا اور پھر پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتا ہوا ان کھنڈروں میں پہنچ گیا جن کی کچھ دیواریں سلامت تھیں۔ ٹائیگر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔

اس کا آقا بھی تو ان کھنڈروں میں آتا تھا۔ ٹائیگر ایک دیوار کے سائے میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک مختلف راستے سے چوک میں واپس آ گئے۔ وہاں پھر اس آدمی نے ٹائیگر کا سر اور بدن تھپتھپایا اور چوک کا ایک چکر لگانے کے بعد آ کر پھر ایک ایسی کار میں بیٹھ گیا جسے ٹائیگر پہچانتا تھا۔ ٹائیگر کو یہ حوصلہ نہ ہو سکا کہ کار کے اندر جا چڑھے۔ وہ کار کے پاس بیٹھ گیا اور اس آدمی کی طرف دیکھنے لگا۔

یکا یک کار اپنے پیچھے گرد و غبار چھوڑتی ہوئی روانہ ہوگئی اور ٹائیگر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اس کار کے پیچھے دوڑنے لگا۔ اسے پہلے ہی کافی سبق مل چکا تھا۔ اب وہ اپنے محسن کو دوبارہ ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا تمام بدن درد کر رہا تھا۔ اس کے باوجود اپنی زبان باہر نکالے چھلانگیں لگاتے ہوئے کار کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ کار آبادی سے نکل آئی تھی اور اب ایک صحرا سے گزر رہی تھی۔ دو تین بار ٹائیگر دوڑتے ہوئے کار سے آگے نکل گیا۔ مگر پھر کار آگے نکل جاتی اور وہ پیچھے رہ جاتا۔

مایوسی نے اسے اپنی تمام قوتیں مجتمع کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ بڑی چھلانگیں لگاتا ہوا کار کے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ مگر کار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ وہ اس سے مل نہیں سکتا تھا۔ اور دوڑتے رہنے سے اسے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی۔ نقاہت اور ضعف کی ایک شدید لہر اسے اپنے معدے سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی اور ایک دم اسے احساس ہوا کہ اس کے اعضا اب مزید اس کے حکم کی تعمیل کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ ذرا سی حرکت بھی نہیں کر پا رہا تھا۔

اس کی تمام سعی بیکار تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں کار کے پیچھے بھاگا تھا اور کہاں جا رہا تھا۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ واپس ہو سکتا تھا۔ وہ وہیں ٹھہر گیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی زبان باہر کو نکلی پڑ رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ اپنے جھکے ہوئے سر کے ساتھ اور بڑی کوشش سے اس نے اپنے آپ کو سڑک کے درمیان سے کھینچا اور سڑک کے کنارے اپنے نحیف و نزار بدن کو گرم اور مرطوب ریت پر گرا دیا۔

اپنے اس وجدان کی بنا پر جس نے کبھی اس سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ٹائیگر کو یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس جگہ سے کبھی نہیں ہل سکے گا۔ درد کی ایک شدید لہر نے اس کے پیٹ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور ایک زرد زرد اور اداس اداس روشنی اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

درد و کرب کی شدت سے بل کھاتے ہوئے اس کے ہاتھ پیر بے حس ہوتے جا رہے تھے۔

اور پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہوگیا۔

دوسرے دن میونسپل کی گاڑی اسے اٹھا کر لے گئی اور گڑھا کھود کر اسے منوں مٹی تلے دبا دیا گیا۔ اور دکانداروں کو پتہ نہ چلا اور پھر چوتھی رات آئی تو ان دکانداروں کی نیندیں حرام ہوگئیں جو کہ ٹائیگر کو حقارت سے دیکھتے مارتے پیٹتے، ٹائیگر کی بھونکنے کی آواز نے ان کا جینا دوبھر کر دیا۔ آوازیں صرف انہیں ہی سنائی دیتی تھیں، کسی اور کو نہیں۔

دو روز تو انہوں نے اپنا وہم سمجھا مگر تیسرے دن سب کے سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ سب اب حتمی بات پر پہنچے کہ ٹائیگر آدھی رات کے وقت آتا ہے اور بھوک کی وجہ سے اودھم مچانے لگتا ہے تو کیوں نہ ہم رات میں اس کے کھانے کے لئے کچھ رکھ دیا کریں اور پھر انہوں نے ایسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ تو ٹائیگر کے بھونکنے کی آواز ختم ہوگئی۔ مگر جس رات وہ کچھ نہ رکھتے تو ان کی نیند حرام ہو جاتی۔

اور پھر وہ رات اور آج کی رات، بلاناغہ وہ روزانہ رات میں ٹائیگر کے لئے کچھ نہ کچھ رکھ دیتے ہیں۔

لوگوں کا کہنا ہے کہ ٹائیگر کے روپ میں کوئی بلا ہے جو کہ آ کر چیزیں کھاتی ہے۔

خونی خزانہ

ملک این اے کاوش۔ سلانوالی سرگودھا

اچانک ایک جانور سامنے آیا اس کا منہ کتے کی مانند اور جسامت کسی گدھے کے برابر تھی اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی اور وہ آنکھوں سے کئی گنا بڑی تھی۔

حرص و لالچ کے گرداب میں ڈولتی اور دماغ پر سکتہ طاری کرتی..... تحیر انگیز کہانی

تینوں دوست نقشہ سامنے میز پر رکھے سر جوڑے پریشان بیٹھے تھے۔ علی اور حیدر بضد تھے کہ نقشہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جبکہ عثمان متواتر انہیں سمجھا رہا تھا کہ نتیجے تک پہنچنے سے قبل ہی اجل اچک لے جائے گی لیکن دونوں دوستوں کی ضد اپنی جگہ برقرار تھی۔ وہ اس نادر موقع کو گنوانا نہیں چاہتے تھے جبکہ نجانے کیوں عثمان ایسی باتیں کر رہا تھا جس سے ان کے حوصلے پست ہو رہے تھے۔

”میں نے خود پتہ لگوایا ہے۔ یہ خزانہ جس غار کے اندر ہے۔ اس سے پہلے ایک گھنے جنگل سے گزرنا پڑتا ہے۔“ عثمان نے انہیں بتایا۔

”اس جنگل کی طرف جو بھی گیا ہے آج تک واپس نہیں آیا کیونکہ سننے میں آیا ہے کہ اس جنگل میں آدم خور موجود ہیں۔ یہی نہیں کچھ لوگوں سے تو یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ وہاں جن بھوتوں کا بھی بسیرا ہے۔ تمہیں پتہ ہونا

چاہیے کہ خزانوں کی حفاظت ہمیشہ ناگ کرتے ہیں۔اگر ہم ان عفریتوں سے بچ بھی گئے تو ان ناگوں سے کیسے بچیں گے؟"

"تمہاری باتیں سن کر یوں محسوس ہورہا ہے کہ جیسے تم ہماری دادی ہو اور ہمیں عمرو عیار کی کوئی کہانی سنا رہے ہو۔" علی بولا۔

"ایسی باتیں کر کے تم ثابت کیا کرنا چاہتے ہو۔کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں جل دے کر تم اکیلے ہی سارا خزانہ ہڑپ کرنا چاہتے ہو؟"

علی کی بات سن کر حیدر نے کھا جانے والی سوالیہ نگاہوں سے عثمان کو گھورا تو عثمان کا من چاہا کہ دونوں کا سر پھوڑ ڈالے۔

"واہ کیا بات کی ہے۔" عثمان نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

"تو تم لوگ یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ جھوٹ بول رہا ہوں؟"

"دیکھو عثمان۔" حیدر نے فیصلہ کن لہجے میں عثمان کو مخاطب کیا۔

"ہم لوگ یک مشت ہو کر جب جائیں گے تو کوئی روح، بدروح یا جن بھوت یا پھر ناگ ہمارا بال بھی بیکا نہیں کر پائے گا۔اور اگر کچھ سامنے آ بھی گیا تو یہ ہتھیار کس دن کام آئیں گے۔ہم اپنے ساتھ اپنی حفاظت کی خاطر آخر کچھ نہ کچھ تو لے کر ہی جائیں گے۔ ہم لوگ بہر صورت خزانہ حاصل کر کے لائیں گے اور ثابت کریں گے کہ ہم بہادر لوگ ہیں۔جنہوں نے جان جوکھم میں ڈال کر وہ خزانہ حاصل کیا ہے۔ اور ویسے بھی انسان بہت بہادر چیز ہے۔جن بھوت سمیت ہر چیز کو اپنا پابند بنانے کی شکتیاں رکھتا ہے۔"

"وہ لوگ اور ہیں۔" عثمان بے چارگی سے بولا۔"ہم لوگ اپنی قسمت نہیں بدل پا رہے ہر چیز کو اپنا پابند کیسے بنائیں گے؟"

"قسمت بدلنے کا وقت اب آ چکا ہے میرے بھائی۔" علی نے لقمہ دیا۔"اگر اس موقع سے ہم نے فائدہ نہ اٹھایا تو ممکن ہے کوئی اور ہی مستفید ہو جائے اور ہم دیکھتے رہ جائیں۔"

"لالچ بری بلا ہے۔" عثمان تنک کر بولا۔

"تم لوگ سمجھ کیوں نہیں رہے کہ خطرات سو فیصد ہیں اور بچنے کے امکان ایک فیصد بھی نہیں ہیں۔"

"مگر ہم اسے غلط ثابت کریں گے۔" علی نے عثمان کی بات سن کر کہا۔

"ہمت مت ہارو اگر آج نہیں تو کب۔آخر کب تک ہم لوگ غربت کی چکی میں پستے رہیں گے۔کیا ہمارے مقدر میں محرومیاں لکھی ہیں۔یاد رکھ لو میری بات۔ہم بہر صورت اس خزانے کی تلاش میں جائیں گے۔اور جس نے انکار کیا اس سے ساری زندگی کا رشتہ ناطہ ختم کر دیا جائے گا۔"

علی کی بات سن کر عثمان نے مجبوراً حامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا دل بری طرح سے گھبرا رہا تھا۔اس کے من کے مندر میں خوف کی گھنٹیاں پیہم بج رہی تھیں لیکن دوستوں کے سامنے انکار کر کے وہ خود کو بزدل نہیں کہلوانا چاہتا تھا۔اس لیے اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور اپنے دوستوں کے ساتھ جائے گا۔

☆.....☆.....☆

تین گھنٹے مسلسل سفر میں رہنے کی وجہ سے وہ کافی تھک چکے تھے۔گاڑی سے اترنے ساتھ ہی انہوں نے پہلے ایک ہوٹل سے جا کر ڈٹ کر کھانا کھایا۔کھانا کھانے کے بعد انہوں نے ویٹر سے چوک محل کا راستہ پوچھا تو اس نے حیرت سے انہیں گھورا۔

"وہاں کیا کرنے جا رہے ہو آپ لوگ؟" ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا راستہ بتا سکتے ہو؟" حیدر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" ویٹر بولا۔"لیکن مشورہ دوں گا یہیں سے واپس چلتے بنو۔جو بھی اس طرف گیا کبھی لوٹ کر واپس نہیں آیا۔"

"کیا راستہ بتا سکتے ہو؟" حیدر نے دوبارہ اپنے سوال پر زور دیتے ہوئے کہا تو ویٹر نے انہیں راستہ سمجھا دیا۔

بل ادا کر کے تینوں دوست ہوٹل سے باہر نکلے۔علی

اور حیدر جانتے تھے کہ عثمان بہت کچھ ان سے کہنا چاہتا ہے لیکن باوجود کوشش کے وہ چپ ہے کیونکہ اب اتنا سفر کر کے واپس چلنے کے لیے کسی نے بھی تیار نہیں ہونا تھا۔اس لیے دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا کہ عثمان کی ڈھارس بندھائی جائے کہیں ایسا نہ ہو کہ منزل کے قریب پہنچنے تک اس کی جان ہی نہ نکل جائے کیونکہ جو اس کی حالت تھی۔اسے دیکھ کر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ اگر اس کے بس میں ہو تو وہ الٹے قدموں بجلی کی سرعت سے دم دبا کر بھاگ جائے گا۔

"زندگی کتنی خوشگوار ہو جائے گی اگر ہم لوگ کامیاب لوٹے تو؟" حیدر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اگر لوٹے تو؟" عثمان بالآخر بول پڑا اور اس کی بات سن کر دونوں نے اسے کھا جانے والے انداز میں گھورا۔

"یار کیا منہ لٹکایا ہوا ہے؟" علی پیچ و تاب کھا کر بولا۔

"اس سے تو بہتر ہے کہ تم نہ ہی ہمارا ساتھ دو۔ بجائے ہماری ڈھارس بندھانے کے ہمیں الٹا ڈرانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہو۔"

جواباً عثمان نے چپ دھار لی۔جلد ہی وہ ایک گھنے جنگل کے سامنے پہنچ گئے۔جنگل دور سے ہی بڑا عجیب دکھائی دے رہا تھا۔اس کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر تینوں کے جسموں میں سرایت کر گئی۔لیکن تینوں نے اپنی کیفیت ایک دوسرے پر واضح نہ ہونے دی۔جنگل کے اندر گھپ اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔حالانکہ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی کرنیں جنگل کے اندر داخل نہیں ہو پا رہیں۔تینوں کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگی تھیں۔

"ہماری منزل ہم سے کچھ فاصلے پر ہے۔" عثمان گویا ہوا تو دونوں نے حیرت سے اسے گھورا۔"یہاں کھڑے ہو کے سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔جب یہاں تک آ ہی گئے ہیں۔تو اب یہاں کھڑے ہو کر آگے کے حالات سے آگاہی ممکن نہیں ہے۔سر پر بندھے کفن کس لو اور چلو۔"

"تھینک یو۔" علی نے عثمان کے گلے لگ کر کہا۔

"تم لوگ میرے لیے بھائیوں کی طرح ہو۔تمہیں مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔اگر ہم جیئیں گے تو ایک ساتھ اور مریں گے تو ایک ساتھ۔"

دونوں دوستوں نے اس کی بات کی تصحیح کی اور تینوں جنگل کے اندر داخل ہو گئے۔دیو قامت اور گھنے درختوں نے جنگل کے اندر گھپ اندھیرا پیدا کیا ہوا تھا۔ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ پڑتا تھا۔تھوڑی دیر تک تو تینوں دوست ایک ہی جگہ بت بنے کھڑے رہے لیکن جلد ہی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئے تو تینوں نے ایک دوسرے کی ڈھارس بندھاتے ہوئے آگے قدم بڑھائے۔

ابھی انہوں نے بمشکل تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا ہو گا کہ یکدم انہیں یوں لگا جیسے ان کے پیچھے کوئی چیز گری ہو۔

تینوں دوستوں نے ایک ساتھ سرعت سے مڑ کر پیچھے دیکھا تو اگلا منظر دیکھ کر تینوں کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ان کے سامنے ایک عجیب و غریب شکل کا جانور کھڑا انہیں گھور رہا تھا۔اس جانور کا منہ کتے کی مانند تھا لیکن جسامت کسی گدھے کے برابر تھی۔سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کی صرف ایک آنکھ تھی وہ بھی اس کے ماتھے کے اوپر۔اس کی آنکھ عام جانوروں کی آنکھ سے دوگنا بڑی تھی۔

اس کی زبان کتے کی مانند منہ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور اس سے پیہم رال ٹپک رہی تھی۔وہ جانور کھا جانے والی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا۔یوں لگ رہا تھا جیسے پلک جھپکتے میں وہ ان تینوں کو کچا چبا جانے کا مصمم ارادہ کر چکا ہو۔اس کی خونخوار اور چبھتی نگاہوں کا مطلب تینوں دوست اچھی طرح سے سمجھ چکے تھے۔

تینوں دوستوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔بدحواسی کے عالم میں تینوں نے پیچھے کی طرف ہٹنا شروع کر دیا۔علی اور حیدر کو پہلی بار اپنی ضد پر افسوس ہو رہا تھا۔عثمان نے ٹھیک ہی کہا تھا لیکن انہوں نے ضد کر کے اپنی جان مصیبت میں ڈال دی تھی۔

"بھاگو۔" یکدم عثمان چلایا اور جس کا منہ جس طرف لگا اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔

اس عفریت نے کھا جانے والی آنکھوں سے تینوں کی

طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے اس نے علی کے پیچھے بھاگنا شروع کردیا۔ علی اس بات سے یکسر نا آشنا تھا کہ موت اس کے اردگرد گھوم رہی تھی۔ زندگی کسے پیاری نہیں ہوتی۔ اپنی زندگی بچانے کے لیے اگر خون کی ندیاں بہانی پڑ جائیں تو انسان دریغ نہیں کرتا پھر یہاں تو یکدم ہی ہوس اور غربت کے مارے تین دوستوں کی جان شکنجے میں پھنس چکی تھی۔ اور جان بچانے کی غرض سے جس کا جدھر منہ لگا تھا۔ اس نے سرپٹ دوڑنا شروع کردیا تھا۔

علی مسلسل بھاگ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ وہ جلد از جلد اس خونی جنگل سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ دور سے ہی اسے روشنی کی مدھم مدھم سی لکیر دکھائی دینی شروع ہوگئی تھی۔ وہ جس قدر تیزی سے بھاگ سکتا تھا۔ جنگل سے باہر نکلنے کے لیے بھاگ رہا تھا۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ تبھی یکدم اسے رکنا پڑ گیا۔ کیونکہ جس طرف وہ دوڑ رہا تھا اس طرف سے یکدم سامنے سے وہ عفریت آچکا تھا۔ علی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ عفریت کو اپنے سامنے دیکھ کر علی نے ایک بار پھر مخالف سمت میں بھاگنا شروع کردیا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا کہ بے بسی اور بے چارگی کے باعث زور زور سے چلا چلا کر مدد مانگے لیکن وہ جانتا تھا کہ دور دور تک اس کی مدد کرنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے دوست بھی نجانے اسے چھوڑ کر کہاں نو دو گیارہ ہو چکے تھے۔ رہ رہ کر اسے دونوں دوستوں کی دوستی پر تاؤ چڑھ رہا تھا۔ خود تو الٹے قدموں بھاگ گئے تھے۔ اور اسے اس عفریت کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

ایک بار پھر علی کو چار و ناچار کنارا پڑا۔ عفریت ایک بار پھر اس کے سامنے آن وارد ہوا تھا۔ ویسے بھی اب اس میں بھی اتنی سکت نہ بچی تھی کہ مزید بھاگ سکتا۔ اس کا سانس اتنی تیزی سے چل رہا تھا کہ اس کی حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ پلک جھپکتے میں اس کے سینے میں دھڑکتا دل اس کی پسلیاں چیر کر باہر ہی نہ آن گرے۔

عفریت نے لپک کر علی کو پکڑا اور ہوا میں اچھالا ایک ساعت شکن چیخ علی کو حلق سے برآمد ہوئی اور جنگل کے سکوت زدہ ماحول کا سینہ چیرتی چلی گئی۔ علی جیسے ہی ہوا میں قلابازیاں کھاتا ہوا نیچے آیا۔ اس عفریت نے اسے دونوں پیروں سے پکڑ کر الٹا لٹکا لیا۔ علی اس عفریت کے ہاتھوں میں پنڈولیم کی طرح الٹا لٹکا ہوا تھا اور اس عفریت سے جان چھڑوانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا لیکن بے سود۔

دوسرے ہی لمحے اس عفریت نے وہ کردیا۔ جس کے بارے میں علی کو کبھی یقین نہیں تھا۔ اس عفریت نے علی کے دونوں پیروں سے پکڑ کر اسے دو حصوں میں منقسم کردیا۔ علی کے حلق سے آخری ساعت شکن درد میں ڈوبی ہوئی چیخ نکلی اور جنگل کی سکوت زدہ فضا کو ایک بار پھر اس چیخ نے ہلا کر رکھ دیا۔ اس عفریت نے اس کے جسم کے دونوں حصوں کو دائیں بائیں اچھال دیا۔ علی کے جسم کے دونوں حصے بری طرح سے تڑپ رہے تھے۔ خون کی بوندیں ہر سمت پھیلتی جارہی تھیں۔ اس کے بعد عفریت نے ایک بار پھر ایک طرف دوڑنا شروع کردیا۔

دوسری طرف عثمان پیہم دوڑ رہا تھا کہ یکدم کسی سے ٹکرا کر زمین پر جا گرا۔ گرتے ہوئے مدھم سی چیخ اس کے حلق سے نکلی۔ گرتے ہی وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا لیکن اگلا منظر دیکھ کر وہ کچھ مطمئن ہوا۔ اس سے ٹکرانے والا کوئی اور نہیں بلکہ حیدر تھا۔ قبل اس کے کہ دونوں آپس میں کوئی بات کرتے، علی کی چیخوں سے جنگل گونج اٹھا۔

"بھاگو۔" عثمان نے حیدر کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دوڑتے ہوئے کہا۔

"علی۔" حیدر نے بھاگتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔" عثمان دوڑتے ہوئے بولا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کے آگے پیچھے سرعت سے دوڑ رہے تھے۔ کافی دیر دوڑنے کے بعد جب عثمان نے مڑ کر دیکھا تو اس کے حواس باختہ رہ گئے کیونکہ حیدر اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ دو موٹے موٹے گہرہائے آبدار اس کی آنکھوں کے پٹ کھولتے ہوئے نیچے جا گرے۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کا دوسرا دوست بھی اس عفریت کا شکار ہو چکا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل

مسوس کر رہ گیا۔ ایک بار پھر اس نے رہی سہی ہمت یکجا کر کے اپنی جان بچانے کے لیے تیزی سے دوڑنا شروع کردیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ جلد ہی اسے روشنی دکھائی دینے لگ گئی۔ دوڑتے دوڑتے بالآخر وہ اس خونی جنگل سے باہر نکل آیا اور ایک چٹان پر بیٹھ کر تیز تیز سانس لینے لگا۔

اس کا سانس پھول چکا تھا۔ کافی دیر چٹان پر بیٹھ کر اس نے سانس بحال کیا اور جب کچھ سانس لینے میں بہتری آئی تو اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا رہ گئی۔ وہ اس غار کے دہانے کے سامنے بیٹھا تھا۔ جس کے اندر نقشے کے مطابق خزانہ تھا۔ جہاں اسے دوستوں کے بچھڑ جانے کا ملال تھا۔ وہیں اسے خزانہ ملنے کی خوشی بھی تھی۔

عثمان جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور غار کی طرف بڑھا۔ غار کے اندر سورج کی کرنیں جانے کی وجہ سے کافی اجالا تھا۔ عثمان آگے بڑھ رہا تھا کہ غار کے اندر جا کر تھوڑی ہی دور اسے بڑے بڑے لکڑی کے صندوق دکھائی دیئے۔ عثمان خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ وہ خزانے تک پہنچ چکا ہے۔ اس کا من چاہ رہا تھا کہ خوشی کے باعث چیخے چلائے اور دنیا کو بتائے کہ اس نے جان جوکھم میں ڈال کر آخر یہ معرکہ مار ہی لیا ہے۔ عثمان گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اپنی خوشی کو قابو میں کرنے کی سعی کرنے لگا اور ایک بار پھر جب وہ سیدھا کھڑا ہوا تو اگلا منظر دیکھ کر وہ انگشت بدنداں رہ گیا۔

عثمان کی نگاہ ایک صندوق پر کنڈلی مارے بیٹھے ایک ناگ پر پڑی۔ جس نے اپنا پھن پھیلایا ہوا تھا۔ عثمان کو اپنے جسم میں دوڑتا لہو منجمد ہوتا ہوا محسوس ہوا لیکن اس کی خوشی کا اس وقت کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جب اس نے سانپ کو باہر کی طرف نکلتے ہوئے دیکھا۔ جب ناگ غار سے باہر نکل گیا تو عثمان جلدی سے ان صندوقوں کی طرف بڑھا، جیسے جیسے وہ صندوقوں کے ڈھکنے اتار کے دیکھ رہا تھا ویسے ویسے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی جارہی تھیں۔ سارے صندوق لبالب ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے تھے۔ عثمان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سارے صندوق لے کر چلتا بنے۔

اس نے ایک صندوق کا آخر انتخاب کیا۔ اس کے اندر ہیرے جواہرات کا انبار لگا ہوا تھا۔ عثمان جانتا تھا کہ وہ اتنا خزانہ تھا کہ اس کی درجنوں نسلیں پاؤں پہ پاؤں دھر کر بیٹھ کر کھا سکتی تھیں۔ یہی نہیں اس خزانے کے عوض وہ ساری دنیا بھی خریدنا چاہتا تو یہ اس کے لیے قطعی مشکل امر نہ تھا۔ بڑی ہی مشکل سے عثمان نے اس صندوق کو اٹھا کر سر پر لادا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ عثمان کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ ذہن کے اندر وہ خود کو ایک شہزادے کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔ عثمان صندوق اٹھائے جیسے ہی غار سے باہر نکلا اگلا منظر دیکھ کر اس کے سارے سپنے کرچیاں کرچیاں ہو کر رہ گئے تھے۔

عثمان نے ایک ٹھنڈا مگر لمبا سانس خارج کیا اور سر پر لادا ہوا صندوق بڑی مشکل سے اتار کر زمین پر رکھا۔ اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے سامنے منظر ہی اتنا بھیانک تھا کہ اسے اپنی بھیانک موت مترشح دکھائی دے رہی تھی۔

سینکڑوں کی تعداد میں سانپ پھن پھیلائے اس کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ جنہیں دیکھ کر عثمان کو یوں لگا کہ جیسے واقعی اس نے ابھی تک جاگتی آنکھوں سے کوئی سپنا دیکھا ہو۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کرے تو کیا کرے۔ سانپ اسے ہر طرف سے بری طرح سے گھیر چکے تھے۔ سانپوں نے دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا تو اسے احساس ہوا کہ اب اس کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا ہے۔

عثمان نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"رکو میرے دوستو مجھے بھی ساتھ لیتے جاؤ، اب میں جان گیا ہوں کہ لالچ بری بلا ہے۔" آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے عثمان بولا اور پھر وہ خود کو موت کے سپرد کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:144

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

بلرام کے آدمی رجنی کو اٹھا کر ڈیرے پر لے آئے، اور اسے بستر پر ڈال دیا، پھر بلرام نے اشارہ کیا تو وہ باہر چلے گئے، اس کے بعد بلرام آگے بڑھا اور رجنی کے چہرے سے کپڑا ہٹادیا تو بلرام پر نظر پڑتے ہی رجنی ہکا بکا رہ گئی۔ وہ سکتے کے عالم میں بلرام کو دیکھے جارہی تھی۔ ادھر کمرے کے ایک کونے میں رجنی کا منگیتر رامو رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ رامو پر نظر پڑتے ہی جیسے رجنی چونک پڑی اس کے حواس ٹھیک ہوگئے اور جیسے ہی بلرام رامو کی طرف مڑا تو رجنی نے ایک موٹا ڈنڈا اٹھایا اور بلرام کے سر پر دے مارا، اس کے بعد دوڑ کر رامو کے سینے سے جا لگی۔ بلرام کے ہاتھ میں پستول تھا، پستول سے گولیاں چل گئیں تو دو گولیاں رجنی کو لگیں اور دو ہی گولیاں رامو کو لگیں تو دونوں موت کی آغوش میں چلے گئے، ان دونوں کی آتمائیں بلرام کو ہلکان کرنے لگیں اور اس کا چین سکون ختم کرکے رکھ دیا۔ بلرام کے گھر کے لوگ موت سے ہمکنار ہونے لگے۔ اور جب بلرام کی مصیبت بڑھی تو وہ رولوکا کے پاس آیا اور ساری کتھا کہہ سنائی۔ تو رولوکا بولا بلرام بابو آپ نے ظلم کی انتہا کردی خیر میں کوشش کروں گا کہ ان دونوں آتماؤں سے آپ کی جان چھوٹ جائے، مگر یہ نوبت نہ آئی، رامو اور رجنی کی آتماؤں نے بلرام کو موت سے ہمکنار کردیا۔ سلطان پور میں ایک پرائمری اسکول تھا اور جب آبادی بڑھی تو اس اسکول کو ترقی دے کر ہائی اسکول بنادیا گیا، اس میں ایک ہیڈ ماسٹر مولا بخش تھے اور کچھ عرصہ بعد ان کا انتقال ہوگیا تو اسکول میں نیا ہیڈ ماسٹر آیا جس کا نام اللہ بخش تھا۔ جس نے اپنی ذمہ داری سنبھال لی۔ کچھ دنوں کے بعد اللہ بخش جج پر چلا گیا۔ چند دن ہی ہوئے تھے کہ ایک رات ایک ماسٹر آیا جس نے اپنا نام اللہ بخش بتایا۔ اور وہ اسکول میں اپنی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے لگا۔ گاؤں کے سارے لوگ اس سے بہت خوش تھے وہ دل و دماغ اور اخلاق کا بہت ہی اچھا تھا۔ اور یہ سلسلہ کوئی تین ماہ تک چلتا رہا کہ ایک شام اسکول کا اصل ہیڈ ماسٹر اللہ بخش آ گیا تو اس شام پرانا ہیڈ ماسٹر رخت سفر باندھا، اور وہ خراماں خراماں قدم اٹھاتا ہوا گاؤں سے باہر جانے لگا تو لوگوں نے دیکھا تو اچنبھے میں پڑ گئے کیونکہ انہیں آنے والے ہیڈ ماسٹر نے بتایا کہ میں تو کئی دنوں سے گھر پر تھا تو میری جگہ کس شخص نے ہیڈ ماسٹر کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھائی۔ خیر دماغ پر زور دینے سے معلوم ہوگیا کہ وہ ہیڈ ماسٹر اللہ بخش نہیں تھا بلکہ مولا بخش کی روح تھی جو کہ تین ماہ تک اللہ بخش کی جگہ اللہ بخش کی شکل میں اپنی ذمہ داری نبھاتی رہی۔ اور جب کہانی ختم ہوئی تو رولوکا خیالوں میں گم صم تھا کہ اس کے ذہن میں آیا۔ ''یہ روحوں کا سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا اور اس حقیقت کو دنیا کے تمام مذاہب کے لوگ اہمیت دیتے ہیں اور نادیدہ قوتوں کی موجودگی کو مانتے ہیں۔'' اتنے میں ایک ملازم آیا اور بولا۔ ''حکیم صاحب آپ کو حکیم وقار بلا رہے ہیں۔ اور یہ سنتے ہی رولوکا خیالوں کی دنیا سے باہر نکل آیا اور ملازم سے بولا۔ ''چلو چلتے ہیں۔'' (اب آگے پڑھیں)

رولوکا جیسے ہی حکیم وقار کے کمرے میں پہنچا تو رولوکا کو دیکھ کر حکیم وقار احتراماً اپنی کرسی سے کھڑے ہوگئے اور مسکراتے ہوئے رولوکا سے مخاطب ہوئے۔ ''حکیم صاحب تشریف رکھیں۔''

اور مصافحے کے بعد رولوکا سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ حکیم وقار کے سامنے ایک کتاب پڑھی تھی۔ کتاب کو دیکھ کر رولوکا نے پوچھا۔ ''حکیم صاحب کتاب کی ضخامت دیکھ کر لگتا ہے کہ کوئی بہت ہی اہم کتاب ہے۔ اور کتاب پر جو تصویر ہے وہ ظاہر کررہی ہے کہ دور فرعون کی کوئی کہانی ہے۔''

یہ سن کر حکیم وقار بولے۔ ''جی حکیم صاحب یہ واقعی فرعون کے دور کی حقیقت پر مبنی کہانی ہے اور اس کا نام ہے۔ ''روح کی بیداری'' ہے تو یہ بہت دلچسپ کہانی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے شروع کی ہے۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''آپ کی باتوں سے ظاہر ہورہا ہے کہ واقعی حقیقت پر مبنی دلچسپ واقعہ ہے۔ آپ

کی مہربانی ہوگی اگر یہ کہانی مجھے سنائیں۔''

پھر حکیم وقار بولے۔ ''کیوں نہیں..... آپ آرام سے تشریف رکھیں، چائے پینے کے بعد میں آپ کو کہانی سناتا ہوں۔''

اور پھر چائے پینے کے بعد حکیم وقار نے کہانی سنانی شروع کی۔ کہانی یہ ہے۔

سورج ڈوب رہا تھا، تاریکی بڑھتی جارہی تھی اور مختار چاہتا تھا کہ جلد از جلد قطب مینار کی مضافاتی بستی مہرولی پہنچ جائے۔ مہرولی قطب مینار کے قریب ایک پرانی بستی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی خوب صورت موٹر کی رفتار اور تیز کردی، ڈوبتے ہوئے سورج کی آخری شعاؤں کے رقص کا منظر مختار کو بے حد پسند تھا اس لئے اس نے کار کی تیز رفتاری کے باوجود مغرب کی طرف نظر ڈالی۔ سورج بتدریج ڈوب رہا تھا، سیاہ بادلوں کے ٹکڑے کسی راہب کے کالے لبادہ کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے اور شفق کی سرخ شعاعیں فضا میں اس طرح کھنچی ہوئی تھیں جیسے کسی نامعلوم ہاتھ نے چند نقرئی تاروں کے ذریعہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی رومانی رابطہ قائم کرنے کی ناکام جدوجہد کی ہو۔

آسمان کی نیلگوں پردے پر کالی گھٹاؤں کا زور بڑھتا جارہا تھا، قدرتی مناظر کو تاریکی نے اپنی آغوش میں چھپالیا تھا اور مختار ہر لحہ کار کی رفتار بڑھاتا جارہا تھا، اسے کو ڈر تھا کہ بارش ضرور ہوگی اس لئے چاہتا تھا کہ بارش سے قبل وہ مہرولی کی آبادی میں داخل ہوجائے۔ جہاں اس کا ایک دوست اپنے ایک تفریحی مکان میں بہت بے چینی سے اس کا انتظار کررہا تھا۔

دفعتاً ہوا تیز چلنے لگی اور مختار نے کار کی رفتار سست کردی۔

ایک لحہ کے لئے اس نے سوچا کہ مہرولی جانے کے بجائے وہ کیوں نہ اپنی کوٹھی واپس چلا جائے لیکن پھر اس نے اپنا خیال بدل دیا کیونکہ اول تو اسے اپنے منتظر دوست کا خیال آیا اور پھر اسے مہرولی کی پرسکون آبادی کا خیال آیا جو اسے دہلی کی مضافاتی آبادیوں میں سب سے زیادہ پسند تھی۔ اس وقت بھی وہ اپنے دوست راشد سے زیادہ مہرولی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ''وہ چھوٹا سا قصبہ انسانی زندگی، اس کے نشیب و فراز اور اس کے دکھ سکھ کی کتنی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس کے در و دیوار میں، اس کے کھنڈرات کے لامتناہی سلسلہ میں، اس کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی جاذب نظر شکستہ قبروں کے کتبوں میں، اس میں بنے ہوئے مہیب پھاٹکوں میں، تاریخی تالابوں میں اور مغل شاہزادوں کے ان عشرت کدوں میں جن کا سارا حسن اور سارا نکھار زمانہ نوچ چکا ہے۔ کتنی زبردست تاریخ چھپی ہوئی ہے۔ اس آبادی میں ترک آئے، پٹھان آئے، غلام آئے، ایرانی آئے، مغل آئے اور ہر ایک نے اس کو اپنی آماجگاہ بنا کر یہاں اپنی یادگاریں قائم کیں، ..... یہی تو وہ آبادی ہے جہاں پرتھوی راج نے اپنی محبوبہ رانی سنجوگتا کے لئے ایک عالیشان محل بنایا اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں سمراٹ اشوک نے ساری دنیا تک گوتم بدھ کا پیغام نجات پہنچانے کے لئے لوہے کی ایک بڑی لاٹ نصب کرائی.....

اس نے سوچا۔ ''ماضی نے زمین کے اس چھوٹے سے قطعہ کو کتنی اہمیت دی لیکن..... آج نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے.....'' ناہموار تنگ سڑکیں، پیچدار گلیوں میں ابھرے ہوئے بے ترتیب پتھر، ہر جانب سڑے اور ٹھہرے ہوئے پانی پر بیٹھنے والے بھنبھناتے ہوئے مچھر لیکن اس بدحالی اور زمانے کی کج روی کے باوجود یہاں کا ماحول کتنا سادہ اور زندگی کی تمام تر حقیقتوں سے کتنا قریب ہے۔ یہاں کی ہواؤں میں کتنا ابدی سکون اور یہاں کے مناظر میں کتنی آسودگی ہے۔'' اور پھر جیسے اس نے سوچا کہ ''کہیں یہی تو وہ تمام وجوہات نہیں ہیں جن کی بنیاد پر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے ساتھ محبت کے ازدواجی گیت گانے کے لئے اسی مقام کو پسند کیا، اشوک نے اپنے انتہائی مذہبی جذبات کا مظاہرہ کرنے کے لئے یہی جگہ منتخب کی اور مسلمان بادشاہوں نے اپنی سلطنت کی شان و شوکت کا دبدبہ بٹھانے کے لئے یہیں اپنی یادگاریں قائم کیں۔''

کار چلاتے چلاتے مختار نے مزید سوچا۔ ''جب مہرولی کا دن اتنا رومان انگیز اور شام اتنی کیف آور ہوتی ہے تو پھر یہاں کی رات کتنی حسین ہوگی۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں رات کی تاریکی میں روحیں بھی آتی ہوں اور وہ روحیں جو اپنی زندگی میں ناکام رہی ہوں..... وہ روحیں جن کی تمنائیں ادھوری رہ گئی ہوں..... وہ روحیں جن کے محبت بھرے گیتوں نے خود ان کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ دیا ہو..... وہ روحیں جو اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے سکی ہوں..... اور وہ روحیں جنہوں نے اپنے خاکی جسم چھوڑنے کے بعد بھی اپنے جسم سے اپنا پیار نہ ختم کیا ہو.....''

اور جیسے ان بھٹکی ہوئی روحوں کا تصور کرکے مختار کانپ گیا..... راستہ کتنا سنسان ہے..... تاریکی کتنی مہیب ہے..... وہ مہرولی نہیں جائے گا..... وہ اس طرف سے نہیں جائے گا جدھر کچی آبادی بھی ہو اور صرف موت کے نہیں زندگی کے بھی آثار ہوں.....'' اور مختار نے یہ فیصلہ کرتے ہوئے اپنی کار ایک کچے راستے پر موڑ دی۔

دور بہت سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آئیں اور مختار کو ایسا لگا جیسے بہت سی بھٹکی ہوئی روحوں نے ایک ساتھ بین شروع کردیا ہو..... اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے مختار خود اپنے آپ پر مسکرادیا۔ ''روح اس وقت تک طاقتور ہے جب تک اس کے پاس جسم ہے۔ جسم کے بغیر روح بالکل ایسی ہی نرم و نازک شے ہے جیسے پھول کے بغیر اس کی مہک..... جو پھول کے جسم سے نکالنے کے بعد باقی تو رہتی ہے لیکن اس طرح کہ خود اس کے وجود کو کوئی اہمیت اور افادیت نہیں رہتی.....''

''لیکن یہ روح ہے کیا.....؟'' اس کے ذہن نے اس سے سوال کیا اور جواب کی تلاش میں وہ خود ہی اپنے ذہن کے تانے بانے میں الجھ کے رہ گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اچھی یا بری روح کے مسئلہ میں الجھ کر رات کی خوشگوار ساعتیں برباد کرے اس لئے وہ دوبارہ مہرولی کے بارے میں سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ ''کچھ بھی ہو یہ سمجھنا اور فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس خوب صورت اور چھوٹے سے قصبہ کی تاریخی معماری میں کس نے زیادہ حصہ لیا۔ ہندو راجاؤں نے جن کا تذکرہ سنسکرت کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے یا مسلمان شہنشاہوں نے جن کی تہذیب، جن کی معماری ذہانت اور جن کا تمدن و ادب آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہاں موجود ہے اور جن کی زندگی کے بہت سے اسرار سینہ بہ سینہ منتقل ہوکر آج بھی مہرولی کے سن رسیدہ مزار کے مجاوروں کے دلوں میں محفوظ ہیں۔''

مختار کی کار کبھی کبھی پتھروں سے ٹکرا کر یا گڑھوں میں اتر کر ہچکولے کھاجاتی تھی لیکن اس کے خیالات کا سلسلہ بدستور قائم رہا۔ ''خوب صورت، اٹھتا ہوا، ابھرتا ہوا، فضا میں بلند ہوتا ہوا اور آسمان کی بلندیوں کو چھوتا ہوا مینار آخر کس کا مان لیا جائے مسلمان مورخین نے تاریخی دلائل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ التمش ایک بہترین معماری ذہانت کا حامل تھا اور اس کے اسی ذہن کی تمام تر قوتیں مدتوں جدوجہد کرتی رہیں تب جاکر یہ قطب مینار عالم وجود میں آیا۔ لیکن اس کے برعکس پنڈت ہردیو سہائے دہلوی کا دعویٰ ہے کہ یہ تمام عمارتیں ان راجاؤں اور مہاراجاؤں کی ہیں جو مسلمان حملہ آوروں کی آمد تک اس خطہ زمین پر حکمران رہے۔ بہرحال ''مختار نے جیسے فیصلہ کیا.....'' ان کھنڈرات میں مسلمان شہنشاہوں کی تہذیب اور ان کی شان و شوکت دفن ہو یا پرانے راجاؤں اور مہاراجوں کی کہانیاں یہ چھوٹی سی دنیا ہے بہت پیاری..... آج بھی یہ بستی چاندنی میں بھیگی ہوئی ایسی زندگی معلوم ہوتی ہے جس میں حرکت نہ ہو، شور نہ ہو، ہنگامہ نہ ہو۔ صرف سکون ہو اور یہ سکون اتنا ابدی اور اتنا خواب ناک ہو کہ دل میں ماضی کی تصویریں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دکھائی دیں اور جیسے یہ قصبہ کوئی قصبہ نہ ہو چاندنی اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی دنیا ہو جس میں لطیف و پاکیزہ روحیں آباد ہوں اور جہاں بے آواز وقت ماضی اور مستقبل کے

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح گزرتا ہو جس طرح حیات انسانی کے دن.....

اب راستہ بھی خراب ہوگیا تھا اور تاریکی بھی کافی بڑھ گئی تھی، سڑک پر دور دور تک ایک شخص بھی نہیں نظر آتا تھا جب کہ اس سڑک پر آمد و رفت ہمیشہ رہتی تھی، تنہائی کے ان احساسات نے فطری طور پر مختار کو فکر مند کیا اور اس نے کار کی رفتار تیز کی.....لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے خیالات میں کھو کر غلط راستہ پر آ گیا ہے کیونکہ راستہ قطب مینار کے بجائے چراغ دہلی کی طرف جاتا تھا.....چنانچہ اگلے چوراہے پر اس نے اپنی کار گھمائی اور سڑک پر پوری تیز رفتاری سے چھوڑ دی جو بند آنکھوں کے ساتھ بھی اس کو سیدھی مہر دلی پہنچا سکتی تھی۔

اس سڑک پر جب کہ وہ مہر دلی کو اپنی منزل بنائے تیزی سے جا رہا تھا اچانک اسے بیچ سڑک پر ایک آدمی چلتا ہوا دکھائی دیا۔ حادثہ کے خوف سے اس نے ہارن بجایا، ہارن کی آواز سنتے ہی وہ آدمی ایک کنارے ہو کر کھڑا ہوگیا اور جب مختار کی کار اس کے قریب سے گزری تو اس نے دیکھا وہ شخص ایک نیلے چغہ سے اپنا پورا جسم چھپائے ہوئے ہے سر پر عمامہ نما کوئی شے ہے اور بائیں شانے پر ایک ایسا عربی رومال پڑا ہے جو عموماً قاری حاجی یا حافظ استعمال کرتے ہیں۔

''اس تنہا.....سنسان اور تاریک راستہ پر یہ اجنبی کون ہوسکتا ہے۔'' مختار نے سوچا۔ ''اس کے خدو خال تو مصریوں سے ملتے جلتے ہیں، ویسا ہی سنہرا رنگ، اونچی ناک، چوڑی پیشانی، لمبا قد اور طاقتور ہاتھ پیر۔''

ایک مرتبہ پھر اس اجنبی کو دیکھنے کا خیال مختار کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس نے کھڑکی سے باہر نکال کر پیچھے کی جانب دیکھا بھی لیکن تاریکی اور کار کے پہیوں سے پیدا ہونے والے گرد و غبار نے اس اجنبی کو اس کی نگاہوں سے بالکل اوجھل کر دیا تھا۔

مختار نے کار کی رفتار تیز کر دی۔

لیکن مصری خدو خال والا یہ پراسرار اجنبی بدستور اس کے ذہن پر مسلط تھا۔ اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں ہمیشہ سے مصر کے اسرار چھائے رہتے تھے، مصر کے بن دیکھے قدیم حسن کا سحر اس پر ایک عرصہ سے طاری تھا، تاریخ کے اوراق میں گمشدہ مصر کی ہر شہزادی قلوپطرہ بن کر اس کے خیالات کی وسعتوں میں سما گئی تھی اور بچپن ہی سے مصر کا حسن اور مصر کے قدیم اسرار اس پر اپنا جادو پھیلا رہے تھے۔

قدیم مصر ہمیشہ سے اس کا ایک انجانا خواب رہا تھا۔ کیونکہ اس کے والد حسام الدین کو جو ایک کروڑ پتی تاجر تھے ان کو مصریات سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انہوں نے کشمیری دروازہ کے باہر اپنی تعمیر کردہ نئی کوٹھی کو صرف مصر کی قدیم چیزوں سے سجایا تھا، اس کی دیواروں پر قدیم مصر کے طرز پر تصویریں بنوائی تھیں اور اپنی لائبریری کو مصری عجائبات و نوادرات کا ایک عجائب گھر بنا دیا تھا، حسام الدین کی قدیم مصر سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اس شوق پر لاکھوں روپیہ خرچ کر چکے تھے اور ان کی کوٹھی کا آرائش کا مصری انداز دیکھ کر کوئی شخص یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی مصری رئیس کی کوٹھی نہیں ہے۔

باپ کے اس شوق کا اثر مختار کے ذہن پر بھی پڑا تھا، بچپن ہی سے وہ مصری عجائبات دیکھ رہا تھا، ابو الہول اور اہرام کی تصویریں دیکھ رہا تھا، مختلف مجسمے دیکھ رہا تھا۔ قدیم مصری زبانوں کے کتبے دیکھ رہا تھا اور اب جبکہ وہ خود تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں قدیم رکھ چکا تھا اس نے خود مصر سے دلچسپی شروع کر دی تھی۔ وہ مصر کے قدیم اسرار اور اس کی تہذیب سے تو متاثر تھا ہی لیکن جوان ہونے کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ متاثر شہزادیوں کی ان خوب صورت تصاویر سے تھا جو اس کی لائبریری میں لٹکی ہوئی تھیں اور جن کو وہ عالم محویت میں گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔

عالم تصور میں وہ مصر کی سیر کرتا ہوا کار چلاتا رہا۔ اچانک بادل گرجے، بجلی چمکی اور تیز بارش شروع ہوگئی۔ رفتار دھیمی کر کے اس نے کار کی اگلی دونوں

بتیاں جلا دیں۔ اور اس روشنی میں یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک اونچی دیوار کے بالکل قریب ہے۔ اچانک خوفناک گرج کے ساتھ بجلی پوری قوت کے ساتھ چمکی اور اس کی تیز روشنی میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کو ہی نہیں دنیا کے ہر ذی ہوش کو دیوانہ کرنے کے لئے کافی تھا۔

تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر پتھر کا ایک پرانا مکان تھا جس کے ایک برج کے نیچے ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔ جس کے جسم پر سیاہ لباس تھا، سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے، سفید رنگ بجلی کی روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھیں کنول کے پھول کی طرح جوانی سے مخمور تھیں۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور یہ وہی شہزادی تھی، مصر کی وہی شہزادی جس کی تصویر مختار کی لائبریری کی ایک دیوار پر موجود تھی، قدیم مصر کی شہزادی جس پر ہمیشہ اس کی محبت بھری نظریں پڑا کرتی تھیں، اور جو بچپن سے لے کر اب تک اس کے ذہن کے ہر گوشے پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کی ان دیکھی محبوبہ کی طرح زندگی کے دلکش خواب کی طرح، قدیم مصر کے اسرار کی طرح، اور وہ چیخ پڑا۔

''تم کون ہو۔'' اور یہ کہتے ہی اس پر ایک عجیب وارفتگی سی طاری ہوگئی۔ کچھ دیوانگی اور لاشعوری سی کیفیت، کار کا اسٹیئرنگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا، ڈگمگاتی ہوئی کار ایک مہیب آواز کے ساتھ کسی درخت سے ٹکرائی، اور وہ اچھل کر باہر گر پڑا۔

وہ بالکل بے ہوش تھا۔

اور اس کی زندگی کے دلکش خواب کی دلفریب تعبیر اسے موت کے قریب لے گئی تھی؟

☆.....☆.....☆

مختار نے بہت آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں، ایک لمحہ کے لئے سامنے کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً کوئی بات ضرور تھی، وہ حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ آنکھیں کھولنے سے صرف ایک منٹ پہلے وہ مصر کی کسی عالیشان عمارت کے ایک ستون سے کمر لگائے بیٹھا ہوا ایک معبد کی کھڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ جو دیوار میں کافی بلندی پر تھی اور جس میں ایک حسن جہاں سوز راہبہ اپنے انتہائی مقدس لباس میں کھڑی ہوئی پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر اس پھیلتی ہوئی تاریکی نے حسن کے اس عدیم المثال پیکر کو اس کی نظروں سے پنہاں کر دیا۔

اور اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

اس لئے کہ وہ دوبارہ یہ منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ایک سفید بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، سارا جسم درد سے بے چین ہے اور قریب کی ایک میز پر دوائی کی شیشیاں، کچھ پیالے اور گلاب کے تازے پھول سے سجا ہوا ایک گلدستہ رکھا ہوا ہے، تھکان محسوس ہونے پر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

مختار کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے یا نہیں۔ ابھی تک اس پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی کہ ایک ملائم، نازک لیکن سرد ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر اسے محسوس ہوا تو اپنی آنکھوں کے پرسکون پردوں کو تیسری بار اس نے آہستہ آہستہ اٹھایا اور اب اس نے دیکھا کہ محبت اور شفقت کے جذبات سے لبریز دو نرس کی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ تھکی تھکی نگاہوں کے ساتھ اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اور اب اسے معلوم ہوا کہ وہ کسی اسپتال میں، اس کے قریب ایک نرس کھڑی ہوئی ہے اور وہ ایک ایسے کمرے میں ہے جس میں نرس کی بڑی بڑی آنکھوں اور گلاب کے سرخ پھولوں کے علاوہ ہر چیز سفید ہے۔

''شکر ہے کہ بالآخر آپ ہوش میں آ گئے۔'' نرس نے دل آویز ہلکی آواز میں کہا۔

مختار نے چاہا کہ جواب میں ہاں کہے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اس نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں بھی خود کو اتنا

خیف و کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ لیکن کمزوری، نقاہت، درد اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ پھر اس کا ذہن مہر دلی جانے والی سڑک کے کنارے برج کے نیچے کھڑی ہوئی اس پراسرار مہ جبیں کی طرف چلا گیا۔ جس کی تصویر اس کی لائبریری میں موجود تھی جس کو وہ اپنے بچپن سے دیکھ رہا تھا اور جس کے بارے میں اسے یہ بتایا گیا تھا کہ ''وہ فرعون دوئم کے خاندان کی ایک خوب صورت شہزادی کی ایک قدیم تصویر ہے۔'' اور جسے اس کے باپ نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے مصری نوادرات کے کسی تاجر سے خریدا تھا۔

مختار کے چہرے پر بے چینی اور تھکان کے آثار دیکھ کر نرس نے اپنی فصیح آواز میں کہا۔ ''یہ دوا پی لیجئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ اپنی طبیعت میں یقیناً حیرت ناک خوشگوار تبدیلی محسوس کریں گے۔''

اور پھر دوا پیتے ہی مختار سو گیا۔

رات گئے اس کی آنکھ کھلی، اب واقعی درد کم تھا، طبیعت کی گرانی دور ہو چکی تھی اور خود کو فرحت بخش محسوس کر رہا تھا، کمرے میں دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہی نرس اس کے پلنگ کے بالکل قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مختار نے غور سے چاروں طرف دیکھا اور اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ وہ واقعی کسی اسپتال کے کمرے میں ہے نرس سے پوچھا۔

''میں یہاں کیسے آیا؟''

''تغلق آباد کے کھنڈروں والی سڑک پر آپ کی کار ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اور ایک عورت آپ کو یہاں تک پہنچا گئی ہے۔ اس وقت آپ اردن اسپتال میں ہیں اور خطرہ کی حد سے نکل چکے ہیں۔'' نرس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''اتنا تو مجھے خود یاد ہے کہ میری کار کو حادثہ ہو گیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کون عورت مجھے یہاں تک پہنچا گئی۔'' مختار نے گھبرا کر پوچھا اور ایک مرتبہ پھر اسے اپنی لائبریری والی مصری شہزادی کی تصویر یاد آ گئی۔

مختار کے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے نرس کی تیوریوں پر خفیف سے بل پڑ گئے اور اس نے تقریباً تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''مسٹر مختار ڈاکٹر بیگ کے حکم سے آپ کو زیادہ گفتگو کرنے کی اجازت قطعی نہیں دی جا سکتی، اب آپ دوا پیجئے اور آرام کیجئے۔''

''لیکن نرس تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟'' مختار نے انتہائی حیرت سے پوچھا کیونکہ وہ بے ہوشی کے عالم میں یہاں پہنچایا گیا تھا اور کسی کو اس کا نام تک نہیں معلوم تھا۔''

''یاد رکھئے کہ میں آپ کے اس آخری سوال کا جواب دے رہی ہوں اس کے بعد آپ بالکل خاموش رہئے گا۔ سنئے جس عورت نے آپ کو یہاں تک پہنچایا تھا اسی نے رجسٹر میں آپ کا نام اندراج کرایا، اسی نے بتایا کہ آپ کا نام مختار عالم ہے اور آپ کے والد کا نام خان بہادر حسام الدین ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آپ کی شکستہ حال کار بھی نئی دہلی کے حمید گیرج میں مرمت کے لئے پہنچا دی جائے گی۔ اس عورت نے خود اپنا کوئی پتہ نہیں بتایا اور ہمارے مزید کسی سوال کا جواب دیئے بغیر اٹھی اور چلی گئی۔'' نرس نے ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کے انداز میں اپنا پورا جملہ ادا کیا۔

اور مختار کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔

''یقیناً یہ کسی روح کا کام ہے۔ ورنہ کسی اجنبی کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے اور میں کس کا بیٹا ہوں۔'' مختار نے سوچا اور خوف کی وجہ سے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ چاہتا تھا کہ کچھ اور سوچے اور نرس اس کے کچھ اور سوالوں کا جواب دے۔ لیکن غالباً نرس اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھنوں کو پہچان گئی اس نے مختار کو دوا پلائی اور ایک مرتبہ پھر التجا بھرے انداز میں سونے کے لئے کہا۔ لیکن مختار کی آنکھوں میں نیند کہاں۔ اس نے محض نرس کو مطمئن کرنے کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ذہنی اعتبار سے وہ ماضی کے ان تمام واقعات پر مسلسل سوچ رہا تھا۔ اور اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

رات اسی طرح گزرتی رہی اور لاتعداد الجھنوں کو دل میں دبائے مختار بھی سو گیا اور جب وہ بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ سورج کی روشنی پھیل چکی ہے اور نرس کے قریب ایک بوڑھا ڈاکٹر بھی کھڑا ہوا ہے، قبل اس کے کہ مختار کوئی سوال کرتا ڈاکٹر نے انتہائی مشفقانہ انداز میں گفتگو کی ابتدا کر دی۔ اس نے کہا۔ ''آپ گزشتہ 48 گھنٹوں سے ہمارے اسپتال کے ایک اسپیشل وارڈ میں زیر علاج ہیں۔ ایک گمنام عورت انتہائی زخمی حالت میں آپ کو یہاں تک پہنچا گئی یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کو بروقت طبی امداد مل گئی اور ہمیں آپ کے والد کا نام معلوم ہو گیا ورنہ آپ کا بچنا محال ہو جاتا۔''

''لیکن میرے والد اس وقت کہاں ہیں۔''

''وہ خود میرے دفتر میں آپ سے ملاقات کے لئے بے چین ہیں۔ آپ اطمینان سے لیٹے رہئے، میں ابھی ان کو یہاں بھیجتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ہمدردی سے جواب دیا اور مختار کے سر پر بندھی ہوئی پٹیوں کا معائنہ کرنے کے بعد نرس کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

چند ہی لمحات کے بعد خان بہادر حسام الدین اس کے کمرے میں بے تابی کے ساتھ داخل ہوئے اور انہوں نے آتے ہی بیٹے کو اپنے سینے سے چمٹا لیا۔

''بیٹا۔ اب کیسے ہو؟ خدا کی قسم میں تمام رات تمہارے کمرے کے آگے بیٹھا رہا۔ تمہاری کار کا حادثہ کیسے ہو گیا؟ تم تغلق آباد کے کھنڈروں میں کیا کرنے گئے تھے؟ وہ کون عورت تھی جو اپنا نام اور پتہ بتائے بغیر تمہیں یہاں تک پہنچا گئی؟ جلد بتاؤ مختار یہ سب کیوں ہوا؟'' خان بہادر نے ایک ہی سانس میں لاتعداد سوالات کر ڈالے۔

''میں اچھا ہوں ابا جان۔'' مختار نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن میں جس حادثہ سے دوچار ہوا ہوں اس نے ذہنی اعتبار سے مجھے بالکل معطل کر دیا ہے۔''

''بیٹے میں تمہاری الجھن دور کرنے کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' حسام الدین نے بیٹے کی پریشانی دیکھ کر کہا۔

تو مختار نے شروع سے لے کر اب تک کے تمام واقعات سنا دیئے۔ اور حسام الدین تفصیل سن کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

انہوں نے سوچا۔ ''کیا یہ ممکن ہے؟ اور پھر خود ہی انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ ممکن ہے کیونکہ مختار جس شہزادی کی تصویر کا تذکرہ کر رہا ہے وہ قدیم مصری تاریخ کے بموجب اب تک زندہ ہے۔'' حسام الدین نے اپنے بیٹے کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دنیا یقین کرے یا نہ کرے لیکن مجھے اس امر پر پورا یقین ہے کہ برج والی عورت وہی ہو گی جس کی تصویر میری لائبریری میں موجود ہے، مجھے مصریات سے دلچسپی ہے میں اس شہزادی کی پوری کہانی جانتا ہوں۔ تم اچھے ہو کر اسپتال سے آ جاؤ پھر میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر حادثہ کی مکمل تحقیقات کروں گا۔''

''جب آپ کو اس شہزادی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ اب تک زندہ کیوں ہے۔'' مختار نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ اب تک زندہ کیوں ہے یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن اس کا نام شہزادی انتانیہ ہے یہ میں تمہاری تسلی کے لئے بتائے دیتا ہوں۔'' حسام الدین نے پرسکون انداز میں کہا۔ ''اور اب تم آرام کرو۔ میں ڈاکٹر بیگ سے گفتگو کرنے کے بعد چلا جاؤں گا اور شام کو پھر آؤں گا۔''

اور یہ کہہ کر باپ نے بیٹے کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر بیگ مریضوں میں مصروف تھے لیکن پھر بھی انہوں نے حسام الدین سے گفتگو کرنے کے لئے وقت نکال ہی لیا۔

''اب آپ مختار کے لئے فکر مند نہ ہوں کیونکہ اب انہیں کوئی خطرہ باقی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر بیگ نے

حسام الدین کے چہرے پر تفکرات کا ہجوم دیکھ کر کہا۔

''نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں اس کے ظاہری نتائج کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں لیکن اپنی آئندہ زندگی میں اسے جن خطرات سے دوچار ہونا ہے ان کی فکر مجھے ضرور لاحق ہے۔'' حسام الدین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' ڈاکٹر بیگ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ میرے پرانے ملنے والے ہیں، آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے مصر کی قدیم تاریخ اور اس کے اسرار سے دلچسپی ہے اور اپنے اس شوق کی تسکین کے لئے میں لاکھوں روپیہ بھی برباد کر چکا ہوں۔ مختار نے حادثہ کی جو تفصیل مجھے بتائی ہے اس کی روشنی میں مجھے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ قدیم مصر کی ایک خوب صورت عورت شہزادی انتانیہ کی روح مختار میں دلچسپی لے رہی ہے۔

شہزادی انتانیہ کو میں اس لئے جانتا ہوں کہ اس کی تصویر میری لائبریری میں موجود ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایسے افراد جو صرف مادہ اور اس کی ٹھوس حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں نہ مختار کی باتوں پر یقین کریں گے اور نہ میری گفتگو پر اس لئے میں آپ سے بحث کرنے کے بجائے آپ سے صرف امداد چاہتا ہوں۔'' حسام الدین نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر بیگ کی طرف دیکھا۔

''خان بہادر حسام الدین ایسے ذمہ دار اور سنجیدہ آدمی کی زبان سے اس قسم کی غیر یقینی باتوں کو سن کر واقعی ڈاکٹر بیگ کو حیرت ہوئی اور وہ خود تذبذب میں پڑ گیا۔ اس کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے، یا تو وہ اس حکایت پر یقین کرے اور یا پھر نہ کرے۔ اور پھر اس نے سوچا کہ یقین کر لینے میں چونکہ کوئی نقصان نہیں ہے اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ خان بہادر کی دل شکنی نہ کرتے ہوئے نہ صرف ان کی باتوں میں دلچسپی لے بلکہ اس مسئلہ پر ان کی مدد بھی کرے۔

ڈاکٹر بیگ کو بہرحال روحانیت پر کوئی یقین نہ تھا۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ اور حقائق پر مبنی ہے۔'' ڈاکٹر بیگ نے مصنوعی جذبات کے ساتھ کہا۔ ''اور میں حادثہ کی تحقیقات کے سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔''

''شکریہ ڈاکٹر صاحب۔ بہت بہت شکریہ۔'' حسام الدین نے خوش ہو کر کہا۔ ''اب آپ میرے صرف چند سوالوں کا جواب دے دیں پہلے یہ بتائیں کہ جس وقت کوئی نامعلوم اور گمنام عورت مختار کو اسپتال میں داخل کرنے آئی۔ کیا آپ موجود تھے؟''

''ہاں۔ ایک آپریشن کے سلسلے میں مجھے دیر ہوگئی تھی اور میں اتفاقاً اس وقت موجود تھا۔''

''مختار کو کسی گاڑی میں لایا گیا تھا، کار میں؟'' حسام الدین نے دوسرا سوال کیا۔

''وہ عورت مختار کو بے ہوشی کے عالم میں ایک گھوڑا گاڑی میں لائی۔ آتے ہی اس نے کہا کہ ''خان بہادر حسام الدین کے لڑکے مختار الدین کی کار کا تعلق آباد کے کھنڈروں میں حادثہ ہوگیا ہے۔ شکستہ کار نئی دہلی کے حمید گیرج میں پہنچا دی گئی ہے اور مختار بے ہوشی کی حالت میں باہر گاڑی پر موجود ہے۔'' میں آپ کا نام سنتے ہی باہر آیا اور عملہ کے چند آدمیوں کی مدد سے مختار کو گاڑی سے باہر نکالا اور عورت کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسے اسپیشل وارڈ میں لے آیا۔''

''اس کے بعد۔'' حسام الدین کی بے چینی بڑھ گئی۔

''اس کے بعد مریض کا معائنہ ختم کر کے جب میں اس عورت کو بلوایا۔ تو وہ جا چکی تھی۔ چنانچہ میں نے فوراً آپ کو فون پر اطلاع دی اور حمید گیرج کو بھی فون کیا کہ کیا کوئی کار اس کے گیرج میں پہنچائی گئی ہے؟ وہاں سے کار کی وصولیابی کا اقرار ہوا ہی تھا کہ چند منٹ کے بعد آپ خود آ گئے۔''

''ہوں۔'' حسام الدین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''صرف ایک سوال اور۔''

''فرمائیے۔'' ڈاکٹر بیگ نے بدستور سرد

لہجے میں کہا

''گھوڑوں کا رنگ کیا تھا۔''

''سیاہ۔ بالکل سیاہ اور سیاہ کوچوان ایک نیلا چغہ پہنے ہوئے تھا۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک کہا ڈاکٹر بیگ۔ واقعی شہزادی انتانیہ فرعون کے دور حکومت میں جس بگھی پر سیر کرنے نکلتی تھی اس کے گھوڑوں کا رنگ سیاہ ہوتا تھا۔''

اور حسام الدین کے اس جواب پر ڈاکٹر بیگ ایک مرتبہ پھر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا۔ اور ایک لمحہ کے لئے اس کے ذہن میں خیال آیا۔ ''یہ دونوں باپ بیٹے پاگل تو نہیں ہوگئے۔ ورنہ ڈھائی ہزار سال گزرنے کے بعد بھی ایک عورت کی زندگی اور پھر اس کی یہ تمام سرگرمیاں..... نہیں نہیں میں ان لغو باتوں پر یقین نہیں کر سکتا میں ان باتوں کو ایک کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا۔ شہزادی انتانیہ کا وجود ممکن ہے لیکن شہزادی انتانیہ آج بھی زندہ ہے یہ میں ہرگز نہیں مان سکتا۔''

ڈاکٹر بیگ ابھی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ حسام الدین چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتہ کے علاج معالجہ کے بعد مختار اسپتال سے گھر واپس آ گیا، لیکن حادثہ کے سلسلہ میں اس کی الجھنوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی، بیماری کے زمانہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے ذہن سے مصری شہزادی کی تصویر نہیں نکلی، نیند تو نیند عالم بیداری میں بھی جب بھی وہ آنکھیں بند کرتا اس کو تخلق آباد کے کھنڈروں کے ایک مدرج میں سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت عورت اس کی طرف دیکھتی نظر آتی اور وہ گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیتا۔

حسام الدین نے بھی اسے منع کر دیا تھا کہ وہ مکمل صحت یابی تک اس سے مصری شہزادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ چنانچہ مسلسل ایک ہفتہ تک مختار کے جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہے۔ اور وہ اس قدر بے تاب ہوگیا کہ ابھی زخمی کی مرہم پٹی ہو ہی رہی تھی کہ وہ اسپتال سے نکل بھاگے۔

کوٹھی میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے لائبریری میں گیا اور وہاں اسی تصویر پر نگاہ ڈالی جس نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

شہزادی انتانیہ کی یہ تصویر بھی نادر روزگار تھی۔ تصویر میں شہزادی باریک لباس میں اس طرح ملبوس تھی کہ اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز نمایاں تھے، سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ماتھے پر موتیوں کی ایک لڑی بکھری ہوئی تھی۔ گلے میں سونے کا ایک باریک سانپ تھا۔ لبوں پر ابدی اور لافانی مسکراہٹ تھی اور ایک ہاتھ میں نیلے گلاب کا ایک تازہ پھول، تصویر کے پس منظر میں ایک معبد گاہ تھی جس کے بڑے دروازے پر ابو الہول کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا۔

مختار عالم محویت میں نہ معلوم کتنی دیر تک اس تصویر کے نزدیک کھڑا رہا کہ اچانک لائبریری کا دروازہ کھلا، اور اس کے والد حسام الدین نے مختار کو سینے سے لگا لیا۔

''مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ اسپتال سے آتے ہی تم سب سے پہلے اسی تصویر کو دیکھو گے۔'' انہوں نے انتہائی مشفقانہ انداز میں کہا اور مختار ایک محبوب مسکراہٹ کے علاوہ اپنے والد کو کوئی جواب نہ دے سکا۔

حسام الدین اور مختار ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کے بال ریشم کی طرح سفید ہو چکے تھے اور دوسرے کے سر پر سیاہ بالوں کی ترتیب قائم تھی۔ ایک کے چہرے پر بڑھاپے کا تجربہ اور اس کی لکیریں تھیں اور دوسرے کے چہرے پر جوانی کی سرخی اور تازگی تھی، دونوں صحت کے اعتبار سے جسیم تھے، رنگ و روغن دلکش تھا، اور خدوخال میں ایک خاص قسم کی رعنائی اور دلکشی تھی۔ مختار حسن مردانہ کا ایک اچھوتا نمونہ تھا اور حسام الدین جاتی ہوئی جوانی کا ایک مجسمہ۔

دونوں باپ بیٹے اس وقت جس لائبریری میں موجود تھے وہ کسی ہندوستانی رئیس کی لائبریری ہونے

کے بجائے برطانوی میوزیم کا وہ کمرہ معلوم ہوتی تھی جس کو مصری آثار قدیمہ سے آراستہ کیا گیا ہو۔ مصر سے حسام الدین کی دلچسپی بہت پرانی تھی، اور جب سے ان کی بیوی مختار کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر لحد کے گوشے میں سوگئی تھی حسام الدین بالکل ہی قدیم مصر کے اسرار کا بن کر رہ گئے تھے، یہی شوق ان کا غم غلط کررہا تھا۔ اور اسی شوق نے ان کی بیوی کی جدائی کے زخم پر گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ مرہم کا کام کیا تھا۔ مصر کے اسرار میں کھو کر وہ اپنی محبوب بیوی کو بھول جانا چاہتے تھے۔ اور اس لئے انہوں نے دوسری شادی نہیں کی۔

ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد حسام الدین نے مصر کے آثار قدیمہ کا جو مجموعہ اکٹھا کیا تھا وہ قدیم مصری تہذیب کا ایک خزانہ تھا جو پورے ملک میں ان کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ تھا۔ یہ مجموعہ صرف لائبریری کی آرائش تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کوٹھی کا ہر کمرہ مصری تہذیب کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ دور دور سے لوگ اس کوٹھی کو دیکھنے آتے تھے اور اس طرح اگر ایک طرف حسام الدین کی شہرت میں اضافہ ہوگیا تھا تو دوسری طرف ان کی ایسے لوگوں سے بھی واقفیت ہوگئی تھی جو مورخ تھے، ڈاکٹر تھے، آثار قدیمہ کے ماہر تھے اور علوم وفنون کے پروفیسر تھے۔

کوٹھی کا جملہ انتظام عازم کی بیوہ بہن شمیم بانو کے سپرد تھا جو بیوہ ہونے کے بعد اپنی زندگی کے پرسکون دن اپنے بھائی کے ساتھ گزار رہی تھیں اور مختار سے اپنے بیٹے سے زیادہ محبت کرتی تھیں..... الغرض کوٹھی کی اندرونی زندگی میں اب تک کوئی انتشار نہ تھا، کوئی اضطراب نہ تھا، کوئی الجھن نہ تھی..... خان بہادر کا کاروبار اپنے عروج پر تھا اور وہ ہر اعتبار سے دنیا کے خوش نصیب ترین انسانوں میں سے ایک تھے..... لیکن..... اب ایک نیا طوفان ان کے دروازہ پر دستک ضرور دے رہا تھا۔

دونوں باپ بیٹے شہزادی انتانیہ کی تصویر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئے اور حسام الدین نے کہا.....

''مجھے تعجب صرف یہ ہے کہ شہزادی انتانیہ کی روح دوبارہ تم سے ملنے کیوں نہیں آئی..... یہی نہیں..... میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اس نے اپنی جھلک دکھانے کے لئے تغلق آباد کے کھنڈروں کو ہی کیوں پسند کیا..... اگر تم سے ملنا ہی چاہتی تھی تو کسی بھی تاریک رات کو تمہاری خواب گاہ میں تم کو جگا سکتی تھی۔''

''اور میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ وہ اتنے پراسرار اور تاریک ماحول میں مجھے اپنی جھلک کیوں دکھانا چاہتی تھی.....'' مختار نے کہا۔

''صرف اس لئے کہ تم اس پر عاشق ہوجاؤ.....'' حسام الدین نے کہا۔ ''اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوگئی..... کیونکہ جہاں تک میرا تجربہ بتاتا ہے تم حادثہ کے بعد سے اب تک صرف اسی کے خیال میں ڈوبے رہے ہو۔''

''لیکن مجھے خود پر عاشق کرانے کا بھی کوئی مقصد ہوگا۔''

''بہت اہم مقصد ہے شہزادی انتانیہ کا..... اور اس مقصد کی ایک لمبی کہانی بھی ہے جو میں اپنے چند احباب کے آنے کے بعد تمہیں اور سب کو سناؤں گا۔''

حسام الدین نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا..... ''آج تم آرام کرو..... کل میں تغلق آباد کے ان کھنڈروں کی طرف چلوں گا جہاں شہزادی انتانیہ نے تم کو اپنی جھلک دکھائی تھی۔ یقین جانو مختار..... میں شہزادی کا ممنون ہوں کہ اس نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچالی..... میرے بوڑھے احساسات پر یہ احسان ہے اور میں تم سے حلفیہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی بے چین و مضطرب روح کو اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کروں گا۔''

''مجھے پوری بات بتایئے بابا..... آپ نے اب تک ہر بات ادھوری کی ہے.....'' مختار نے بے چین ہوکر کہا۔

''تم صرف تین دن انتظار کرلو'' میرے چند مخصوص احباب باہر سے آنے والے ہیں، ان کے آنے پر میں پوری کہانی بیان کردوں گا۔'' حسام الدین نے مختار

کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔

الجھن کم کرنے کے بجائے باپ کی گفتگو نے مختار کی الجھنیں بڑھادیں، بار بار وہ شہزادی کی تصویر کی طرف دیکھتا رہا اور اس کا دماغ مسلسل سوچتا رہا کہ اپنی طرف متوجہ کرنے کا شہزادی کا کیا مقصد تھا؟''

لیکن مختار کو اس سوال کا جواب نہ ملا۔

دوسرے دن ناشتہ کی میز پر حسام الدین نے مختار کو تغلق آباد جانے کی تیاری کرنے کے لئے کہا اور اس کے علاوہ اور کوئی دوسری بات نہیں کی مختار کو حیرت تھی کہ اس زبردست حادثے کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ ایک روح نے ان کے بیٹے کو سحر زدہ کرلیا ہے پھر بھی وہ اتنا پرسکون کیوں نظر آرہے ہیں۔

کیا وہ واقعی معاملہ کی تہہ پر پہنچ چکے ہیں؟

ٹھیک دس بجے دونوں باپ بیٹے اپنی شاندار کار میں تغلق آباد کے کھنڈروں کی طرف روان ہوگئے، نئی دہلی کی صاف ستھری سڑکوں سے گزرنے کے بعد حسام الدین نے مختار سے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ روح کا کوئی مسکن نہیں ہوتا اس لئے تغلق آباد جانا بالکل بیکار ہے لیکن پھر بھی میں وہاں اس لئے جارہا ہوں کہ شاید میں یہ معلوم کرسکوں کہ شہزادی نے تم پر اپنا غیر معمولی خوب صورتی کا جادو چلانے کے لئے تغلق آباد کا سنسان کھنڈروں کا ہی انتخاب کیوں کیا؟ ہاں ایک بات اور کہ تم اپنی یادداشت پر زور دے کر یہ بتاسکتے ہو کہ وہ کیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔''

''وہی تصویر والا لباس۔ سفید اور انتہائی باریک۔'' مختار نے جواب دیا اور اس کے بعد دونوں باپ بیٹے خاموش ہوگئے۔

شاید دونوں اپنے اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ تغلق آباد کے سنسان اور غیر آباد علاقہ میں داخل ہوگئے۔ اور جب راستہ بالکل ہی ناہموار ہوگیا۔ تو حسام الدین نے کار روک دی۔ اب دونوں پیدل تھے اور دور سے تغلق آباد کے مہیب کھنڈر نظر آرہے تھے۔

''ہم صحیح راستہ پر ہیں یا غلط راستہ پر؟'' حسام الدین نے سوال کیا۔

''مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری کار اسی سڑک پر جارہی تھی۔''

''تو پھر ان کھنڈروں میں کوہ برج تلاش کرو جس کے نیچے شہزادی کھڑی تھی۔'' اور دونوں سایہ دار گھنے درختوں میں آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف تغلق آباد کے آثار کھنڈرات کی صورت میں موجود تھے۔ لیکن برج کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دفعتاً مختار رک گیا۔ ''وہ دیکھئے کچی سڑک سے تقریباً چالیس گز کے فاصلہ پر وہ برج موجود ہے۔ اور وہ درخت بھی جس سے میری کار ٹکرا گئی تھی۔'' حسام الدین بھی رک کر اس برج کو دیکھنے لگے۔ اور چند لمحات کے بعد دونوں اس برج کی طرف روانہ ہوگئے۔''

مختار کے ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی تھی، ماحول واقعی دہشت ناک تھا، ہر طرف خاموشی تھی اور ایسے خطرات تھے جن کا انسان کو تصور تک نہیں ہوتا لیکن حسام الدین بالکل پرسکون انداز میں اس طرح برج کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے وہاں کوئی شخص ان کی ملاقات کا منتظر ہو۔

نزدیک پہنچنے پر معلوم ہوا کہ برج ایک شکستہ مکان کی چھت پر بنا ہے، مکان کے چاروں طرف چار دیواری کھنچی ہوئی ہے اور بائیں گوشے پر ایک چھوٹا سا مینار بھی بنا ہوا ہے۔ حسام الدین اور مختار غور سے مکان کے گرد وپیش کا جائزہ لیتے رہے اور اس کے بعد عازم ایک شکستہ فصیل میں داخل ہوگئے۔

فصیل کے بعد ایک اچھا خاصا میدان تھا جس میں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی اور جنگلی پھولوں کی بے شمار جھاڑیاں موجود تھیں۔ میدان کے بعد ایک اور چہار دیواری تھی، جس میں ایک محراب دار دروازہ تھا اور سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

حسام الدین نے غور سے ان پرانی، شکستہ اور پتھریلی سیڑھیوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر ان کی بھی حیرت کی

انتہا نہ رہی کہ سیڑھیوں پر باقاعدہ جھاڑ دی گئی ہے اور وہ بالکل صاف ہیں۔"

"گویا..... اس سنسان مکان کے کھنڈرات میں کوئی ذی حیات بھی موجود ہے۔" حسام الدین نے دل ہی دل میں کہا اور مختار کو اشارہ کرکے زینے پر چڑھنے لگا۔ اور اس مکان میں داخل ہو کر جو یقیناً بادشاہوں کی رہائش گاہ کوکائی اہم حصہ رہی ہوگی دونوں باپ بیٹوں کو ایک لمحہ کے لئے سناٹا سا ہوگیا۔

مکان بالکل خالی تھا۔ برج بالکل سنسان تھا لیکن شکستہ مینار کے قریب ایک مسلمان بوڑھا بارگاہ رب العزت میں سجدہ ریز تھا۔ حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دونوں اس بوڑھے نمازی کو دیکھتے رہے اور نماز کے بعد جب اس بوڑھے نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ان پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔

بوڑھے کی آنکھیں خونی کبوتر کی طرح سرخ تھیں اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جو روحانی جلال تھا اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"تم لوگ یہاں کیوں آئے..... اور میری عبادت میں مخل کیوں ہوئے۔" بوڑھے کی گرجدار آواز سے پوری فضا گونج گئی۔

"جی..... ہم....." حسام الدین سخت دل ہونے کے باوجود ہکلا گئے۔

"میرے بیٹے کو اس برج کے نزدیک ایک حادثہ ہوگیا تھا۔"

"وہ سب مجھے معلوم ہے..... اور میرا ہی حکم تھا جو انتانیہ کی روح نے تمہارے بیٹے کو اسپتال تک پہنچادیا۔" بوڑھے کی آواز میں اب بھی گرمی باقی تھی۔

اور بوڑھے کے اس جواب نے جیسے دونوں باپ بیٹوں کی سوچنے سمجھنے اور جواب دینے کی صلاحیت ختم کردی۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی ہی جارہی تھی۔

"تو کیا یہ بوڑھا علم کی ان حدوں کو بھی پار کرچکا ہے جس کے بعد روح اور مادہ میں فرق مٹ جاتا ہے۔ اور فانی وغیر فانی دونوں ایک ہی وقت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔"

حسام الدین نے ایک منٹ کے لئے سوچا اور چاہا کہ آگے بڑھ کر اس بوڑھے بزرگ کے ہاتھوں کا عقیدت بھرا بوسہ لیں۔

"نہیں۔" بوڑھے نے حسام الدین کو روک دیا۔ "میں اسے پرستش کہتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ عقیدت کا یہ مظاہرہ تم کیوں کررہے ہو۔ سنو شہزادی انتانیہ کی روح بھٹک رہی ہے، وہ بیداری کے لئے بے تاب ہے۔ فرعون نے اس کے زندہ جسم کی ممی بنادی تھی۔ حادثہ والی رات وہ مجھ سے ملنے آئی تھی کہ واپسی پر تمہارے بیٹے کی نگاہ اس پر پڑگئی اور وہ حادثہ ہوگیا لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا۔"

"لیکن محترم بزرگ..... اب میں اپنے بیٹے کی خاطر اسے بیدار کرنا چاہتا ہوں۔" حسام الدین نے بوڑھے کے رعب و جلال کے باوجود کہہ ہی دیا۔

"کوشش کرسکتے ہو۔ قاہرہ سے آگے لکسر سے صرف 22 میل کیف اصلہ پر اس کا زمین دوز مقبرہ موجود ہے۔ جہاں وہ پتھر کے ایک تابوت میں گزشتہ ڈھائی ہزار سال سے لیٹی ہوئی ہے۔" بوڑھے کا لہجہ نرم ہوچکا تھا۔ "اور اب تم جاسکتے ہو۔ کوئی دوسرا سوال کئے بغیر۔" اور یہ کہہ کر اس گمنام اور پراسرار بوڑھے نے ایسی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا کہ دونوں پر ہیبت سی طاری ہوگئی اور دونوں الٹے قدم واپس آگئے۔

عمارت کے باہر آکر دونوں باپ بیٹے عالم سکوت میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے اور اس پراسرار بوڑھے کی گفتگو اور اس کے نتائج پر غور کرتے رہے جس نے محض چند منٹ قبل ان کے حواسوں تک کو معطل کردیا تھا۔ چند منٹ غور کرنے کے بعد حسام الدین جیسے چونک گئے۔ "آخری سوال تو ابھی باقی ہے۔ اس کے جواب کے بغیر انتانیہ کا مقبرہ کیسے تلاش کیا جائے گا۔" اور وہ مختار کی طرف کوئی اشارہ کئے بغیر انتہائی تیز قدموں کے ساتھ دوبارہ مکان میں داخل ہوگئے۔

لیکن اب مکان بالکل خالی تھا۔ حسام الدین

نے اس کھنڈر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن بوڑھے کا کوئی پتہ نہ تھا۔ مایوسی، ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبہ کے ساتھ جب وہ واپس ہوا تو اس کی نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو ایک چھوٹے سے پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ کانپتے ہاتھوں سے حسام نے کاغذ اٹھایا تو اس میں لکھا تھا۔

"..... حسام الدین میری ملاقات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا..... اور نہ آج کے بعد مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرنا..... یہ اسرار خودی ہیں..... تم ان کی تہہ تک نہ پہنچ سکو گے مجھے معلوم تھا تم واپس ضرور آؤ گے اور مجھ سے شہزادی انتانیہ کے مقبرہ کے بارے میں ایک آخری سوال ضرور کرو گے۔ تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ فراعنہ مصر کے مقبروں سے پہلے مصریوں کی ایک مختصر سی آبادی لکسر سے 22 میل دور جب فراعنہ مصر کے کھنڈرات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تم شمال کی جانب بڑھتے جانا۔ ڈیڑھ میل کے بعد تمہیں ایک پہاڑی نما پتھریلا ٹیلا ملے گا۔ اس ٹیلہ پر چڑھو گے تو تمہیں مشرق کی ایک جانب چھوٹا سا مضبوط مقبرہ جواہرام کی طرز پر بنا ہے دکھائی دے گا۔ بس یہی انتانیہ کا مقبرہ ہے اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی باہری فصیل کے جنوبی پھاٹک پر قدیم مصری زبان میں یہ عبادت کندہ ہے۔

"اس کا مقبرہ..... جو بیدار کی جائے گی۔"

اپنے بیٹے سے کہہ دینا کہ وہ دیوانگی کی حدوں کو نہ چھوئے، انتانیہ کی روح بھٹک رہی ہے اور اگر اس کو عملیات یا دیگر روحانی طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ انتہائی خطرناک حرکتوں کا بھی ارتکاب کرسکتی ہے۔

اس کا فرض ہے کہ وہ فی الحال انتانیہ کو ایک خواب ہی سمجھے۔ حالانکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انتانیہ کی روح آج بھی دہلی میں موجود ہے اور شاید اسی جگہ تمہارے بالکل نزدیک جہاں تم یہ خط پڑھ رہے ہو۔"

حسام الدین نے گہری اور ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ خط ختم کیا اور سوچ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوگئے کہ انتانیہ ان کے قریب موجود ہے۔ تھرتھراتی

عقلمند عورت

شاعر:

ہمیں تو اپنوں نے لوٹا غیروں میں کہاں دم تھا
ہماری کشتی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا

بیوی:

تم تو تھے ہی نابلد تمہاری عقل میں کہاں دم تھا
کشتی لے کر ہی کیوں گئے جہاں پانی کم تھا

عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ عورت کو کسی تنظیم، فیکٹری یا سربراہ مملکت بننے سے منع کیا جاتا ہے مگر دور جدید میں یہ بات پس پشت ہوکر رہ گئی ہے اور عورتیں بہت بڑے بڑے کام کرنے لگی ہیں جبکہ کئی ممالک میں عورت سربراہ کی ذمہ داری بہ احسن و خوبی سرانجام دے چکی ہے۔

اور پھر اس شعر سے بھی اندازہ ہورہا ہے۔

(شمس الحق - کراچی)

ہوئی نظروں کے ساتھ انہوں نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ اور ان کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

برج کے نیچے انتانیہ اپنے قدیم لباس میں موجود تھی۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اور وہ اپنی نیلی آنکھوں سے فصیل کے باہر مختار کو دیکھ رہی تھی جو باپ کے انتظار میں بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔

چیخ کے ساتھ ہی انتانیہ کی پرچھائیں غائب ہوگئی۔

کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ حسام الدین جس نے زمانے کی سختی اور نرمی کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا تھا۔ وہ جو مصر کے اسرار کا دیوانہ تھے۔ اور جو قدیم مصر کی تہذیب کا حال معلوم کرنے کے لئے اپنی جان تک دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مکان سے باہر آئے اور فصیل کے باہر کھڑے ہوکر ایک مرتبہ خالی برج

اور دوسری مرتبہ فصیل کے باہر کھڑے ہوئے اپنے بیٹے مختار پر نظر ڈالی۔ اور جیسے باپ کی تمام محبت، شفقت اور تمام جذبات اس کی آنکھوں میں امنڈ آئے۔

بوڑھے خان بہادر نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گہری سانس لیا اور زیر لب فیصلہ کیا۔

''مختار کی خاطر مجھے شہزادی انتانیہ کی بے چین روح کو سکون دینا ہی پڑے گا..... میں مصر جا کر اس کا مقبرہ ضرور کھودوں گا۔ ورنہ انتانیہ کی روح میرے بیٹے کو دیوانہ بنا دے گی۔''

لیکن سوال یہ تھا کہ تابوت میں سوتی ہوئی انتانیہ کی زندہ ممی کو بیدار کیسے کیا جائے.....؟

☆.....☆.....☆

خان بہادر حسام الدین ایسے مصر پرست کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ تغلق آباد کے کھنڈرات میں یہ واقعات پیش آئیں گے اور ان کی نہ صرف انتانیہ سے بلکہ ایک ایسے انسان سے بھی ملاقات ہوگی جس پر انسان سے زیادہ فوق البشر اور فوق البشر سے زیادہ جن ہونے کا شبہ کیا جاسکتا ہے۔

تقریباً تین بجے رات تک وہ سو نہ سکے۔ خیالات کا ہجوم ان کو نیند سے دور کرتا رہا، اور وہ انتانیہ، بوڑھے عبادت گزار اور مختار کی تثلیث میں الجھ کر رہ گئے۔ وہ جاگتے رہے اور عالم بیداری میں انتانیہ کی زندہ لاش کو دیکھتے رہے اور باہر تمام رات بارش ہوتی رہی بجلی چمکتی رہی اور بادل اتنے زور سے گرجتے رہے گویا ہزاروں توپیں ایک ساتھ چلائی جارہی ہوں، اور جب ان کو کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ مسہری سے اٹھ کر آتش دان کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور آگ کے شعلوں کو اس طرح دیکھتے رہے۔ گویا اس آگ کے شعلوں میں بھی ان کو انتانیہ کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

اسی کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ سو گئے۔ اور جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو بارش تھم چکی تھی، ابھرتے سورج کی کرنوں کا عکس پانی میں رنگ رنگ کے بلبلوں پر رقص کررہا تھا۔ بھیگے ہوئے درخت تمام رات کی طوفانی بارش سے ڈرے سہمے کھڑے تھے اور دور سے ان کی بہن شمیم کی آواز آرہی تھی۔ شاید وہ اپنے کسی نوکر کو ڈانٹ رہی تھیں۔

ناشتہ سے قبل حسام الدین خلاف معمول اپنی لائبریری میں گئے اور دیر تک شہزادی انتانیہ کی تصویر کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے حد یہ کہ اسی عالم میں ان کے ہونٹوں پر ایک ہیبت ناک تبسم پیدا ہوا اور سگار منہ میں دبائے ناشتہ کی میز پر آگئے۔ غالباً وہ کوئی سخت فیصلہ کر چکے تھے۔

شمیم بانو میز پر اپنے بھائی اور مختار کا انتظار کررہی تھیں۔ لیکن جب بھائی کے آجانے کے بعد مختار نہ آیا تو انہوں نے کہا۔ ''مختار کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ آج بھی اس نے ناشتہ میں دیر کردی۔''

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھیں کہ مختار کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید تھا، آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات تھے اور بالوں کی بے ترتیبی یہ گواہی دے رہی تھی کہ جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔ بیٹے کی یہ حالت باپ سے چھپی نہ رہ سکی..... اور انہوں نے پوچھا۔ ''کیوں مختار..... کیا تم رات دیر سے سوئے تھے۔''

''نہیں بابا۔'' مختار کی آواز میں بھی مردنی تھی۔

''کیوں؟''

''بابا..... آپ یقین کریں یا نہ کریں بہرحال شہزادی انتانیہ..... رات بھر ہماری کوٹھی میں موجود رہی۔''

''وہ کیسے؟''..... گھبراہٹ میں خان بہادر کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔

''میں دس بجے رات کو ہی سو گیا تھا۔ لیکن تیز بارش کی آواز سے اچانک میری آنکھ کھل گئی اور جب کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی، سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور مجھے بارش سے دھلی ہوئی یہ ہوا اتنی اچھی لگی کہ میں وہیں کھڑکی کے نزدیک کھڑے ہو کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا، جو بالکل سنسان تھی۔ اور جس پر بارش کے باوجود ایک

پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

اور میں نے دیکھا کہ ایک سایہ کوٹھی کا آہنی پھاٹک کھول کر داخل ہوا۔ پھاٹک کے نزدیک بالکل اندھیرا تھا لیکن جب وہ سایہ روشنی میں آیا تو وہ انتانیہ تھی۔ جی ہاں انتانیہ جو غور سے میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہی لباس، وہی نیلی آنکھیں، ویسے ہی سنہرے بال اور گلے میں سونے کا ویسا ہی باریک سانپ جو اس کی تصویر میں موجود ہے۔

صاف ظاہر ہے ابتداء میں میں نے اس کو اپنا وہم سمجھا اور بحیثیت انسان ڈر کر اپنے کمرے کی کھڑکی بند کردی، چند منٹ تک حسب معمول بارش اور گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دی لیکن اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی جارہی ہے۔ قریب تھا کہ میرے منہ سے چیخ نکل جاتی لیکن میں نے دل مضبوط کرکے دروازہ کھولا کہ شاید کوئی نوکر ہی کسی ہنگامی ضرورت کی وجہ سے دستک دے رہا ہو لیکن راہداری میں بالکل سناٹا تھا۔

ماتھے کا پسینہ پونچھ کے میں نے دروازہ بند کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ ابھی میرے خیالات میں یکسوئی آئی بھی نہ تھی کہ اچانک پھر دستک کی آواز سنائی دی۔ ایک بار..... دو بار..... تیسری بار ہلکی ہلکی جیسے دستک دینے والے کے نازک ہاتھ تھکے جارہے ہوں۔ اس مرتبہ میں واقعی ڈر گیا۔ میری ہمت جواب دے گئی۔ رات کے پرہول سناٹے نے میرے خوف میں مزید اضافہ کیا۔ میں نے چاہا کہ میں چیخ مار کر آپ سب کو مدد کے لئے پکاروں لیکن چیخ میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ میں نے کوشش کی کہ اٹھ کر دروازہ کھولوں لیکن میرے قدم جم کر رہ گئے اور جیسے سارا بدن سن ہوگیا مجھے نہیں معلوم کہ میری نیم بے ہوشی کی یہ کیفیت کتنی دیر تک باقی رہی۔ لیکن جب میں نے اپنے حواس پر قابو پایا تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میرے سرہانے نیلے گلاب کا ایک پھول موجود تھا۔ بالکل ویسا ہی پھول جیسا شہزادی انتانیہ کی تصویر میں موجود ہے۔

میں نے یہ پھول اپنے کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھانا چاہا لیکن اٹھا نہ سکا۔ رات اسی طرح گزر گئی۔ اور تمام رات میں ایسا محسوس کرتا رہا جیسے کوٹھی کے باغیچے میں کوئی نرم و نازک وجود چہل قدمی کررہا ہے۔''

مختار نے یہ کہہ کر اپنی بند مٹھی کھولی۔ گلاب کا نیلا پھول اب بھی بالکل تر و تازہ تھا۔

خان بہادر حسام الدین نے غور سے اس پھول کو دیکھا اور اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ اور دوبارہ ناشتہ میں مصروف ہوگئے۔

شمیم بانو جو غور سے بھتیجے کی آپ بیتی سن رہی تھیں ناشتہ کی طرف قطعی متوجہ نہیں ہوئیں۔ اور نہوں نے کہا..... ''میرے خیال میں مختار پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے۔''

حسام الدین نے بہن کی اس خلوص میں ڈوبی ہوئی بے معنی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور ناشتہ کرتے رہے۔ گویا ان کے خیال میں مختار کی یہ سرگزشت متوقع تھی اور انہیں اس کا پہلے سے علم تھا۔

''آج رات تم میرے کمرے میں سونا..... انتانیہ کے سلسلے میں کل رات میں نے بھی ایک اہم فیصلہ کیا ہے اور کل صبح آقا مصدق طہرانی کی آمد کے بعد میں اپنا کام شروع کردوں گا۔''

''کیا کام.....؟'' مختار نے بے چین ہو کر پوچھا۔

''انتانیہ کی بیداری کا کام میں اسے بیدار کرکے رہوں گا.....'' حسام الدین نے مضبوط قوت ارادی کے ساتھ جواب دیا۔

''یہ انتانیہ کون ہے۔ آپ کس کی بیداری کا تذکرہ کررہے ہیں.....'' شمیم بانو نے بھائی سے سوال کیا۔ اور بھائی نے کہا۔ ''ایک شہزادی..... جو سو رہی ہے اور یہ میرا حکم ہے کہ آج کے بعد اس مسئلہ پر تم مجھ سے کوئی بات نہ کرنا۔''

بھائی کا حکم سن کر شمیم خاموش ہوگئیں، حسام

الدین ناشتہ سے فارغ ہوکر چلے بھی گئے لیکن مختار اس طرح کرسی پر بیٹھا رہا جیسے وہ بے انتہا تھک گیا ہو۔

☆.....☆.....☆

دوسرا دن اور دوسری رات خیریت سے گزری سوائے اس کے کہ مختار کے بے چین دل کو کسی طرح قرار نہ آیا..... اور جب صبح ہوئی تو مصدق طہرانی جو حسام الدین کے ٹیلی گرام پر بذریعہ ہوائی جہاز صبح آٹھ بجے دہلی پہنچ رہے تھے۔

حسام الدین اور مختار دونوں وقت سے بیس منٹ پہلے ہوائی اڈے پہنچ گئے ٹھیک آٹھ بجے جہاز پالم کے ہوائی اڈے پر اترا..... اور تمام مسافر جہاز سے باہر آئے تو خان بہادر کو دور ہی سے مصدق طہرانی کا چہرہ دکھائی دینے لگا کیونکہ طہرانی کا قد کسی حال میں ساڑھے فٹ سے کم نہ تھا، ان کے خدوخال کافی دلآویز تھے، چمکدار بھورے بالوں میں نہایت خوش اسلوبی سے کنگھی کی ہوئی، چہرے پر مختصر سی مونچھیں تھیں اور خفیف سی داڑھی تھی اور جسم پر ایرانیوں کا قومی لباس تھا۔

طہرانی نے بھی حسام الدین کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ اٹھا کر ہیلو..... ہیلو..... کیا..... اور حسام الدین کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب وہ باہر آئے تو حسام الدین نے دوڑ کر ان سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہونے کے بعد مختار سے ان کا تعارف کرادیا طہرانی نے پرخلوص دعاؤں کے ساتھ مختار کے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک مرتبہ پھر خان بہادر سے خیریت دریافت کی۔

''آپ کا تفصیلی تار پڑھ کر میں گھبرا سا گیا اور گو مجھے بالکل فرصت نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کہ جلد از جلد آپ کی مطلوبہ چیزوں کے ساتھ اپنے دوست کی مدد کے لئے دہلی پہنچ جاؤں۔'' طہرانی نے حسام الدین سے مخاطب ہوکر کہا اور مختار یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ ان کی آواز میں موسیقی کی سی ملاحت ہے۔

''آقائے طہرانی..... میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں..... بہرحال آپ کوٹھی چلئے دوپہر کے کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں ہوں گی۔'' خان بہادر حسام الدین نے گرمجوشی سے طہرانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ اور پھر تینوں آدمی کار میں بیٹھ گئے۔

آقا مصدق طہرانی پیدائشی طور پر ایرانی تھے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ مصر میں گزرا تھا۔ قدیم مصر کے اسرار معلوم کرنا ہی ان کی زندگی کا مقصد تھا۔ مصر کی قدیم زبان پر ان کو عبور حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر یورپ اور امریکہ بلائے جاتے تھے کہ وہ مصری مقبروں کی کھدائی میں نکلے ہوئے سنگی کتبوں کو پڑھ دیں۔ آقا مصدق حکومت مصر کی اجازت کے بعد قدیم مقبروں کی کھدائی اکثر خود بھی کرواتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے اکثر عجائب خانوں میں انہی کے فردخت کردہ مصری نوادر موجود تھے۔ خان بہادر حسام الدین کی کوٹھی بھی انہی کی بیچی ہوئی مصری چیزوں سے سجی ہوئی تھی اور یہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ حسام الدین کی کوٹھی مصری طرز تعمیر کی بنیادوں پر بنائی گئی اور اس کو اس انداز سے سجایا گیا کہ کوٹھی کے ہر گوشے سے قدیم مصر کی تاریخ و تہذیب کی بو آنے لگی۔

کوٹھی کی لائبریری میں شہزادی انتانیہ کی جو تصویر موجود تھی وہ ایک مصور نے اس تصویر کو سامنے رکھ کر بنائی تھی جو آقا طہرانی کو چند پرانی دستاویزوں کے ساتھ مصر میں ایک قدیم مقبرہ کی کھدائی کے وقت ملی تھی۔ اور خان بہادر حسام الدین نے اس اصلی تصویر اور تمام دستاویزوں کا از سر نو مطالعہ کرنے اور اپنے اگلے پروگرام میں طہرانی کی ہر ممکن امداد حاصل کرنے کے لئے مصدق کو تہران سے بلالیا تھا، جہاں وہ عمر کے آخری ایام سکون سے بسر کررہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد حسام الدین مختار اور طہرانی گفتگو کرنے کے لئے اس کمرہ میں بیٹھ گئے جس میں طہرانی کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور حسام الدین نے شروع سے اب تک کے تمام واقعات طہرانی کو سنادیئے۔

''انتانیہ کی روح واقعی بھٹک رہی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اشتراک و تعاون سے اس کی روح کو سکون دے دوں۔'' حسام الدین نے تمام واقعات سنانے کے بعد امید بھرے لہجہ میں کہا۔

''میرے دوست بڑھاپے نے ایک بڑی حد تک مجھے مضمحل کردیا ہے۔ اور میں نہیں چاہتا کہ عمر کے اس آخری دور میں کوئی سخت کام کروں لیکن اس حادثہ کی تفصیل نے خود میرا شوق بیدار کردیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم میں آپ کو میرا ہر ممکن تعاون حاصل ہوگا حقیقت یہ ہے کہ رعمیس نہم کے زمانے سے اب تک زندہ انسانوں کا مقبرہ بنانے کی تجویز کسی بنی نوع انسان کے لئے نہیں بنائی گئی ہوگی۔'' طہرانی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ اور پھر اپنا وہ چرمی سوٹ کیس کھولا جس کو وہ ہوائی جہاز سے اترتے وقت اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔

چرمی سوٹ کیس کو انتہائی احتیاط سے کھولنے کے بعد انہوں نے ایک داغدار بوسیدہ تین فٹ لمبا چمڑہ جس کا ایک حصہ غائب تھا نکالا اور قریب کی میز پر پھیلا دیا۔۔۔ بس یہی وہ آخری دستاویز ہے۔ جو انتانیہ کی گمشدہ زندگی پر روشنی ڈال سکتی ہے۔'' طہرانی نے یہ کہتے ہوئے دستاویز پر بنی ہوئی ایک تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور مختار نے دیکھا کہ لائبریری والی تصویر اس تصویر کی ایک صاف ستھری نقل ہے۔ اس کی نگاہیں اس ہزاروں سال پرانی تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تصویر سے جھانکنے والی شہزادی انتانیہ کی آنکھیں ایک ساحرہ کی طرح اس کو اپنے سحر سے ساکت کرتی جارہی ہیں۔

''بلاشبہ یہ تصویر قدیم مصری اہل فن کی مصوری کا انوکھا شاہکار ہے اور اس دستاویز میں جو بہرحال نامکمل ہے تفصیل کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ زندہ شہزادی انتانیہ کی تصویر و تکفین کیسے کی گئی۔'' طہرانی نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔ ''اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں اس دستاویز کا مالک ہوں جو مجھے آج سے تقریباً 27 سال قبل ایک مقبرہ کے کھنڈروں کی کھدائی کے وقت ایک آہنی صندوق میں موم جامہ کئے ہوئے تھی۔ موم جامہ کھولتے ہی میں نے پہلی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی عام وصیت نامہ نہیں ہے جو عموماً ممی کے ساتھ دفن کردیا جاتا تھا چنانچہ میں نے دستاویز کے ان حصوں کو بڑی عرق ریزی سے صاف کیا جو خراب ہوگئے تھے، اور جب میں نے دستاویز پر لکھی ہوئی پوری کہانی پڑھ لی تو مجھے یقین ہوگیا کہ یہ دستاویز نہ صرف لاثانی بلکہ انمول ہے کیونکہ اس پر سیٹی اول کی حکومت کے آخری ایام کی تاریخ اور اس کی مہر ثبت تھی جس کی مصر میں 1320 قبل مسیح حکومت تھی یعنی اس طرح یہ دستاویز تقریباً تین ہزار دو سو سال پرانی ہوچکی تھی۔

سیٹی اول کے دور حکومت میں ممی بنانے کا فن اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا، ممی بنانے کے سلسلے میں حکماء اور فن کار روز نئے نئے تجربے کرتے تھے اور فرعون ان کی سرپرستی کرکے ان کو انعام واکرام دیتا رہتا تھا۔ اس دستاویز میں یہ درج ہے کہ ممی بنانے کے فن کے ماہر کے ایک گروہ نے جو خاص طور پر سیٹی اول کے حکم سے متعین کیا گیا تھا سالہا سال کے مطالعہ اور تجربوں کے بعد ایک ایسی منزل پر پہنچادیا جو نتیجہ معلوم کئے بغیر ادھوری ہی کہی جاسکتی تھی۔ ان ماہرین کا مقصد تھا کہ وہ ایک زندہ انسان کی ممی بنائیں اور پھر اسے ایک مقررہ مدت تک زندہ بھی رکھیں۔''

دونوں باپ بیٹے طہرانی کی گفتگو میں منہمک رہے اور طہرانی کہتا رہا۔ ''یہ دستاویز دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلا حصہ مکمل ہے اور دوسرا نامکمل کیونکہ اس کا ایک حصہ غائب ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا حصہ اس میں شامل نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ'' یہاں اس نے اپنی لمبی انگلی دستاویز پر رکھی۔ ''اس پھٹے ہوئے حصہ تک تقریباً تین سو برس کی داستان ضرور ختم ہوگئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر سات فرعونوں کے کاتبوں کے نام وستخط درج ہیں۔

اگر میرا علم صحیح ہے اور میں نے اس کو غلط نہیں پڑھا ہے تو میرے خیال میں اس دستاویز کا پہلا مختصر حصہ سیٹی اول کے اختتام سلطنت کے آخری ایام میں لکھا گیا ہے اور اس میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ

فرعون دوران سیٹی اول کی منشاء حاصل کر کے تجہیز و تکفین کے دیوتا ''ایمون راع'' کے ایک کاہن اعظم کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ نہ صرف انسانی جسم بلکہ اس کی روح بھی مخصوص حالات میں ایک محدود عرصہ تک اپنی اصلی حالت میں باقی رکھی جاسکتی ہے۔''

''ایمون راع'' کے اس کاہن اعظم کو یقین تھا کہ اس نے ہر وہ انتظام کرلیا ہے جو روح انسانی کی بقاء کے اس تجربہ کو کامیاب بنانے میں مدد و معاون ثابت ہوسکے چنانچہ اس نے اپنے اس فلسفہ کو کامیاب بنانے کے لئے فرعون کی سرپرستی حاصل کرنا چاہی اور وہ یہ شاہانہ سرپرستی حاصل کرنے میں فتح یاب بھی ہوگیا۔

تجربہ میں فرعون کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں۔

تراشے ہوئے خوب صورت، عالیشان مقبرے اور لافانی اہرام سیٹی اول کی سطوت و شوکت کے اظہار کے لئے ناکافی خیال کئے گئے، اس لئے یہ طے پایا کہ آنے والی نسلوں اور مستقبل کی دنیا کے سامنے مصر اور فرعون مصر کی عظمت پارینہ کی تصدیق کرنے کے لئے ایک زندہ یادگار قائم ہونا چاہئے۔ اور اس باعزت اور باعث افتخار یادگار کے لئے شہزادی انانیہ نے جو متناسب اعضاء نیلی آنکھوں اور رنگ و روپ کے اعتبار سے اپنے دور کی سب سے خوب صورت شہزادی تھی خود کو پیش کردیا۔

دستاویز کے پہلے حصہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شہزادی انانیہ کو مصر کے ایک دور افتادہ علاقے ''یونا'' کے ایک شہزادے سے جس کا نام ''اُحمس'' تھا شدید محبت تھی، اُحمس اپنے دور کا ایک بہادر جنگجو افسر بھی تھا اور خود بھی انانیہ پر ملتفت تھا لیکن دیوتاؤں کو شاید محبت کا یہ رشتہ پسند نہیں آیا اور شہزادی انانیہ کی مرضی کے بالکل خلاف اس کی منگنی ''اسپاتا'' نام کے ایک بزدل اور عیاش شہزادے سے کردی گئی۔ جب کہ انانیہ کو موت منظور تھی لیکن کسی حال میں یہ پسند نہ تھا کہ اس کے دل کی دنیا میں اُحمس کے علاوہ کوئی اور اپنی دنیا آباد کرے۔

اسی اثناء میں ''اُحمس'' شمالی جنگوں میں مارا گیا اور انانیہ کی نظروں میں دنیا تاریک ہوگئی۔ اُحمس کی موت کے بعد انانیہ کا یہ معمول ہوگیا تھا کہ وہ ہر رات کو سفید لباس پہن کر ایک ایسی بگھی میں سوار ہوکر جس میں کالے گھوڑے جتے ہوتے تھے اُحمس کے مقبرہ جاتی اور اس کے دروازے پر نیلے گلاب کا ایک پھول جو اس کو بے حد پسند تھا رکھ کر روتی ہوئی واپس آجاتی۔ وہ اپنی اس نامراد زندگی سے عاجز ہوکر ہر لمحہ موت کی دعا مانگتی تھی اور اس نے ایک دن سیٹی اول کے سامنے دوزانو ہو کر ''اسپاتا'' سے شادی کرنے سے انکار بھی کردیا۔

قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ اگر جسم باقی رہے تو مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی دن روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل ہوگی اور مردہ ایک مرتبہ پھر زندہ ہوجائے گا بدنصیب انانیہ کو بھی اس عقیدہ پر یقین تھا چنانچہ جب اس نے سنا کہ ''ایمون راع'' کے کاہن اعظم کو اپنے اس تجربہ کے لئے ایک زندہ انسان کی ممی بنائے جانے اور اس کی روح کو ایک لامحدود عرصہ تک باقی رکھا جائے تو اس کے لئے ایک انسانی جسم کی ضرورت ہے تو اس نے اس تجربہ کے لئے اپنے جسم کی خدمات پیش کردی۔ تاکہ اگر تجربہ کامیاب ہو تو اس وقت تک اس کی روح اور اس کا جسم اپنی تمام تر تازگی، شگفتگی اور جوانی کے ساتھ باقی رہے جب تک کہ دیوتاؤں کے حکم سے ''اُحمس'' کی روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل نہ ہوجائے۔

''شہزادی انانیہ کو یقین تھا کہ اپنے زندہ جسم کے ساتھ ہزاروں سال کی گہری اور پرسکون نیند کے بعد جب وہ بیدار ہوگی تو اس کی ملاقات اپنے محبوب سے ضرور ہوگی۔''

چند منٹ کے سکوت کے بعد طہرانی نے دوبارہ اپنا سلسلہ کلام جاری کیا۔ ''اس دستاویز میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ شہزادی انانیہ کے زندہ جسم کی ممی کس طرح بنائی گئی اور ضرورت کے وقت اس کو کس طرح بیدار کیا جائے گا۔ لیکن اس میں یہ ضرور لکھا ہے کہ جب فرعون نے انانیہ کی پیشکش قبول کرلی تو اس کے لئے نیل کے کنارے ایک خاص قسم کا زمین دوز مقبرہ بنایا گیا اور پھر

کاہن اعظم کی نگرانی میں اس کو ایک سنگی تابوت میں پرسکون، گہری اور مسلسل نیند میں سلادیا گیا۔

اور اس طرح سیٹی اول کے دور حکومت میں اپنی نوعیت کے ایک انوکھے تجربے کا آغاز ہوگیا۔ بظاہر یہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوتا ہے۔ طاقت اور جھوٹی خدائی کے نشہ میں چور ایک دیوانے فرعون کا خواب جس نے ایک بے کس و شیزہ کی زندگی ایک مسلسل نیند میں تبدیل کردی۔

لیکن دستاویز کا دوسرا حصہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سیٹی اور دیوتا ایمون راع کا کاہن اعظم نے جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر بعد کے فرعون دیکھتے رہے۔ یعنی انانیہ زندہ رہی اور بند آنکھوں کے ساتھ زندگی بھر سانسیں لیتی رہی۔

دستاویز کے دوسرے نامکمل حصے میں جو حالات درج ہیں ان کے بموجب ہر فرعون وقت مقررہ پر انانیہ کا مقبرہ کھول کر اس کام کے لئے متعین کاہنوں کی موجودگی میں خوابیدہ انانیہ کو جگا کر اس کی موت و حیات کا امتحان لیتا تھا اور دستاویز تجربہ کی کامیابی کی مہر لگا کر دوبارہ مقبرہ بند کردیتا تھا۔ سیٹی اول کی وصیت کے بموجب ہر پچاس برس کے بعد یہ امتحان ضروری تھا، چنانچہ دستاویز بتاتی ہے کہ مقبرہ کا دروازہ سات مرتبہ کھولا گیا اور اس کے ثبوت میں اس پر سات فرعونوں کے دستخط موجود ہیں۔

سیٹی اول نے انانیہ کے سنگی تابوت کے قریب وہ تمام دوائیں رکھ دی تھیں جن سے انانیہ کو بیدار کیا جاسکتا تھا اور ایک چکنے پتھر پر جگانے کا طریق کار کندہ کرادیا تھا۔ ایک کے بعد ایک سات فرعون اس پر عمل کرکے انانیہ کی ناقابل یقین نیند سے بیداری اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور دستاویز پر نتیجہ کا اندراج کرتے رہے۔ یہ اندراج اسی رنگ سے کیا جاتا تھا جو اس فرعون کا قومی اور سرکاری رنگ ہوتا تھا چنانچہ دستاویز میں واقعی سات رنگ موجود ہیں۔ فرعون کے علاوہ کاہن اعظم بھی تصدیق کے لئے دستخط کرتا تھا اور ایک الگ حاشیہ پر اپنے تاثرات بیان کردیتا تھا۔ دستاویز کی صداقت کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ ہر کاہن اعظم کا خط ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ دستاویز کا جو حصہ ضائع ہوچکا ہے اس میں کیا تحریر تھا اور بعد کے کیا واقعات بیان کئے گئے تھے لیکن ساتویں فرعون نے خود اس میں اپنے ہاتھوں سے مہر لگانے کے بعد یہ لکھا ہے کہ ''تادم تحریر شہزادی انانیہ زندہ ہے۔''

طہرانی نے مزید کہا۔ ''آج سے 27 سال قبل جب میں مصر میں تھا اور آج بھی جب کہ میں مصر اور اس کے اسرار سے سینکڑوں میل دور ہوں مجھے یقین تھا اور ہے کہ یہ دستاویز اور اس میں بیان کردہ تفصیل موجودہ دنیا کی حکمت سرجری اور سائنس کو باطل ثابت کرسکتی ہے بشرطیکہ انانیہ کا مقبرہ دریافت کرلیا جائے، میں ہمیشہ سے قدیم مصری تہذیب کا دیوانہ تھا چنانچہ میں مصر کے اس اسرار کا پرچم ساری دنیا پر لہرانے کے لئے انانیہ کا مقبرہ تلاش کرتا رہا۔ اور مسلسل پانچ سال تک وادی نیل میں گھومتا رہا کہ شاید مجھے یہ مقبرہ مل جائے اور میں سیٹی اول کی ہدایت پر عمل کرکے اس انانیہ کو نیند سے بیدار کردوں جو تقریباً ساڑھے تین ہزار سال سے اپنے تابوت میں سو رہی ہے اور اس کی منتظر ہے کہ وہ جاگے اور جاگ کر اپنے محبوب اُحمس سے ملاقات کرے۔ لیکن اپنی ہر ممکن کوشش کے باوجود میں مقبرہ کی تلاش میں ناکام رہا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے پورا یقین ہے کہ شہزادی انانیہ کا زندہ جسم آج بھی اپنے زمین دوز مقبرہ کے سنگی تابوت میں سو رہا ہے۔ لیکن اب شاید حرمان نصیب شہزادی کی روح اپنے جسم کی بیداری کے لئے بے چین ہوگئی ہے۔ شاید اس لئے کہ اس کی بھٹکی ہوئی روح نے اپنی محبت کے مرکز ''اُحمس'' کو دنیا کے کسی گوشے میں کسی اور نام یا کسی اور قالب میں دیکھ لیا ہو۔ اور وہ اپنے محبوب سے اس ملاقات کے لئے جس کی خاطر اس نے ایک خطرناک تجربہ کے لئے اپنے جسم کی پیش کش کی تھی بے چین ہوگئی ہو۔ شہزادی کی روح جانتی ہے کہ جسم کے بغیر روح بیکار ہے اور شاید اسی لئے اس کی روح کو اپنے اس زندہ جسم کی ضرورت محسوس

ہو رہی ہے جو اپنے تابوت میں سو رہا ہے۔''

شدت جذبات سے طبرانی کی آواز بھرا گئی۔ وہ چند منٹ تک بالکل خاموش رہا اور اپنی نم آنکھوں سے اس دستاویز کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس دستاویز کو اسی طرح تہہ کرکے چرمی سوٹ کیس میں رکھا اور کہا۔

''دوست حسام الدین تمہارے دل پر کچھ بھی بیتے اور تمہیں کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ انتانیہ کا محبوب شہزادہ احمس تمہارا بیٹا مختار ہی ہے..... ورنہ انتانیہ کی روح دہلی کو اپنا مرکز نہ بناتی۔ رات کی تاریکی میں اس کی روح تمہاری کوٹھی کے مختلف کمروں میں نہ بھٹکتی اور مختار کی خواب گاہ میں داخل ہو کر نیم بے ہوش مختار کے سرہانے نیلے گلاب کا پھول نہ رکھتی۔

میں نہیں جانتا کہ تمہارے بیان کے بموجب تغلق آباد کے کھنڈروں میں تم سے ملاقات کرنے والا وہ بزرگ کون تھا۔ لیکن انتانیہ کے بارے میں اس کے انکشافات اور پھر تمہارے نام اس کے خط میں انتانیہ کے مقبرہ کا مکمل پتہ یہ ضرور ثابت کرتا ہے کہ وہ فوق البشر ضرور تھا۔ اور وہ خود چاہتا ہے کہ انتانیہ کو مسلسل نیند کی قید سے نجات مل جائے۔

''اس لئے آؤ میرے دوست ہم دونوں مل کر انتانیہ کا مقبرہ تلاش کریں اس کو اس کی نیند سے بیدار کریں اور ایک عورت کو اس کے محبوب سے ملا دیں۔''

حسام الدین اور مختار دونوں پر سکتہ طاری تھا، طہرانی کی اس لمبی گفتگو اور جذباتی خواہش کے اظہار کے بعد بھی دونوں کئی منٹ تک خاموش رہے۔ ایک مرتبہ پھر حسام الدین کے چہرے پر شاداب مسکراہٹ پھیلی اور انہوں نے مختار کی طرف دیکھتے ہوئے طہرانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''میرے دوست۔ میں خود انتانیہ کے مقبرہ کی تلاش میں تمہاری مدد چاہتا تھا اور اسی لئے سابقہ تعلقات کے پیش نظر میں نے تمہیں تار بھیج کر یہاں بلوالیا۔ لیکن مختار کے قالب میں انتانیہ کے محبوب شہزادے احمس کی روح موجود ہے یہ میں ماننے کے لئے تیار نہیں اس لئے کہ میں آواگون کا قائل ہی نہیں۔''

''میں مہم کی افادیت اور اس کے مقاصد کے پیش نظر تم سے مسئلہ تناسخ پر کوئی بحث کرنا بھی نہیں چاہتا۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل نہیں ہوں لیکن تم دیکھ لینا کہ اگر ہمیں انتانیہ کا تابوت مل گیا اور ہم اس کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مختار ہی احمس ثابت ہوگا۔'' طہرانی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔ ''خیر'' طہرانی نے کچھ توقف کے بعد حسام الدین سے کہا۔ ''تمہارا آخری فیصلہ کیا ہے؟''

''ہم تینوں آدمی اردن اسپتال کے ڈاکٹر بیگ کے ہمراہ اگلے ہفتہ مصر کے لئے روانہ ہو جائیں گے۔ آج سے انتانیہ کے تابوت کی تلاش ہی میرا مقصد حیات ہے۔''

اور حسام الدین کے اس جملہ نے جیسے کمرے کی پرسکون فضاء ہی بدل دی۔

☆.....☆.....☆

تین دن تک کوٹھی میں کوئی قابل ذکر واقعہ رونما نہیں ہوا۔ حسام الدین سرگرمی سے مصر کے سفر کی تیاریوں میں مصروف رہے، اور انہوں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد ڈاکٹر بیگ کو بھی سفر میں شریک ہونے کے لئے رضامند کرلیا۔ ڈاکٹر بیگ کا کہنا تھا کہ انتانیہ اور اس کی روح کا قصہ ایک جھوٹی اور بے بنیاد کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، وہ سفر میں جانے کے لئے بالکل تیار نہ تھے لیکن حسام الدین کی ضد کے آگے آخر کار انہیں سر تختہ خم کرنا ہی پڑا، اور انہوں نے بھی تین ماہ کی چھٹی لے کر تیاریاں شروع کردیں۔

دھیرے دھیرے حسام الدین کے حلقہ احباب میں یہ خبر پھیل گئی کہ وہ کسی اہم مہم پر مصر جانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ چنانچہ ایک دن ان کے دو دوست جن میں ایک فلسفہ اور ریاضی کا پروفیسر ارشد تھا اور دوسرا علم کیمیا و دہیت کا ماہر احمد ریاض تھا، ان سے الوداعی ملاقات کرنے کے لئے کوٹھی آئے۔ جہاں حسام الدین نے ان کا تعارف اپنے ایرانی دوست طہرانی سے بھی کرایا۔ اور اس طرح ڈاکٹر بیگ کی موجودگی میں سفر کی نوعیت پر ایک دلچسپ گفتگو شروع ہوگئی۔

''کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہوگی اور آپ یلیتھا کا زندہ جسم حاصل کرکے اس کو بیدار کرلیں گے۔'' پروفیسر ارشد نے سگار کا دھواں منہ سے چھوڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ مجھے پورا یقین ہے۔'' حسام الدین کے بجائے مصدق طہرانی نے جواب دیا۔

''لیکن مجھے نہیں۔'' پروفیسر ارشد نے گردن ہلا کر کہا۔

''یقین نہ ہونے کا سبب۔'' حسام الدین نے سوال کیا۔

''اس لئے کہ میں اس کہانی کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔'' پروفیسر ارشد نے منہ بنا کر کہا اور پروفیسر کے اس روکھے جواب نے کمرہ کی فضا مکدر کردی۔

پروفیسر عام حالات میں بھی بے حد خشک مزاج اور آہستہ گو تھا۔ وہ صرف اس مسائل پر گفتگو کرنے میں جوش دکھاتا تھا جس میں خود اس کی دلچسپی ہو اور اسی لئے اس کے احباب اس کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے۔ لیکن طہرانی وہ اس کے دوستوں میں تو نہ تھا؟

احمد ریاض ایک دراز قامت اور خوش گفتار بوڑھا تھا جس میں خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، جسمانی اعتبار سے وہ گول مول قسم کا انسان تھا، جس کا چہرہ سرخ، سر ضرورت سے زیادہ بڑا اور بال بالکل بھورے تھے۔

اور ان سب کے برعکس طہرانی کی خوش مزاجی یا بدمزاجی کا دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ اس محفل میں وہ سب سے زیادہ دانا اور سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، دنیا کے مہذب یا غیر مہذب بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جہاں کی سیاحت اس نے نہ کی ہو۔ حد یہ کہ وہ ایمیزن کے جنگلات بھی دیکھ چکا تھا اور تبت کے پراسرار دیہات بھی۔ اس کو پروفیسر ارشد کا جواب برا تو بہت لگا لیکن پھر بھی مسکرا کر خاموش ہوگیا۔

ادھر حسام الدین اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے مجوزہ سفر کی تفصیل اور اس کی نوعیت پر تبادلہ خیالات کررہے تھے اور ادھر مختار اپنی بے چینیوں کو دل کی گہرائیوں میں دبائے کوٹھی کی چھت پر بلا مقصد ٹہل رہا تھا۔

کوٹھی جس کا نام خان بہادر حسام الدین نے اپنے شوق کی عکاسی کرنے کے لئے ''عروس نیل'' رکھا تھا کشمیری دروازے کے باہر ایک کھلی ہوئی جگہ پر تھی اور وہ اس وقت عمارت کی سب سے اونچی چھت پر تھا جہاں سے پوری آبادی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سکون میں ڈوبی ہوئی آبادی کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ چھت پر کھڑے ہی کھڑے اس نے باغ کے اس گوشے پر نگاہ ڈالی جہاں ایک رات انتانیہ اسے دکھائی دی تھی۔ لیکن اس وقت اسے خاردار انگور کی بیلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پودے کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔ چنانچہ جب یہاں بھی اسے کوئی سکون نہ ملا تو وہ لائبریری میں چلا گیا کہ کچھ دیر شہزادی کی تصویر دیکھ کر اپنا دل بہلائے، دیر تک وہ اس خاموش، ساکت اور پراسرار تصویر کو دیکھتا رہا، اس تصویر میں بنی ہوئی سمندر سے زیادہ گہری نیلی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اور ان سنہرے بالوں کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کی دھڑکنوں کے چاروں طرف ایک حصار سا کھینچ چکے تھے۔

اور جب اس کا دل یہاں بھی نہیں لگا تو اس کمرے میں چلا آیا جہاں اس کے والد کے پانچوں قریبی دوست مصری سفر پر تلخ گفتگو کررہے تھے۔ خان بہادر حسام الدین نے اس کمرے کو بھی خاص طور سے سجوایا تھا۔ الماریوں میں طرز کہنہ کے ظروف رکھے گئے تھے اور گلدانوں میں پھولوں کے بجائے خوب صورت تراشے ہوئے مصری بت پورا کمرہ آثار قدیمہ کی چیزوں سے مکمل طور پر آراستہ تھا، حد یہ کہ فرنیچر بھی قدیم طرز کا تھا۔

پانچوں دوست انتہائی گرمجوشی سے گفتگو کرنے میں منہمک تھے کہ مختار دروازہ کھول کر عین اس وقت داخل ہوا جب مصدق ایرانی کہہ رہا تھا۔ ''میرے معزز دوستو! اب تک کی زبردست بحث کے بعد بہرحال میں یہ ثابت کرچکا ہوں کہ یہ دستاویز اصلی ہے اور اس میں

بیان کردہ واقعات تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ دستاویز کی صداقت ہر صورت میں ناقابل تردید ہے۔ اور ہماری مہم کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم دستاویز میں لکھے ہوئے دعوؤں کی اصلیت معلوم کریں۔ یعنی انتانیہ کا مقبرہ کھود کر اس کا تابوت حاصل کریں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہزاروں سال سے سونے والی شہزادی بیدار ہوسکتی ہے یا نہیں؟

''میں آپ سے متفق ہوں۔'' احمد ریاض نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے خود اکثر کتابوں میں پڑھا ہے کہ سیٹی اول کے دور میں ممی بنانے کے فن نے بے انتہا ترقی کی تھی اس لئے کیا عجب ہے کہ اس فرعون نے کسی زندہ انسان کی ممی بنانے کی اسکیم بنائی ہو اور اس کے لئے شہزادی انتانیہ کا ہی انتخاب کیا ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیٹی اول اپنے ہر فعل کو مذہبی حیثیت دیتا تھا۔ اور خدا بننے کا جنون اس کے دماغ میں اس حد تک سما گیا تھا کہ اس نے خود کو ''ایپس'' دیوتا مشہور کر کے اپنی پرستش شروع کروادی تھی۔''

''چلئے میں مانے لیتا ہوں۔'' پروفیسر ارشد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہ دستاویز میں جو حقائق بیان کئے گئے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہیں لیکن میں چاہوں گا کہ ڈاکٹر بیگ دستاویز میں لکھے ہوئے اس دعوے پر اپنی رائے ظاہر کریں کہ شہزادی انتانیہ کو بیدار کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس کا تعلق علم عضویات سے ہے۔''

ڈاکٹر بیگ جو، اب تک اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے جھانک کر استفہامیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ ''میں فوراً کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ زندگی یعنی روح بے ہوشی کی حالت میں ایسی صورت اختیار کر جاتی ہے جس کے متعلق سائنس تاریکی میں ہے۔ ایک مشہور سائنسدان نے اس مسئلہ پر جہاں تک روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کے فعل کے لئے جسم کے خارجی حالت کی درستگی اشد ضروری ہے۔ مطلب یہ کہ میری رائے میں جو بالکل ذاتی ہے اس دستاویز کا دعویٰ بالکل باطل ثابت ہوگا۔''

''گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر شے کے فعل کے لئے اس کی تازگی اور خارجی حالات کی صحت مندی ضروری ہے۔'' طہرانی نے مداخلت کی۔''

''ہاں۔ اور اس اصول کا اطلاق صرف جسم انسانی پر نہیں پودوں اور گلوں کے بیجوں تک پر ہے۔'' ڈاکٹر بیگ نے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں نے ایک مرتبہ ایک مقبرے میں سے فرعون کی چودھویں نسل کے زمانے کے گندم کے بیج حاصل کر کے بوئے تھے۔ اور۔'' طہرانی نے کہا۔

''تو کیا ان سے کوئی فصل پیدا ہوئی۔'' ڈاکٹر نے طہرانی کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

''نہیں۔ لیکن اس کے پودے 9 انچ تک بڑھے اور پھر مرجھا گئے۔'' طہرانی کچھ اور کہتا لیکن ڈاکٹر بیگ نے آہستہ آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''تو ان بیجوں میں زندگی کی رمق ضرور موجود تھی۔ جو مستور تھی۔ چند مشہور و معروف حکماء نے ایک چٹان میں کوئی سانپ قید کر دیا تھا اور یہ سانپ کئی سو برس تک زندہ رہا۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کشمیر میں ایک سادھو دیکھا تھا جو اپنی روح کے جسم سے علیحدہ کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اور مہینوں بلا کچھ کھائے پیے زندہ رہتا تھا۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا گوشت پوست کے ریشے ساڑھے تین ہزار برس تک جیسا کہ دستاویز میں لکھا ہوا ہے صحیح سلامت رہ سکتے ہیں۔''

''اگر دستاویز کی تحریر کے بموجب تین سو سال تک سلامت رہ سکتے ہیں تو ساڑھے تین ہزار سال تک بھی باقی رہ سکتے ہیں۔'' طہرانی نے فوراً کہا۔

''خیر میں ہر بات مانے لیتا ہوں لیکن یہ کیسے مان لوں کہ کسی زندہ انسان کی ممی بنائی جاسکتی ہے۔ جب کہ ممی بنانے کے لئے انسانی لاش کو مہینوں تک اور شورے کے حوض میں ڈال دیا جاتا تھا۔ اور یہ بالکل

ناممکن ہے کہ ایک زندہ انسان پر وہ عمل کیا جائے جو ممی بنانے کے لئے ایک لاش پر کیا جاتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے لاتعداد ممیاں دیکھی ہیں اور اسی بناء پر میں یہ بات پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔'' پروفیسر ارشد نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ دستاویز کی صداقت مانتے ہیں تو پھر اس پر بھی یقین لائیے کہ فرعون مصر سیٹی اول کے حکماء اور کاہنوں نے نہ صرف زندہ انسانوں کی ممی بنانے کا بلکہ روح کی واپسی کا بھی کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور معلوم کرلیا ہوگا ورنہ انتانیہ کو ساڑھے تین سو برس تک سات مرتبہ بیدار نہ کرتے اور دوبارہ نہ سلا پاتے۔''

اور طہرانی کے اس جواب نے تقریباً سب کو خاموش کر دیا۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد پروفیسر ارشد اور احمد ریاض دونوں نے بالکل اچانک متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ بھی اس مہم میں شریک ہو رہے ہیں اور خان بہادر حسام الدین کے ساتھ مصر جانے کے لئے تیار ہیں۔ گویا اس طرح اب اس مہم میں چھ آدمی شریک ہوگئے۔ تمام اخراجات کی ذمہ داری خان بہادر نے اپنے ذمہ لے لی۔

اور سیاح صفت طہرانی کی خوشی و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کی 28 سال قدیم آرزو پوری ہونے جارہی تھی اور اپنی جوانی کے انتہائی جوشیلے اور مسکراتے دنوں میں اس نے مصر کی قدیم ترین تہذیب اور اس کے انتہائی اہم اسرار کا پردہ اٹھنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو رہا تھا۔ طہرانی کے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک بھرپور امنگ نے انگڑائی لی۔ آنکھوں میں نوجوانی کی وہ چمک جس کو بڑھاپے نے ماند کر دیا تھا ایک مرتبہ پھر عود کر آئی۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر ایک فاتح مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

ادھر مختار بھی سوچ رہا تھا۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب میں انتانیہ کو مجسم نیند سے بیداری کی انگڑائی لیتے ہوئے دیکھ سکوں گا۔

ایک ہفتہ کے بعد یہ قافلہ دہلی سے بمبئی کے لئے روانہ ہوگیا۔

یہ ایک ہفتہ آلات حرب، کھدائی کے اوزاروں اور سفر کے دوسرے سامان کی خرید و فروخت میں انتہائی جوش و خروش سے گزرا اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی۔

حسام الدین کی بہن شمیم بانو نے بھی پارٹی میں شامل ہونے کی ضد کی لیکن کوٹھی کی حفاظت کے خیال سے انہیں چھوڑ دیا گیا۔ اور وہ نہ جاسکیں۔

قاہرہ جانے والا جہاز بمبئی کے بندرگاہ سے گیارہ بجے رات کو روانہ ہونے والا تھا اس لئے پارٹی کے افراد نو بجے تک بندرگاہ پہنچ گئے اور جہاز پر سامان پہنچا دیا گیا۔ اب سب کی منزل ایک ہی تھی یعنی قاہرہ اچانک مختار کی نظریں جہاز کے عرشہ پر پڑیں اور وہ بت کی طرح ساکت رہ گیا۔

انتانیہ جہاز کے عرشہ پر موجود تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک ہی منٹ کے بعد وہ دیوانہ وار جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ لیکن قبل اس کے کہ اوپر پہنچتا ایک آدمی سے اس کی ٹکر ہوگئی اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آ رہا۔

حسام الدین اور اس کی پارٹی کے کسی بھی آدمی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ چنانچہ جب مختار نے انہیں بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے انتانیہ کو جہاز کے عرشہ پر دیکھا ہے۔ تو طہرانی کے علاوہ ہر شخص لرز کے رہ گیا۔

طہرانی بہرحال پرسکون تھا۔!!!

☆.....☆.....☆

بارہ دن کے بحری سفر کے بعد حسام الدین کی پارٹی قاہرہ پہنچ گئی۔ جہاں انہوں نے ہوٹل میں اپنی قیام کا بندوبست کیا۔

یہ ہوٹل قلب شہر میں تھا اور جس کی بالکونی سے شہر کی کئی سڑکیں اور بازار دکھائی دیتے تھے۔

حسام الدین اور پارٹی کے دوسرے لوگ لکسر

جانے کی تیاریوں میں اور کھدائی کے لئے عملہ تلاش کرنے میں مصروف رہتے تھے اور مختار قاہرہ کے بازاروں اور مصر کے حسن میں مدہوش رہتا تھا۔ تمام دن وہ سڑکوں پر گھومتا۔ سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھتا، بازاروں کی گہما گہمی دیکھتا۔ اور ان برقع پوش خواتین کو دیکھتا جن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر شخص کے دل میں ہیجان پیدا کرنے کے لئے کافی تھیں۔

لیکن اسے تو ان نیلی آنکھوں کی تلاش تھی۔ جو اس کے قلب کا سارا سکون درہم برہم کر چکی تھیں۔ اور جس نے ایک بہت بڑی حد تک اسے مخبوط الحواس بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا کیا مصر کا سفر اس کے تاریک خوابوں میں امید کی شعاعیں پیدا کر سکتا ہے؟ وہ قاہرہ کے مشہور عجائب گھر بھی گیا جہاں سیٹی اول کی ممی ایک تابوت میں رکھی ہوئی تھی۔ اور جس کی شکل دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قدیم مہذب مصر کا جلیل القدر حکمران ہے اس نے مصر کو ایک تہذیب و تمدن کی معراج پر اس وقت پہنچا دیا جب یورپ وحشی انسانوں کا مسکن تھا اور امریکہ میں صرف کوہ و صحرا، دریا اور دلدلیں تھیں۔ وہ سیٹی اول کی ممی کو دیر تک دیکھتا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی سیٹی اول ہے جس کی خداداد فہم اور اک کی داستانیں آج تک باقی ہیں۔ جس نے شہزادی انتانیہ کے زندہ جسم پر تاریخ انسانی کا ایک حیرت ناک تجربہ کیا ہے۔ جس کے لبوں نے اس کے خوابوں کے حسینہ سے باتیں کی ہیں اور جس کی آنکھوں نے ان نیلی آنکھوں کو دیکھا ہے جو اس پر سحر طاری کر چکی ہیں۔

سیٹی اول کی ممی کے قریب کھڑے ہی کھڑے جیسے مختار نے عالم تصور میں انتانیہ کو دیکھ لیا..... انتانیہ کو اتنی حسین اور نازک جیسے گلاب کا تازہ کھلا ہوا پھول، تیکھے نقوش، گورے گالوں پر جھکی ہوئی سیاہ لانبی آنکھیں..... نیلی آنکھوں میں شباب کی مستی، ایک ایسا نسوانی مجسمہ جس میں حسن و شباب کی تمام رعنائیاں موجود ہوں..... بس سیٹی اول نے جس انتانیہ سے گفتگو کی ہوگی وہ ایسی ہی ہوگی اور مختار کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔

شام کو پارٹی کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہوئے فیصلہ یہ ہونا تھا کہ یہاں سے کس دن کوچ کیا جائے اور صرف طہرانی کا انتظار تھا جو ایک معتبر گائیڈ کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ تقریباً آٹھ بجے طہرانی بھی ایک آدمی کے ساتھ ہوٹل پہنچ گیا۔ طہرانی کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تمام دن دوڑ دھوپ کرتا رہا ہے۔ اس کا سفید رنگ گرمی کی تمازت سے جھلس کے رہ گیا تھا اور عقاب نما آنکھوں میں انتہائی تھکن کے آثار تھے۔ حسام الدین نے طہرانی کے ساتھ آنے والے نووارد مصری کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ جس کے چھریرے بدن پر سفید دستار لباس اس کو ایک سچا مصری ثابت کر رہا تھا، جس کی آنکھوں سے معصومیت ٹپک رہی تھی اور جو اپنے آبنوسی عصاء کے ساتھ ایک عبادت گزار مصری معلوم ہوتا تھا۔

طہرانی نے سب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔ ”اب میں آپ کا تعارف اپنی مہم کے ایک نئے ممبر حسن اصغر سے کراتا ہوں جو وادی شاہان مصر کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں جو میں نہیں جانتا میں نے ان کو راضی کر لیا ہے کہ یہ خوابیدہ شہزادی کی خواب گاہ تک ہماری رہبری کریں گے۔ انہی کی وساطت سے میں نے ایسے پندرہ مزدوروں کا بھی انتظام کر لیا ہے جو خاموشی اور رازداری کے ساتھ مقبرہ کی کھدائی کریں گے اور ہم سے ایک دن پہلے لکسر روانہ ہو جائیں گے۔

حکیم وقار کہانی یہیں تک سنا پائے تھے کہ ایک ملازم آیا اور حکیم وقار سے مخاطب ہوا۔ ”حکیم صاحب انتظار گاہ میں چند مریض آپ سے ملاقات کے لئے بیٹھے ہیں۔“

یہ سن کر فوراً رولو کا بولا۔ ”حکیم صاحب آپ مریضوں سے ملاقات کریں۔ میں بھی چلتا ہوں۔ آپ سے کل اس وقت آگے کی یہ حقیقی کہانی ضرور سنوں گا۔ اب میرے دماغ میں یہ بات زور پکڑ گئی ہے کہ حقیقت پر مبنی اس کہانی کے اختتام پر ”میں کوشش کروں گا کہ شہزادی انتانیہ کی روح سے میری ملاقات ہو جائے اور رولو کا اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

(جاری ہے)

شیطان کی بیٹی

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

خوبرو حسینہ بارش اور بجلی چمکنے کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک اس پر بجلی گر پڑی اور چشم زدن میں وہ جل کر خاکسر ہوگئی اور اس طرح اس کا نام و نشان مٹ کے رہ گیا۔

اوہ خدایا!.....اس کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوگیا، حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے

ہمارا گھر کاسکونی کے ایک غیر آباد اور سنسان علاقے میں تھا اور وہ اٹھارویں صدی عیسوی کی ایک پرانی حویلی تھی جس کے آگے لمبے لمبے درختوں کی ایک قطار تھی۔ برآمدے کے پاس دوسری منزل کی سیڑھیوں کے کنارے گلاب کا ایک پودا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہ 100 سال پرانا ہے۔ پہلی منزل کی کھڑکی کے پاس ایک اور بوڑھا درخت تھا۔ جس کی جھکی ہوئی شاخیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس درخت کے خوشبودار گلاب آج بھی میرے تصور میں ہیں۔ یاسمین اور لیموں کے درختوں کی خوابیدہ مہک آج بھی رہ رہ کر ایک گزرے ہوئے خوبصورت زمانے کی یاد دلاتی ہے۔ وہ حویلی اگرچہ پرانی تھی لیکن بچپن کی سیر و تفریح اور کھیل کود کے لئے شاید ہی کوئی اور جگہ اس سے زیادہ موزوں ہو سکتی ہو۔ آس پاس پھیلے ہوئے انگوروں

کے خوشے ہمارے منتظر ہوتے۔ قریب ہی بہتے ہوئے دریا کا منظر اور بید کے درخت۔ کھیل کود کے دنوں میں ہمیں اور کیا چاہئے۔

لیکن اس گھر میں ایک ایسی جگہ تھی جہاں بڑا مہیب اندھیرا رہتا تھا۔ ایک خوفناک اور پراسرار جگہ ایک خفیہ اور ویران کوٹھری جو گھر سے کچھ دور باورچی خانے کے پیچھے واقع تھی، میں اور میرا بھائی اسے کسی نامعلوم وجہ سے ''بلیک فیٹ ہاؤس'' کہتے تھے۔ یہ کوٹھری باغیچے کے پاس شاید ہمارے دادا نے تعمیر کروائی تھی۔

اس اندھیری اور پراسرار کوٹھری کا بھید ہمیں اس دن معلوم ہوا جب میں آٹھ سال کا تھا۔ اور میرا بھائی سات سال کا اور ہم دونوں اپنی اتالیق مارتھی کے ساتھ باغ میں آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اسی دن سے ہم اس تنگ و تاریک کوٹھری کا راز جاننا چاہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی نامعلوم طاقت ہمیں اس کوٹھری کی طرف بلا رہی ہے۔

ایک دن حیران اور سراسیمہ اس کوٹھری کے قریب پہنچے۔ لیکن اندر داخل ہونے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔

''پہلے تم چلو۔'' میرے بھائی نے مجھ سے کہا۔

''نہیں پہلے تم جاؤ۔'' میں نے جواب دیا۔

آخر بحث و تکرار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ دونوں اکٹھے اس کال کوٹھری میں داخل ہوں۔ ہم اس کوٹھری میں پہنچے اور جامد اور ساکت حیران ششدر کھڑے ہوگئے۔ بڑے بڑے مکڑی کے جالے اوپر لٹک رہے تھے۔ اور ہر طرف سے مدھم ڈراؤنی آوازیں آرہی تھیں میرے بھائی آرمنڈ نے فوراً وغائیہ گیت گانا شروع کردیا۔ اس کی عادت تھی کہ جب کبھی وہ کسی بات سے خوفزدہ ہوتا تو یہی گیت گاتا تھا اور خدا سے مدد کا طالب ہوتا تھا۔ میں نے بظاہر، حوصلے کا اظہار کیا اور اپنی جیب میں رکھے ہوئے چاقو کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر آنے والی مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

کچھ لمحہ تک ہم یونہی خوفزدہ کھڑے رہے۔ آخر جب اس گھپ اندھیرے میں کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑا اچنبھا ہوا کہ ساری کوٹھری میں عجیب و غریب، سامان بکھرا ہوا ہے۔

''یہ دیکھو ایک بڑی تین پہیوں کی پرانی سائیکل۔''

آرمنڈ نے سرگوشی میں کہا۔

''اور یہ دیکھو آرمنڈ یہ پتھر کا کتنا بڑا برتن ہے، بالکل میرے قد کے برابر۔'' میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

ہمیں علی بابا اور چالیس چور کی کہانی یاد آگئی۔ اور پھر ہم نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ دوبارہ موم بتی اور ماچس لے کر آئیں گے۔

ابھی ہم پلٹنے ہی والے تھے کہ ایک بہت بڑی چمگادڑ ایک زندہ وجود کی طرح ہمارے قریب سے گزرتی ہوئی کہیں دور پرواز کرگئی اور ہم خوف و دہشت کے ساتھ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔

سخت پریشانی اور سراسیمگی کی کیفیت تھی۔ زرد چہرہ، دھڑکتے دل، بے انتہا خوف اور سوالیہ نشان بنے ہوئے ہم بھاگتے رہے۔ بھاگتے رہے اور گھر پہنچنے سے پہلے باغیچے کے اندر جھولوں میں بیٹھ گئے۔ ہمارے پیر بری طرح گرد میں اٹے ہوئے تھے اور ہم اپنے اس راز کے بارے میں سرگوشیاں کررہے تھے..... ''قسم کھاؤ۔'' میں نے اپنے بھائی سے کہا۔ ''تم اس راز کو ظاہر نہ کرو گے۔ خواہ کوئی تمہیں مار ہی ڈالے مگر نہیں بتاؤ گے۔''

''ہاں میں قسم کھاتا ہوں۔ اس راز کو راز ہی رکھوں گا۔''..... بھائی نے قسم کھائی۔ قسمیں کھانے کے بعد ہم گھر روانہ ہوئے۔

''بلیک فیٹ ہاؤس۔'' میں ہم روشنی لے کر بھی داخل ہوئے۔ لیکن موم بتی کی روشنی نے بھی اس اندھیری کوٹھری کی وحشت دور نہیں کی۔ بلکہ بعض گوشے تو اور بھی زیادہ تاریک ہوگئے۔ ہم کو اس روشنی میں کچھ لمحوں کے بعد بکھرے ہوئے سامان سے خوف نہ آیا۔ لیکن کچھ نامعلوم آوازیں چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ خود اپنے تنفس کی آواز سے سخت دہشت ہورہی تھی۔

یہ تھا ہمارا بچپن اور یہ ہماری تفریح اور بے فکری

کے انداز۔ لیکن اس کے ایک سال بعد جب میں نو سال کا ہوا تو میری زندگی میں ایک ایسا حیرت انگیز واقعہ پیش آیا کہ اس کے بعد میری زندگی میں اور خیالات میں بڑا انقلاب پیدا ہوگیا۔ وہ عجیب واقعہ یہ تھا.....

ایک دن آرمنڈ اور میں باغیچہ میں کھیل رہے تھے۔ میری ممی ہمارے پاس بڑی شفقت کے ساتھ آئیں اور ہمارے ساتھ کھیلنے لگیں۔ وہ کہیں باہر جانے والی تھیں اور گاڑی تیار تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ وہ اس وقت ایک بڑی اور پھولدار کناری والا ہیٹ پہنے ہوئے تھیں۔ کچھ لمحے ساتھ کھیلنے کے بعد انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری اتالیق مارتھی۔ ہمیں چھوڑ کر جانے والی ہے اور ان کی جگہ یہ فریضہ ایک جرمن اتالیق سنبھالے گی۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ہماری جرمن اتالیق کا نام فریولین نیو برگ ہے۔ وہ بانوور سے آنے والی ہے۔ جہاں وہ کاؤنٹس دان ڈرز بیچ کے ہاں اس کی لڑکی کی اتالیق کی حیثیت سے ملازم تھی۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ہماری نئی اتالیق بڑی فاضل عورت ہوا اور ہمیں بیالوجی، تاریخ اور پیانو کے علاوہ ڈرائنگ وغیرہ بھی سکھائے گی۔ ہماری ممی نے ہمیں پھر حسب عادت تھپتھپایا۔ ہمارے بے سلیقہ اور بڑھتے ہوئے ناخنوں کو ٹوکا اور چلی گئیں۔

جونہی ان کی گاڑی ہماری نظروں سے دور ہوئی، اور اس کا صرف غبار باقی رہ گیا تو ہم ''بلیک فیٹ ہاؤس'' میں داخل ہوئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہم چپ چاپ بیٹھے تھے جیسے کوئی سانحہ پیش ہو۔ ہماری خاموشی بدلتے ہوئے حالات کی اہمیت کو ظاہر کررہی تھی۔ آخر، آرمنڈے نے خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

''خدا جانے جرمن کیسے ہوتے ہیں؟''

وہ بہت اداس دکھائی دے رہا تھا۔

''انہوں نے کئی بار پیرس کا محاصرہ کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور کیا تم کو یاد ہے کہ اس وقت کی بات ہے جب ہمارے چچا جنرل تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ بہت خوب صورت بالوں والی عورت ہے۔'' اس نے کہا۔

''مگر ہم اس کی بولیاں نہ سمجھ سکیں گے۔'' میں بولا۔

''ہوسکتا ہے وہ جس ٹرین میں سفر کررہی ہو اسے حادثہ پیش آجائے۔'' آرمنڈ نے عادتاً کہا۔

جیسے ہی آرمنڈ نے یہ فقرہ ختم کیا، اندھیرے میں ایک بہت بڑا وجود حرکت کرتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ بڑے بوجھل قدموں کے ساتھ حرکت کررہا تھا۔ اتنے بوجھل قدموں کے ساتھ کہ اس کی آواز بڑی دہشت انگیز تھی۔

ہم نے ایک دوسرے کو دھکا دے کر ایک دوسرے سے پہلے کوٹھری سے نکل جانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں آرمنڈ پرانی تین پہیوں والی بائیسکل سے ٹکرا گیا۔ اور میں اسی کشمکش میں گر گیا۔ ایک بڑی خوفناک سی صورت بڑے غصہ اور جوش میں ہمارے قریب سے گزری، میں نے اپنے ننگے پیروں میں اس کی حرارت اور اس کے تنفس کی گرمی محسوس کی۔

خوف کی شدت سے ہم دیوانوں کی طرح بڑبڑاتے ہوئے گزرے اور اس اندھیرے سے دھوپ کی مہرباں روشنی میں پناہ لی۔

ہمارے پاؤں گرد آلود اور حال پریشان کن، آرمنڈ نے دوڑتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بتایا کہ ''یہاں کوئی زندہ وجود ضرور تھا جس نے ہماری باتیں سن لی ہیں۔ خدا جانے اب ہمارا کیا حشر ہوگا۔'' اس کے بعد اس نے اپنے خاک آلودہ ہاتھ دھوئے اور وغائیہ گیت گانا شروع کردیا۔ اس دن کے بعد ہم پر ایسا خوف طاری ہوا کہ ہم پھر سے 20 کلومیٹر کے دائرے سے، باہر نہ نکلتے تھے۔ قریب کے ایک کھیت سے انجیر یا بادام حاصل کرنے کے علاوہ کہیں اور جانے کے نام سے کانوں میں انگلیاں دیتے تھے۔ ارمنڈ کی دعا پوری نہ ہوئی۔

ہمیں کسی ٹرین کے حادثے کی اطلاع نہیں ملی۔ بلکہ اس کے بجائے فریولین نیو برگ ہماری نئی اتالیق ہمارے گھر ایک حادثے کی طرح پہنچ گئی۔

''یہ سلانٹر ہے اور ارمنڈ۔'' میری اس نے ہمارا تعارف کراتے ہوئے ہماری نئی اتالیق نیو برگ سے

کہا۔ اس نے اپنا سیاہ دستانے والا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ کچھ مبہم سے الفاظ کہے اور پھر وہ ارمنڈ کی جانب بڑھی۔ ارمنڈ نے بڑی پھرتی سے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اس تعارفی ملاقات کے بعد وہ ممی کے ساتھ زینہ چڑھ کر دوسری منزل کی طرف چلی گئی۔

جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو میں نے اپنے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھا جو بہت زرد ہو رہا تھا۔

''کیا یہ عورت خوفناک نہیں ہے؟ اس کی آنکھیں سفید ہیں، حیرت انگیز سفید۔'' اس نے کہا۔

''مگر تم تو بڑی خوش خلقی سے پیش آئے تھے آرمنڈ میں تو ایک لمحہ کو یہ سمجھا تھا کہ شاید وہ عورت تمہیں اچھی لگی۔''

''نہیں..... بالکل نہیں..... میں ڈر گیا تھا۔'' وہ بولا۔

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے بادلوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''کوئی طوفان تو نہیں آ رہا ہے اس وقت۔''

''نہیں طوفان نہیں وہ سفید آنکھوں والی عورت آئی ہے۔ وہ بہت ڈراؤنی ہے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اوہ خدا! اس کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ کیوں نہ ہوگیا۔ جو اسے یہاں لے کر آئی ہے۔''

☆.....☆.....☆

ہم یک لخت خاموش ہوگئے اور ٹہلنے لگے اور خود بخود بغیر کسی ارادے کے اس راستے کی طرف چل کھڑے ہوئے، جو ''بلیک فیٹ ہاؤس'' یا اندھیری کوٹھری کو جاتا تھا۔ ہمیں اس وقت کوئی خوف اس کوٹھری سے محسوس نہ ہوا۔ چلتے چلتے ارمنڈ بولا۔

''میں نے اور کسی چیز کی طرف دھیان نہیں دیا۔ مجھے تو اس کی سفید آنکھوں سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ایک اور عجیب بات ہے۔'' میں بولا۔ ''وہ نیولین ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔ فینسی نپولین ہیٹ۔'' میں نے کہا۔ ''بڑی سی ہیٹ!''

''کیوں اس کے بالوں کو کیا ہوا؟ ہو نہ ہو وہ گنجی ہے۔'' ارمنڈ بولا۔

''تمہارے خیال میں کیا عمر ہوگی اس کی؟''

''خاصی عمر ہے۔ کوئی 30 برس ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''اوہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ابھی مرے گی نہیں عموماً لوگ 30 سال سے زیادہ ہی زندہ رہتے ہیں اور ہاں اس نے جرمن زبان میں کچھ کہا بھی تھا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا بڑبڑا رہی تھی۔'' ارمنڈ نے اپنے شانے ہلا دیئے اور بولا۔

''میں کچھ کچھ سمجھ گیا ہوں۔ وہ کوئی منتر پڑھ رہی ہوگی۔ ضرور کوئی منترا گر وہ جادوگرنی یا چڑیل نہیں تو اس کی آنکھیں سفید کیوں ہیں؟''

''ہمیں فوراً واپس آ جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں آتے ہی کوئی سبق دینا چاہتی ہو۔ سفید آنکھوں والی بلا۔'' میری آواز میں گھبراہٹ تھی۔ جسے میں اپنے چھوٹے بھائی سے چھپا رہا تھا تاکہ وہ مجھے کم حوصلہ نہ سمجھے..... اگرچہ ہمیں اس دن سبق نہیں دیا گیا۔

لیکن بہرحال ہمارے ہاتھ میں ہفتہ بھر کا پروگرام تھما دیا گیا تفریح، کھیل اور پھول جمع کرنے کا وقت سرخ روشنائی سے تحریر کیا گیا تھا۔ اور ہر روز 6 سے 7 بجے شام کا وقت ہماری خطاؤں کی سزا کے لئے وقف کر دیا گیا تھا، دن بھر میں سب سے سنہرا وقت 2 سے 3 بجے کا تھا۔ یہ وقت نیو برگ نے اپنے آرام کے لئے وقف کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

یہ ٹائم ٹیبل مکتب میں ٹانگ دیا گیا۔ ارمنڈ نیو برگ سے خلاف توقع سے بڑی سعادت مندی سے پیش آ رہا تھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ شاید برگ کی باتوں میں ارمنڈ آ گیا ہے۔ بہرحال جب ارمنڈ سے میری اکیلے میں ملاقات ہوئی تو میں نے سوال کیا۔

''تم اس عورت سے اتنی خوش خلقی اور سعادت مندی کیوں برت رہے ہو؟''

''میں ہمیشہ اس سے خوش خلقی برتوں گا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس کا راز کیا ہے؟''

''کیا راز ہے اس کا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ شیطان کی بیٹی ہے۔'' اس نے کہا۔

''شیطان؟''

''ہاں! اس کے پاس جو صوفہ ہے، کالا اور سنہری صوفہ اس کو انسانی بالوں سے بھر دینا چاہتی ہے۔ وہ تمہارے اور میرے بال بھی سزا کے طور پر کاٹ لے گی اور انہیں اپنے صوفے کی، زینت بنائے گی۔''

مجھے جھرجھری سی آ گئی اور شدید وہشت ہوئی۔ لیکن ہم دونوں خاموشی سے ٹہلنے لگے۔

''ممی سے نہ بتا دینا۔ یہ ٹھیک نہیں ہے، انہوں نے اس عورت کو سفر خرچ دیا ہے۔ وہ اس عورت سے خوش معلوم ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اس شیطانی طاقت کے سامنے اکیلے اور تنہا ہیں۔ مجھے تو یہ عورت کسی یہودی کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ شاید اس کے خاندان نے ہمارے باپ کو قتل کیا ہو۔ اور کون جانتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسی کے باپ نے پیرس کا محاصرہ کرنے کے بعد ہمارے جنرل چچا کو ہلاک کیا ہو..... وہ تمہارے بال ضرور کاٹ لے گی۔ ہم اس کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتے۔''

ارمنڈ مایوس ہوا جا رہا تھا۔

''میں اس کی زندگی تلخ کر دوں گا۔ اتنی تلخ کہ وہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر چلتی بنے گی۔ اس کا صوفہ بہت جلد اس کے ساتھ روانہ ہو جائے گا۔ کیا سمجھے سیدھے جرمنی۔'' میں نے جواب دیا۔

''نہیں۔ نہیں ایسا ہرگز نہ کرنا۔''

ارمنڈ کا رنگ فق ہوگیا۔

''میں یہی کروں گا۔ بالکل یہی کروں گا۔ یہ میرا پکا ارادہ ہے۔'' میں چلایا۔ اس نے میرا بازو زور سے پکڑا اور گڑگڑا کر بولا۔ ''نہیں۔ خدا کے لئے۔''

''لیکن کیوں نہیں آخر کس لئے؟ تم کیوں وکالت کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لئے کہ اگر وہ مرگئی تو ہم پر شبہ کیا جائے گا۔ ہمیں ہوشیاری سے کام کرنا ہوگا۔ کیا سمجھے؟''

ہم ایک خفیہ لیگ بنائیں گے۔ تم لیڈر ہو گے۔ کیونکہ تم بڑے ہو۔ پھر ہم ہر صبح شیطان مردہ باد کا نعرہ لگائیں گے۔ سب کام خفیہ ہونا چاہئے۔ یاد رکھو۔''

اتنے میں نیو برگ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے حسب معمول نپولین ہیٹ بڑی شان سے پہن رکھی تھی، وہی اکلوتی ٹوپی جو اس کے پاس تھی۔ یہ ٹوپی ہر وقت اس کے سر پر لدی رہتی تھی۔ ممی کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے البتہ اتار دی جاتی تھی۔

نیو برگ اب بہت قریب تھی۔

''تم اپنے ہاتھ صاف کیوں نہیں کرتے؟'' اس نے وہیں سے مجھے ٹوکا۔

میں نے سنی ان سنی کر دی۔ اور ایک پرندہ، کی طرف دیکھنے لگا جو نغمے الاپ رہا تھا۔ ارمنڈ بڑی پھرتی سے صاف نکل گیا۔

''سلانٹر۔ تم نے میری بات سنی یا نہیں۔'' وہ بولی آواز میں غصہ تھا۔

میں نے پھر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

''جاؤ اور اپنے بال ٹھیک کرو۔'' وہ کہتی ہوئی گزر گئی۔ ''ہاں ہاں سب کو معلوم ہے پہلے اپنے صوفے میں، رکھے ہوئے بالوں کو دیکھو۔'' وہ جیسے ہی گزری۔ میں بڑبڑایا۔

''اسی دوران ہمیں اپنی اتالیق کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔

اس نے ہمیں جو تعلیم دی، اس میں تعلیم برائے نام اور قصیدے زیادہ ہوتے تھے۔

تعلیم کے دوران ارمنڈ اکثر چپکے سے میرے کان میں کہا کرتا تھا۔

''یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر شیطان کے بارے میں پوچھو کہ کیا خیال ہے، میم صاحب کا؟''

لیکن میں نے کبھی کوئی ایسا سوال نہیں کیا۔ وہ اکثر سبق کے دوران میرے بالوں کو ٹوکتی تو میں خاموش رہتا..... ہماری ہٹ دھرمی دیکھ کر اکثر اپنی سعادت مند شاگرد، ''مٹ زیل'' کی اچھی عادتوں کی روزانہ مثال دی جاتی تھی۔ تاکہ ہم کو حیا آ جائے۔ مٹ زیل کے روز

مرہ کے ذکر سے ہمیں اس لڑکی سے بھی چڑ ہوگئی ہم کچھ اور تو نہ کرسکتے تھے۔ شدید نفرت کی کیفیت میں ہم نے ایک دن مٹ زیل کی فرضی قبر کھودی اور بڑے خلوص کے ساتھ اس کی میت پر آنسو بہانے اور اس کی بخشش کی دعا مانگنے کے بعد اس کا فرضی پتلا قبر میں دفنا دیا۔

اور یوں انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوئی۔ اس تدفین کے بعد جب اس لڑکی کا ذکر آتا، ہم بے تحاشہ ہنس دیتے۔

دن گزرتے رہے۔ ارمنڈ نے اپنی نئی اتالیق سے سعادت مندی کا رویہ جاری رکھا اور میں نے تلخ برتاؤ، میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

''آخر کار اسے جانا ہوگا۔'' میں نے آرمنڈ کو آتے ہوئے دیکھ کر اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

''وہ تین سال تک غریب مٹ زیل کا ناطقہ بند کرتی رہی ہے۔ تین سال۔ تین سال تو بچوں کی زندگی میں بہت ہوتے ہیں۔''

''خداوندا!'' اس نے کہا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے۔ حالات خراب سے خرب تر ہوتے گئے۔ ایک دن نیو برگ نے پیانو سکھاتے ہوئے چھڑی سے میری مرمت کردی۔ پھر ایک مرتبہ اس نے مجھے ایک لفظ کو سو مرتبہ لکھنے کی سزا دی.....

سزائیں، سفید آنکھیں اور صوفہ میں انسانی بال۔ یہ سب باتیں لمبی بڑھاتی چلی گئیں۔ اس ایک سال کے عرصہ میں بڑی ناخوش گوار باتیں ہوئیں۔ ممی کا رویہ ویسا ہی تھا۔ ایک دن ہم نے اپنی ممی کے رویہ کے بارے میں بات کی.....'' یہ بڑی خطرناک بات ہے کہ وہ ممی کو بھی شیشے میں اتار چکی ہے۔'' میں نے ارمنڈ سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے کہا۔

اور غریب ممی اس بدروح عورت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی۔'' ارمنڈ نے بڑی مایوسی سے جواب دیا۔ ''ہماری مایوسیوں کے ساتھ ساتھ ہماری کوششیں بھی جاری رہیں۔ ہم نے اس سفید آنکھوں والی آسیبی عورت کو بھگانے کے لئے جو کچھ کیا جاسکتا تھا کیا۔ ''طرح طرح کی شرارتیں کی گئیں۔ ارمنڈ اس کی ہیٹ پر بیٹھ گیا۔ ہم دونوں نے ایک چمگادڑ اس کے سونے کے کمرے میں چھوڑ دی۔ انتہا یہ کہ معصوم بچی مٹ زیل کی قبر بھی اپنی اتالیق کو دکھادی۔ جس پر وہ بہت برہم ہوئی۔ سزا بھی دی۔ لیکن گھر چھوڑ کر نہ بھاگی۔ وہ پتھر کا جگر لے کر آئی تھی۔ آخر وہ دن بھی آ گیا۔ جب دونوں طرف سے انتہا ہوگئی۔

وہ گرمیوں کی ایک شدید گرم صبح تھی۔ باوجود دروازے بند ہونے کے، تیز دھوپ اسکول میں داخل ہوکر ہمیں پریشان کررہی تھی۔

وہ ہماری پریشانی سے لاپرواہ ہوکر تاریخ کا سبق دے رہی تھی۔ تاریخ زبردستی حلق میں انڈیلی جارہی تھی۔ اور اپنی سفید آنکھوں سے اس طرح گھور رہی تھی جیسے یہ آدم خور شیرنی ہمیں کھانا چاہتی ہے۔ ہمیں دہشت بھی ہورہی تھی اور غصہ بھی آرہا تھا۔ آخر اس نے مجھے ایک سو مرتبہ ایک فقرہ لکھنے کی سزا دی اور ارمنڈ کو کونے میں جاکر کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ اور ہمیں گھورتی رہی۔ جیسے ہماری ساری جسمانی طاقت اپنی آنکھوں میں کھینچ لینا چاہتی ہو۔

ممی اس دن لنچ پہ بھی نہیں آئیں۔ ورنہ کچھ لمحوں کو چھٹکارا ہوجاتا۔ انہیں سر کا درد لاحق تھا۔ چنانچہ ہم نیو برگ کی نگرانی میں کھانا کھاتے رہے۔ وہ نپولین ہیٹ پہنے بہت سی چیزیں سامنے رکھے ہوئے آہستہ آہستہ کھانا کھاتی رہی تاکہ ہم پریشان ہوں ہم صبر کرتے رہے۔ ہم کو ''بلیک فیٹ ہاؤس'' مشورہ کرنے کے لئے جانا تھا۔ اگر ہم ذرا بھی بے صبری کرتے تو وہ ہم کو اور سزا دیتی۔ آخر اندھیری کوٹھری میں جاکر صلاح مشورہ کرنے کا وقت نہ ملتا۔ آخر اس کا لنچ ختم ہوا اور وہ کھڑی ہوئی اور یہ ہدایت کرتے ہوئے کہ ہم گھر ہی میں کھیلیں، کیونکہ باہر دھوپ بہت ہے اور شور نہ مچائیں۔ کیونکہ ممی کے سر میں درد ہے، اپنی نپولین ہیٹ کو کرسی پر دانستہ چھوڑ کر مڑی اور اس طرح چلنے لگی جیسے واقعی چلی گئی ہو۔ اور پھر ہیٹ کے بہانے دوبارہ پلٹ کر آئی وہ جانتی تھی کہ ہم اس کے جانے کے بعد اس کے پیچھے اس

کو چڑانے والی صورتیں بنائیں گے اور وہ موقع پر پکڑ کر اس بہانے ہمیں سخت سے سخت سزا دینا چاہتی تھی۔

وہ جیسے ہی دوبارہ واپس ہوئی ہم سزا کے ڈر سے ایسے کھڑے ہوگئے جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ وہ ہمیں کئی منٹ تک ٹکٹکی باندھے گھورتی رہی۔ اپنی خوفناک سفید آنکھوں سے گھورتی ہوئی، وہ آہستہ اور مدھم آواز میں، کوئی منتر پڑھنے لگی اور ساتھ ہی ہمیں بتادیا کہ اب اس کی جانب سے ہمیں اس بدسلوکی کی بدترین سزا ملے گی۔ ایسی سزا جو کہ اب تک نہ ملی تھی اور اس کے بعد ہم اس کے قدموں کی آہٹ سنتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ آہٹ دور ہوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ مرحلہ انتہائی نازک تھا ہم سرپٹ دوڑے۔ بہت جلد اس ڈر سے کہ کہیں یہ منحوس صورت عورت دوبارہ نازل ہوکر ہمیں روک نہ دے، پسینے میں شرابور، گرد اور دھول میں اٹے ہوئے ہم بھاگتے رہے۔ ایک وحشت اور سراسیمگی کی حالت جو بیان سے باہر تھی۔

آرمنڈ کا چہرہ خوف اور دہشت سے پیلا ہورہا تھا۔ بھاگتے ہوئے ہماری کیفیت اس مجرم کی سی تھی جو جیل سے بھاگ رہا ہو۔ اور جسے پھانسی لگنے والی ہو۔ یا جنگی مجرم دشمن کے کیمپ سے فرار ہورہا ہو۔ ہم بھاگ کر سیدھے ''بلیک فیٹ ہاؤس'' پہنچے اور لرزتے کانپتے زمین پر بیٹھ گئے۔ جہاں آج کی نازک صورت حال پر ہم دو مظلوم بھائیوں کی خفیہ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ ہمیں ایسی بدترین سزا دی جانے والی ہے جو ہمیں اس سے پہلے کبھی نہ دی گئی تھی۔''

خوف زدہ آرمنڈ نے بہت زور سے چیخ کر کہا۔

حالتِ اضطراب میں وہ دیواروں پر ہٹر مارتا ہوا اور سسکیاں بھرتا ہوا کچھ نامعلوم الفاظ بولتا رہا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ضبط کی تلقین کی۔ لیکن میں جتنی زیادہ ضبط کی تلقین کرتا اور سمجھاتا، وہ اتنی ہی شدت سے چیختا اور روتا۔ میں اس کی پیٹھ تھپتھپاتا رہا۔ میں نے اس کے سر کے بال نوچے۔ بالکل طوطے کے پروں کی طرح، کیونکہ میں خوف اور صدمے کے مارے زور سے بولنے کی تاب نہ رکھتا تھا۔ آخر اس کی ہچکیوں کا تانتا ٹوٹ گیا۔ اور اس نے ناک سنکتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں جانتے کہ وہ کیسی خوفناک سزا دے گی سلانٹر.....؟''

''میں کچھ کچھ سمجھتا ہوں۔ میں وہ سزا برداشت نہ کرسکوں گا۔ میں مرجانا بہتر سمجھتا ہوں۔ ہاں مجھے معلوم ہے کہ وہ اب کیا سزا دے گی۔''

''کیا سزا دے گی؟'' میں نے دہشت زدہ ہوکر پوچھا کیونکہ میرا دل ڈوب رہا تھا۔

''ہاں۔ وہ بڑی خوفناک سزا دے گی۔ وہ سب سے پہلے تو ہمارے بال کاٹ لے گی اور پھر اپنی ساحرانہ قوت سے یا صلیب کے ذریعے مار ڈالنے کی کوشش کرے گی۔ اور آہستہ آہستہ ہماری جانب بڑھتی ہوئی موت کا تماشہ دیکھے گی۔ وہ ہمیں اپنی سفید آنکھوں سے گھورے گی۔ وہ ہم سے نفرت کرتی ہے۔ وہ ہم سے انتقام لے رہی ہے۔ شاید ہم چائے کے وقت سے پہلے موت کی آغوش میں ہوں گے۔ خداوند اس نے چار بجے کا وقت دیا ہے۔''

یہ ایک بڑی بھیانک تصویر تھی جو میرے بھائی نے کھینچ دی تھی۔ وہ تصویر ایک پردہ کے منظر کی طرح، میرے ذہن میں ابھرنے لگی جیسے ارمنڈ اور میں مصلوب اور مردہ ہو اور ہماری لاشوں کے پاس اسکول میں نیو برگ بڑے اطمینان کے ساتھ کھا پی رہی ہو کیک اور مٹھائی اور ہماری بے خبری اس دلدوز سانحہ سے بے خبر اپنی پیشانی پر پٹی باندھے سر کے درد کی دوا لگائے آرام کررہی ہوں۔ اپنے بیٹوں کی موت سے بے خبر! ابھی میرے ذہن میں یہ ہیبت ناک تصویر حرکت کررہی تھی کہ اچانک ارمنڈ نے چونک کر کہا۔ ''سنو، دیکھو، یہ کیا ہے.....''

میں نے اپنی ہچکی روک لی۔ اور اس آواز پر کان لگادیئے مجھے دور فاصلے پر بجلی کی مدھم گرج سنائی دی۔

''طوفان ہے۔'' میں نے ارمنڈ سے سرگوشی میں کہا۔

''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری کوٹھری میں ایک

بے نام خوف اور دہشت پھیل گئی ہے۔"

"لیکن کہیں بہت دور ہے یہ طوفان۔" ارمنڈ نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ اتنے میں ایک اور گرج کی آواز خاموشی کے طلسم کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ یہ گرج نسبتاً زیادہ بلند تھی۔

ہمیں فوراً گھر جانا چاہئے۔ ممی ہمارا طوفان میں باہر رہنا ہرگز گوارا نہیں کرسکتیں۔" ابھی ارمنڈ کا یہ جملہ ختم نہ ہوا تھا کہ اندھیری کوٹھری اچانک روشنی کی ایک زبردست چکا چوند کردینے والی موج سے جگمگا اٹھی۔ ساتھ ہی بادل بڑے زور سے گرجا۔ ہم نے اپنے کان انگلیوں سے بند کرلئے اور چندھیا دینے والی تیز روشنی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بعد بارش شروع ہوگئی۔ تیز بارش جس کی زبردست بوچھاڑ، کوٹھری میں آرہی تھی، بارش کے ساتھ ساتھ طوفان کی مہیب آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں، پانی کا ایک دھارا کوٹھری کی جانب بڑھ رہا تھا۔ دروازہ یک لخت کھل گیا۔ ہم نے اس سے بچاؤ کے لئے جونہی جست لگائی۔ بجلی کی تیز روشنی نے ایک لمحہ کے لئے نظروں کو چکا چوند کردیا اور ایک زبردست گرج پھر سنائی دی اور پھر فوراً ہی خاموشی چھاگئی۔

اب مٹی سے سوندھی خوشبوئیں ابھرنے لگیں ہوا صاف اور شفاف ہوگئی چمکدار سورج ہنستا ہوا بادلوں سے نکل آیا۔ ارمنڈ مسکرایا اور مجھے ٹہوکا دیا۔ "ہمیں اب یہاں سے بھاگ نکلنا چاہئے۔" میں نے کہا۔ جوتے ہاتھ میں لئے ہوئے ہم "بلیک فیٹ ہاؤس" سے نکلے۔

اچانک ابھری ہوئی دھوپ کی روشنی میں ہم نے نیو برگ کو اپنی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ہمیں دہشت کے مارے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی ساکت و جامد ہم کھڑے ہوگئے۔ دہشت کی ایک جھرجھری ہمارے جسم میں دوڑ گئی اور ہم آنے والے بھیانک لمحے کے انتظار کرنے لگے۔

نیو برگ ایک لمبا اسکرٹ پہنے ہوئے بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ نپولین ہیٹ اس کے سر پر جوں کا توں موجود تھا۔ لیکن وہ اس کے چہرے پر کوئی کیفیت نہیں پیدا کرتا تھا۔ اس کی سفید آنکھیں ہمیں گھورنے لگیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نزدیک سے نزدیک ہوتی گئی۔ لیکن ہمارے قدم من من بھر کے ہوچکے تھے۔ ہم نے اپنی جگہ سے خوف کے مارے، جنبش تک نہ کی۔ پلک تک نہ جھپکی۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے قریب سے گزر گئی۔

آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی وہ حیرت انگیز طور پر بغیر کچھ کہے گزر گئی۔ اور دور ہوگئی۔ ہم نے اسے صنوبر کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے دیکھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی تو ہم گھر کی طرف دوڑے، گھر پہنچتے ہی ہم نے اپنی ممی کو برآمدہ میں پایا، ممی نے ہماری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور کمرے کا دروازہ بند کرکے ہمیں یہ خبر دی کہ طوفان شروع ہونے سے ایک یا دو منٹ پہلے نیو برگ پر بجلی گر پڑی۔ وہ بجلی گرتے وقت صدر دروازے میں کھڑی ہوئی تھی اور یہ کہ آدھ گھنٹہ پہلے وہ مرچکی ہے۔

"وہ مرچکی ہے..... آدھ گھنٹہ پہلے..... اور اب وہ کہاں ہے؟" میں نے بڑی حیرت سے سوال کیا۔

"جب ڈاکٹر آگیا تو اس کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔"

"حیرت ہے، سخت حیرت۔" میں نے کہا۔

"کیونکہ میں تو اسے طوفان کے بعد بھی صنوبر کے درختوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ نپولین ہیٹ پہنے ہوئے تھی۔"

"نہیں۔ نہیں ڈارلنگ وہ نیو برگ نہیں ہوسکتی اسے تو بجلی کے پہلے ہی حملہ نے ہلاک کرڈالا تھا۔"

"لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ وہی تھی نپولین ہیٹ پہنے ہوئے۔" میں نے دوبارہ کہا۔ "میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔"

"نہیں۔" ارمنڈ نے مداخلت کی۔ "نہیں غلط ہے۔ وہ ہیٹ پہنے ہوئے نہیں تھی۔ اس وقت۔"

میری اور ممی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور آرمنڈ دعائیہ گیت گانے لگا۔

نادیدہ طاقت

عثمان غنی۔ پشاور

اچانک آسمانی گڑگڑاہٹ ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے قرب و جوار روشنی میں نہاگیا، گڑگڑاہٹ اتنی تیز تھی کہ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو اور خوبرو لڑکی کا دل اچھل کر حلق میں آگیا کہ اتنے میں.....

سنسان ویران اور خوفناک اندھیرے میں جنم لینے والی دل گرفتہ اور دل شکستہ کہانی

یہ راستہ انتہائی خراب ہے، ہمیں اس راستے سے نہیں آنا چاہئے تھا، نویرہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔ تیز بارش ہورہی تھی، اور ساتھ ہی طوفانی ہوائیں بھی زوروں پر چل رہی تھیں، رات کا گہرا سناٹا پھیل چکا تھا، کچے راستے پر کوئی گاڑی نہیں تھی بلکہ دور دور تک صاف میدان تھا اور بے شمار اونچے نیچے، قد آور درخت سڑک کے دونوں اطراف کھڑے تھے، کیچڑ انتہائی زیادہ تھی، آسمانی بجلی ایک کڑک سے چمکی اور گرج کی آواز کے ساتھ پورا منظر روشنی میں نہا گیا، فرنٹ سیٹ پر نویرہ اور طلال بیٹھے تھے۔ دونوں کی نظریں سڑک کے اگلے حصے پر لگی ہوئی تھیں، ایک بار پھر بجلی چمکی اور سامنے کا منظر روشنی میں نہا گیا، نویرہ طلال کے بازوؤں میں لپٹ گئی، دونوں کو چند لمحے کی روشنی میں حد نظر تک کوئی سایہ سا دکھائی دیا، اور پھر مکمل اندھیرا چھا گیا، وہ کیا تھا، گاڑی

ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی، وہ پتہ نہیں؟ طلال نے لاعلمی ظاہر کی۔

کیا ہوا۔ گاڑی کیوں روک دی۔ پتہ نہیں۔ نویرہ گاڑی خود رک گئی ہیں۔ میں خود حیران ہوگیا ہوں اب کیا ہوگا۔

نویرہ انتہائی پریشان ہوگئی۔ اسی لمحے بارش نے شدت اختیار کرلی۔ میں گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس تیز برستی بارش میں، میں تو گاڑی سے باہر نہیں نکل سکتی، اچھا تم کوشش کرو میں ذرا سیل فون دیکھ لیتی ہوں، نویرہ نے پرس سے سیل فون نکالا، طلال نے 4,3 بار کوشش کی، مگر بے سود، کوئی خاص بات نہ بن سکی، یار گاڑی اسٹارٹ نہیں ہورہی ہے۔ اور اب کیا کیا جائے۔

نویرہ یہ سن کر سیخ پا ہوگئی، اب کیا ہوگا۔ طلال یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ تم مجھے لانگ ڈرائیو پر لاتے، نہ یہ مصیبت جھیلنی پڑتی، ہم شہر سے بہت دور ہیں۔ ہم کیا کسی کی مدد بھی نہیں لے سکتے، نویرہ نے افسوس سے کہا۔ کچا راستہ شدید بارش کی وجہ سے کافی کیچڑ آلود ہو چکا تھا، گاڑی سے نکلنا ممکن نہ رہا تھا۔

نویرہ نے اپنے پرس سے سیل فون نکالا۔ ارے یہ کیا۔ اس میں تو سگنل ہی نہیں آرہے ہیں۔ ورنہ میں اپنے کسی جاننے والے کو تو فون کردیتی اب کیا رات ہمیں اس سنسان ویرانے میں گزارنی پڑے گی۔ بارش کی شدت میں اضافہ ہوگیا دور سے ایک روشنی کا گولا ان کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ شاید وہ کوئی گاڑی ہے۔ نویرہ نے امید بھری آس سے کہا۔

ہاں اللہ کرے کہ شاید ایسا ہی ہو کہ وہ ہماری مدد کو راضی ہوجائیں۔ دونوں امید بھری نظروں سے سامنے دیکھنے لگے۔ سامنے سے آنے والا آہستہ آہستہ قریب آتا گیا۔ یہ کیا؟ یہ تو تو، کوئی اکیلا آدمی ہے اس نے برساتی پہنی ہے اور ہماری جانب آرہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ ہے اور اس سے اتنی تیز روشنی نکل رہی ہے کہ کوئی گاڑی کی ہیڈ لائٹس لگ رہی ہے۔

ہاں نویرہ مجھے بھی بالکل ایسا ہی لگ رہا ہے۔ مگر یہ کون ہے، جو رات کے اندھیرے میں ہماری طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ ضرور، یہاں کا باسی ہوگا، نویرہ نے امید سے طلال کو دیکھ کر کہا۔

شاید ایسا ہی ہو مگر نویرہ دیکھو تو وہ اتنی تیز طوفانی بارش میں کیسے پرسکون چل رہا ہے۔ اس کی شکل نظر نہیں آرہی ہے۔ شاید وہ ہماری طرف ہی آرہا ہو، کیونکہ وہاں پر ہماری گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند ہوئی تھیں، شاید ایسا ہی ہو۔ آنے والا اب 25,20 گز کی دوری پر رہ گیا۔ خدا خیر کرے، دونوں کی نظریں سامنے آنے والے شخص پر محور ہوگئیں، رفتہ رفتہ لمحے کی حساب سے وقت گزرتا گیا اور وہ اب کچھ دوری پر رہ گیا۔ وہ گاڑی کے قریب آ گیا اور دونوں اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ یہ کوئی 80 سالہ بوڑھا تھا۔ جس نے لمبی برساتی پہنی تھی۔ اور اس نے ایک گول مول ہیٹ کیپ پہنی تھی۔ وہ چلتا ہوا طلال کی طرف آ گیا۔ صاحب..... اس نے کہا۔

ایسے لگا کہ کوئی بھوت بول رہا ہو۔ یا پھر کوئی خراب ریڈیو ہو، دونوں اس کالے بوڑھے کی آواز سن کر سکتے کی حالت میں آ گئے۔ بوڑھے نے تیز روشنی ان کی طرف کی۔ کیا بات ہے صاحب، کیا میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں، یہاں قریب میرا گھر ہے۔ میں نے آپ کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس بند ہوتے دیکھیں تو یہاں دیکھنے آ گیا۔

بارش باہر بہت تیز تھی اور زوروں پر تھی، وہ بے حد ڈراؤنا تھا۔ قد لمبا تھا اور اس کی چال بھی عجیب تھی، کیونکہ اس کی عمر زیادہ تھی، مگر وہ نوجوان کی طرح بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ دونوں بالکل چپ تھے۔

کیا بات ہے صاحب، آپ جواب کیوں نہیں دے رہے۔ وہ..... میں..... میں..... طلال کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ میرے پاس چھتری موجود ہے، ادھر نزدیک ہی میرا گھر ہے، آپ دونوں رات گزار کر چلے جائیں۔ نویرہ طلال کو دیکھنے لگی اور طلال کی بھی حالت عجیب تھی۔ نویرہ گاڑی سے باہر نکلی، باہر تیز بارش نے ایک لمحے میں اسے دوبارہ گاڑی میں

بیٹھنے پر مجبور کردیا۔ بوڑھے کی آنکھوں میں روشنی کی سی چمک ابھری۔

بی بی، یہ لو چھتری بوڑھے نے اپنے لمبے اوور کوٹ سے بلیک کلر کی چھتری نکال لی۔ یہ لو میم صاحبہ، بوڑھے کی خراب آواز سنائی دی۔ اچھا شکریہ! اس بار واقعی نویرہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور اس نے بوڑھے کے ہاتھ سے چھتری لے لی اور پھر اگلے لمحے گاڑی سے باہر نکلی، اس نے اونچی ہیل والی جوتی پہنی تھی اور پھر اس نے چھتری پھیلا دی۔ چھتری کی وجہ سے وہ بارش سے بچ گئی، طلال تم بھی باہر نکلو! نویرہ نے طلال کی طرف دیکھ کر کہا۔

ہاں صاحب، بی بی صاحبہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ یہاں ویرانے میں رات گزارنا ٹھیک نہیں ہے۔ وہاں نزدیک میرا گھر ہے، وہاں چلتے ہیں، طلال بابا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں ہم رات یہاں پر گزار نہیں سکتے۔ بلکہ ہم بابا جی کے ساتھ چلے تو زیادہ اچھا ہے۔ طلال نے گاڑی کو وہاں پر چھوڑا اور تینوں اب آگے کی طرف چلنے لگے، خوف دونوں کو مسلسل محسوس ہورہا تھا۔ مگر گاڑی میں بھی نہیں رک سکتے تھے۔ کیونکہ یہاں بھی خوف محسوس کیا جاسکتا تھا۔

تقریباً کیچڑ میں آدھا گھنٹہ چلنے کے بعد بوڑھا ایک خستہ حال عمارت کے قریب آ کر بولا۔ یہ عمارت میرا گھر ہے۔ دونوں عمارت کو دیکھ کر چونک گئے، کالے رنگ کی کالی عمارت تھی اور تین یا پھر چار منزلہ عمارت تھی۔ چاروں منزلوں سے پلستر جگہ جگہ سے اتر گئی تھی اور نہایت کسمپرسی کی حالت میں کھڑی تھی۔ دونوں نے عمارت کو دیکھا اور خوف کی ایک سرد لہر دونوں کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کرگئی۔ اردگرد دونوں کی نگاہیں گھوم گئیں، مگر اردگرد دور دور تک کوئی دوسری عمارت نظر نہیں آئی۔ اردگرد وسیع میدان تھا، اور تیز برستی بارش کی وجہ سے یہاں پر خوفناک منظر پیش ہورہا تھا۔ بوڑھے کی آواز بلند ہوئی، یہ باہر سے جتنی بدصورت نظر آتی ہے، یہ عمارت اندر سے اتنی خوب صورت اور دلکش ہے کہ آپ لوگ پھر شاید باہر نکلنے کے بارے میں سوچیں۔

اچھا نویرہ نے حیرت سے طلال کی طرف دیکھا۔ چلو اندر چلیں، طلال نے بوڑھے کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ وہ مین گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔ زنگ آلود سا گیٹ تھا، جب بوڑھے نے گیٹ کو دھکا دیا، تو چرچراہٹ کے ساتھ گیٹ کھل گیا اور بھیانک آواز پیدا ہوگئی دوسرے لمحے خاموشی چھا گئی، جوں جوں وہ دونوں اندر جارہے تھے، توں توں حیرت سے ان کے منہ کھل رہے تھے۔ اندر اور باہر کی عمارت میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ راہداری میں سرخ قالین بچھائی گئی تھی اور گرد کی دیواروں پر قدیم تصاویر چسپاں تھیں، اندر عمارت میں سہولت کی ہر آسائش دستیاب تھی۔ راہداری میں مشعلیں روشن تھیں اور ان کی روشنی بہت بھلی معلوم ہورہی تھی۔ یہ عمارت اندر سے بہت کشادہ اور وسیع نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں بوڑھے کے پیچھے چلتے چلے گئے، راہداری ختم ہوئی تو آگے دوسری منزل کی طرف سیڑھیاں جارہی تھیں، اور پیچھے بھی کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ عمارت باہر سے جتنی بدصورت اور بھیانک دکھائی دے رہی تھی اندر سے کسی جنت سے ہرگز کم نہ تھی۔ خیر بوڑھے کی آواز سنائی دی۔ تم دونوں یہاں پیچھے والے سامنے کمرے میں جاؤ۔ میں اوپر رہتا ہوں، نویرہ نے کہا۔ بابا جی، آپ اس عمارت میں اکیلے رہتے ہو، یا کوئی اور بھی یہاں رہائش پذیر ہے، ہاں یہاں پر میری بیوی میرے ساتھ رہتی ہے اور یہ ہمارا گھر ہے، میں تم دونوں کے لئے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں، اور اپنی بیوی سے تم دونوں کو ملواتا ہوں، اچھا ہم سامنے والے کمرے میں جارہے ہیں، طلال نے بوڑھے کی طرف دیکھ کر کہا۔

ہاں چلے جاؤ۔ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے اور میں ابھی بس کچھ دیر میں اپنی بیوی کو بھیجتا ہوں! وہ دونوں ساتھ سامنے والے بڑے اور کشادہ کمرے میں داخل ہوگئے، کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، دونوں کو حیرت بھی ہوئی کہ اتنی بھیانک، ہولناک اور سنسان جگہ پر یہ عمارت اور وہ بھی اتنی حسین و

جمیل، خیر وہ دونوں تھوڑے،بہت بھیگ چکے تھے، کیونکہ بارش بہت تیز تھی، ہم کپڑے تبدیل کرلیں، نویرہ الماری میں کپڑے ٹٹولنے لگی، مگر یہ کیا، کپڑوں سے الماری تو بھری تھی، اور وہ بھی ان کے ناپ کی تھی۔ خیر دونوں نے کپڑے تبدیل کرلئے، تو دروازے پر دستک ہوئی، ایک حسین آواز ان کے کانوں میں آئی، کیا میں اندر آسکتی ہوں۔

دونوں انتہائی حیران رہ گئے۔ ہاں دروازہ کھلا ہے آجایئے۔ طلال نے جواب دیا۔ وہ آواز نسوانی تھی اور دونوں کی نظریں دروازے پر مرکوز ہوگئیں، آنے والی نے ہلکے انداز سے دروازہ کھولا اور جب اندر داخل ہوئی تو دونوں کی آنکھیں ایک مرتبہ پھر حیرت سے چار ہوگئیں، کیونکہ آنے والی انتہائی خوب صورت جسم وقد کی مالک تھی، ایسا لگا ان کو جیسے جنت کی حور زمین پر اتر آئی ہے۔

تم کون ہو؟ نویرہ، وہ بول نہ سکی، اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی، اس نے ٹرے کو ان کے سامنے میز پر نہایت احتیاط سے رکھا اور کہا میں بوڑھے کی بیوی ہوں، یہ انکشاف ان دونوں کے لئے بالکل عجیب تھا، دونوں نے سوچا تھا کہ بوڑھے کی بیوی بھی بوڑھے کی طرح مکروہ شکل والی ہوگی، مگر یہ تو کوئی حسین و جمیل دوشیزہ تھی، ٹرے سے کپڑا ہٹایا گیا، یہ دیکھ کر ان کو سخت حیرانی ہوئی کہ ہر برتن سونے کے تھے اور ان پر ہیرے جواہرات کا کام نقش ہوا تھا۔ یہ کھانا اپ لوگ کھالو! میں کچھ دیر بعد برتن اٹھانے آتی ہوں! طلال اور نویرہ کھانے کو دیکھ کر ان پر ٹوٹ پڑے، کھانا انتہائی لذیذ تھا، اچانک ایک دم نویرہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اسے محسوس ہوا کہ کھانے کے سالن میں انسانی انگلی تھی، طلال مت کھاؤ کھانا۔

کیوں، طلال نے حیران ہوکر پوچھا۔ مجھے سالن میں انسانی انگلی دکھائی دی ہے۔

کیا مطلب؟ طلال یہ سن کر سخت مضطرب ہوا کیا [illegible] یہ سب تمہارا خوف ہوگا۔تم ڈرگئی ہوگی۔ نہیں خود میں نے دیکھی لیکن نہیں میں نے دیکھی تھی۔ اب سالن میں نہیں ہے۔ شاید تمہیں وہم ہوگیا ہو! ہاں کھانا تو بہت لذیذ ہے، خیر دونوں نے پھر چند ایک نوالے اور کھانا کھا کر بس کردیا۔ نویرہ نے برتن سمیٹے اور میز کے اوپر رکھ دیئے، اتنے میں دروازہ کھلا اور وہی حسینہ پھر داخل ہوگئی، اس کے ہاتھ میں مشروب کے گلاس تھے، سرخ گاڑھا قسم کا شربت وہ لے کر آئی تھی، یہ مشروب ہے۔ آپ دونوں کے لئے ہیں۔ اس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ جی دراصل وہ آپ کا شوہر کہاں گم ہوگیا؟ طلال نے اس سے پوچھا۔ وہ اوپر رات کو وظیفہ پڑھتا ہے۔ اس لئے نیچے نہیں آسکا۔ ورنہ ضرور آجاتا، اچھا آپ دونوں کا نام کیا ہے؟ اس کی بیوی نے ان سے پوچھا۔

یہ میرے شوہر طلال ہیں اور میں نویرہ ہوں، اچھا آپ کا نام کیا ہے؟ جی میرا نام علینا ہے، اور میرا شوہر ''وکنام'' ہے۔ آپ کے شوہر کا نام کچھ عجیب نہیں ہے کیا؟ نویرہ اس سے باتوں میں مصروف ہوگئی۔ جی ہاں۔ وکنام نام بہت عجیب ہے۔ علینا نے لبوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ کیا میں آپ سے کچھ ذاتی سوالات پوچھ سکتی ہوں۔ نویرہ نے علینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ہاں کیوں نہیں۔ فی الحال تم دونوں یہ مشروب پی لو۔ میں بعد میں آتی ہوں۔ علینا یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ اور دو عدد گلاس بطور ان کے لئے میز پر رکھ کر چھوڑ گئی۔ دونوں نے بیک وقت مشروب کے گلاس اٹھائے اور منہ سے لگائے، ایک دم نویرہ نے گلاس نیچے پھینک دیا اور کہا کہ خون، کیا طلال کی آنکھیں ابل پڑیں، کہاں ہے خون، خون یہ خونی گلاس تھا۔ اس میں کون تھا کیا کہہ رہی ہو تم، اس میں خون نہیں تھا، دیکھو یہ کیا لذیذ مشروب ہے اور اس کا ذائقہ کس قدر مسحور کن ہے۔ مگر شاید تم، تم کو وہم ہوگیا ہو، دیکھو کمرے کا قالین گندا کردیا۔

نہیں طلال مجھے وہم نہیں ہوا بلکہ میں سچ کہہ

رہی ہوں، اس شربت کا ذائقہ بالکل نمکین تھا۔ اور یہ شربت بالکل گاڑھا تھا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ہم دونوں ان کے جال میں بری طرح پھنس رہے ہیں۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔ لگتا ہے تمہارا ذہن خوف میں مبتلا ہے اور، اور تم کو ہر چیز عجیب وغریب لگتی ہے۔ میں کیا کہوں، چیز لیکن دیکھنا طلال۔ اگر میرا یہ خوف سچ ثابت ہوا تو یہ رات ہم پر بہت بھاری گزرے گی۔ شاید وہ لوگ انسانی روپ میں کچھ اور ہوں۔ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ شاید یہ تمہارا وہم ہو۔ اور وہم کا کوئی علاج نہیں ہے ایک دم کمرے کی کھڑکی زور سے کھڑکی اور کھڑکی کے دونوں پٹ کھل گئے، باہر اب بھی بارش زوروں پر تھی، بارش کے شور کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ نویرہ ڈر کے مارے اٹھ گئی۔ دیکھا طلال میں نہ کہتی تھی یہاں پر ضرور کوئی نہ کوئی ہے، یہ کھڑکی ہوا کے دوش پر کھلی تھی، نویرہ اور تم یوں بچوں کی طرح ڈر رہی ہو، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ دیکھو اگر تم ہمت ہارلوگی تو اس عمارت کے مقابلے میں باہر خوف بہت زیادہ ہوگا۔ اور اگر باہر کی سردی بھی تو برداشت سے باہر ہے۔ نویرہ، صرف ایک رات کی ہی تو بات ہے۔ خدا کے لئے مت ڈرو، خوف کو دل سے دور پھینک دو، اگر یہ لوگ آدم خور، یا کچھ اور ہوتے تو اب تک ہمیں مار چکے ہوتے، باہر کی نسبت یہ کمرہ ہمارے لئے محفوظ ہے۔ ہاں طلال یہ تو ہے خیر وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور علینا کمرے میں داخل ہوگئی۔ علینا جی شکر ہے کہ آپ آگئیں۔ میری بیوی بہت ہی پریشان ہے۔ ہاں پریشان تو ہے۔ علینا نے مسکرا کر کہا۔

دراصل یہاں جو بھی آتا ہے، وہ کچھ کچھ پریشان ہوتا ہے، مگر شکر ہے کہ آپ بڑے دل والے ہیں، آپ مجھے بہت ہی باہمت مرد لگ رہے ہیں۔ علینا نے طلال کی طرف ناز انداز سے کہا۔ نویرہ نے علینا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور علینا نے نویرہ کی طرف دیکھا۔ نویرہ کو علینا کی آنکھوں میں آگ سی دہکتی ہوئی دکھائی دی۔ اور اس کے دانت، منہ سے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے، وہ جلدی سے مڑ کر دوسری جانب دیکھنے لگی، اگر علینا اسے مزید کچھ دیر اور دیکھتی تو شاید نویرہ خوف سے بے ہوش ہوجاتی۔ نویرہ کے پسینے چھوٹنے لگے، سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر بے شمار قطرے آگئے، ارے واقعی تم تو بہت زیادہ ہی ڈرپوک ہو۔ علینا نے نویرہ کی بدلتی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر کہا۔ طلال نے بھی اس کی تائید کی۔ ہاں کچھ لوگ اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ اور میری بیوی کا دل بڑا ہی کمزور ہے۔ یہ اس ماحول سے ڈرگئی ہے۔

کیا آپ کو ڈر نہیں لگتا۔ طلال کے اس سوال پر علینا نے ہنس کر اسے دیکھا۔ میں تو کئی سالوں سے یہاں اس ویرانے میں رہتی آئی ہوں، یہ جو میرا شوہر ہے۔ یہ میرا سب سے بڑا محافظ ہے۔

ہاں یہ تو ہے میرا شوہر طلال بھی میرا محافظ ہے۔ نویرہ خوف کے باوجود علینا کو جتا گئی...... بالکل ایسا ہی ہے۔ طلال بھی مسکرایا۔ میں یہاں اس لئے آئی تھی کہ آپ سے معلوم کرسکوں کہ آپ دونوں کو کچھ چاہئے، تو نہیں ہے، علینا نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا!...... جبکہ طلال اور نویرہ نے ایک دوسرے کو دیکھا! کچھ دیر کے بعد خاموشی کے بعد طلال بولا۔

نہیں علینا جی ہمیں کچھ نہیں چاہئے، آپ کا بہت بہت شکریہ، ٹھیک ہے میں جاتی ہوں۔ آپ دونوں آرام کرلیں۔ ٹھیک ہے ناں۔

علینا مڑی۔ اسی اثنا میں زور سے آسمانی گڑگڑاہٹ ہوئی، گڑگڑاہٹ اتنی تیز تھی کہ جیسے آسمان پھٹا ہو۔

نویرہ خوف کے مارے طلال سے لپٹ گئی، اسی لمحے علینا مڑی اور اس نے دونوں کو دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے طلال کو آنکھ ماری اور جلدی سے مڑی اور دروازے سے باہر نکلی، باہر اب بھی بارش ہورہی تھی۔

نویرہ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟ آسمانی گڑگڑاہٹ سے بھی خوفزدہ ہورہی ہو۔

طلال تم وہ محسوس نہیں کر رہے ہو جو میں کر رہی ہوں۔ میرے خیال میں ہم کسی ان دیکھی طاقتوں کے آگے بے بس ہو گئے ہیں۔ طلال یہ عمارت چار منزلہ ہے، مگر بہت ہی کم رقبے پر بنائی گئی ہے۔ اس کے اوپری منزلوں میں یہ میاں بیوی ہی رہتے ہیں کیونکہ ہم تو پہلی منزل پر ہیں۔ باہر تھوڑا سا کھلا لان ہے۔ مجھے لگتا ہے یہ دونوں ضرور ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔

نوریہ، بس ایک رات کی ہی بات ہے۔ دیکھو علینا چلی گئی ہے۔ میں تمہارے خوف کو مدنظر رکھتے ہوئے دروازہ بھی بند کرتا ہوں۔ طلال اٹھا اور اس نے دروازے کا کنڈا اندر سے بند کر دیا۔

باہر اب بھی زوروں پر بارش برس رہی تھی، اچانک گڑگڑاہٹ ہوئی اور کمرے کی کھڑکی زور سے ہوا کے دوش پر کھل گئی، سرد ہوا کے جھونکے اندر کمرے میں داخل ہو گئے۔

نوریہ کانپ کر رہ گئی۔ طلال دیکھا تم نے، کسی انجانی طاقت نے کمرے کی کھڑکی کو کھول دیا۔

نوریہ یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تمہارے دل میں خوف کی پرچھائیاں ہیں، اگر ہم اس گاڑی میں رات گزارتے تو سردی سے ہمارا برا حال ہو جاتا۔ میں مانتا ہوں کہ ہمارے مہمان کچھ عجیب ہیں مگر یہ جگہ اس ویرانے سے لاکھ درجے بہتر ہے۔ بس ایک رات کی بات ہے کل صبح ہوتے ہی ہم نکل جائیں گے۔

طلال تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر تم بھول رہے ہو کہ علینا نے ہمیں کھانے میں انسانی انگلی کھلانے کی کوشش کی اوپر سے مشروب کے نام پر خون پلایا۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں تو بے ہوش ہو چکی ہوتی...... نوریہ، میں نے غور سے مشروب اور کھانے کو دیکھا تھا۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارے اعصاب پر خوف سوار ہے اور تمہیں وہم ہو رہا ہے۔ اچھا میں ہوں نا، بس سو جاؤ، طلال پلنگ پر لیٹتے ہوئے بولا۔

اس نے کمبل اوڑھ لیا۔ نوریہ بھی اس کے ساتھ سونے کے لئے لیٹ گئی...... کچھ دیر تک دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، اور پھر طلال نوریہ کو دیکھنے لگا۔ نوریہ تو خوف کا شکار تھی۔ مگر پتہ نہیں اب وہ بے ہوش کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔ یہ سب طلال کے لئے نہایت ہی حیرن کن تھا۔ جبکہ نوریہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے بہت زیادہ خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اسے ساری رات نیند نہیں آئے گی۔ مگر اب وہ سوئی پڑی تھی۔

طلال نے کمرے کی کھڑکی بھی بند نہیں کی تھی۔ کھڑکی سے ٹھنڈی ہوائیں آ رہی تھیں۔ باہر گھپ اندھیرا تھا۔ مگر عمارت کے باہر روشنی تھی۔ یہ روشنی عمارت کے کمرے سے آ رہی تھی۔

اچانک طلال کو کمرے میں سے باہر کھڑکی میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ طلال نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں پر علینا کھڑی تھی۔ اور وہ طلال کو اشارے سے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

طلال حیران رہ گیا۔ وہ اٹھا۔ اور کمرے کی کھڑکی کی طرف جانے لگا۔ وہاں واقعی علینا ہی کھڑی تھی...... طلال باہر آ جاؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔

طلال نے سوئی ہوئی نوریہ کو دیکھا...... طلال وہ نہیں اٹھے گی، تم باہر آ جاؤ۔ طلال کے کانوں میں علینا کی شیریں آواز پڑی۔

طلال نے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ طلال اب علینا کے روبرو کھڑا تھا۔ طلال نے اسے دیکھتے ہی پوچھا؟ تم نے مجھے کیوں بلایا ہے؟

طلال تم کو یہاں ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ نہیں؟......

علینا یہ کیسا سوال ہے۔ مجھے تو کوئی خاص ڈر محسوس نہیں ہو رہا ہے۔ مگر میری بیوی بہت زیادہ گھبرا گئی ہے۔

ہاں وہ تو ہے، مگر اب وہ سو گئی ہے۔ علینا نے سکون سے کہا۔

تمہارا شوہر وکنام کہاں ہے؟...... میرا شوہر اپنے عمل میں مصروف ہے۔ علینا نے کہا۔ کیسا عمل؟...... طلال الجھ کر بولا۔

طلال تمہیں پتہ نہیں ہے۔ مگر تم اب بہت جلد

الجھ ہو جاؤ گے کہ وکنام کون سا عمل کر رہا ہے...... علینا تم کیسی الجھی باتیں کر رہی ہو، مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے...... ہاں واقعی یہ تو ہے، آؤ میرے ساتھ میں تمہیں کچھ بتانا چاہتی ہوں...... وہ دونوں راہداری میں آگے ہی آگے چلنے لگے۔

طلال کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، وہ بالکل بھی سمجھ نہیں رہا تھا کہ علینا اسے کیا بتانا چاہتی ہے۔

راہداری ختم ہوئی تو اوپر جانے کے لئے سیڑھیاں آ گئیں۔ علینا نے سیڑھیوں پر قدم رکھ دیا اور اس کے پیچھے پیچھے طلال بھی جانے لگا۔

علینا ہم کہاں جا رہے ہیں؟ طلال رہ نہ سکا۔

میرے کمرے میں!...... علینا مسکرا کر بولی۔

طلال رک گیا، اور علینا بنا دیکھے ہی بولی۔ طلال رکو مت میرے پیچھے چلے آؤ...... جب طلال نے یہ سنا تو وہ خوف کی لپیٹ میں آ گیا۔ علینا تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں رک گیا تھا؟ طلال نے خوفزدہ ہو کر پوچھا؟ علینا نے مڑ کر طلال کو دیکھا اور مسکراتی ہوئی اس کی جانب ایک قدم بڑھی۔ طلال پہلے میرے کمرے میں چلو، پھر سب بتاتی ہوں۔

علینا، تمہارے کمرے کے علاوہ بھی بات ہو سکتی ہے اور بہتر یہی ہے کہ ہم باہر ہی بات کر لیں۔

علینا واپس مڑی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی، چپ چاپ میرے پیچھے آؤ ورنہ نقصان میں رہو گے۔

طلال علینا کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، مگر اس کے ذہن کو کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا...... علینا! میں نوریہ کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔

علینا ایک دم مڑی...... اور تیز لہجے میں بولی۔ کیا کہا تم نے کہ تم نوریہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے یعنی کہ تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہیں کوئی تعلق قائم کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں، طلال تم کو میں ایک سچائی بتانا چاہتی ہوں اور وہ سچائی تمہارے لئے بہت اہم ہے اگر تم نہیں آنا چاہتے تو ٹھیک ہے پھر بعد میں پچھتاؤ گے......

ڈاکٹروں، حکیموں اور ماہرین طب کی ہدایات سے لکھی گئی مفید کتاب

شوگر (ذیابطیس)

قیمت-/100 روپے

اس کتاب میں شوگر کیسے اور کیوں ہوتی ہے، شوگر صحت کے لئے سب سے سنگین خطرہ، ایکسپائر استعمال نہیں کرنی چاہئیں، بڑھتی عمر، شوگر کیا ہے، ٹائپ ون شوگر، ٹائپ ٹو شوگر، بلڈ پریشر کا خطرہ، ہائی بلڈ شوگر کے مریضوں کی سرجری خطرناک ہو سکتی ہے، شوگر کی پیچیدگیوں سے کیسے نمٹا جائے، احتیاطی تدابیر، شوگر اور ڈپریشن کا تعلق، افسردہ اداس مائیں اور بچے، نارمل بلڈ شوگر کیا ہے، جانچ کب کروائیں، شوگر بڑھنے کے اسباب اور تدارک، موٹے افراد کا خوف، سگریٹ نوشی، وجوہات، شوگر سے محفوظ رہنے والی خواتین، انفیکشن، بچوں پر ماؤں کا اثر، پیشاب کی نالی میں انفیکشن، ذیابطیس کے مریضوں کے لئے خطرناک بیماریاں، ڈپریشن، شوگر کی علامات اور اس سے بچاؤ کے طریقے، دیسی و ڈاکٹری نسخے پڑھئے اس کتاب میں۔

حکیم غلام مصطفٰے

دعا بک کارنر منشی محلہ گلی نمبر 5 امین پور بازار فیصل آباد

علینا مگر تم نے انداز بہت مشکوک سا اپنایا ہوا ہے۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی ہے کہ میں کیا کروں۔

طلال بس تم صرف میرے پیچھے آؤ۔ پھر تم خود فیصلہ کرنا کہ تمہیں کیا کرنا ہے..... ٹھیک ہے۔ طلال نے علینا کی طرف دیکھ کر کہا۔

دونوں اب سیڑھیوں سے اوپر جارہے تھے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر علینا نے ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور طلال کے ساتھ اس کمرے میں اندر داخل ہوئی، کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ علینا نے آگے بڑھ کر ایک فانوس نما چیز روشن کرلی، اس کی روشنی بہت تیز تھی۔ روشنی کمرے میں پھیل گئی اور ہر چیز روشن ہوگئی۔ یہ کمرہ ایک ہال نما کمرے کی طرح بڑا تھا۔ اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اور ایک چیز پر جب طلال کی نظریں پڑیں تو وہ خوف کی وجہ سے کانپ اٹھا۔ اس کی نظریں اسی چیز پر جم کر رہ گئیں۔

کہاں کھو گئے ہو؟ علینا کی آواز طلال کی سماعتوں میں گونجی.....

علینا یہ کیا ہے..... یہ کھوپڑی یہاں کیوں رکھی ہے..... علینا طلال کو دیکھ کر مسکرائی..... طلال یہ ماروائی کھوپڑی ہے اور تمہاری نظریں اسی کھوپڑی پر ٹھہری ہوئی ہیں..... تم بیٹھو!..... طلال بیٹھ گیا، مگر ابھی تک طلال کی نظریں کھوپڑی سے ہٹی نہیں تھیں..... علینا اس کے ساتھ بیٹھ گئی، علینا نے طلال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو طلال کو اس کا ہاتھ اتنا سرد لگا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہری سی دوڑ گئی۔

طلال تم بہت نڈر ہو، اور میں جو تمہیں بتانے والی ہوں، اسے غور سے سننا، طلال گم صم سا اسے دیکھ رہا تھا..... طلال میں وکنام کی بیوی نہیں ہوں' وہ ایک جادوگر ہے اور میں اس کی قیدی ہوں، طلال تم اور تمہاری بیوی نویرہ یہاں پھنس گئے ہو، میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھی وکنام کے قید سے نجات دلا دو۔ اور اس شیطان کو جہنم واصل بھی کردو۔ طلال طریقہ میں تمہیں بتاؤں گی۔ وکنام شیطان کیسے ختم ہوسکتا ہے اور پھر ہم آزاد ہوجائیں گے علینا کیا تم خود اس کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتی۔

نہیں طلال، اگر میں ایسا کرسکتی تو میں تمہیں مدد کے لئے کیوں بلاتی، جبکہ میں خود اس کی غلام ہوں، اور اس سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں اور میں بہت کمزور ہوں، جبکہ تمہاری بیوی نویرہ خطرے میں ہے۔ وکنام آج رات جو عمل کررہا ہے وہ عمل نویرہ کے لئے کررہا ہے۔ اس سے پہلے کہ دیر ہوجائے اور وکنام کی ماورائی طاقتیں بیدار ہوجائیں تمہیں وکنام کو ختم کرنا ہوگا.....

علینا مجھے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا ہے؟ کہ میں کیسے ایک جادوگر کا خاتمہ کردوں گا..... طلال کی پریشان آواز میں خوف کا عنصر نمایاں تھا..... طلال تمہیں بس یہ کرنا ہوگا کہ تم نے اس کی جادوئی کھوپڑی کو توڑنا ہوگی، اور اگر تم اس کے عمل سے پہلے پہلے کھوپڑی کو توڑ لوگے تو غالباً جیت تمہاری ہوگی۔ وکنام کی ساری جادوئی طاقتیں اسی کھوپڑی میں ہیں اور اب موقع بھی اچھا ہے۔ کیونکہ وکنام عمل میں مصروف ہے اس کی جانب سے ردعمل کے طور پر بھی کوئی طاقت کھڑی نہیں ہوگی۔

علینا تم اس کی قیدی کیسے بنی؟.....

طلال میں پھر یہ کہانی تمہیں سناؤں گی۔ پہلے تم اس کو ختم کردو!..... اچھا اتنا تو بتاؤ کہ وکنام کون سا عمل کررہا ہے۔ طلال نے جلدی سے پوچھا! طلال وہ ایک خطرناک عمل کررہا ہے۔ بس یوں سمجھو کہ اسے ایک لڑکی کا خون چاہئے، اور عمل کے آخر میں وہ نویرہ کو مار کر اس کا خون پیئے گا، تم دونوں کی گاڑی خراب نہیں ہوئی تھی بلکہ وکنام نے جادو کے زور سے خراب کردی تھی۔ اور پھر خود چل کر تم دونوں کو یہاں لے آیا۔ وہ ہمیشہ سے نوجوان لڑکیوں کا خون کا رسیا رہا ہے۔ خون اس کا پسندیدہ ترین مشروب ہے۔ اور وہ ایک خون آشام ہے۔

جب وہ عمل ختم کرے گا تو نویرہ خوابیدہ انداز میں چلتی ہوئی اس کے کمرے میں جائے گی اور اس کے سامنے لیٹ جائے گی۔ یہ سب جادو کے زیر اثر ہوگا۔ اور پھر وکنام ایک تیز دھار چاقو سے نویرہ کے شہ رگ پر کٹ لگائے گا۔ اور پھر نویرہ تڑپے گی اور خون کا فوارہ جو نویرہ کی شہ رگ سے نکلے گا۔ سیدھا وکنام کے کھلے منہ میں جائے گا.....

یہ سب کچھ سن کر طلال کے خوف سے رونگٹے کھڑے ہوگئے، طلال گم صم سا اسے دیکھنے لگا..... طلال تم خود کو خوف کی لپیٹ میں لے رہے ہو۔ طلال اگر خوف محسوس کروگے تو تم کچھ بھی نہیں کرسکو گے، تم اپنی نویرہ کو ہاروگے، اس شیطان کے آگے جو ذرا بھی رحم دل نہیں ہے۔

علینا، اگر میں کھوپڑی توڑ ڈالوں تو کیا وکنام ختم ہوجائے گا..... نہیں وہ تو ختم نہیں ہوگا، مگر اس کی جادوئی طاقتیں ختم ہوجائیں گی اور میں آزاد ہوجاؤں گی۔ تب تم آسانی سے اسے ختم کرلوگے۔

ٹھیک ہے، میں کھوپڑی کو ختم کرتا ہوں، طلال پرجوش لہجے میں بولا..... اور کھوپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ کھوپڑی کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا..... طلال جلدی سے کھوپڑی کو پکڑ لو، یہ کھوپڑی کسی غیر کو اپنے قریب زیادہ برداشت نہیں کرسکتی اور اگر ایک اس کھوپڑی کی طاقتیں عمل میں آگئی تو یہ بہت جلد تمہارا خاتمہ کردے گی۔

علینا نے چیخ چیخ کر طلال سے کہا..... طلال نے ہاتھ آگے بڑھا کر دونوں ہاتھوں سے وہ سرخ رنگ کی کھوپڑی پکڑ لیا اور اسے اس میز سے اٹھالیا جس پر وہ کھوپڑی پڑی تھی۔

تیز ہوائیں کمرے میں چلنے لگیں، اور کمرے میں ایک کھر کھراتی ہوئی چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ کھوپڑی سے نکلی تھی۔ چیخ نے وکنام کا نام لیا..... وکنام اپنی طاقتوں کو بچاؤ..... ایک بار پھر کھر کھراتی ہوئی آواز کھوپڑی سے نکلی.....

علینا چیخی، طلال تم اس کھوپڑی کو پوری قوت سے فرش پر دے مارو، اگر یہ ٹکڑوں میں بٹ جائے تو سمجھو کہ اس کھوپڑی کی طاقتیں ضائع ہوگئی ہیں۔ طلال نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے کھوپڑی کو اپنے سر سے اونچا کیا اور پوری قوت سے کھوپڑی کو کمرے کے فرش پر دے مارا۔

اسی لمحے ایک سایہ سا اڑتا ہوا آیا۔ اس نے کھوپڑی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر دیر ہوچکی تھی۔ کھوپڑی زمین پر گرتے ہی پاش پاش ہوگئی۔

وہ سایہ جو جلدی میں نمودار ہوا تھا، کھوپڑی کے پاش ہوتے ہی چنگاڑتا ہوا غائب ہوا۔ غالباً وہ محافظ سایہ تھا۔ جو کھوپڑی کی حفاظت کے لئے تھا، مگر وہ اس وقت کھوپڑی سے دور تھا۔ جب قریب آیا تو اس کی طاقت ختم کی جاچکی تھی۔ طلال نے علینا کی طرف دیکھا۔ مگر علینا اپنی جگہ سے غائب ہوچکی تھی۔ طلال نے ارد گرد نظریں دوڑائیں، مگر پورے کمرے میں اسے علینا کہیں بھی نظر نہیں آئی۔ طلال کو ایک بار پھر خوف کی گہری پرچھائیں نے آگھیرا..... طلال کے کانوں میں علینا کی آواز سنائی دی۔

طلال اب میں نظر نہیں آسکتی۔ میں ایک روح ہوں، جو وکنام کی قیدی تھی۔ اب میں وکنام کی قید سے رہائی پاچکی ہوں۔ اب تم وکنام کو ختم کرو۔

میں وکنام کو کیسے ختم کروں، وہ کہاں پر ہے؟

وکنام اوپر، آخری کمرے میں ہے، وہ کمرہ جھاڑ اور بوسیدہ سا کمرہ ہے۔ وہاں پر وکنام عمل کررہا ہے وکنام کو خبر ہوچکی ہے۔ کہ اس کی طاقتیں ضائع ہوچکی ہیں۔ اگر وہ عمل ادھورا چھوڑتا ہے تو نقصان اس کا ہی ہوگا، اس لئے وہ صبح تک عمل نہیں چھوڑے گا، بلکہ تم اس کے پاس جاؤ اور اس کو ختم کرو.....

ٹھیک ہے علینا، تم میری رہنمائی آگے بھی کرتی رہنا، تاکہ ہم بحفاظت یہاں سے نکل جائیں۔

طلال اب ہال نما کمرے سے نکل رہا تھا، وہ اب سیڑھیوں میں اوپر ہی اوپر جارہا تھا۔ آگے راہداری تھی، راہداری سے نکل کر چوتھی منزل پر پہنچ کمرے قطار

کی صورت میں بنائے گئے تھے۔ طلال نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی، مگر وہ کھل نہیں رہا تھا۔ پھر اس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ آگے کیا، وہ دروازہ خود بخود بنا آواز کے کھل گیا، طلال بے دھڑک ہوکر کمرے میں داخل ہوگیا، کمرے میں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مگر پھر ہر چیز صاف ملگجے اندھیرے میں نظر آرہی تھی۔ کمرہ چھوٹا سا تھا اور اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کمرہ خالی تھا۔

طلال تم غلط کمرے میں آگئے ہو، وکنام اس کے ساتھ ملحقہ کمرے میں ہے۔ طلال کے کانوں میں علینا کی آواز گونجی۔

طلال جلدی سے کمرے سے نکلا اور اس کے ساتھ ملحقہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ اندر کمرے میں زرد نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی، کمرہ دھول مٹی کی آماج گاہ بنا ہوا تھا اور پورے کمرے میں جگہ جگہ مکڑیوں نے بے تحاشا جالے بنے ہوئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں وکنام بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی پشت طلال کی طرف تھی۔ وکنام کمرے کے وسط میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آگے سیمنٹ کی دو پختہ سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں، اور اس سیڑھی کے اوپر ایک بڑی شمع رکھی ہوئی تھی اور اس شمع کی لمبائی ایک فٹ ہوگی جبکہ اس کی چوڑائی تین انچ تھی، شمع روشن تھی اور وکنام زمین پر بیٹھا ہوا منتر پڑھ رہا تھا۔

طلال وکنام کے بالکل سر پر کھڑا ہوگیا.....

وکنام بولا۔ ”تم نے میری برسوں کی محنت ضائع کردی ہے۔ مگر میں اب بھی جادو پر دسترس رکھتا ہوں، تم نے میری بے شمار طاقتیں ضائع کی ہیں۔ اس کی تمہیں بھیانک سزا ملے گی.....

وکنام میں اتنا پاگل نہی ہوں کہ تمہیں مزید مواقع دوں، اب میں تمہاری زندگی کا دیا بجھانے آیا ہوں۔ طلال پرجوش ہوکر بولا۔

طلال یہ شخص صحیح کہہ رہا ہے۔ یہ اب بھی بہت بڑا جادوگر ہے۔ مگر تم گھبراؤ نہیں، یہ ابھی مکمل میں ہے، اور یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کمرے میں علینا کی آواز گونجی..... علینا میں تمہیں دوبارہ قید کرلوں گا، اور تمہیں غداری کرنے پر سخت سے سخت سزا دوں گا۔ وکنام غضب ناک ہوکر چیخا۔

طلال جوش سے بولا۔ وکنام تمہارا یہ خواب کبھی بھی پورا نہیں ہوگا۔

وکنام دوبارہ ایک بار پھر سے اپنے عمل میں مصروف ہوگیا۔ اور اس کی توجہ دونوں پر سے ہٹ گئی، علینا تو نظر نہیں آرہی تھی مگر وہ طلال کے قریب ہی کھڑی تھی۔ طلال اس جادوگر کے عمل میں بہت کم وقت رہ گیا ہے۔ تم کسی طرح اس روشن شمع کو بجھادو۔ اگر یہ شمع وقت سے پہلے بجھ گئی تو اس جادوگر کا عمل ناکام ہوجائے گا اور جو طاقتیں اس کے پاس ہیں یہ اس سے بھی محروم ہوجائے گا۔

علینا کی دھیمی سرگوشیاں طلال کے کانوں میں سنائی دیں۔

طلال آگے بڑھا اور اس نے شمع پر پھونکیں مارنی شروع کردیں۔ شمع کے گرد سرخ خون سے حصار کھینچا گیا تھا، اور شمع کی موم سیڑھی کی فرش نما سیمنٹ پر دھیرے دھیرے پھیل رہی تھی۔

طلال کی پھونکوں سے شمع کی روشنی ڈگمگانے لگی، مگر وہ بجھ نہیں رہی تھی۔ طلال مسلسل پھونکیں مار رہا تھا۔ مگر اس کی کوشش ناکام ہورہی تھی۔

طلال تم انسان ہو۔ تم ضرور یہ شمع بجھادو گے، علینا کی سرگوشی ایک بار پھر اس کے کان میں گونجی۔

طلال نے اپنی پھونکیں تیز کردیں، جس سے شمع کی زرد روشنی پنڈولم کی طرح کمرے میں منڈلانے لگی۔

وکنام یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور اس نے منتر تیزی سے پڑھنا شروع کردیا۔ وکنام کا چہرہ رفتہ رفتہ زرد ہورہا تھا۔

شمع کی روشنی مستقل برقرار تھی۔ طلال یہ جانتا تھا کہ شمع کو پھونک مار کر بجھانا ہے۔ اگر اس نے ہاتھ کی مدد سے شمع کو بجھانے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ سرخ رنگ کے خونی حصار سے ٹکرا کر جل جائے گا۔

علینا چیخی، طلال عمل میں کم وقت رہ گیا ہے۔ جلدی کرو، طلال نے جلدی جلدی زور زور سے پھونکیں مارنی شروع کردیں، وہ ٹیڑھا ہوکر کھڑا تھا، اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے تھے اور وہ تھکن سے بے حال ہوگیا تھا، اچانک کمرے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا، اور نویرہ خوابیدہ انداز میں کمرے کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ کسی روبوٹ کی مانند چلتی ہوئی وکنام کی طرف بڑھنے لگی۔

طلال نے جونہی نویرہ کو دیکھا۔ اس کی توجہ شمع پر سے ہٹ گئی۔ اس نے چیخ کر نویرہ کو آواز دی۔ نویرہ رکو۔ آگے مت بڑھو۔

طلال تم نویرہ کو چھوڑو۔ یہ عمل کی وجہ سے کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتی اور نہ سن سکتی ہے۔ یہ زندہ لاش کی مانند ہے۔ جو صرف جادو کے زیر اثر ہے۔ تم جلدی سے شمع کو بجھادو۔ طلال کے کانوں میں جلدی سے علینا کی آواز پڑی۔

طلال نے زور سے منہ میں ڈھیر ساری سانس بھری اور زور سے شمع پر دے ماری۔ شمع ایک لمحے کو جیسے بجھ سی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ اور پھر لمحے کے ہزارویں سیکنڈ میں دوبارہ روشن ہوگئی۔ طلال کے چہرے پر جو خوشی کے رنگ آئے تھے وہ کافور ہوگئے۔

وکنام، اور سیڑھی کے درمیان، نویرہ کسی بت کی مانند لیٹ گئی۔ وکنام جلدی جلدی منتر پڑھنے لگا۔

طلال اس سے پہلے کہ وکنام منتر ختم کرکے نویرہ کے شہ رگ پر چھری پھیر کر عمل کو کامیاب کردے، تم جلدی سے شمع کو بجھادو۔ وقت بہت کم ہے۔ اس بار طلال کے کانوں میں علینا کی گونجدار آواز سنائی دی۔ جیسے کہ علینا بھی اس لمحات کی وجہ سے کرب میں مبتلا ہو۔

طلال کا چہرہ سرخ ہوچکا تھا۔ اس کے کان غصے کی وجہ سے لال ہوچکے تھے اور آنکھیں سرخ ہوچکی تھیں۔ جبکہ غصے کے باوجود اس کے دل میں خوف کی لہریں گردش کررہی تھیں۔ اگر عمل ختم ہونے سے پہلے میں شمع کو بجھا نہیں سکا تو کیا ہوگا۔ اس کے ذہن میں خوف کی گہری دیوار جیسے قائم ہورہی تھی۔

طلال، اگر تم نے ان چند لمحوں میں بھی شمع نہ بجھائی تو تم نویرہ کو کھودو گے۔ ایک بار پھر غائب نویرہ نے طلال کی ہمت بندھائی۔

طلال نے اپنی منہ اور سانس ہوا سے بھردی۔ اور اس کی آنکھوں میں شمع کا ٹمٹماتا ہوا لو دکھائی دے رہا تھا۔ طلال نے پورے زور و شور سے پھونک ماری کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ مگر پھر شمع کا روشن ہالہ ٹمٹمانے لگا۔

طلال بے بسی سے شمع کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں بہنے لگیں۔ وکنام نے طلال کی بے بسی پر ایک قہقہہ لگایا اور پھر اس نے اپنے ہاتھ میں ایک تیز دھار چھری اٹھائی، اب وکنام چھری پر منتر پڑھ رہا تھا۔ شمع کی زرد روشنی میں چھری کا تیز دھار سرا چمک رہا تھا۔ طلال کی نظریں چھری پر جم گئی تھیں۔ نویرہ بے خبر لیٹی ہوئی تھی اور غائب علینا چیخ رہی تھی۔

طلال نے ایک گہری سانس لی اور اس نے دل ہی دل میں خدا سے مدد مانگی۔ ”خدا تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوتا ہے۔ جب بھی سچے دل سے تجھ سے مدد مانگی جائے تو وہ ضرور مدد کرتا ہے۔“ طلال نے آنکھیں بند کرلیں اور دل میں کہا، ”یا اللہ مدد؟ میری اس مشکل وقت میں مدد فرما۔“ اسی لمحے طلال کے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، وکنام کا ہاتھ آہستہ روی سے اوپر اٹھ رہا تھا۔ وکنام کے ہاتھ میں باریک تیز دھار چھری تھی۔

طلال نے زور سے نعرہ لگایا..... اللہ اکبر اور آہستہ سے روشن شمع پر پھونک ماری۔ کمرے میں ایک دم گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ روشن شمع وقت سے پہلے بجھ گئی۔

اندھیرے میں وکنام کی خوف سے دردناک چیخ گونجی بجھی شمع سے جو سفید دھواں اٹھا تھا وہ لہروں کی طرح وکنام کے اردگرد گھومنے لگا، وکنام نے اپنا گلا خود دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور کھردری آواز میں چیخنے لگا۔ جیسے کہ کوئی انجانی طاقت اس کا گلا دبا رہی ہو۔ وکنام کی چیخیں

اب سسکیوں میں تبدیل ہوگئیں۔

غائب علینا چیخ کر بولی۔ طلال جلدی سے یہ چھری اٹھالو اور وکنام کو ختم کردو۔ اب تم اس کو ہاتھ لگا سکتے ہو۔ طلال نے اندھیرے میں چمکتی ہوئی چھری اٹھائی اور وکنام کے دل کے مقام پر پیوست کردی۔ وکنام کے منہ سے ایک دردناک چیخ گونجی اور ارتعاش پیدا کرتی ہوئی ختم ہوئی۔

اسی لمحے نویرہ نے جھٹ سے آنکھیں کھولیں اور جلدی سے کھڑی ہوگئی، اس نے اروگ رو دیکھا اور خوف سے بولی۔ یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟''

طلال نے آگے بڑھ کر خوفزدہ نویرہ کو بانہوں میں بھرلیا۔

طلال نویرہ کو لے کر جلدی سے اس عمارت سے نکلو، یہ عمارت رفتہ رفتہ غائب ہونے والی ہے اور اگر یہ غائب ہوگئی تو تم دونوں چوتھی منزل سے نیچے زمین پر گرو گے۔ یہ سننا تھا طلال نے نویرہ کا ہاتھ پکڑا اور دوڑ لگادی، دونوں اتنی تیزی سے دوڑ رہے تھے کہ وہ دونوں آدھے منٹ کے ٹائم سے عمارت سے باہر تھے۔

باہر صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اب بھی ہلکا نیلگو اندھیرا تھا۔ اچانک عمارت غائب ہوگئی اور وکنام کی لاش زمین پر دھڑام سے گری۔ باہر حیرت انگیز طور پر کوئی کیچڑ نہیں تھی اور وہ دونوں ایک چٹیل میدان میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں حیرت سے وکنام کی لاش دیکھ رہے تھے۔ علینا کی آواز ان کے کانوں میں پڑی۔ طلال تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے مجھے وکنام جیسے شیطان کی قید سے رہائی دلادی۔ تم دونوں وکنام کی لاش کو جلادینا، کئی اور ارواح بھی ہیں جو تم دونوں کی شکر گزار ہیں۔ اب ہم ہمیشہ کے لئے یہاں سے چلے جائیں گے۔

رکو علینا، تم وکنام کی قید میں کیسے آئی، طلال نے علینا سے پوچھا۔ جو لوگ نافرمان ہوتے ہیں اپنے بڑوں اور خودکشی جیسے حرام موت مرتے ہیں ان کی روحوں کو خدا بھی قبول نہیں کرتا۔ میں اسی لئے اس موذی کے قید میں تھی، یہ عمارت سال میں ایک بار ظاہر ہوجاتی ہے۔ اور اس رات جادوئی بارش یا طوفان یا کسی اور وجہ سے وکنام کسی نہ کسی راہ گیر کو اپنے جال میں پھنسا لیتا ہے اور پھر وہی عمل کرتا ہے جو آج رات کر رہا تھا۔ تم دونوں خوش قسمت تھے کہ اس شیطان کے قہر سے محفوظ رہے۔

علینا اگر تم ہماری مدد نہیں کرتی تو ہم بھی بے موت مارے جاتے...... ہاں بس اس بار خدا نے میری سن لی۔ علینا مسکرائی۔ نویرہ طلال کو حیرت سے دیکھ رہی تھی کہ طلال علینا سے کیا بات چیت کر رہا ہے۔ مگر وہ بھی علینا کی باتیں سن رہی تھی، اسے حیرت تھی کہ علینا کیوں نظر نہیں آرہی ہے۔ نویرہ اور طلال اللہ تم دونوں کو اپنے امان میں رکھے، میں ساتھی روحوں کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف جارہی ہوں، ہوسکے تو میرے لئے دعائے مغفرت ضرور کرنا، خدا حافظ۔

طلال نے نویرہ کو سارے واقعات بتائے اور دونوں اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ گاڑی تھوڑی دوری پر کھڑی تھی۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا، دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور گاڑی میں جیسے چابی گھمائی وہ اسٹارٹ ہوگئی، طلال نے گاڑی آگے بڑھائی اور وکنام کی لاش کے قریب روک دی، اس نے علینا کے کہنے کے مطابق وکنام کی لاش پر پیٹرول چھڑک دیا اور اسے آگ لگادی۔

طلال مطمئن تھا اب کوئی اس جادوگر کے سحر میں دوبارہ نہیں پھنسے گا اور نہ کبھی وہ عمارت نظر آئے گی، طلال نے خوف کو بالائے طاق رکھ کر جواں مردی سے وکنام کو جہنم واصل کیا تھا۔

طلال گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی میں ہلکی موسیقی لگی تھی، وہ نویرہ کے ساتھ اپنی گاڑی میں گھر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی گاڑی شہر میں گھوم رہی تھی۔ اور دونوں کے چہروں پر بے پناہ خوشی تھی۔

انسانی درندے

طارق محمود۔ کامرہ اٹک

وقت کو پیروں تلے روندنے والوں کے سامنے جب وقت آن کھڑا ہوا تو وہ بے بس بے کسی اور مجبوری کے عمیق گڑھے میں گرگئے اور گڑگڑانے لگے مگر وقت نے ان سے منہ موڑ لیا تھا۔

حقیقت سے چشم پوشی کرنے والے لوگوں کے لئے لرزہ براندام کرتی سبق آموز کہانی

باھر زوردار بارش ہورہی تھی۔ بارش کے کھڑکی سے گرتے ہوئے قطرے ایک عجیب اور دماغ کو جھنجھنانے والا راگ الاپ رہے تھے، میں نے کھڑکی کا ایک پٹ آہستہ سے وا کرکے باہر دیکھا، اتنی موسلا دھار بارش کی وجہ سے دس بارہ فٹ کے فاصلہ پر گلی کا دروازہ تک نظر نہ آرہا تھا۔ غرض باہر کا نظارہ میرے دماغ کو بے چین کر رہا تھا۔ ''طور خان آپ پریشان نہ ہوں، وہ لوگ ضرور کسی پناہ میں ہوں گے۔ میری بیوی نیر نے مجھے جب کافی دیر ادھر ادھر پریشان ٹہلتے اور بار بار کھڑکی کھول کر بے چین ہوتے دیکھا تو کہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اسے بھی پریشان پایا۔

''نیر تم بھی تو پریشان نظر آرہی ہو...... تم ایسے کرو کہ ایک کپ قہوہ بنالاؤ۔'' وہ سر ہلا کر کچن میں چلی گئی، میں خود ٹینشن میں تھا اسے تو کچھ دیر کے لئے اس ٹینشن

سے آزاد کرتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ قہوہ بناتے ہوئے بھی میرے لئے پریشان ہی ہوگی، اسی لئے میں بھی ٹہلتے ہوئے کچن میں چل گیا، اس نے چولہے پر دیگچی چڑھائی ہوئی تھی، جس میں بنا قہوہ خوب ابل رہا تھا۔ لیکن نیر کھلی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی، میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا لیکن اسے میرے اندر آنے کا احساس تک نہ ہوا، بلکہ وہ اپنا سارا دھیان باہر شور مچاتی بارش پر دے رہی تھی۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ چونک اٹھی۔ ''نیر قہوہ بن گیا ہے۔'' میری آواز سنتے ہی اس نے دیگچی کی طرف دیکھا اور پھر آہستہ سے اسے اتار لیا، ہم دونوں ہی نے قہوہ پیا۔ رات کا ایک بجنے والا تھا لیکن نیند دونوں کی آنکھوں سے دور تھی۔ قہوہ پیتے ہی میں نے برساتی اٹھائی اور پہننے لگا کہ نیر نے آگے ہو کر مجھ سے برساتی لے لی۔ ''باہر کا موسم دیکھ رہے ہیں آپ..... اس موسم میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا، اور آپ ان کو ڈھونڈنے کے لئے جانا چاہتے ہیں۔''

''تو کیا کروں نیر ہم دونوں ہی ان کے لئے پریشان ہیں..... وہاں سے یہاں تک راستے میں ایک ڈاک بنگلہ ہے اور مجھے پورا یقین ہے کہ اگر وہ شام کے چار بجے چلے ہوئے ہوں گے تو بارش سے پہلے پہلے وہ ڈاک بنگلہ کراس کر آئے ہوں گے اور اب ضرور بارش میں کہیں پھنسے ہوں گے۔'' میں نے بے بسی سے کہا تو نیر کی آنکھ سے آنسو چھلک پڑے۔ وہ تھی ہی ایسی کہ اسے دوسروں کے دکھ درد رلا دیتے۔

ہمیں جاگتے جاگتے رات کے تین بج گئے، کالے بادل چھٹ گئے، تیز بارش نے بوندا باندی کی شکل اختیار کر لی تو میں نے برساتی پہنی اور رائفل اٹھا کر نیر سے گھر کا دروازہ پکا بند کرنے اور بچوں کا خیال رکھنے کا کہہ کر گھر سے نکل پڑا، بڑی ٹارچ لانا بھی نہیں بھولا۔

☆.....☆.....☆

میں دفتر میں بیٹھا کام کرنے میں مگن تھا کہ ہلکی سی آواز کر کے سپرنٹنڈنٹ فیاض صاحب اندر آ گئے۔ ''السلام علیکم..... طور خان میں نے تمہیں پریشان تو نہیں کیا۔''

''ارے نہیں سر کیسی بات کر رہے ہیں آپ۔'' میں نے سلام کا جواب دے کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹھو..... بس تم سے کچھ گپ شپ لگانے آیا ہوں۔'' ان کے چہرے پر شفقت بھری مسکراہٹ تھی۔ یہ کہہ کر وہ میرے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں نے بہت کہا کہ ''وہ میری کرسی پر بیٹھیں لیکن وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھے رہے۔

ان کی بیگم ایک این جی او کے سرکردہ رکن تھیں اور وہ ہمارے پہاڑی علاقہ میں عورتوں کے لئے کوئی ویلفیئر ادارہ کھولنا چاہتی تھیں تو ان کو کسی نے بتایا کہ میری بیوی نیر بھی لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے اور جتنی ہو سکے مدد بھی کرتی ہے اس لئے انہوں نے فیاض صاحب کو میرے پاس بھیجا تھا تاکہ میری بیوی ان کے ساتھ مل کر اس علاقہ میں این جی او کا کام کریں۔

مجھے سارا پلان سن کر اس میں کوئی قباحت نظر نہ آئی میں نے رضامندی ظاہر کر دی اور آ کر نیر کو ساری بات بتائی۔ وہ تو جیسے پہلے سے ہی تیار بیٹھی تھی لوگوں کی مدد کرنا تو جیسے اس کی گھٹی میں تھا اور پھر فیاض صاحب اور ان کی بیگم نے ہمارے گھر آنے کا پروگرام بنا لیا میں نے انہیں رات کے کھانے پر انوائٹ کیا۔

اچانک موسم ابر آلود ہوا اور کالے بادل منٹوں میں برسنے لگے اور برسے بھی اتنے تیز کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا علاقہ جل تھل ہو گیا۔ ہم میاں بیوی فیاض صاحب اور ان کی بیگم کا انتظار کرتے رہے۔ لیکن.....

☆.....☆.....☆

میں نے گھر سے نکلتے ہی ٹارچ آن کر لی اور اس کی روشنی میں ڈاک بنگلہ کے راستے پر جس راستہ سے کہ ان کے آنے کا امکان تھا سنبھلتے ہوئے چل پڑا ہلکے پھلکے نالے بھی سیلاب لگ رہے تھے، میں بہت احتیاط سے قدم رکھتے ہوئے ڈھلوان اترنے لگا گھنے درختوں کے اندر پہنچتے ہی میں نے ٹارچ کی روشنی ادھر ادھر بکھیری دور دور تک کوئی گاڑی نظر نہ آئی میں سوچ رہا تھا کہ ان کے پاس بند باڈی کی جیپ ہوگی۔ بارش کی یلغار سے بچنے کے لئے انہوں نے ہو سکتا ہے کہ جیپ کسی درخت یا کسی چٹان وغیرہ کے نیچے کھڑی کر دی ہو۔

میں اس گاڑی اور دونوں ں میاں بیوی کی تلاش میں اس گھنے جنگل کے کافی اندر تک آ گیا اچانک بوندا باندی رک گئی اور مطلع صاف ہو گیا سپیدہ سحر نمودار ہونے لگی اتنے آگے اپنے آپ کو دیکھ کر مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو میں نے آخری نظر ادھر ادھر ڈال کر واپسی کا سوچا ہی تھا کہ ایک طویل نسوانی چیخ نے جنگل کی خاموشی کو چیر دیا اس کے بعد تو ہذیانی چیخوں کا ایک سلسلہ سا شروع ہو گیا جس کا رخ میری ہی طرف لگ رہا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھی کسی چیز سے ڈر کر میری سمت ہی بھاگتی آ رہی تھی۔ میں نے آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لئے پہلے ہی رائفل تیار کر لی اور سامنے اس طرف جہاں سے چیخوں کی آواز آ رہی تھی دبے اور محتاط قدموں سے بڑھنے لگا۔

میں تھوڑا ہی آگے چلا تھا کہ ایک عورت بال کھولے اندھا دھند بھاگتی، شور مچاتی آ رہی تھی وہ کس چیز سے ڈر کر بھاگ رہی تھی وہ چیز اب تک نظر نہیں آئی تھی۔

اچانک اس کے عین پیچھے ایک موٹے گھنے درخت کے پیچھے سے ایک ریچھ نمودار ہوا جو کہ دونوں پچھلی ٹانگوں پر کسی انسان کی طرح بھاگتا آ رہا تھا اور بھاگتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سینہ کوبی کر رہا تھا۔ اتنے بڑے اور خطرناک ریچھ کو دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس ریچھ نے اپنے لمبے لمبے بازوؤں کو اس لڑکی کی طرف بڑھایا اور اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

میں سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن کوئی حرکت تو دور کی بات میرے منہ سے چیخ تک نہ نکل سکی۔

اس ریچھ نے لڑکی کو اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا اور پھر بڑی بے دردی سے جھٹکے دینے لگا، میں نہ تو شکاری بنا اور نہ ہی ایسی صورت حال سے اس سے پہلے واسطہ پڑا تھا ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا جس نے درختوں کو زور سے ہلایا میرے سر پر بارش کے وہ قطرے جو درختوں کے پتوں پر اٹکے ہوئے تھے گرنے لگے میرے سر پر ٹھنڈک سی پھیلنے لگی اور سر کے ٹھنڈا ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ''لڑکی کو اس درندے سے بچانا ہوگا۔'' یہ سوچتے ہی میرا سارا ڈر خوف جیسے بھاگ گیا، میں نے رائفل کو تیار کر کے اس درندے کا نشانہ لیا لیکن میرے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ خود وہ لڑکی تھی جسے کہ میں بچانے کی کوشش کرنے والا تھا کیونکہ ریچھ نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ اب تو اس لڑکی کے کپڑے بھی اس نے پھاڑ دیئے تھے۔

مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس لڑکی کو ریچھ کے سامنے سے کیسے ہٹاؤں۔

اچانک ریچھ نے اس لڑکی کو اپنے سر سے اوپر اٹھا لیا تو یہ منظر دیکھ کر میرے منہ سے چیخ نکلی جس کے سامنے اس لڑکی کی چیخیں بھی ماند پڑ گئیں۔

وہ لوگ

وہ لوگ کتنے کم ظرف ہوتے ہیں جو دوسروں کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وہ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں جو بے غرض دوسروں کے کام آتے ہیں۔ اور سچی محبت کرتے ہیں۔

وہ لوگ کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں جو دوسروں کو خوشیاں دینے کا باعث بنتے ہیں۔

وہ لوگ کتنے عظیم ہوتے ہیں جو دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دیتے ہیں۔

وہ لوگ کتنے بدقسمت ہوتے ہیں جو رشتوں کی خلوص اور سچائی کی قدر نہیں کرتے۔

وہ لوگ کتنے کھوکھلے ہوتے ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد ہوتا ہے۔

وہ لوگ کتنے ایثار پسند ہوتے ہیں جو دوسروں کی خوشیاں اپنی خوشیاں سمجھتے ہیں۔

(خضر حیات۔ روڈہ تھل، خوشاب)

میری چیخ سن کر اس ریچھ نے میری طرف دیکھا اور چند ساعت دیکھنے کے بعد لڑکی کو آرام سے نیچے زمین پر رکھ دیا اور بڑے جارحانہ انداز میں میری طرف بڑھنے لگا تو میں نے رائفل سیدھی کی اور اللہ کا نام لے کر ریچھ کے سر کا نشانہ لے کر لبلبی دبادی۔

دھماکہ کی آواز، ریچھ کی چیخ اور پھر ریچھ کا پیچھے الٹنا۔

میں آہستہ آہستہ ریچھ کے پاس جا پہنچا جو کہ چند ساعت تڑپنے کے بعد ساکت ہو چکا تھا۔ گولی نے اس کا آدھا سر غائب کر دیا تھا۔ سیون ایم ایم کی رائفل تھی اس وقت کی مضبوط رائفل تھی لیکن اس کی کارکردگی دیکھ کر میں حیران رہ گیا میں نے ریچھ کو دیکھ ہی لیا تھا کہ مجھے سسکیوں کی آواز آنے لگی اور تب مجھے یاد آیا کہ سامنے وہ لڑکی بھی نیم برہنہ پڑی ہے۔

میں نے برساتی اتاری اور آہستہ سے اس لڑکی کے اوپر ڈال دی۔ ”بہن یہ پہن لو.....اور تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہی ہو؟“ اس کے جواب میں وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے اسے سہارا دیا وہ بمشکل کھڑی ہو سکی۔ ”بھائی میں سب کچھ بتادوں گی۔ لیکن پہلے میرے شوہر کو بچالیں وہ چند لٹیروں کے قبضے میں ہیں۔“ اس نے سسکتے ہوئے آہستہ آہستہ کہا اور اپنے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

میں اسے سہارا دے کر اپنے ساتھ ہی چلانے لگا کیونکہ میں اس کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا، ایک تو ریچھ کی ڈیڈ باڈی پڑی تھی اور دوسرا اکیلی عورت کوئی مسئلہ اور بھی بن سکتا تھا۔

ہم دس منٹ چلتے رہے، وہ چند قدم چل کر مجھے کہتی۔ ”پلیز بھائی مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ جلدی سے میرے شوہر کے پاس پہنچو۔“ وہ بار بار کہتی لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔

چلتے چلتے مجھے کسی انسان کے جسم سے جو کہ زمین پر آڑا ترچھا پڑا تھا۔ ٹھوکر لگی تو میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور گرتا چلا گیا، گرتے ہوئے میری نظر اس انسان کے چہرہ پر پڑی تو مجھے ایک شاک لگا کیونکہ وہ ہمارے سپرنٹنڈنٹ فیاض صاحب تھے۔

میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور دوسری طرف سے فیاض صاحب کی بیگم کی چیخ ابھری اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا، آخری خیال جو میرے ذہن میں آیا وہ بہت ہی بھیانک تھا۔ میں نے بیگم صاحبہ کو ایک ریچھ جیسے درندہ سے تو بچالیا تھا لیکن انسانی درندوں سے نہ بچا سکا، تین چار آدمیوں کے قدموں کی آواز اور پھر بے ہوشی۔

اس کے بعد مجھے ہوش اسپتال میں آیا۔ اسی اسپتال کے ایک کمرہ میں فیاض صاحب بھی ایڈمٹ تھے لیکن ان کی بیگم غائب تھیں اور پھر دو تین دن بعد ان کی بیگم کی لاش بہت بری حالت میں جنگل سے ملی۔

اس شام فیاض صاحب میرے سامنے سسک پڑے اور پھر بلند آواز سے رو پڑے ان کے ساتھ میری بھی آنکھیں نم تھیں۔ ایک آفیسر کی بیوی کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔

علاقہ ڈی ایس پی نے تمام پولیس کو اس پورے جنگل اور ارد گرد فیاض صاحب کے بتائے ہوئے حلیہ کے آدمیوں کی تلاش پر لگادیا، ان میں سے دو مل ہی گئے لیکن پولیس مقابلہ میں مارے گئے اور تین فرار تھے لیکن مجھے پتہ ہے کہ وہ تینوں جب بھی پولیس کی گرفت میں آئے تو ایک اور پولیس مقابلہ ہوگا جس میں وہ تینوں مارے جائیں گے۔

میں جانتا ہوں کہ بہت ہی برا ہوا اور ان آدمیوں کی سزا بھی یہی ہونی چاہئے۔ ایسے انسانی درندے اسی قابل ہیں.....

لیکن چند دن ہی گزرے تھے کہ جنگل میں جہاں کہ فیاض صاحب اور ان کی بیگم کے ساتھ خونی حادثہ پیش آیا تھا، اس جگہ تینوں فرار دہشت گرد درندوں کی لاشیں پڑی ملی تھیں۔ ان تینوں کے نرخرے بھنبھوڑ دیئے گئے تھے۔ چہرا بھی بہت ہی بھیانک طریقے سے نوچا گیا تھا۔

ان تینوں کے ماتھے پر کسی نوکیلی کیل سے کندا کیا گیا تھا۔ ”برائی کا انجام۔“

گلاب چہرے

احسان سحر۔ میانوالی

عقلمند اور ذی شعور لوگ ہمیشہ دوسروں پر تنقید کرنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانکتے ہیں اور پھر اپنی کوتاہیاں درست کرنے کے بعد دوسروں کو تنقید کرتے ہیں تو اصلاحی پہلو اجاگر ہوتا ہے۔

نیک خواہشات اور اچھی یادیں انسانی زندگی کی سرمایہ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

وہ چہرے واقعی گلاب جیسے تھے جو میرے ارد گرد رہے۔۔۔

گلاب کسے اچھا نہیں لگتا اور گلاب چہرے تو پھر سبھی کے دلوں کی دھڑکن ہوتے ہیں، دھڑکن جو دل کو زندہ رکھتی ہے۔ دل اور دھڑکن ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں' میں نے ایک عجیب زندگی گزاری ہے' آوارہ گردی' یہ گھومنا یوں ہی تو نہیں دربدر رہنا' گم ہے ان ہی گلیوں میں کوئی ہم سفر اپنا۔

میرا خیال ہے کہ میں نے جس انداز کی زندگی گزاری ہے وہ شاید بہت ہی کم نصیب ہوتی ہوگی' میری زندگی میں کوئی عیش و آرام وغیرہ کا دخل نہیں رہا۔

یہ نہیں ہوا کہ میں محلوں میں رہا ہوں' گاڑیوں میں سفر کرتا رہا ہوں' قیمتی ملبوسات کا استعمال کیا ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ عام طور پر غربت ہی میرے

ساتھ رہی ہے' زندگی کو مختلف اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ حیرت انگیز کردار اور دوست ملتے رہے ہیں کیسے کیسے لوگ جن کے رویے عجیب تھے' جن کی باتیں عجیب تھیں اور جن کے اندر کا انسان کچھ اور تھا۔

اچھی یادیں قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں اور میری یادوں کے سرمائے میں ہی لوگ تھے۔ یہی گلاب چہرے ہیں' جو مجھے یاد آتے ہیں تو بے کیف اور بے سکون زندگی میں تھوڑی دیر کیلئے کیف سا آجاتا ہے۔

لوگ مجھے آج بھی ملتے ہیں' اسی انداز کے ویسے ہی پراگندہ طبع لوگ لیکن کل اور آج میں بہت فرق ہوگیا ہے وہ فرق یہ ہے کہ کل میں ان کرداروں کے ہمراہ ہوجاتا تھا، ان کے ساتھ ساتھ انکے اچھوتے مزاج کا ہم نوا اور ہم عمل بن جاتا تھا، لیکن آج صرف دیکھتا ہوں......تماشا کرتا ہوں اور دل شاد کرتا ہوں۔

میں نے سوچا کہ ایسا نہ کہ یہ کردار اپنے تذکروں سے محروم رہ جائیں۔ کوئی انکی کہانیاں بیان کرنے والا بھی نہ ہو اس لیے میں نے ان کرداروں کو یکجا کرنے کا عمل شروع کیا ہے' یہ گلاب چہرے وہی ہیں، ایک ایسا شخص جس کی عمر چالیس پینتالیس سال تھی' سیاہ رنگت اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا' پان اس طرح کھاتے جیسے جگالی کر رہے ہوں' یا تو وہ پان کھا رہے ہوتے یا پھر گفتگو کرتے تھے' انکی گفتگو بھی انکے مزاج اور انکی شخصیت کی طرح ہی منفرد تھی۔

انکے ساتھ پرابلم یہ تھی کہ وہ ۔۔۔صدا کے کنوارے تھے' اور اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ آج تک کوئی لڑکی انہیں معیار کے مطابق نہیں ملی تھی۔ (یہ اور بات ہے کہ کسی لڑکی نے انہیں معیار کے مطابق سمجھا ہی نہ ہو) ان کے ساتھ ایک دشواری یہ بھی تھی کہ وہ ہر لڑکی پر عاشق ہوجایا کرتے۔ چاہے بقول ان کے وہ انکے معیار کی ہو یا نہ ہو انکا فلسفہ یہ تھا کہ ''پہلے دھڑام سے عاشق ہوجاؤ' اس کے بعد اسکے معیار کو پرکھو۔''

اس زمانے میں محلے میں ایک لڑکی ہوا کرتی تھی' بہت خوبصورت اور ڈیشنگ قسم کی' ہم دوست اسے قلو پطرہ کہا کرتے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں سے اس لڑکی کو مانگ لیا تھا۔ یہ کسی کو مانگ لینے کی اصلاح بھی بہت خوب تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ فلاں لڑکی کو ہم نے اپنے لیے پسند کرلیا ہے۔ اس لیے کوئی اور اس کیلئے کوشش نہ کرے تو اس طرح میں نے قلوپطرہ کو اپنے لیے مانگ لیا تھا۔ اسی لیے ہمارے گروپ کا کوئی اور لڑکا اسکی طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ یہ اور بات تھی کہ سب اسے دیکھ کر آہیں بھرتے رہتے۔

میرا دماغ اس وقت گھوم کر رہ گیا جب نفیس صاحب نے مجھ سے اس لڑکی کا تذکرہ کیا۔ ''بھائی'' کیا تم نہیں چاہتے کہ میری اجاڑ بے رنگ زندگی میں کچھ خوشیاں آجائیں'

''کیوں نہیں چاہتا نفیس بھائی'' آپ سدا خوش رہیں۔''

''تو پھر میرا ایک کام کردو' وہ پان کی پیک کے چھینٹے اڑاتے ہوئے بولے۔

فرمائیں' میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں۔۔؟

''یار اس محلے میں ایک لڑکی ہے جسے سب قلو پطرہ کہتے ہیں'' انہوں نے کہا۔

''تو پھر۔۔؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''میں نے سنا ہے کہ اس لڑکی سے تمہاری جان پہچان ہے؟''

نفیس صاحب نے یہ ٹھیک ہی کہا تھا' دو چار مہینوں کی محنت کے ساتھ قلو پطرہ سے میری سلام دعا ہونے لگی تھی' محنت اور دل سے کیے گئے کام کا ہمیشہ اچھا ہی صلہ ملتا ہے' ''جی ہاں' جان پہچان ہے۔''

''تو پھر۔۔؟'' میں نے پوچھا' میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا ہوں۔۔؟''

''تم اس سے میری دوستی کرادو'

''کیا'' میں حیران رہ گیا تھا۔ ''نفیس صاحب یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں''

''میں بالکل جائز بات کر رہا ہوں۔ دیکھو نا میرا معاملہ یہ ہے کہ میں خزاں رسیدہ ہو چکا ہوں نہ جانے کب زندگی ساتھ چھوڑ جائے اور میری زندگی میں کسی لڑکی کے آنے کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔ جبکہ تمہاری بات اور ہے تمہارے پاس بے شمار چانسز ہیں اس لیے میں تم سے یہ درخواست کر رہا ہوں''

مجھے ان کی باتوں پر ہنسی آرہی تھی اور غصہ بھی ''نفیس صاحب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں زبردستی کسی لڑکی کو مجبور کروں کہ وہ آپ سے دوستی کرے''

''پھر بھی آدمی دوستوں کی خاطر کوشش کرتا تو ہے''

''اچھا یہ بتائیں کہ دوستی ہوگئی تو پھر آپ کیا کریں گے۔۔؟''

''کچھ بھی نہیں میاں' میں آج تک اپنی زندگی میں کسی لڑکی کو کسی ہوٹل نہیں لے گیا ہوں بس یہ میری اتنی سی خواہش ہے''۔

مجھے ان کی بات سن کر ان سے ہمدردی ہونے لگی تھی' کیسے ترسے ہوئے آدمی تھے' اچھا کتنی بار ہوٹل لے جانا چاہتے ہیں۔۔؟''

''صرف ایک بار'' انہوں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔'' اسکے بعد اسکا پیچھا چھوڑ دوں گا اسکی طرف دیکھوں گا بھی نہیں اور زندگی بھر اس خوشگوار یاد کو اپنے سینے سے لگائے رکھوں گا''

نفیس صاحب کی صورتحال پر واقعی افسوس ہو رہا تھا اگر ان کی آرزو بھی اتنی سی ہی تھی تو اسے پورا کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا بشرطیکہ قلوپطرہ یہ بات مان لیتی۔

''چلو ٹھیک ہے'' میں نے ان کی حالت زار پر ترس کھاتے ہوئے کہا' میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں' ''میاں دل لال کردیا ہے میرا'' نفیس صاحب نے جذباتی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا' چلو چل کر چائے پیتے ہیں''۔

میں نے نفیس صاحب سے وعدہ تو کرلیا تھا لیکن میں جانتا چاہتا تھا کہ قلوپطرہ یہ سن کر بھڑک اٹھے گی وہ اسی مزاج کی لڑکی تھی اسے کہاں گوارہ ہوسکتا تھا کہ وہ

ڈاکٹروں، حکیموں اور ماہرین طب کی ہدایات سے لکھی گئی مفید کتاب

کولیسٹرول اور علاج

قیمت -/100 روپے

اس کتاب میں، کولیسٹرول کی حقیقت، کولیسٹرول اور ہماری خوراک، کن غذاؤں سے کولیسٹرول بڑھتا ہے، کولیسٹرول کس طرح کم کریں، مچھلی، میٹھی اشیاء، زیادہ نمک نہ کھائیں، کولیسٹرول اور دل کے امراض، دل میں درد، ہارٹ اٹیک کی ایک اہم وجہ، احتیاطی تدابیر، ہومیوپیتھی کی دوائیں، دل کے امراض کی وجوہات، موٹاپا، مچھلیوں میں کولیسٹرول کے فوائد، مچھلی اور دودھ، مناسب ماحول، کولیسٹرول کا ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی علاج، کولیسٹرول کا طبی علاج، چربی سے پرہیز کیجئے، کھانے پینے کی اشیاء سے کولیسٹرول کم کیجئے، اور بہت کچھ پڑھئے کولیسٹرول کے بارے میں کہ کس طرح کولیسٹرول سے محفوظ رہا جائے، اور کون کون سی ورزشوں سے کولیسٹرول کو کم کیا جاسکتا ہے۔

حکیم غلام مصطفٰے

دعا بک کارنر منشی محلہ گلی نمبر 5 امین پور بازار فیصل آباد

نفیس صاحب جیسے آدمی کے ساتھ ہوٹل جائے۔

دیکھ لیا آپ نے کیسے کیسے معصوم لوگ ہوا کرتے تھے اور کیسی معصوم خواہش ہوا کرتی ہیں مجھے یقین تھا کہ نفیس صاحب جو کہہ رہے تھے وہ بالکل درست ہے وہ صرف ایک بار اس سے مل لینا چاہتے تھے صرف ایک بار اور یہ ایک ہی بار ان کا سرمایہ حیات ہوتا۔

قلوپطرہ تو وہ لڑکی تھی جو خود آج تک میرے ساتھ کہیں نہیں گئی تھی وہ نفیس صاحب کے ساتھ کیا جاتی؟ اسی لیے مجھے اسکی انکاری کا پکا یقین تھا۔

چونکہ میں نفیس صاحب سے وعدہ کر چکا تھا اس لیے ڈرتے ڈرتے ایک دن قلوپطرہ سے بات کرلی

''ہاں بتاؤ'' اس نے غضبناک ہو کر میری طرف دیکھا ''کیا کہنا ہے''؟

''تم تو ابھی سے ناراض ہو رہی ہو''

''بتاؤ تو سہی''

''کیا تم کسی اچھے سے ہوٹل میں کھانا کھانا پسند کروگی؟'' میں نے دریافت کیا

''میرا خیال تھا کہ وہ مجھے جھڑک دے گی لیکن اسکے برعکس اس کے دانت نکل آئے۔ ''کیوں نہیں تو پھر کب لے کر چل رہے ہو مجھے؟''

''شکر ہے کہ تم یہاں تک تو آئیں'' میں نے ایک گہری سانس لی ''میں تمہیں نہیں لے جا رہا بلکہ کسی اور کے ساتھ جانا ہوگا''

''کیا بکواس ہے کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟'' وہ ایکدم بھڑک اٹھی تھی۔

''پلیز تم میری پوری بات تو سن لو'' میں نے کہا اور پھر جلدی جلدی اسے ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ یہ کہانی سن کر وہ بہت دیر تک ہنستی رہی تھی'' تو یہ کہو نا کہ ایک ڈرامہ کرنا ہوگا۔'' اس نے کہا'' ٹھیک ہے' میں صرف ایک تو اس چونچے کے ساتھ جانے کیلئے تیار ہوں لیکن اس نے کوئی الٹی سیدھی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا''

''نفیس واقعی نفیس آدمی ہے'' میں نے اسے یقین دلایا۔ ''تمہارے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی''۔

''اگر اس نے کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو میں اسے نہیں چھوڑوں گی'' قلوپطرہ نے کہا'' بالکل میری طرف سے اجازت ہے''

وقت اور دن وغیرہ جب طے ہوگئے تو میں نے نفیس صاحب کو یہ خوش خبری سنا دی، اس وقت نفیس صاحب کی حالت دیکھنے کے قابل تھی ان کے دونوں گال خوشی سے تپنے لگے تھے ایسی چمک آنکھوں میں آ گئی تھی جو شاید برسوں کے بعد انہیں حاصل ہوئی ہوگی۔ ''میرے دوست۔'' انہوں نے جذباتی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا تھا تمہارا بہت بہت شکریہ تم مجھے زندگی کی سب سے بڑی خوشی دینے والے ہو''

''بھائی نفیس صاحب اس سے جی بھر کر باتیں کریں وہ آپکی ہر بات سنے گی''

''یہ بتاؤ کب میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش پوری ہونے والی ہے''

''پرسوں' آپ پرسوں ہی اسے رات کا کھانا ساتھ کھلائیں گے''

''ٹھیک ہے'' ان کی آنکھیں خواب ناک سی ہوگئی تھیں اور اس وقت ان کے اندر کا پڑھا لکھا ایسا شخص جاگ اٹھا تھا جس کو زندگی میں محبت کا ایک لمحہ بھی حاصل نہ ہوا ہو۔'' اس سے کہنا کہ خوب بن سنور کر آئے، اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی لالی ہو اور ہاتھوں میں موتیا کے گجرے بھی ہوں تا کہ جب وہ میرے ساتھ ہوٹل میں داخل ہو تو پورا ہوٹل اس کے وجود کی بھینی بھینی خوشبو سے مہک اٹھے اور اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ وہ اپنے بالوں کو کھلا رکھے تا کہ میں اس کے خوبصورت بالوں کو دیکھ کر اچھے اشعار زیادہ کہہ سکوں' اور اس سے کہنا کہ یہ بد صورت اور محروم قسم کا انسان ہے اس سے باتیں کرے تو اسکے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم ہو''

''یہ سب ہو جائے گا نفیس صاحب، میں اس سے کہہ دوں گا وہ آپکی ہدایات پر پوری طرح عمل کرے

گی اس کی قربت پر آپ کو کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

''اور اس سے یہ بھی کہنا کہ اگر ہو سکے تو گلابی ڈریس پہن کر آئے ایسی خوبصورت گلابی لڑکیوں کے لباس کو بھی گلابی ہونا چاہتے''

ملاقات سے ایک دن قبل جب میں نے قلوپطرہ کو یہ سب بتایا تو وہ بھڑک اٹھی'' کیا اس بڈھے کا دماغ خراب ہوگیا ہے وہ کیسی فرمائشیں کر رہا ہے؟''

''یہ اس کی خواہشات ہیں جو صدیوں سے اس کے سینے میں دبی ہوئی ہیں۔'' میں نے کہا'' اور جب تم ان سے ملاقات کے مرحلے تک پہنچ ہی تو اس ذرہ سی بات میں کیا حرج ہے''

بھڑکی ہوئی قلوپطرہ کو بڑی مشکل سے منایا گیا تھا اور وہ یہ سب کرنے کو تیار ہوگئی تھی میں نے یہ خوش خبری بھی نفیس صاحب کو سنا دی وہ یہ سب سن کر خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

''یہ ہوئی نا بات ابھی دیکھئے انداز گل فشانی گفتار میں اس کے سامنے شاید ایسی ہی گفتگو کروں گا ایسی گفتگو کروں گا جو اگر ریکارڈ کرلی جائے تو تاریخ کی سب سے اچھی گفتگو ثابت ہو۔''

میں نے نفیس صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ قلوپطرہ نے انکے لیے کیا سوچ رکھا ہے اور ان کو یہ بتایا بھی نہیں جا سکتا تھا قلوپطرہ کی اسکیم یہ تھی کہ اس نے اپنی کئی سہیلیوں کو مدعو کر رکھا تھا وہ سب کی سب وہاں باری باری پہنچ جاتیں اور نفیس صاحب سے کھانے کی فرمائش کرتیں ظاہر ہے اسکے بعد نفیس صاحب پر جو گزرتی وہ بہت ہی بری ہوتی بالا آخر وہ دن آ گیا جب نفیس صاحب اور قلوپطرہ کو ڈنر کرنا تھا۔

اس دن ایک عجیب بات ہوئی نفیس صاحب میرے گھر آ گئے اس وقت ان کی کیفیت کچھ عجیب ہو رہی تھی انہوں نے مجھ سے کہا'' احسان میرے دوست تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے یہ موقع فراہم کیا ہے لیکن''

''لیکن کیا نفیس صاحب'' میں نے انکی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا

''میں نہیں جا سکوں گا'' انہوں نے بتایا

''کیا'' میں تو جھک سا رہ گیا'' آپ کیوں نہیں جا سکیں گے۔؟''

''اس لیے کہ یہ موقع میری زندگی کا سب سے خوبصورت اور شاندار موقع ہوگا اور مجھے معلوم ہے کہ اس کے بعد مجھ بدنصیب کیلئے ایسی کوئی رات نہیں آئے گی اور میں زندگی بھر اس کے حصول کیلئے بے چین رہوں گا اس لیے عمر تمام کا روگ لگانے سے بہتر ہے کہ کنارہ کشی اختیار کرلوں۔''

''نفیس صاحب۔''

''تم یہ مت سمجھنا کہ میں اخراجات کی وجہ سے ایسا کہہ رہا ہوں، نہیں میرے پاس پیسے ہیں'' یہ لو'' انہوں نے دس ہزار روپے زبردستی میری جیب میں ڈال دیے تھے'' جاؤ تم نوجوان ہو خوبصورت ہو تم اس کے ساتھ جاؤ اور اس کی محبت کا لطف اٹھاؤ اور میری طرف سے اسے دعائیں دینا۔''

اتنا کہتے ہی وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے اور میں ایک تصویر بنا وہاں کھڑا رہ گیا اس وقت نفیس کا سیاہ چہرہ گلاب جیسا معلوم ہوتا تھا۔

اب کہاں ہیں ایسے کردار ایسے لوگ سب ختم ہوگئے اب صرف رفتگاں کی دھول رہ گئی ہے جس نے گلاب چہروں کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہے۔

کردار تو آج بھی ہیں لیکن انداز بدل گئے ہیں اب یہ سب کمرشل کردار ہیں تجارتی منصوبہ بندی کرنے والے اور الٹے سیدھے خواب دکھانے والے، کیا لوگ تھے کہ مرجاتے تھے بیٹھ کر چاند کی کشتی میں کہیں جھیل کے پار ہم سر شام کی خواب نگر جاتے تھے اگلے وقتوں میں سنا ہے کہ پرانے کچھ لوگ آنکھوں آنکھوں میں جہاں سے گزر جاتے تھے، اپنی آنکھوں میں تپش ایک جہاں کی لے کر، وسعت نیل میں کچھ لوگ اتر جاتے تھے۔

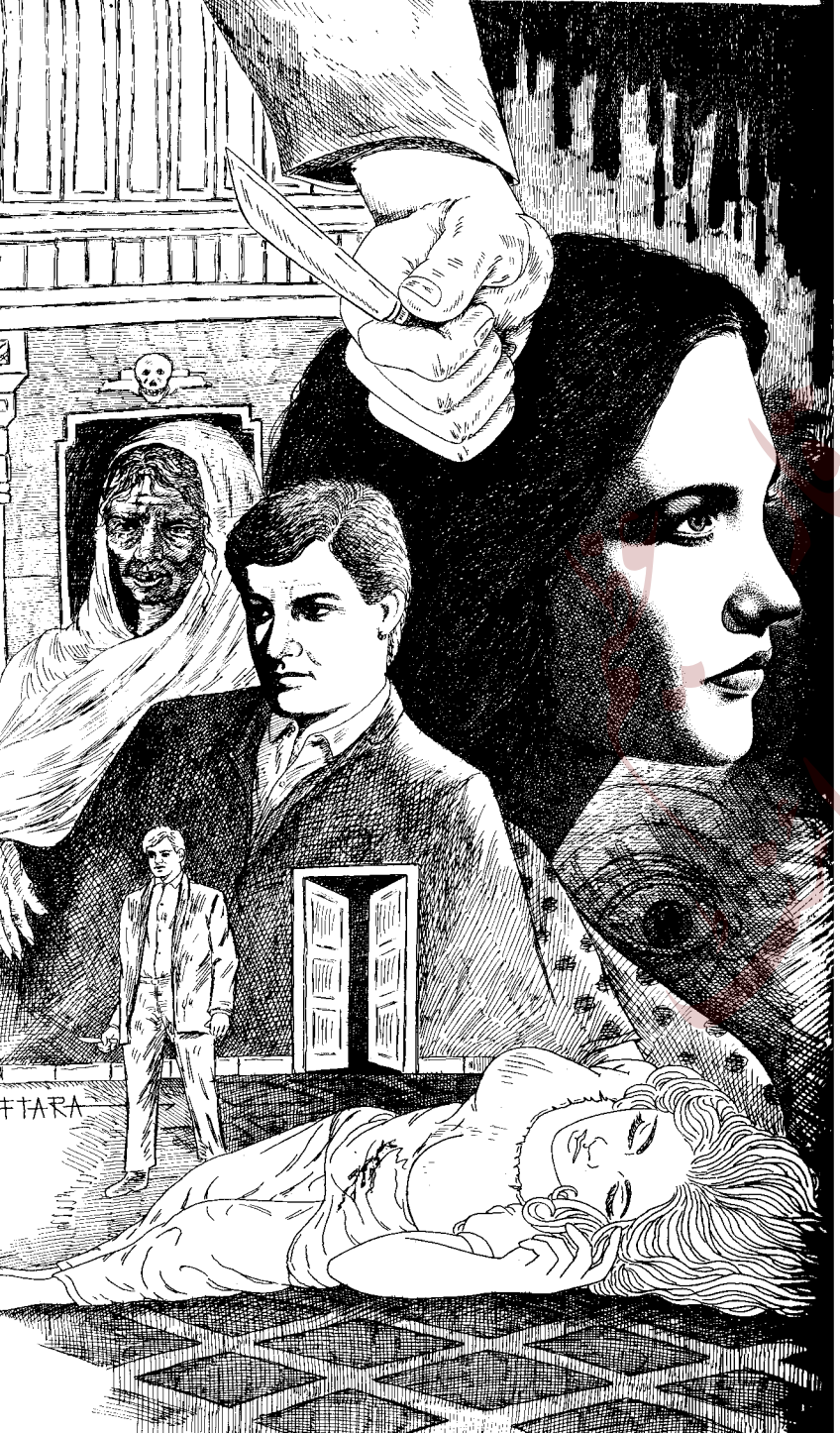

خونی جزیرہ

ایم الیاس

قسط نمبر:2

خوفناک حیرت ناک اور دھشت ناک وادی میں جنم لینے والی عجیب و غریب خوف کی وجہ سے دل کو سہماتی اور رگوں میں خون کو منجمد کرتی، قدم قدم پر لرزاتی اور پورے جسم میں ارتعاش پیدا کرتی نادیدہ قوتوں کی ناقابل فراموش اور ناقابل یقین، ڈرائونی کھانیوں کی فہرست میں سب سے آگے حقیقت پر مبنی خونی کھانی۔

مشہور و معروف رائٹر کے زور قلم کی شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو حیران کردے گی

میرے سارے جسم میں ہی نہیں بلکہ پوروں میں سنسنی بجلی کی رو کی طرح اتر گئی..... دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ میں ایک آدمی ہونے کے ناطے آدمی کو ذبح کروں.....؟ کیا ایک انسان اس قدر شقی القلب ہوسکتا ہے۔ وہ قصاب جو جانوروں کو ذبح کرتے ہیں وہ کسی انسان کو ذبح کرنے سے رہے۔

''کیے.....؟'' میرے حلق میں آواز پھنس گئی۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

''آنند پرکاش کو.....'' نریندر نے بڑی بے پروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔

''کیا.....؟ آنند پرکاش کو.....؟''

مجھ پر کوئی بجلی سی آ گری..... مجھے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔

''ہاں..... اس شخص کو..... میں تمہیں کسی پرندے یا جانور کو ذبح کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔''

نریندر نے مجھے اوپر سے نیچے تک تیز نظروں سے گھورا۔ میں اس کی زہریلی نظروں کی تاب نہ لاسکا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ مجھ کو کچا چبا جائے گا۔ میں نے نظریں نیچی کرلیں۔ اس سے وہ ایک درندہ لگ رہا تھا۔

''تم اچھل کیوں پڑے.....؟ اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ کس لئے پریشان ہوگئے ہو؟''

''اس لئے کہ آنند پرکاش ایک مشہور و معروف سماجی کارکن ہیں..... ان کا تعلق کبھی بھی کسی سیاسی جماعت یا گروہ سے نہیں رہا ہے..... اور نہ کبھی انہوں نے ہماری تنظیم کے خلاف کوئی کام کیا..... نہ وہ ہمارے مخالف یا دشمن ہیں..... وہ صرف اور صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں..... غریبوں اور انسانیت کی بھلائی کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں..... دکھی لوگوں کے لئے ان کا دل ہر وقت پریشان اور تڑپتا رہتا ہے۔'' میں نے رک رک کر جواب دیا۔

''تم ان کے بارے میں بہت معلومات رکھتے ہو.....؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم سے ان کے بارے میں تفصیل سے بتانے کے لئے تو نہیں کہا.....؟ بڑے قدر دان اور مداح ہو.....؟''

''ان کے بارے میں تو نہ صرف آسام بلکہ پورے ملک کا بچہ بچہ بھی جانتا ہے۔'' میں نے قدرے بے خوفی سے کہا۔ ''میں بھی ان کے بارے میں بہت کچھ سنتا رہتا ہوں۔ ان کے پرستاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

''جب تم یہ جانتے ہو تو یہ بھی جانتے ہوگے کہ..... پولیس انسپکٹر سریندر کپور کا بڑا بھائی ہے.....؟'' نریندر

نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیوں.....؟''

وہ انسپکٹر سریندر کپور جو شیلانگ سے تبادلہ کرا کے آیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے ہمارے تین آدمیوں کو حوالات میں بند کیا ہوا ہے جو بڑے اہم اور سرگرم کارکن ہیں۔''

''ہاں..... یہ اس کا بڑا بھائی ہے.....'' نریندر نے زہر خند لہجے میں کہا اور اس کے بشرے پر حقارت ابھر آئی۔ ''اس نے ہمارے ان تین آدمیوں پر تشدد کر کے زبان کھولنے پر مجبور کیا۔ لیکن ان تینوں نے زبان نہیں کھولی۔ تشدد اور ایذائیں بھی برداشت کرلیں..... وہ ہماری تنظیم کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے..... اسے میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں مل رہا ہے..... اور نہ وہ ہمارے اڈوں کا پتا چلانے میں کامیاب ہوسکا اور نہ ہی اس کے پاس ہمارے آدمیوں کی فہرست ہے..... اس لئے وہ ہم پر ہاتھ ڈال سکا نہیں..... میرا بااثر ہونا کام آرہا ہے..... میں ان بااثر لوگوں کی کیسی سیوا کرتا ہوں..... ان کی پسند کی شراب اور شباب بھی فراہم کرتا رہتا ہوں۔ میری پہنچ نہ ہوتی اور شباب اور شراب کا جادو نہ چلا ہوتا تو اب تک ہم سب اندر ہوتے..... اس لئے میں اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ ان کی سیوا سے غافل نہ رہوں۔''

نریندر نے غلط نہیں کہا تھا۔ آسام میں غربت و افلاس تھی۔ ایسی لڑکیوں عورتوں کی کوئی کمی نہ تھی جنہیں کوڑیوں کے دام خریدا جاسکے۔ وہ ایک مٹھی چاول کے عوض اپنی عزت حوالے کردیتی تھیں..... نریندر کرتا یہ تھا کہ ان لڑکیوں، عورتوں کو دلہنوں کی طرح بناؤ سنگھار کرا کے ان پاپیوں کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کرتا تھا کہ یہ دوشیزائیں ہیں اور ان کی زندگی میں اب تک کوئی مرد نہیں آیا۔ انہیں اچھی طرح سبق رٹا دیا جاتا تھا اور ساقی بھی بنا دیا جاتا تھا۔

''آپ اس کا تبادلہ کیوں نہیں کرا دیتے.....؟'' میں نے رسمی انداز سے اسے مشورہ دیا۔ میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی۔ اگر میں یہ مشورہ نہیں دیتا تو اس کے شک وشبہات بڑھ جاتے۔

''اس کا تین ماہ تک تبادلہ ہونا ممکن نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''کیوں ممکن نہیں ہے.....؟ آپ کا تو بڑا اثر و رسوخ ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس لئے کہ وہ بہت اوپر سے آیا ہے تاکہ صرف ہماری تنظیم کا نام ونشان صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔'' نریندر فکرمندی سے کہنے لگا۔ وہ جس طرح کی منصوبہ بندی ہمارے خلاف کررہا ہے اس کی وجہ سے وہ دو تین ہفتے ہی اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائے گا۔ کم بخت بڑا ذہین، ہوشیار اور منصوبہ ساز ہے۔''

''باس.....! کیا آپ نے اس کے آگے چارہ نہیں ڈالا جیسا کہ آپ ہمیشہ دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں.....؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کا ڈالا ہوا چارہ ایسا جادو ہے کہ اس سے کوئی بچ نہیں سکتا..... نہ بچا ہے اور نہ اس کا کوئی توڑ ہے..... یہ آزمودہ ہے۔ کیسے کیسے سورما، سخت مزاج اور اصول پسند شباب کی مار سہہ نہ سکے۔''

''تم کیا یہ سمجھتے ہو کہ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں..... میں نے ایسی اداکاراؤں کی تصویریں جن کی حشر سامانیاں مردوں کو تڑپا دیں اور ان کے دلوں میں ان کے حصول کی تمنائیں پیدا کردیں..... آرزوؤں کو جنم دے..... یہ تصویریں میں نے خصوصی حاصل کی تھیں..... اس کے علاوہ میں نے اسے کل ایک کروڑ ٹاکا..... اور چار سو گز رقبہ پر بنی ہوئی کوٹھی کی پیشکش کی تھی اس نے نہ صرف صاف انکار کردیا بلکہ تصویروں کے پرزے پرزے کردیئے..... شراب جو پرانی اور ولایتی تھی انہیں دریا برد کردیا۔ وہ شراب اور پرشباب اداکاراؤں کی تصویریں میں نے ایک لاکھ ٹاکا میں خریدی تھیں۔ ان اداکاراؤں سے میں نے فون پر کہا تھا کہ اسے اس طرح سے خوش کرو کہ وہ میری ہر بات مان لے اور میں تمہیں اتنا خوش کروں گا کہ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں۔ میرا ہر وار اور داؤ..... خالی گیا..... اب میں کیا کروں؟''

''اس کی ایسی کمزوری ہوسکتی ہے کہ وہ راہ راست

پر آجائے۔'' میں نے کہا۔ ''آسام اور بنگال میں ایسے جادوگروں اور جادوگرنیوں کی کوئی کمی نہیں ہے جن کا جادو اس پر چل جائے..... ان کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔''

''کسی جادوگر اور جادوگرنی کے سحر کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''کسی ماہر جادوگر اور جادوگرنی کی تلاش میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ان کا حصول آسان نہیں ہے۔ جو ہیں ان کا جادو اثر نہیں کرتا ہے۔''

''پھر آپ کیا کریں گے.....؟'' میں نے کہا۔

''اس طرح وہ ہماری تنظیم کا خاتمہ کردے گا اور ہمارے آدمیوں کو چن چن کر جیلوں میں ٹھونس دے گا۔ لہٰذا کوئی تدبیر کرنی ہوگی..... منصوبہ بنانا ہوگا۔''

''میرے ذہن میں اس کی ایک ایسی کمزوری ہے کہ جس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔''

''وہ کیا.....؟'' میں نے چونک کر تجسس سے پوچھا۔

''چوں کہ وہ اپنے بڑے بھائی اور بھابھی کو نہ صرف بہت چاہتا اور عزت دیتا ہے اس لئے میں نے اس کی محبت کی دولت سدا کے لئے چھین لینے کا فیصلہ کیا ہے..... یہی ایک ایسا راستہ ہے کہ وہ راہ راست پر آسکتا ہے۔''

پھر بھی اس نے ہٹ دھرمی کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے اصول پر قائم رہا تو.....؟'' میں نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''پھر اسے اس دنیا سے رخصت کردینا تمہاری ذمے داری ہوگی..... میں اسے ابھی راستے سے نہیں ہٹا رہا ہوں کہ پہلے اس کے دل پر ایک گھاؤ لگے..... اب تم جاؤ اور آنند پرکاش کے قتل کا منصوبہ بنا کر دو دن میں میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں تمہاری مدد کے لئے کیلاش اور خیرو کو بھی ساتھ کردوں۔'' نریندر نے سفاک لہجے میں کہا۔

جب میں جانے لگا تو اس نے کہا۔ ''انیل راج.....! تمہیں کوئی پسند ہو تو بتاؤ..... اعلیٰ قسم کی شراب بھی مہیا کرسکتا ہوں۔''

''لیکن باس میں ان چیزوں سے دور ہوں۔''

میری بات ختم ہوئی تھی کہ اچانک کمرے کی لائٹ بجھ گئی اور ایک کرخت، ڈراؤنی، دہل دہلاتی، وحشت ناک، نسوانی آواز سنائی دی۔ جیسے کہ کسی کے نرخرے پر چھری چلائی جارہی ہو، اور زبردست طوفانی قہقہہ اس کے بعد لائٹ آگئی۔

نریندر کی حالت دیدنی تھی، چہرہ زرد ہورہا تھا، آنکھوں میں ویرانی اور جسم پر ہلکی کپکپی طاری تھی، سپاٹ چہرہ لئے وہ میری طرف یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ نیر کی بھی حالت غیر تھی، اور میں اس حالت میں، میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

اور میں اس رات ایک پل کے لئے سو نہ سکا۔ کروٹیں بدلتا رہا۔

اگر نریندر مجھ سے کہتا کہ تم خودکشی کرلو تو شاید میں کرلیتا۔ لیکن میں آنند پرکاش کے قتل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ وہ ایک عظیم اور بے مثال شخص تھا جو بے غرض اور مخلص تھا اور انسانیت کی بھلائی کے لئے کوشاں تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کے لئے وقف کردیا تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں پر راج کررہا تھا۔ عوام کا دل جیتنا اور ان کے دلوں پر حکومت کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے..... اگر وہ لوگوں کو حکم دے کہ گھروں سے نکل آؤ اور حکومت کا تختہ الٹ دو لوگ اس لمحے نکل آئیں۔ لوگ اس کی پرستش کسی دیوتا کی طرح کرتے تھے۔ اس کی نظر میں ہر شخص بلاتفریق تھا۔ اس کا تعلق کسی بھی رنگ ونسل، دھرم اور مذہب سے کیوں نہ ہو برابر تھے..... وہ حکومت اور سیاست سے بہت دور تھا۔

انسپکٹر سریندر کپور نے جب سے اس شہر میں آکر چارج سنبھالا تھا جب سے ہمارے گروہ کی سرگرمیاں قدرے متاثر ہوگئی تھیں اس بات نے نریندر کو تشویش میں مبتلا کردیا تھا..... انسپکٹر سریندر کپور مجرموں کے لئے بڑا سخت گیر تھا۔ وہ ایک فرض شناس، دیانت دار اور با

اصول افسر تھا۔ کسی مجرم کے ساتھ رعایت کرنا جانتا نہیں تھا۔ قانون کی پاسداری کو اس نے اپنی زندگی کا محور بنالیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں قانون کی سلامتی اور تحفظ کے لئے اپنی جان قربان کردوں گا۔

پھر میرے کانوں میں کہیں دور سے اتم بابو کی آشنا آواز سنائی دی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو.....؟ نریندر پر قانون نے کمند ڈال دی اور اس گروہ کا قلع قمع ہوگیا تو اس دیش پر تمہارا احسان ہوگا..... تمہیں انسانیت کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگانا ہوگی..... اس شبھ کام میں دیر نہ کرنا.....

☆.....☆.....☆

وقت کب ایک جیسا رہا تھا جو آج رہتا..... وقت جو کسی کا نہیں ہوتا ہے۔

اس طرح اب دنیا بہت بدل گئی اور برق رفتاری سے بدلتی جارہی تھی۔ یہ تو ازل سے ہی دنیا بدلتی چلی آرہی ہے..... حالات ایک جیسے نہیں رہے تھے اور نہ رہ سکتے..... آج دنیا میں کیا کچھ تبدیلیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ پہلے کسی بھی مافیا کا کوئی پتا اور نام ونشان نہیں رہا تھا۔ لیکن دنیا میں اب ایسا کوئی خطہ یا ملک نہیں رہا تھا جہاں کسی مافیا کا وجود نہ ہو..... آسام، بنگلہ دیش اور ہندوستان میں بھی نریندر کی مافیا تھی۔ لیکن اس نے اپنا مرکز آسام کو بنایا ہوا تھا..... کون سا قصبہ ایسا تھا جس میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی نہ ہوں..... بردہ فروش..... سیاست..... صنعت..... منشیات اور اسمگلنگ کا وہ بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کے پاس کیا کچھ نہ تھا..... بظاہر وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا۔ لیکن وہ پس پردہ ایک مافیا، دہشت گرد اور بلیک میلر بھی تھا۔ جس سے عام لوگ بہت پریشان اور ہراساں اور خوف زدہ تھے۔ اس کے نام سے کانپتے تھے۔

وہ شو بزنس کی دنیا میں بلیک میلر کہلاتا تھا۔ ہیروئن، رقاصاؤں اور فلم سازوں اور ہدایت کاروں کو وہ اپنا غلام سمجھتا تھا۔ خصوصاً فلموں اور ٹی وی کی اداکارائیں اس کے لئے کٹھ پتلی تھیں۔ ان کی کیا مجال اور ہمت کہ وہ اس کے حکم کی سرتابی کرسکیں۔ اس کا ہر حکم بلا چون وچرا مانتی تھیں۔ اس کے پاس ان کی ایسی ممنوعہ قسم کی تصویریں تھیں کہ وہ اپنی زندگی اور قسمت کو روتی تھیں۔

میں چاہتا تھا کہ اس مافیا کا خاتمہ کردوں اور اسے کیفر کردار تک پہنچاؤں لیکن میرے ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن پھر بھی میں نے ٹھان رکھی تھی اس کے خلاف جو کچھ بھی غیر محسوس انداز سے کرسکتا ہوں اور کروں گا۔

میں نے نریندر کے نہ صرف اڈوں کی بلکہ اس کے گروہ کے ممبروں کی ایک فہرست انسپکٹر سریندر کپور کے حوالے کردی تھی۔ اس کے ہاں پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ کیوں کہ نریندر کے پالتو کتے اس کی نگرانی کرتے اور غیر محسوس انداز سے اس کا تعاقب بھی..... جب وہ رات اپنے گھر میں ہوتا تو یہ پالتو کتے اس کی اتنی کڑی نگرانی نہ کرتے۔ میں اس سے اس کے دفتر میں جا کر مل نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس کے گھر پر کوئی بہروپ بھر کے رات کے وقت جاسکتا تھا۔ میں نے ایک سادھو کا بہروپ بھرا اور رات کے دو بجے اس کے ہاں پہنچا تو انسپکٹر سریندر بہت خوش ہوا۔ میں نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا اور اطمینان کرلیا تھا کہ کوئی کتا موجود نہ ہو۔

جب میں نے اس سے اپنی دلی خواہش کا اظہار کیا کہ نریندر کو کیفر کردار تک پہنچایا جائے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جذباتی ہونے سے کام نہیں ہوسکتا۔ اس پر فوری طور پر ہاتھ ڈالنا اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنا آسان نہیں ہے۔ منصوبہ بندی کی اشد ضرورت ہے کیوں کہ وہ ایک طاقت ور مافیا ہے۔ دوسرے مافیاؤں کے مقابلے میں نہایت طاقتور اور با اثر بھی ہے۔ کالی بھیڑوں کو وہ دولت کے بل بوتے پر خرید لیتا ہے اور مخالف اور دشمن کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔

☆.....☆.....☆

دوسرے دن میں رات کے سمے گہری نیند میں غرق تھا کہ میری نیند ٹوٹ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ دستک دے رہا ہے۔ کمرے میں نائٹ بلب جل رہا تھا۔ جو دودھیا تھا اور اس کی

روشنی میں ایسا لگتا تھا کہ کمرے میں چاندنی چٹکی ہوئی۔ میں نے اس منجمد روشنی میں دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اس وقت کون آسکتا ہے.....؟ شاید یہ میرا واہمہ ہو..... پھر دوسرے لمحے قدرے تیز دستک ہوئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید نریندر نے مجھے کسی مشن پر بھیجنے کے لئے کسی کو بھیج کر بلایا ہو..... وہ منشیات کی کھیپ یا اسلحہ کی سپلائی کے لئے مجھے راتوں کے وقت طلب کرلیا کرتا تھا۔

میں بیرونی دروازے والے کمرے میں گیا۔ روشنی کی۔ دروازہ کھولا تو یقین نہیں آیا میں سمجھا کہ میں غنودگی میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ نیند کا میری آنکھوں میں غلبہ تھا۔ میں ایک لمحے کے لئے پلکیں جھپکانا بھول گیا۔

نریندر کی جوان اور حسین سیکریٹری کویتا کھڑی تھی۔ دروازہ کے کھلتے ہی وہ تیزی سے اندر گھس آئی۔ پھر اس نے پلٹ کر دروازہ بند کیا اور اندر سے چٹخنی لگادی۔ پھر میرا ہاتھ تھام کر وہ مجھے خواب گاہ میں لے آئی۔

کویتا اس وقت سراسیمہ، پریشان اور خوف سی دکھائی دی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی اس کی بے حرمتی کرنا چاہتا تھا وہ اس سے اپنی آبرو بچا کر میرے ہاں آئی ہے۔

دوسرا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ شاید میرے قرب کے لئے آئی ہو۔ چوں کہ دور سے دوڑتی ہوئی آئی تھی اس لئے اس کی سانسیں سینے میں دھونکنی کی طرح چل رہی تھیں اس لئے وہ سراسیمہ اور پریشان اور متوحش سی لگ رہی تھی۔ رات کے اس سے وہ بڑی دلکش اور پرکشش لگ رہی تھی۔

وہ میرے بارے میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ میں کس قماش کا ہوں۔ میں کیسی ہی حسین، نوجوان اور بے پناہ پرکشش لڑکی کیوں نہ ہو اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتا نہیں ہوں۔

کویتا جتنی حسین اور پرکشش تھی اتنی ہی اچھی اور پیاری لڑکی تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلف تھی۔ ایک اچھے اور گہرے دوست کی مانند کی تھی۔ تنہائیوں کے باوجود کبھی دیوار نہیں گرائی اور نہ ہی مجھ پر مہربان ہوئی۔ ہمارے درمیان خلوص کا جو رشتہ تھا وہ روز بروز گہرا ہوتا جارہا تھا۔ ہم دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے بڑی عزت موجود تھی۔

اس کا رات کے تین بجے اچانک اور غیر متوقع آنا میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے بشرے سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ نوجوانی کے ہاتھوں مجبور ہوکر آئی ہو۔ اس کے دل میں کیا ارمان ہیں جو وہ پورا کرنا چاہتی ہو۔

وہ مجھے بستر پر لے کر بیٹھ گئی تو میں نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کا سینہ بدستور دھڑک رہا تھا۔ سانسیں قابو میں نہیں آئی تھیں۔

''کویتا.....!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کردیں۔ ''خیریت تو ہے.....؟ رات کے تین بج رہے ہیں؟''

''خیریت ہی نہیں ہے..... اس لئے آئی ہوں..... تمہاری جان خطرے میں ہے۔''

''وہ کس لئے.....؟'' میری حیرت دوچند ہوگئی۔

''میں نے کیا کیا.....؟''

''اس لئے کہ تم نریندر کے خلاف انسپکٹر سریندر کپور سے جو مخبری کی ہے اس کی اطلاع باس کو ہوگئی ہے۔'' اس نے میرے قریب ہوکر سرگوشی کی اور اس کی سانسیں اعتدال پر آگئیں۔

''وہ کیسے.....؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اسے اس بات کی اطلاع کس نے دی؟ جب کہ میں نے بڑی رازداری اور احتیاط سے مخبری کی تھی۔ اس کے فرشتوں کو بھی خبر ہونے سے رہی تھی۔''

''تھانے کے حوالدار نے ٹیلی فون پر نریندر کو بتایا کہ تم نے غداری کی ہے.....'' کویتا کہنے لگی۔ ''وہ کالی بھیڑ ہے..... باس کا پالتو کتا ہے جو اس کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے۔ رتی رتی بات کی خبر دیتا ہے..... وہ آستین مار ہے پولیس کا.....''

''کویتا.....! یہ تو بہت برا ہوا..... اب باس کا ردعمل کیا ہے۔'' میں نے تشویش سے کہا۔

''وہ کیلاش کے انتظار میں ہے جو کسی کام سے شہر گیا ہوا ہے۔ وہ آج صبح سات بجے پہنچنے والا ہے۔'' کویتا نے لمحہ بھر توقف کرکے کہا۔ ''اس کے پہنچتے ہی سب سے پہلے اس کا یہ کام ہوگا کہ وہ تمہیں ختم کردے۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ کویتا.....!'' میں نے ممنونیت سے کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا۔''

''اس میں شکریہ اور احسان کی کیا بات ہے انیل راج.....!'' اس نے میرا ہاتھ تھام کر اس کی پشت پر بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ بولی۔ ''تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے وہ کتنا بڑا ہے۔ میں اسے آخری سانس تک نہیں بھول سکتی۔''

''میں نے کون سا احسان کیا کویتا.....!'' میں نے کہا۔ ''وہ تو میرا فرض تھا جو میں نے انسانیت کے ناتے کیا تھا۔''

''تم نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر میری بہن سنگیتا کی جان اور آبرو بچائی۔'' وہ بولی۔ اور اس ایک لمحے میں مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ میں تو اپنا فرض ادا کرکے اس واقعہ کو بھول چکا ہوتا۔

چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ کویتا کی نوجوان بہن جو کہ نہایت حسین و جمیل تھی۔ ایک روز وہ پوجا پاٹ کے لئے مندر گئی تو دوپہر کا وقت تھا۔ اس سمے مندر میں کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ چار تھے جن کا مندر میں ٹھکانہ تھا۔ وہ معصوم اور پوجا پاٹ کے لئے آنے والی لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلاتے تھے۔ وہ دوپہر کے سمے نہایت حسین اور پرکشش لڑکی کو اس کی آشا پوری کرنے کی غرض سے بلاتے اور اپنا منہ کالا کرتے تھے۔ وہ عورتیں جو بانجھ اور بے اولاد ہوتی تھیں وہ اس پریشانی..... سے پریشان ہوکر آتی تھیں کہ ان کی کسی کا رن گود بھر جائے۔ کیوں کہ ان کے پتی ان سے کہتے تھے کہ اگر انہوں نے وارث نہیں دیا تو پھر طلاق دے کر دوسری شادی کرلیں گے۔ مندر کے پجاری ان سے کہتے تھے کہ ہم سب کو خوش کردو تو تمہاری دلی آشا پوری ہوجائے گی۔ وہ انکار کرتیں تو وہ چاروں ناگ بن جاتے..... وہ غریب اپنا سب کچھ سونپ اور ہار کر چلی جاتی تھیں۔ شرمناک واقعے کو راز رہنے دیتی تھیں۔ کیوں کہ اس میں ان کی رسوائی اور ذلت تھی۔ کوئی ان کی بات کا اس لئے یقین نہیں کرتا کہ وہ ہر لحاظ سے دھرم کے رکھوالے تھے۔ یہ گھناؤنا کھیل دھرم کے نام سے جاری تھا۔ کسی لڑکی یا عورت نے ان کے اصل چہرے دکھائے تو اسے قتل کردیا گیا۔ انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔

یوں تو ان کے کرتوت میرے علم میں تھے۔ لیکن میرے پاس ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا لیکن میں پھر بھی سوچتا ضرور تھا کہ ان شیطانوں اور ناگوں سے کب اس مندر کو پاک کروں..... رانی پونم نے جو کہانی سنائی تھی وہ میں بھولا نہیں تھا۔ مندروں میں یہ گھناؤنے کھیل کھیلے جاتے تھے۔ تاہم میں اس تاک اور گھات میں تھا کہ مندر اور دھرم کی عزت اور پاکیزگی کو قائم رکھوں۔

آخر ایک دن موقع مل گیا تھا۔ میں نے سنگیتا کو مندر جاتے دیکھا۔ وہ اکیلی جارہی تھی۔ دوپہر کا سمے تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیوں اور کس لئے اکیلی مندر جارہی ہے۔ وہ دسویں جماعت کی ذہین طالبہ تھی۔ اس نے اپنے اسکول میں مڈل سے بڑی کام یابی حاصل کی تھی۔ ہر کلاس میں ہر برس اول تھی۔ پھر مجھے کویتا کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ سنگیتا کی دلی خواہش ہے کہ وہ میٹرک میں پورے آسام میں ٹاپ کرے۔ اسے تعلیم کے حصول کا جنون تھا۔

اس کو اس سمے اکیلی مندر جاتے ہوئے دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔

کویتا اور سنگیتا دونوں بہنیں نہایت حسین اور پرکشش تھیں۔ لیکن کویتا کی چھوٹی بہن اپنی بڑی بہن سے کہیں پرکشش تھی۔ اس کی اٹھان اور نشوونما غیر

معمولی تھی۔ وہ متناسب بدن کی تھی اور اس کے حسن و شباب کا چرچا شیلانگ شہر میں تھا۔ آسامی لڑکیوں کی گندمی رنگت میں بڑی جاذبیت اور صلاحیت تھی۔ ہر کوئی اسے دیکھ کر دیکھتا رہ جاتا تھا۔ جوان لڑکے اور مرد اسے دیکھتے تو ان کے سینوں میں سرد آہوں کا غبار بھر جاتا۔ اس پر جوانی ٹوٹی پڑ رہی تھی۔

کویتا گو کہ نریندر کی پرائیویٹ سیکریٹری تھی اور بلا کی حسین تھی۔ لیکن اس نے کویتا کی بھرپور جوانی سے اس لئے فائدہ نہیں اٹھایا تھا کہ اس کی پسند اور کمزوری چالیس برس کی اور شادی شدہ عورتیں تھیں۔

میں نے کویتا کی زبانی سنا ہوا تھا کہ سنگیتا میٹرک میں ٹاپ کرنے کے لئے بڑی بے چین ہے۔ اس لئے بھی کہ اس کی ایک ہم جماعت لڑکی ریما جو نہایت ذہین تھی اس نے سنگیتا کو چیلنج دیا ہوا تھا کہ وہ پورے آسام میں ٹاپ کرے گی۔ اس کا باپ ایسا جادو منتر جانتا ہے جس کے زور پر وہ کامیاب ہوجائے گی۔ یہ حقیقت بھی تھی۔ اسے کسی نے بتایا تھا کہ ریما کے باپ کا جادو منتر مندر کا پنڈت توڑ دے گا۔ وہ اس لئے مندر جارہی تھی حالانکہ کویتا نے اسے سمجھایا ہوا تھا کہ کوئی جادو منتر کسی کو ٹاپ کرنے نہیں دے سکتا۔

میرے اور سنگیتا کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے آواز دے کر روکتا وہ مندر میں داخل ہوچکی تھی۔ کچھ دیر بعد جب میں اندر داخل ہوا تو ایک کمرے سے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ میں ایسی جگہ کھڑا ہوگیا تھا کہ انہیں دیکھ سکتا تھا کہ لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پجاری اس سے کہہ رہا تھا۔

''تم ہم چاروں کی باتیں اور شرط مان لو تو اول آسکتی ہو۔''

''آپ لوگوں کی کیا شرط اور باتیں ہیں؟'' سنگیتا نے معصومیت سے پوچھا۔

''ہم چاروں کو اس وقت باری باری خوش کرنا ہوگا۔'' پجاری کے بجائے پنڈت جی نے کہا۔

سنگیتا اس کی بات کی تہہ میں نہ پہنچ سکی۔ اس نے پھر پوچھا۔ ''میں کس طرح خوش کروں؟ کیا رقم اور زیور دینا ہوگا؟''

''ہمارے پاس رقم اور زیورات کی کوئی کمی نہیں ہے۔'' سادھو مہاراج نے کہا۔

''پھر میں کیا کچھ بھینٹ کرسکتی ہوں۔ صاف صاف بتائیں۔'' سنگیتا نے کہا۔

''اری او بے وقوف احمق او بدھو۔'' پنڈت جی نے تمسخر سے کہا۔ ''تیرا حسن جوخزانے سے بھرا ہوا ہے اسے ہم پر نچھاور کرنا ہوگا..... جبھی تجھے کامیابی ملے گی..... تو ٹاپ کرے گی۔ آیا تیری سمجھ میں.....''

''میرا جسم خزانے سے بھرا ہوا ہے.....؟'' وہ ہنس پڑی اور معصومیت سے بولی۔ ''جسم میں کون سا خزانہ ہوتا ہے۔

یہ کیسی باتیں کررہے ہیں آپ لوگ.....؟ میں نے کبھی سنی نہیں۔''

''اچھا تو ایسا کر..... اپنے کپڑے اتار دے..... میں بتاتا ہوں۔'' سنیاسی بولا۔

''ہشت..... ایسا بے ہودہ مذاق کررہے ہو..... میں یہاں اس لئے تو نہیں آئی۔'' وہ بولی۔

''سن لڑکی.....!'' پجاری نے کہا۔ ''تجھے ہم سب کی باری باری دلہن بننا ہوگی۔ جبھی تیری آشا پوری ہوگی۔ چل سامنے والے کمرے میں.....''

''تو تم لوگ میری عزت سے کھیلنا چاہتے ہو.....؟'' سنگیتا کا چہرہ ایک دم سے متغیر ہوگیا۔

''تو جو بھی سمجھ لے..... کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے..... چل میرے ساتھ سامنے والے کمرے میں.....'' پجاری بولا۔

''نہیں..... نہیں.....'' وہ ہذیانی لہجے میں بولی۔ ''میں واپس گھر جارہی ہوں۔ تم لوگوں نے مجھے کیا سمجھا ہوا ہے۔''

وہ جانے کے لئے مڑی تو پجاری نے لپک کر اسے دبوچ لیا۔ اسے گود میں اٹھانا چاہا تو اس نے پجاری کے منہ پر تھوک دیا تو اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر وہ کسمسا کر اس کے بازوؤں سے نکلی اور اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر

اتنے زور سے دھکیلا کہ وہ الٹ کر سادھو کے اوپر جا گرا۔ پھر دونوں توازن قائم نہ رکھ سکے۔ فرش پر جا گرے۔

پھر سنگیتا پھرتی سے مڑ کے دراز ے کی طرف بھاگی تو پنڈت لپک کر اس کے راستے میں حائل ہوگیا۔ وہ ٹھٹھک کے رک گئی۔

''کہاں جارہی ہو راج کماری .....! دل توڑ کے.....'' پنڈت نے استہزائیہ لہجے میں بڑے بھونڈے پن سے کہا۔

''ہٹ جاؤ۔'' سنگیتا پھنکاری۔ ''مجھے جانے دو شیطان.....تم لوگ میری عزت تباہ کرنا چاہتے ہو؟''

''سنو.....'' وہ بولا۔ ''ہم تمہیں اس وقت تک جانے نہیں دیں گے جب تک ہم خوش نہ ہوجائیں۔''

''میں مرجاؤں گی تم لوگوں کے ارمان پورے نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولی۔ وہ سرخ ہوگئی۔

عین اس وقت پجاری نے کونے میں جو پلنگ تھا اس کے بستر کے نیچے سے ایک چاقو نکالا۔ پھر وہ پنڈت کے پاس آ گیا۔ پھر ان تینوں نے ہی بستر کے نیچے سے چاقو، چھرا اور خنجر نکالا اور اسے نرغے میں لے لیا۔

''تو نے میرے چہرے پر تھوکا ہے میں تجھے چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا۔'' پجاری نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''وہ تھر تھر کانپنے لگی اور اس کا چہرہ بے لہو ہوگیا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر ان ناگوں کو دیکھنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ غش کھا کر گرنے والی ہے۔

وہ چاروں اس کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ میں فوراً ہی کمرے میں گھس گیا اور کرخت لہجے میں بولا۔

''خبردار..... جو اس لڑکی کی عزت سے کھیلنے کی کوشش کی۔ اسے جانے دو.....''

''ارے یہ اوتار کہاں سے آ گیا.....؟'' پجاری نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''سنو.....'' پنڈت نے کہا۔ ''تم جس طرح آئے ہو۔ اس طرح لوٹ جاؤ..... ہمارے رنگ میں بھنگ مت ڈالو۔''

''میں سنگیتا کو یہاں سے لے جائے بغیر نہیں جاؤں گا.....'' میں نے بے خوفی سے کہا۔

''تمہیں اگر اس لڑکی کو لے جانا ہے تو تین چار گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔'' پنڈت بولا۔ ''پھر اس کے بعد لے جانا..... اس لئے کہ یہاں جو بھی عورت آتی ہے ہم اس سے دل بہلائے بغیر جانے نہیں دیتے ہیں۔''

''میں کسی قیمت پر اس کی عزت تباہ ہونے نہیں دوں گا۔'' میں نے تکرار کے لہجے میں کہا۔

''اور ہم ہر قیمت پر اپنی حسرت پوری کر کے رہیں گے۔'' پجاری نے غصے سے کہا۔ ''اگر تم باز نہیں آئے تو پھر ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے..... تمہیں مار کر کسی گڑھے میں دفن کر دیں گے۔''

''تم لوگوں کو نہ صرف شرم آنی چاہئے بلکہ ڈوب کر مرنا چاہئے۔'' میں نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ''تم لوگ لڑکیوں اور عورتوں کو فریب اور سبز باغ دکھا کر بلاتے ہو اور ان کی عزت سے کھیلتے ہو اور مندر، دیوی، دیوتاؤں کا تقدس پامال کرتے ہو..... میں یہ بات سنتا آیا تھا کہ تم لوگ گھناؤنا اور شرمناک کھیل کھیلتے رہے لیکن میں نے یقین نہیں کیا تھا..... لوگ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ آج اور ابھی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سن لیا..... اب کسی قیمت پر اس لڑکی اور مندر کی بے حرمتی ہونے نہیں دوں گا..... کسی نے مجھے لڑکی کو لے جانے سے روکنے کے کی کوشش کی تو اس کا حشر نشر کر دوں گا۔''

وہ چاروں میری بات سن کر ہنسے اور قہقہے مارنے لگے۔ سادھو مہاراج نے کہا۔

''یہ اکیلا اور نہتہ ہو کر بڑی اکڑ دکھا رہا ہے۔''

سادھو مہاراج نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کرو کہ اسے پکڑ کے اس کی مشکیں کس دو..... پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش جنگل میں لے جا کر پھینک دیتے ہیں تاکہ یہ درندوں کی غذا بن جائے..... اور اس لڑکی سے اس وقت تک دل بہلائیں گے جب تک ہم سب کا دل نہیں بھر جاتا.....''

پھر وہ چاروں لڑکی کو چھوڑ کر میری طرف بڑھنے لگے..... چاقو، چھرا اور خنجر لہراتے ہوئے تاکہ مجھے نرغے میں لے کر مجھے پکڑ کے میری مشکیں کس دیں..... سنگیتا کا خوف و دہشت سے برا حال تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی جارہی تھیں۔ وہ ساکت و جامد بت بنی کھڑی تھی۔ اس میں نہ تو اتنی طاقت تھی اور نہ ہی فرار کا راستہ تھا۔

میں گھبرایا نہیں اور نہ ہی خوف زدہ ہوا۔ میں نے اپنے حواس قابو میں رکھے اور ایسی کوئی چیز تلاش کرنے لگا جس سے میں مزاحمت اور مقابلہ کرسکوں۔ معاً میری نگاہ ایک لاٹھی پر پڑی جو دروازے کے پاس رکھی تھی۔ سب سے آگے پنڈت آیا تاکہ چھرے سے مجھے زخمی کردے۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کے جسم کے سب سے نازک اور حساس حصے پر لات رسید کی تو وہ تڑپ کر چیخا اور اپنے ساتھیوں پر الٹ کر گرا تو وہ بھی گر پڑے۔ اس کے ہاتھ سے چھرا چھوٹ گیا۔

مجھے سنہرا موقع اور مہلت مل گئی تھی۔ میں چاہتا تو لپک کر چھرا اٹھا سکتا تھا لیکن اس سے ان تینوں سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ چاقو اور خنجر سے میرا نشانہ لے کر زخمی کرسکیں۔ البتہ سنگیتا کے لئے فرار کا موقع مل گیا تھا۔

''سنگیتا.....! تم فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ..... میری چنتا نہ کرنا۔'' میں نے لاٹھی اٹھا کر کہا۔ ''میں ان سے نمٹ لوں گا۔''

سنگیتا پل بھر تذبذب میں رہی۔ وہ مجھے ان درندوں کے رحم و کرم پر چھوڑنا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ میری کوئی مدد کرنے سے قاصر تھی اس نے میرے ہاتھ میں جو چار فٹ لمبا، موٹا اور مضبوط لکڑی کا جو ڈنڈا لاٹھی نما تھا دیکھا تو وہ بجلی کی سی سرعت باہر لپک گئی۔

وہ چاروں فوراً ہی سنبھل کر کھڑے ہوگئے اور پنڈت نے چھرا بنا لیا۔ میں دروازے کے پاس کھڑا ہوگیا تاکہ کوئی سنگیتا کے تعاقب میں نہ جاسکے۔ پھر ان چاروں نے نفرت اور غصے سے اور مشتعل ہو کر پھر چاروں ستون گھیرے میں لینے کے لئے بڑھنے لگے تو میں نے ڈنڈا فضا میں لہرایا..... میری بدقسمتی تھی کہ ڈنڈا میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دوبارہ جا گرا۔

وہ چاروں ہنسنے اور قہقہے مارنے لگے تو پنڈت نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

''تم تینوں اس حرام زادے سے نمٹو اور دوڑ کر جاتا ہوں تاکہ لڑکی کو پکڑ کے لاؤں وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔''

''پنڈت جی.....! اس زحمت کی کوئی ضرورت نہیں..... تم لوگوں کی حسرت پوری نہیں ہونے کی.....''

یہ ایک نسوانی مانوس سی آواز تھی..... نہ صرف میں بلکہ وہ چاروں بھی حیران اور پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے تھے۔ اس آواز کو میں ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ یہ رانی پونم کی آواز تھی۔ وہ حاضر لیکن غائب تھی۔

پھر وہ ڈنڈا خود بخود حرکت میں آیا اور فضا میں بلند ہوا۔ دوسرے لمحے صرف مجھے رانی پونم نظر آئی۔ ان لوگوں کو نہیں..... اس نے ڈنڈا ہاتھ میں تھاما ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا میں انہیں جان سے ماردوں؟''

''جو تمہارا آ گیا.....'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''یہ ناسور ہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں ایسا معذور اور اپاہج کر دیا جائے کہ وہ کسی لڑکی عورت کی عزت تباہ کرنا در کنار اسے چھو بھی نہ سکیں۔ ان ناگوں نے نہ جانے کتنی لڑکیوں، عورتوں کی عزت اجتماعی طور پر تباہ و برباد کی ہے۔''

''ہاں..... میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ یہ دنیا والوں کی نظروں میں نشان عبرت بن جائیں..... ان کا حشر نشر دیکھ کے وہ لڑکیاں اور عورتیں خوش ہوجائیں گی۔ جنہیں ان درندوں نے جی بھر کے پامال کیا۔''

وہ چاروں دہشت زدہ ہو کر میری اور رانی پونم کی گفتگو سن رہے تھے..... پھر رانی پونم ان چاروں پر ڈنڈا لے کر ٹوٹ پڑی..... اس نے ان کے ہاتھ پیر اور ہڈیاں توڑ کر انہیں اپاہج اور معذور کر دیا۔ ان کی دلی خواہش چیخوں سے مندر گونج اٹھا تھا۔ کوئی نہ تو ان کی چیخیں سننے

۱۱۱ اور مدد کو آنے والا بھی نہیں تھا۔ وہ چاروں ورد اور لطیف کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ رانی پونم ان کا تیا پانچہ کر کے میرے پاس آئی اور بولی۔

''مجھے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میرا وچن نبھایا..... ایک لڑکی کی عزت بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دی..... میری آتما نے دیکھا کہ تمہاری جان خطرے میں ہے تو میں تمہاری مدد کے لئے چلی آئی۔''

''کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہا ہوں.....؟'' میں نے حیرت اور خوشی سے دیکھا۔

''نہیں..... یہ ایک حقیقت ہے..... تم سنگیتا یا کسی کو بھی اعتماد میں لے کر میرے بارے میں نہیں بتانا..... کوئی تمہاری اس بات پر یقین نہیں کرے گا..... یہ واقعہ راز میں رہے۔''

اس نے پھر میرے قریب آ کر میرے گلے میں اپنی سڈول، مرمریں اور عریاں بانہیں حمائل کر دیں اور میرے چہرے پر جذباتی انداز سے جھک گئی۔ پھر ہم دونوں بڑی دیر تک دنیا و مافیہا سے بے نیاز رہے۔

جب میں وہاں سے نکل کر واپس جا رہا تھا یہ سب کچھ ایک سپنا سا لگ رہا تھا..... اور واہمہ اسے واہمہ سمجھنے سے میرا ذہن قاصر تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک آتما تھی۔ اور پھر اس کا لمس اور ہونٹوں کی مٹھاس میرے ہونٹوں میں جذب لگ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہے ہو انیل.....!'' کویتا کی آواز مجھے سوچوں کی دنیا سے نکال لائی۔ ''یہ وقت سوچنے اور فیصلہ کرنے کا نہیں ہے۔ لمحہ لمحہ قیمتی اور اہم ہے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ۔ مجھے تمہاری جان اپنی جان کی طرح عزیز ہے۔''

''کویتا.....! تم نے میری خاطر اپنی جان داؤ پر لگا دی.....'' میں نے کہا۔

''تم جتنا جلد ہو سکے اس شہر اور ملک سے نکل جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو..... میرے لئے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں'' میں نے سر ہلایا۔

''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا.....'' اس نے کہا۔ ''ریل گاڑی، بس یا ہوائی جہاز سے سفر نہیں کرنا۔''

''وہ کس لئے.....؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اس میں حرج کیا ہے؟''

''اس لئے کہ باس نے موبائل فون پر اپنے تمام آدمیوں کو تمہارے بارے میں بتا دیا کہ تم فرار ہونے کی کوشش کرو گے..... کسی بھی بہروپ میں..... لہٰذا رات دن تمہاری کڑی نگرانی کی جائے۔'' کویتا نے بتایا۔

''پھر میں اس صورت میں کس راستے سے فرار ہوں؟ کس طرح سے.....؟'' میں نے سراسیمگی سے پوچھا۔

''تم گھاٹ پر جاؤ..... وہاں سے موٹر بوٹ لے کر ہندوستان کی طرف نکل جاؤ..... میرے خیال میں ہر طرح سے کولکتہ تمہارے لئے محفوظ ترین شہر ہوگا..... گو کہ سفر لمبا ضرور ہے لیکن راستے میں دو تین غیر معروف آتے ہیں۔ وہاں ٹھہر کر اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہو۔

''کویتا.....! تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میرے پاس اتارنے کے لئے.....''

''انیل.....! تم نے جو میری بہن کی عزت بچائی ہے نہ صرف اس وجہ سے بلکہ اس لئے بھی کہ بابو اتم مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہتے تھے..... کیا میں تمہاری خاطر اتنا بھی نہیں کر سکتی؟ بہر حال یہ وقت ان باتو کا نہیں ہے انیل.....!''

☆.....☆.....☆

کویتا نے ایک اور بڑا زبردست خطرہ مول لیا تھا جو اسے کسی قیمت پر نہیں لینا تھا۔ کیوں کہ دیکھا جائے تو اسے یہ خودکشی کہی جائے تو بے جا نہ تھا۔

اس نے اپنی گاڑی میرے گھر سے قدرے ہٹ کر ایک نیم اندھیری گلی میں کھڑی کی اور گھر تک آئی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی میں مجھے بندرگاہ کے قریب چھوڑا۔ اس وقت وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ ویران اور سنسان جگہ تھی اور ہر طرف وحشت برس رہی تھی اور ایک نامعلوم سا خوف محسوس ہوتا تھا۔ خیر میں تو عادی تھا لیکن

ایک عورت نہیں ہوسکتی تھی، کویتا غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کے اعصاب بڑے مضبوط تھے۔ کوئی اور لڑکی اس کی جگہ ہوتی تو وہ رات کے اس سے آنے کی ہمت نہیں کرتی۔

''اچھا دوست.....!'' اس نے گاڑی سے اترنے کے بعد مجھ سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

''کویتا.....! میں بہت سی یادیں لے کر جارہا ہوں۔ کاش! میری مخبری نہ ہوئی ہوتی۔''

''میں خود بھی یہی چاہتی تھی کہ نریندر کا گروہ کیفر کردار تک پہنچے.....'' وہ بولی۔ ''ویسے مجھے توقع ہے کہ انسپکٹر سریندر کپور کے ہاتھوں نریندر کے گروہ کا قلع قمع ہوجائے گا..... اس لئے کہ وہ صرف بڑا بہادر اور ایک عظیم پولیس افسر ہے۔ بکنے والا نہیں..... اس کا ضمیر کوئی خرید نہیں سکتا۔ ایسا شخص ہی مافیا سے ٹکرا سکتا ہے..... لیکن اس کام میں وقت لگے گا۔ کیوں کہ یہ مافیا بڑی منظم ہے۔''

''یہی بات انسپکٹر سریندر کپور نے مجھ سے کہی تھی جو تم کہہ رہی ہو؟'' میں نے تائیدی لہجے میں کہا۔

پھر وہ مجھ سے بڑے دوستانہ اور جذباتی انداز سے رخصت ہو کر گاڑی میں جا بیٹھی۔ میں اس وقت تک کھڑا اس کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نگاہوں سے اوجھل نہ ہوگئی۔ لیکن وہ دل سے اوجھل نہ ہوسکی۔ میری آنکھیں نمناک سی ہوگئیں۔

پھر میں ٹرمنل پر اس جگہ پہنچا جہاں نریندر کی لانچیں اور موٹر بوٹس کھڑی ہوئی تھیں۔

میں نے ایک چھوٹی مگر جدید ترین اور تیز رفتار موٹر بوٹ لی جس میں چپو بھی رکھے ہوئے تھے۔ چپو اس لئے تھے کہ فیول ختم ہونے اور انجن کی کسی خرابی کے سبب موٹر بوٹ نہ چل سکے تو ان سے کام لیا جاسکے۔ میں نے اچھی طرح سے دیکھ اور اطمینان کرلیا کہ وہاں کوئی موجود تو نہیں ہے جو میری نقل و حرکت چھپ کر دیکھ رہا ہو۔ اتفاق سے وہاں کوئی نہ تھا۔ میری قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ پھر میں نے دیر نہیں کی کہ شاید کوئی پہرہ دار گشت کرتا ہوا ادھر آ نکلے.....

مجھے نہ صرف موٹر بوٹ بلکہ لانچ بھی چلانا آتا تھا۔ میں منشیات کی اسمگلنگ کے لئے نہیں استعمال کرتا تھا۔ میں صبح ہونے تک اس شہر سے بہت دور نکل آیا تھا۔ مجھے عجلت میں کھانے پینے کی چیزیں لینے کا بالکل بھی خیال آیا تھا۔ اور نہ کویتا کو بھی..... ورنہ وہ میرے لئے بہت کچھ لے آتی..... اصل میں کویتا کو اور مجھے اپنی جان پیاری تھی۔ کویتا نے چلتے وقت مجھے بسکٹ کا ایک ڈبا اور جو منرل واٹر کی ایک بوتل جو اس کی گاڑی میں موجود رہتی تھی مجھے دے دی تھی۔ دوپہر تک بسکٹ ختم ہوچکے تھے اور پانی کے چند گھونٹ رہ گئے تھے۔ دور دور تک کوئی جزیرہ اور ساحل نظر نہیں آیا تھا جہاں میں کچھ دیر آرام کرتا اور ستا لیتا۔

رات جیسے تیسے گزر گئی۔ مجھے سنگیتا، مندر اور وہ چاروں ناگ یاد آتے رہے جو سنگیتا کی بے حرمتی کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ رانی پونم کی آتما نہ آتی تو میں ان کے ہاتھوں سے خود کو شاید ہی بچا پاتا..... ڈنڈا ہاتھ میں آ گیا تھا جس سے میں ان پر قابو پالیتا اور ان کا وہی حشر نشر کرتا جو رانی پونم نے کیا تھا۔

دوسرا دن طلوع ہوا تو وہ میرے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ صبح ہی مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ ساون بھادو باراں کے ساتھ طوفان شروع ہونے والا ہے۔ عجلت میں مجھے فیول چیک کرنا یاد نہیں رہا تھا۔ اور پھر فیول کل شام ہی ختم ہوچکا تھا۔ چپو چلاتے چلاتے میرے بازو شل ہوچکے تھے اور پانی کے چند گھونٹ رہ گئے تھے۔ دور دور تک کوئی ساحل اور جزیرہ نظر نہ آتا تو میں چپو کشتی میں رکھ کر لیٹ جاتا۔ پھر کشتی کو لہروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا۔ مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میری بوٹ کی سمت جارہی ہے..... ؟ اس کی منزل کون سی ہے؟

سہ پہر کے وقت میری حالت ایک مردے سے بھی بدتر تھی۔ بھوک پیاس نے مجھے نڈھال کردیا تھا۔ گرمی اس قدر تیز تھی کہ پیاس سے برا حال ہورہا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ سمندر کا پانی بہت ہی کھارا تھا۔ وہ پینے کے قابل ہرگز نہیں تھا۔ پھر کوئی غلطی سے دو ایک گھونٹ پی لے تو اس کے معدے کا سارا نظام الٹ جاتا تھا اور انتڑیاں زہر آلود ہوجاتی تھیں اور قے ہوجاتی..... کلی کرتے ہوئے بھی ڈر سا لگ رہا تھا۔

میں جاں بلب ہورہا تھا کہ غشی نے مجھے دبوچ لیا۔ پھر میں نے کچھ دیر بعد اپنے ہونٹوں پر شہد آگیں لب محسوس کئے جس سے میں نے زندگی اور توانائی محسوس کی..... ایک آوارہ سا خیال غشی دور ہونے کے بعد آیا کہ کیا یہ رانی پونم کی آتما تھی.....؟ وہی لمس اور مٹھاس..... وہ مجھے پراسرار انداز سے میرے خشک ہونٹوں کو سیراب کرگئی تھی۔ ورنہ شاید میں جان دے دیتا..... میں بڑی دیر تک تازہ دم سا رہا۔ اور پیاس بالکل بھی محسوس نہ ہوئی۔ گویا وہ میری ہم سفر تھی اور میرا خیال رکھ رہی تھی۔ یہ امر طمانیت بخش تھا۔

پھر میں نے سوچا کہ نہیں وہ میری ہم سفر نہیں ہے تو یہ خیال نفی ہوا۔ وہ ظاہر کیوں نہیں جیسا کہ مندر میں ہوئی تھی۔ یہاں ہے کون میرے ساتھ..... وہ نظر آسکتی تھی.....؟ میں نے شاید غشی کی حالت میں ایسا محسوس کیا ہے۔ میں الجھ سا گیا۔ عجیب سے مخمصے میں پڑ گیا۔ میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ خواب کی حالت میں بہت کچھ محسوس ہوجاتا ہے۔ لیکن وہ مندر میں صرف میرے سامنے ظاہر ہوئی تھی۔ اس نے ڈنڈے کو جادو کا ڈنڈا بنادیا تھا۔ اگر ان چاروں کی ہڈیاں پسلیاں ایک نہ ہوجاتیں تو میں اسے ایک خواب ہی سمجھتا..... اور پھر اس کا جذباتی اور خود سپردگی سے اپنے آپ کو میرے حوالے کردینا اور اس کا لمس اور ہونٹوں کی مٹھاس؟ میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کی آتما سچ مچ انسانی روپ میں آ گئی تھی۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا؟

میں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا کہ ایک دم سے مجھے نریندر کا خیال آیا کہ کہیں اس کے آدمی میری تلاش میں نہ نکل آئیں؟ جب وہ کسی کا جانی دشمن بن جاتا تھا تو ان کی جان لئے بغیر چپ نہیں بیٹھتا تھا اور اس کی موت کے درپے ہوجاتا..... اس کے نزدیک مخبری اور غداری سنگین اور ناقابل معافی جرم تھے۔ وہ اپنے دشمن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا اور اس وقت چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ جب تک اسے زمین میں زندہ گاڑ کر اس کی سمادھی بنادے۔ میں اس لئے اس کا بدترین دشمن بن چکا تھا کہ جلتی پر تیل گرادیا تھا۔ اس کے ممبروں کی فہرست انسپکٹر سریندر کپور کو حوالے کردی تھی۔

میں نے دل میں سوچا کہ..... نریندر کو اس بات کا علم ہوچکا ہوگا کہ میں سمندر کے راستے موٹر بوٹ سے فرار ہوچکا ہوں۔ ایک نئی اور جدید ترین موٹر بوٹ گم پا کر اس کے آدمیوں نے اسے اطلاع دے دی ہوگی..... اس کے آدمی اس لئے میرے تعاقب میں نہیں آئے تھے کہ ان کے علم میں شاید یہ بات تھی کہ کسی وجہ سے اس میں فیول کم تھا۔ میں زیادہ دور نہیں جاسکوں گا۔ کیوں کہ جو جزیرہ اور ساحل تھا وہ دور دراز تھا۔ سمندر اور یہ سر میرے لئے دردناک موت کا باعث ہوگا۔ میں کتنی دور تک چپو چلا کر جاسکتا ہوں۔ گرمی، دھوپ اور حبس..... اور بھوک پیاس فرشتہ اجل ثابت ہوگی۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ میں بھوک اور پیاس کی شدت کے باعث لمحہ بہ لمحہ قریب ہوتا جارہا تھا۔ رانی پونم کی آتما کے بجائے تصور میں فرشتہ اجل میری نظروں کے سامنے مسکراتا دکھائی دیتا تھا وہ مجھے جیسے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔ میں نے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے پکارا۔

''رانی پونم.....! تم کہاں ہو.....؟ میری حالت کیا تمہاری نظروں میں نہیں ہے؟''

مجھے نہ تو اس بات کا جواب ملا اور نہ ہی وہ آئی۔

جب میرے لئے پیاس کی شدت ناقابل برداشت ہوگئی تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ سمندر کا پانی کسی زہر سے کم نہیں ہے تو میں نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر پی لیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔

پانی حلق میں پہنچا بھی نہیں تھا کہ بڑے زور کی ابکائی آئی اور میں نے قے کردی۔ قے ہوتے ہی میں مزید نڈھال اور اس طرح سے بے دم ہوگیا جیسے مجھے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیا۔ مجھ پر موت کی سی غنودگی طاری ہونے لگی۔

سمندر میں تیز ہوائیں چلنے کی وجہ سے لہروں میں طغیانی آنے لگی..... آسمان پر گہرے گہرے سیاہ بادل چاروں سمتوں کے افق سے تیزی سے چھانے لگے تو گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ مجھے کسی سمت اور سامنے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

مجھے صرف اتنا یاد رہا کہ ایک بڑی لہر نے کشتی کو اس طرح اوپر اٹھالیا جس طرح ایک پہلوان اپنے حریف کو پھینکنے کے لئے اوپر اٹھالیتا ہے۔ پھر اس لہر نے ایک کھلونے کی طرح پھینک دیا۔ مجھے لگا کہ میں سمندر کی تہہ میں نہیں بلکہ موت کی آغوش میں جارہا ہوں.....!

☆.....☆.....☆

معلوم نہیں میں کب تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہا تھا۔

جب مجھے ہوش آنے لگا تو سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ میں قبر نما گڑھے میں لیٹا ہوا ہوں۔

پھر میں نے ایک گہری سانس لی۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو آنکھیں کھول نہ سکیں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ میں کسی نرم و گداز اور مرمریں جسم کی آغوش میں ہوں اور میرے چہرے پر گرم گرم سانسوں کی تمازت جھلسا دے رہی ہے..... مجھے رانی پونم کا خیال آیا یہ اس کی آتما ہے اور میں اس کا قرب اور لمس محسوس کررہا ہوں۔ یہ خام خیال ثابت ہوا۔ اگر وہ ہوتی تو میرے چہرے پر جھک کر نہ صرف میرے ہونٹوں کی پیاس بجھا دیتی بلکہ سارے جسم میں توانائی بھر دیتی اور مجھ سے سرگوشی کرتی اور مصیبت سے نکال دیتی۔

کہیں میں عالم بالا میں تو موجود نہیں ہوں۔ چوں کہ میرے ذہن پر رانی پونم کا خیال سوار ہے۔ اس لئے میں اس کا قرب اور لمس سا محسوس کررہا ہوں۔ میں ریت پر لیٹا ہوا ہوں اور میرے منہ پر دھوپ پڑ رہی ہے۔ پھر میں نے اتنی سکت اور توانائی سی محسوس کی کہ آنکھیں کھول سکوں۔

میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی منوں بھاری پلکیں اوپر اٹھائیں تو میرا خیال درست ثابت ہوا۔ میں ایک مندر کے کنارے لیٹا ہوا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھنے کے لئے اپنی طاقت مجتمع کررہا تھا کہ ایک بڑی سرکش موج آئی اور اس نے مجھے اپنی آغوش میں لے کر مزید دور پھینک دیا۔ چند ثانیوں کے بعد اس سے بھی ایک بڑی سرکش موج کسی عفریت کی طرح آئی تو میں کسی نہ کسی طرح ہمت کرکے اٹھا کہ کہیں یہ سوچ مجھے واپس سمندر میں نہ لے جائے اور ڈبو دے۔ پھر میں چند قدم چل کر نقاہت سے گر پڑا۔ لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہ تھی۔ کیوں کہ اب میں سمندر کی موجوں کی دسترس سے باہر تھا اور بڑی سے بڑی موج یہاں تک آرہی تھی اور نہ ہی آسکتی تھی۔ پھر مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی تو میں اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ ریت پر گر پڑا۔

میں نے اپنے چہرے پر ایک عجیب سی مہک اور سارے جسم میں فرحت بخش سی تپش محسوس کی۔ پھر میرے کانوں میں رانی پونم کی درد بھری آواز لہرائی۔

''انیل.....! تم حوصلے اور ہمت سے کام لو..... میری آتما بار بار آنے سے رہی..... لیکن وچن دیتی ہوں کہ میں کسی افتاد کے وقت تمہاری سیوا کے لئے آنے کی کوشش کروں گی۔ کیوں کہ تم جانتے ہو کہ دنیا میں کتنی بدی ہے بلکہ روز بروز بڑھتی جارہی ہے..... اس کا شکار زیادہ تر عورتیں ہیں..... وہ درندوں کا شکار بنتی رہتی ہیں..... لیکن زیادہ تر دوش لڑکیوں عورتوں کا ہے..... کیوں کہ وہ جسمانی نمائش کرتی پھرتی ہیں..... درندہ صفت مرد جو کسی بھیڑیے سے کم نہیں ہوتے ہیں انہیں اس حالت میں دیکھ کر رال ٹپکاتے ہیں.....''

میں نے غشی کی سی حالت میں کہا۔ ''رانی پونم..... ! تم جانتی ہو میں یہاں فرار ہوکر کیوں آیا ہوں.....'' میں نے کہا۔

''ہاں.....'' اس نے میرے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا تو وہ سرد ہورہے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''تم آتما ہوکر بھی مرئی حالت میں نہیں ہو..... میں تمہارا سرد جسم اور لمس محسوس کررہا ہوں.....''

من کے دیوتا نے مجھ پر بہت ساری طاقتیں دی

ہیں..... میں مرکر بھی امر ہوں..... میں چاہے کسی بھی روپ اور حالت میں آسکتی ہوں..... ہر آتما کو یہ صلاحیت نہیں دی جاتی ہے۔''

''مجھ پر غشی طاری ہے..... لیکن میں تمہاری آواز سن رہا ہوں۔ قرب اور لمس محسوس کررہا ہوں..... لیکن اتنی ہمت نہیں ہے کہ آنکھیں کھول سکوں..... تمہیں دیکھ سکوں..... مجھے شکتی دو کہ میں تمہیں دیکھ سکوں۔''

''میں نہیں چاہتی کہ تم مجھے اس حالت میں دیکھو..... میں کچھ نہیں کہہ سکتی..... شاید تم بہک جاؤ..... میں تمہیں شکتی دے کر جارہی ہوں..... اپنا منہ کھول دو..... میں تمہارے منہ میں چند قطرے ٹپکانا چاہتی ہوں۔''

میں باوجود کوشش کہ آنکھیں نہ کھول سکا۔ البتہ میں نے اپنی زبان پر چند گرم گرم قطرے محسوس کئے جو حلق میں جذب ہونے لگے..... پھر میں بے ہوش سا ہوگیا۔

جانے کتنی دیر تک غشی طاری رہی اور میں دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا رہا۔ اس وقت تک جب دن چڑھ نہیں آیا تھا۔ جب غشی سے نکل کر ہوش میں آیا تو دن پوری طرح نکلا ہوا تھا۔ رانی پونم موجود نہیں تھی لیکن اس نے میرے حلق میں جو امرت ٹپکایا تھا اس سے میں توانائی محسوس کررہا تھا۔ پھر میں اٹھ بیٹھا۔ آسمان کے سینے پر اور کسی افق پر بادل کا ٹکڑا تک نہ تھا۔ صاف و شفاف نیلا آکاش بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سمندر کے کنارے سفید براق پرندے فضا میں پرواز کررہے تھے۔

میں نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ساحل کی لمبائی ایک میل سے زیادہ ہوگی۔ ایک طرف چٹانیں تھیں اور دوسری طرف ناریل، سپاری اور تاڑ کے درخت تھے۔ مجھے خیال آیا کہ میں کہیں سری لنکا کے کسی جزیرے پر تو نہیں آگیا.....؟ میں کوئی دو تین مرتبہ اسمگلنگ کی غرض سے بڑی لانچ لے کر کولمبو جاچکا تھا۔ سری لنکا جزائر کا ملک تھا۔ لیکن تیز رفتار لانچ میں چار دنوں کی مسافت تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ میں سری لنکا کی حدود میں واقع کسی جزیرے پر پہنچ گیا ہوں اور رانی پونم کی آتما نے جادو کے زور سے پہنچا دیا ہو۔ یہ میرا ایک قیاس تھا۔

یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہوگئے اور رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ مجھے سمندر کی موجوں نے اپنی چٹانوں کے درمیان سے پھینکا تھا۔ اگر میں کسی ایک چٹان سے بھی ٹکرا جاتا تو میرے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں معجزانہ طور پر شاید اس لئے بچ گیا تھا کہ میری کوئی نیکی کام آگئی تھی۔ یا پھر رانی پونم کی آتما نے مجھے ان کی زد میں آنے سے بچایا تھا۔

ابھی تک میرے حواس قدرے معطل تھے۔ میں نے قدرے بلندی پر کھڑے ہوکر متلاشی نظروں سے چٹانوں کے درمیان دیکھا کہ شاید وہاں میری موٹر بوٹ موجود ہو..... وہاں اور نہ ہی سمندر میں اس کا کوئی نام و نشان نظر آیا..... نجانے وہ کس سمت نکل گئی تھی.....؟ یا پھر چٹانوں سے ٹکرا کے اس کے پرخچے اڑ گئے ہوں۔ اب میں اس جزیرے کا قیدی ہوکر رہ گیا تھا۔ اب صبر کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔ میں بے بس سا ہوکر رہ گیا۔

اب جو بھی سنگین اور خطرناک قسم کی صورت حال تھی اس سے نمٹنا تھا۔ حالات سے نبرد آزما ہونے کے لئے میں جیسے اٹھ کھڑا ہوا تھا کیوں کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اب وہ کم زوری اور نقاہت نہیں تھی جس کا غلبہ میں نے کچھ دیر پہلے غشی کی حالت میں محسوس کیا تھا۔ رانی پونم نے امرت کے جو چند قطرے منہ میں ٹپکائے تھے اس کے کارن توانائی سی محسوس ہورہی تھی اور جسم میں کچھ حرارت سی آگئی تھی۔

میں چند لمحوں کی سوچ و بچار کے بعد درختوں کی سمت چل پڑا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میرے پیروں میں کوئی کمزوری محسوس نہیں ہورہی ہے تو میں نے اپنی رفتار قدرے تیز کردی۔ میں نے جنگل کی حدود میں قدم رکھا تھا کہ دفعتاً خاموش فضا میں دور سے ایک آواز آتی سنائی دی اور میں ایک دم سے اچھل کر چوکنا ہوگیا تھا۔

کیوں کہ یہ آواز ہیلی کاپٹر کی تھی اور میں اس کی آواز سے آشنا اور مانوس تھا۔

نریندر کے پاس تین ہیلی کاپٹر تھے۔ تو اسمگلنگ اور اسلحہ کی ترسیل کے لئے آسام، ہندوستان اور بنگلہ دیش کی سرحد کے قریب اتارے جاتے تھے۔ میں گھنے درختوں کے پیچھے جا چھپا..... ہیلی کاپٹر کم بلندی پر پرواز کرتا ہوا کنارے پر اتر گیا۔ اس میں سے دو مسلح بدمعاش اترے..... ان میں سے ایک کے ہاتھ میں جدید ترین امریکی ساخت کی دوربین رائفل تھی..... جو کیلاش تھا اور موتی تھا۔ موتی کے ہاتھ میں ایک شارٹ گن تھی۔ موتی دشمن کی گردن میں لوہے کا تار ڈال کر اسے بل دے کر اس کی جان لے کر بڑی خوشی محسوس کرتا تھا۔ وہ دونوں تھوڑی دیر کھڑے جائزہ لیتے رہے۔ پھر ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ پھر ہیلی کاپٹر اڑا اور شمال کی جانب نیچی پرواز کرتا ہوا چلا گیا۔

نریندر کو میری تلاش تھی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ میں نے انسپکٹر سریندر کپور کو گروہ کے بارے میں کیا کچھ بتایا؟ پھر وہ مجھے موت کی نیند سلا دینا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے واپس جانے سے میری جان میں جان آئی۔ پھر ایک بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہ جزیرہ بنگلہ دیش میں چٹا گانگ کے قریب ہے۔ سری لنکا کی حدود میں نہیں ہے۔

پھر میں اس چٹان کی طرف بڑھ گیا۔ جو سب سے اونچی تھی جہاں سے اس علاقے کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ چاروں طرف ایک گہرا سناٹا مسلط تھا۔ فضا میں چرند پرند نغمہ سرا تھے جس سے ایک حسن سا پیدا ہو گیا تھا۔

اب چوں کہ کسی بات کا کوئی ڈر، خوف اور خطرہ نہیں رہا تھا لہٰذا میں اس لئے بے فکر ہو کر چٹان پر چڑھنے لگا۔ پھر بھی چوکنا تھا کہ کہیں ہیلی کاپٹر دوبارہ واپس نہ آ جائے۔ اس جزیرے پر آبادی کا امکان تھا لیکن ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دیئے۔ پھر بھی میں اپنی تسلی کرنے کے لئے دیر تک جائزہ لیتا رہا۔ میں عجلت کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جب مجھے کوئی مکان یا آبادی نظر نہ آئی تو پھر میں چٹان سے اتر کے ایک سمت چل پڑا۔

چند قدموں کی مسافت طے کی تھی کہ مجھے ایک جگہ کالے انگور کی بیل دکھائی دی۔ یہ جنگلی انگور تھا۔ چوں کہ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھنے لگ رہے تھے اس لئے میں نے ایک انگور توڑ کے اس پر پھونک مار کے صاف کیا اور اسے چوسا۔ وہ بے رس سا تھا اور اس میں اتنا رس نہیں تھا کہ جو پیاس بجھا سکے لیکن پھر قدرے حلق تر سا ہو گیا۔

میں نے ایک راستہ دیکھا جو چٹان سے جا رہا تھا..... یہاں شاید کبھی لوگوں کی مدد رفت رہی ہوگی جس سے یہ راستہ سا بن گیا تھا۔ یہ راستہ کوئی دو سو گز آگے جا کر بائیں جانب مڑ گیا اور قدرے اوپر کی جانب چلا گیا تھا۔ جب میں اس بلندی پر پہنچا تو خاصے فاصلے پر قدرے اونچائی پر ایک مکان نظر آیا جس میں ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ چار کمرے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ مکان کچھ زیادہ قدیم نہ تھا..... اس مکان کے اردگرد میدان تھا اور جنگل سے خاصے فاصلے پر تھا۔

میں تھوڑی دیر تک کھڑا اس مکان کا جائزہ لیتا رہا۔ اس خیال سے بھی کہ اس میں کوئی رہتا ہو وہ یقیناً باہر ضرور آئے گا۔ لیکن یوں باہر سے کوئی اندر جاتا دکھائی نہیں دیا۔ مجھے اس مکان میں زندگی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے۔ میں نے مکان کے اطراف کا دور تک جائزہ لیا۔ شاید اس مکان کا رہائش کسی کام سے باہر گیا ہو اور شاید وہ آتا ہوا دکھائی دے۔ دور دور تک کسی آدم زاد کا نام و نشان نہ تھا۔

میں نے پھر مکان پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیں۔ اندر سے ویرانی اور گہری خاموشی جھانک رہی تھی۔ جیسے یہ مکان آسیب زدہ ہو۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ لگتی تھی۔ تاہم میں پھر بھی محتاط اور چوکنا تھا..... مکان اور برآمدے کی کھڑکیوں میں سے اندر جھانکتا ہوا اس کی طرف دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ دو ایک کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ میں اپنی مزید تسلی کے لئے اس کے عقبی حصے کی طرف گیا۔ عقبی دروازہ بند تھا۔ پھر گھوم پھر کے برآمدے میں آیا تو ہولناک سکوت ڈسنے لگا۔

اندر گھستے ہوئے مجھے ایک ان جانا سا ڈر اور خوف محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی موجود ہے جو میرے داخل ہوتے ہی وہ مجھے دبوچ لے گی۔ سامنے والے دروازے پر ایک ٹوٹی ہوئی بائیسکل پڑی تھی۔ اس کے قریب ٹوٹی ہوئی تپائی اور بید کی کرسی بھی پڑی تھی..... پھر میں اور بڑے محتاط انداز سے دبے پاؤں بڑھا اور ایک کمرے کی کھڑکی میں سے اندر جھانکنے لگا کہ شاید اندر کی آواز سنائی دے۔ لیکن اندر جو سکوت تھا وہ اس قدر ہیبت ناک تھا کہ اندر قدم رکھنے کی بالکل بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اندر موجود لوگوں نے میری آہٹ پا کر اپنی سانسیں روک لی ہیں اور شاید وہ لوگ مسلح بھی ہو گئے ہوں گے۔ پھر اچانک محسوس کر کے۔ اگر انہوں نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوئی کوشش کی تو اس صورت میں میرا ردعمل کیا ہوگا.....؟ کیا میں انہیں بتاؤں کہ میں کشتی میں چٹا گانگ جا رہا تھا کہ وہ الٹ گئی اور سمندر میں ڈوب گئی۔ میں بڑی مشکل سے تیرتا ہوا اس جزیرے پر پہنچا ہوں۔ معلوم نہیں وہ میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں؟

میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کبھی کسی خوف کو قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا اور خطرات کا ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس خالی مکان نے میرے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے جنم دے دیئے تھے اور میرے پیروں میں نادیدہ سی بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ چوں کہ بے حد پراسرار سا لگ رہا تھا اس لئے اندر جانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

میں نے اس کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر جو کھلا ہوا تھا اونچی آواز میں پوچھا۔

''کیا اندر کوئی ہے؟''

میری آواز اندر کے کمروں میں گونج گئی۔ کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر میں نے پہلے سے بھی بلند آواز میں کہا۔

''کوئی اندر ہے تو باہر آ جائے..... میں ایک اجنبی مسافر ہوں۔''

دوسری مرتبہ بھی جواب نہیں ملا تو میں نے غصے سے دروازہ پیٹ ڈالا۔

''آپ لوگ نہ تو جواب دے رہے ہیں اور نہ ہی باہر آ رہے ہیں۔''

اب مجھے پوری طرح اندازہ ہو گیا کہ مکان کے اندر کوئی نہیں ہے اور وہ سنسان اور ویران سا ہے۔ اگر کوئی ہوتا تو جواب ضرور ملتا یا پھر وہ ضرور باہر آتا۔ اسے کسی اجنبی مسافر سے ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوتا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر مکان کے باہر کے ماحول اور اطراف کا سرسری سا جائزہ لیا۔ پھر دوسرے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ معاً میری نگاہ ایک درمیانہ سائز کے ٹین کے کنستر پر پڑی۔ قریب جا کر دیکھا تو وہ بارش کے صاف و شفاف پانی سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے یہ کنستر یہاں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے کنستر اٹھا کر منہ سے لگایا۔ وہ میٹھا اور فرحت بخش ہی تھا۔ سمندر کا ہوتا تو کھارا ہوتا..... اس کا ایک گھونٹ بھی حلق سے اتارا نہیں جا سکتا تھا۔

پانی پینے کے بعد میں نے اپنا واہمہ دور کرنے کے لئے پھر ایک بار مکان کے گرد چکر لگایا۔ پھر برآمدے کی طرف آ گیا۔

مجھے اس مکان کے بائیں جانب قریب ہی پھولوں کی کیاریاں نظر آئیں۔ یہاں شاید پھولوں کے دل دادہ لوگ رہتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں اور کہاں چلے گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں دہشت گرد پکڑ کر لے گئے ہوں.....؟ یا پھر دہشت گردوں کے خوف سے بھاگ نکلے ہوں.....؟ میں مکان کے اندر جانے سے پہلے پھر ایک بار اس کا باہر سے جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ شاید کوئی جو مجھے دیکھ کر کہیں چھپا ہوا ہو..... مکان کے اندر کہیں بھی..... اچانک میرے سامنے مسلح ہو کر نہ آ جائے۔ یوں بھی یہ مکان ہر لحہ میرے لئے ایک طرح سے پراسرار سا ہونے لگا تھا۔ میں کسی صورت میں عجلت کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی احتیاط کا دامن چھوڑنا چاہتا تھا۔

اس مکان سے قریب ایک اور چٹان تھی۔ میں وہاں گیا تو اس کے عقب میں مجھے کچھ دور جھونپڑیاں دکھائی دیں اور ان سے تھوڑی دور سمندر دکھائی دیا۔ وہاں چھوٹی سی بندرگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ جھونپڑیاں ماہی گیروں کی ہوسکتی تھیں۔ میں نے ان جھونپڑیوں کے پاس جاکر انہیں دیکھا۔ وہ غیر آباد تھیں اور ان میں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہاں مجھے ایک کشتی بھی دکھائی دی۔ یہاں جو لوگ کسی وجہ سے اس جزیرے سے چلے گئے تھے گو کہ ان کے یہاں سے جانے کی وجہ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن پھر ایک خیال آیا کہ کوئی بھی جزیرہ یا بستی اس وجہ سے چھوڑ جاتا ہے کہ کوئی خون خرابہ ہوا ہو..... یہ خونی جزیرہ بن گیا ہوگا۔ لیکن یہ بات یقینی طور پر کہی نہیں جاسکتی تھی۔ صرف اندازے اور قیاس کی ہی ہوسکتی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد جب میں دوبارہ مکان کے پاس آیا تو ایک دم سے بھوک کھل اٹھی اور پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔

اب تک بھوک میرے قابل برداشت اور قابو میں اس لئے بھی تھی کہ میری ساری توجہ مکان کی طرف لگی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ میں خوف و دہشت سے بھی دوچار تھا۔ میرے دل میں جو ہیبت تھی اب وہ دور ہوچکی تھی۔

میں نہ صرف پیٹ بھر کے کھانا کھانا چاہتا تھا بلکہ آرام کی بھی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ اس لئے بھی کہ تھکن اور نڈھال پن محسوس ہورہا تھا۔ میں سب سے پہلے اپنے ان دونوں مسئلوں کو حل کرنا چاہتا تھا..... آرام تو ممکن تھا لیکن جب تک پیٹ میں ایندھن نہ پڑ جائے گا اس وقت تک آرام نہیں ہوسکتا تھا..... بھوجن کا مسئلہ اس ویران جزیرے پر کیسے حل کروں.....؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا..... آدمی ہر قسم کے حالات اور بڑے سے بڑے خطرناک دشمن کا مقابلہ کرسکتا ہے لیکن بھوک سے لڑنا سب سے مشکل امر ہے۔

پھر میں بے خوف و خطر اس مکان میں گھس گیا۔ کیوں کہ اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔

مجھے اپنے قدموں کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس مکان کے اندر کل تین کمرے تھے جب کہ باہر سے چار کمرے معلوم ہوتے تھے۔ ان کمروں میں اخبارات کی ردی بھری ہوئی تھی۔ یہ اخبارات بنگلہ زبان اور انگریزی کے تھے۔ بنگلہ دیش اور کولکتا سے شائع تھے۔ میں نے ایک کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مکان کچھ بلندی پر واقع تھا۔ مجھے یہاں سے بندرگاہ دکھائی دیتی تھی۔ اور اس کے قریب اس مکان کی ساخت کا ایک اور مکان تھا لیکن میں ابھی نہیں گیا تھا۔

اس مکان میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ میں نے اس کے تمام کمرے، باورچی خانہ اور ہر گوشہ دیکھ لیا۔ چھان مارا تھا، پھر ایک آس سی لے کر شاید وہاں کھانے کے لئے کچھ مل جائے میں دوسرے مکان کی طرف چل پڑا۔

میں کئی بار چلتے چلتے بری طرح چونکا تھا۔ کیوں کہ مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا تھا کہ جیسے کوئی غیر محسوس انداز سے میرے تعاقب میں چلا آرہا ہو۔ جب میں مڑ کے دیکھتا تو کسی کو نہیں پاتا..... یہ عجیب اور پراسراریت تھی کہ میرے نتھنوں میں ایک سوندھی خوشبو کی مہک آئی ..... میں نے ایسی خوشبو رانی پونم میں محسوس کی تھی..... اور اس کے علاوہ سرراہ یا بازاروں میں کوئی دوشیزہ یا عورت قریب سے گزرتے سے میرے ذہن پر چھوڑ جاتی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں رانی پونم کی آتما تو نہیں ہے.....؟ اگر وہ ہے تو ظاہر کیوں نہیں ہورہی ہے.....؟ بہرحال سوندھی جسمانی خوشبو نے مجھے یہ جاننے اور سمجھنے پر مجبور کردیا تھا کہ کوئی عورت میرے تعاقب میں ضرور ہے..... نہ صرف غیر محسوس انداز بلکہ پراسرار طور پر..... بہرحال رانی پونم نہیں ہے..... یہ جو خوشبو ہے وہ رانی پونم کی نہیں ہے بلکہ ہر جوان دوشیزہ میں ہوتی ہے۔

کہیں یہ جزیرہ آسیبی تو نہیں ہے؟..... بنگال کے خطے میں ابھی جادو کی باقیات موجود تھیں.....

جادوگر اور جادوگرنیاں جو آسام اور بنگلہ دیش سے تعلق رکھتی تھیں وہ مختلف گوشوں بلکہ ویران اور سنسان علاقوں میں کسی وجہ سے جا کر بس گئی تھیں..... جادو گرنیوں کے متعلق بہت سے قصے اور کہانیاں زد عام تھیں کہ جب کوئی جوان اور خوب صورت مرد ان علاقوں سے گزرتا تھا تو وہ اسے جادو کے زور سے مکھی یا جانور بنا کر رکھ لیتی تھیں اور جب ان کی طلب ہوتی تھی تو وہ اسے انسانی روپ میں لے آتی تھیں۔ یہ مبالغہ آمیزی نہ تھی۔ یہ حقیقت تھی۔ بنگال کی جادوگرنیوں کا جادو بڑا زبردست تھا۔ اس ویران جزیرے پر ان کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں دو ایک قدم چل کر رک جاتا اور پھر کسی جگہ چھپ جاتا اور پھر اپنی تسلی کرکے آگے بڑھ جاتا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ جوان بدن کی خوشبو رفتہ رفتہ معدوم ہوتی گئی۔ پھر بھی محتاط تھا کہ ان سے جان چھوٹی ہے اس لئے کہ ان کے جادو کا زور مجھ پر نہیں چلا ہے۔ اس لئے انہوں نے مایوس ہوکر اپنا ارادہ بدل دیا اور تعاقب بند کردیا۔ جب میری ہر طرح سے تسلی ہوگئی تو میں نے اپنی رفتار تیز کردی۔ اس طرح مجھے دس منٹ کی مسافت آدھے گھنٹے میں طے کرنا پڑی۔ میں اس مکان پر پہنچا۔ یہ مکان بھی خاصی بلندی پر بنا ہوا تھا۔ میں اپنے آپ کو چھپاتا اور محتاط انداز سے قدم بڑھاتا گیا تو اپنے آپ کو اس مکان کے عقبی حصے پر پایا۔

میں نے عقبی حصے کے دروازے پر کھڑے ہوکر زور زور سے آوازیں دیں۔ ''اندر کوئی ہے.....؟''

مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ کیوں کہ اندر گہرا سکوت طاری تھا۔ اب وہاں مزید کھڑے ہوکر پکارنا فضول اور وقت ضائع کرنا تھا۔ پھر میں مکان کے بیرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے میں رک کر سوچتا رہا کہ کیا کروں.....؟ اندر جاؤں یا نہیں.....؟ کیا اس بات کی امید ہے کہ یہاں کھانے کو کچھ مل جائے گا.....؟ پھر میں دوسرے لمحے مکان میں گھس گیا۔

اندر کے ایک کمرے کے ایک فرش پر میں نے بسکٹوں کا گتے کا ایک رنگین اور خوب صورت ڈبا اور ایک ٹوٹی ہوئی چھری دیکھی۔ میں نے لپک کر ڈبا اس طرح اٹھایا جیسے کوئی اور نہ اٹھالے۔ ڈبا آدھا خالی تھا۔ باقی نصف میں خاصے بسکٹ موجود تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میری بھوک اور کھل اٹھی..... میں نے جلدی جلدی ایک ایک کرکے تمام بسکٹ کسی ندیدے کی طرح کھالئے جو میرے لئے کسی من وسلویٰ سے کم نہ تھے۔ بسکٹ تازہ، خستہ اور لذیذ بھی تھے۔ میں نے بسکٹوں کا خالی ڈبہ اس لئے ہی پھینکا کہ ایسی بے سروسامانی میں ایسی چیزیں بہت کام آتی ہیں۔ میں نے ڈبا ایک جگہ رکھ دیا۔ پھر میں پہلے والے مکان میں لوٹ آیا۔ مکان میں جاکر لیٹنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے مکان سے باہر آکر کھلی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپ کر لیٹ گیا۔ یہ ہر لحاظ سے بہت محفوظ جگہ تھی۔ میں کسی کی نظروں میں نہیں آسکتا تھا۔ میں چوں کہ بہت تھکا ہوا تھا اس لئے لیٹتے ہی نیند نے مجھے فوراً دبوچ لیا۔

☆.....☆.....☆

جب میں بیدار ہوا تو دیکھا کہ دن ڈھل چکا ہے۔ سورج جو مشرق سے مغرب کی طرف سفر کررہا تھا اب وہ مغرب کے قریب پہنچ چکا تھا۔ موسم بھی بہتر ہوگیا تھا۔ دھوپ میں تمازت نہیں رہی تھی۔ ہوا بھی خوش گوار چل رہی تھی۔ میں ایک جماہی لے کر اٹھ بیٹھا۔ لمبی نیند لینے سے طبیعت خاصی ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ بسکٹ کھانے سے پہلے میں نے جو نقاہت محسوس کی تھی وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے تھی۔ اب یں اپنے آپ کو قدرے بہتر اور توانا محسوس کررہا تھا۔

پھر میں کھانے کی تلاش اور جستجو میں نکلا۔ مجھے افسوس اور پچھتاوا تھا کہ میں نے سارے بسکٹ کیوں کھالئے۔ اس میں سے کچھ تو بچا کر رکھتا تو اس وقت کام آتے۔ لیکن اس وقت ناقابل برداشت بھوک نے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جو کھانے کے کام آسکے۔ میں نے کچھ مسافت طے کی تھی کہ زمین پر ناریل گرا ہوا دکھائی

دیا۔ میں نے اسے توڑ کر اس کا پانی پیا اور پھر اس کا گودا کھالیا جس سے جسم میں ایک قوت آ گئی۔

مجھے اچانک یاد آ گیا مکان کے قریب سے میں نے ایک راستے کو گزرتے ہوئے دیکھا۔ یہ راستہ کہیں جاتا تو ہوگا۔ یہ ایک رہ گزر سی دکھائی دیتی تھی۔ مجھے اس جزیرے کی پراسراریت، ویرانی اور تنہائی سے دحشت سی ہونے لگی۔ میں نے سوچا۔ کاش! کوئی ہوتا جس سے میں باتیں کرتا..... پھر جانے مجھے کیا ہوا کہ میں خود کلامی کرنے لگا۔ بلند آواز سے اس طرح سے کہا جیسے کوئی سننے والا موجود ہے۔

''کیا تم یہ بتا سکتے ہو کہ یہ راستہ کہاں جاتا ہے.....؟''

''ابھی..... تم نہیں جانتے..... یہ کیسے ہوسکتا ہے میرے بھائی.....! یقیناً یہ راستہ کہیں ضرور جاتا ہے؟''

''یوں کرو کہ میرے ساتھ چلو..... میں تمہیں بتاتا ہوں.....''

مجھے اپنی آواز بڑی عجیب، ویران، کھوکھلی، اور کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی..... ایسا لگا جیسے یہ کسی اجنبی کی آواز ہو۔ عجیب سی بات تھی اور ناقابل فہم اور پراسرار کہ مکان میں بسکٹوں کا ڈبا ملتا..... بسکٹ بھی خستہ اور تازہ تھے اور اگر کئی دنوں کے ہوتے وہ اس قدر تازہ اور خستہ تو نہ ہوتے..... کیا کسی جن بھوت یا آتما نے یہاں لا کر بسکٹ کھائے ہوں اور باقی بسکٹ ڈبے میں رکھ کر چھوڑ دیئے ہوں تاکہ کسی وقت آ کر انہیں کھالے.....؟

جب مجھے کوئی جواب نہیں ملا تو اس راستے پر چلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔

میں چل پڑا۔ پھر میں چلتا رہا۔ اب میرا کام رکنا نہیں چلنا ہی رہ گیا تھا۔ یہ راستہ مجھے جنگل میں لے گیا۔ وہاں بڑے بڑے بلی کی جسامت کے خون خوار چوہے..... چھپکلیاں اور ایسے ایسے اقسام کے زہریلے کیڑے مکوڑے ادھر بھاگ رہے تھے جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اگر وہ کاٹ لے تو آدمی کے جسم میں ان کا زہر سرایت کر جائے۔ یہی خونی مخلوق اس جیرے کی آبادی معلوم ہوتی تھی..... پھر اس خیال سے میرے جسم میں ڈر اور خوف سنسنی بن کر دوڑ گیا تھا کہ سانپ بھی ہوں تو میں کیا کرلوں گا.....؟ میرے پاس بچاؤ کے لئے کوئی ہتھیار بھی تو نہیں تھا۔ چوں کہ مجھے اس راستے پر ایک سانپ بھی نظر نہیں آیا اس لئے میں چلتا گیا۔ تاہم ہشیار اور محتاط اور چوکنا بھی تھا کہ کسی بل سے سانپ نہ نکل آئے۔

آسام اور بنگلہ دیش میں جب بھی کوئی سیلاب اور طوفان آتا تو وبائی امراض پھوٹ پڑتے تھے۔ ان امراض کی وجہ سے بعض گاؤں، دیہات اور جزیرے خالی ہوجاتے تھے۔ شاید اس جزیرے پر شاید کوئی مرض پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے لوگ جزیرہ خالی کر کے چلے گئے تھے۔ اس جزیرے پر آبادی کا نہ ہونے کا یہی سبب نظر آیا۔

میں چوں کہ خاصی دور نکل آیا تھا اس لئے میں نے واپسی کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ سورج مغرب کی وادی میں غروب ہونے کے لئے نیچے ہوتا جا رہا تھا۔ کچھ آگے جا کر راستہ بلندی کی طرف جانے لگا۔ اب جنگل کم گھنا ہوگیا۔

کچھ دیر بعد سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ دن بھی جیسے غروب ہوجاتا تھا۔ راستہ بھی ختم ہوگیا تھا۔

اب میرے سامنے چاروں اطراف ویرانی ہی ویرانی برستی دکھائی دیتی تھی۔ میں ایک جگہ رک گیا۔ مجھ پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس حیرت کی جگہ خوف نے لے لی۔ کیوں کہ رات آنے میں بھی دیر نہیں تھی۔ مجھے رات آنے کا کوئی خوف نہیں تھا، خوف اس بات کا تھا کہ میں رات کہاں گزاروں گا.....؟ پھر میں چاروں اطراف دیکھنے لگا۔ پھر میری نگاہ مخالف سمت اٹھ کر ایک جگہ مرتکز ہوگئی۔ سامنے ایک ندی بہہ رہی تھی اور اس پر لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ اس پل سے قدرے فاصلے پر ایک باغیچہ سا بنا ہوا تھا جس کی کیاریوں کی مینڈھوں

میں سمندری گھونگھے اور سیپ سجے ہوئے تھے جو کسی بڑے قرینے سے رکھے تھے۔ باغیچے کے ساتھ ایک چھوٹا اور خوب صورت سا مکان بھی تھا جس میں صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ کمرے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس مکان کی وضع قطع کسی عبادت گاہ کی سی تھی۔ اس کے دروازے کے آگے تین صاف ستھری سیڑھیاں تھیں۔

میں یک لخت چونک پڑا۔ مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ نیچے والی سیڑھی پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ پہلے تو یہ خیال آیا کہ شاید یہ رانی پونم کی آتما ہو۔ وہ اس لئے نہیں تھی کہ وہ فطری حالت میں نمودار ہوئی تھی۔ لیکن یہ لڑکی گہرے بھورے رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ لیکن اس کا جسم سفید براق دوپٹے کی محراب میں تھا۔ سورج کی آخری سنہری کرنیں اس پر پڑ رہی تھیں۔ جو اس کی عمر کو ظاہر کر رہی تھیں۔ میں نے اسے تنقیدی نظروں سے دیکھا تو وہ صرف جوان ہی نہیں بلکہ غیر معمولی طور پر حسین اور دلکش بھی تھی۔ اس میں ایک عجیب اور دل موہ لینے والی سنسنی تھی جو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔

میں اس لڑکی کو دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے ڈر گیا۔

اس لئے کہ یہ لڑکی انسان نہیں ہوسکتی تھی۔ کیوں کہ وبائی امراض جو دو ماہ پیشتر پورے دیش میں پھوٹے تھے شاید یہاں بھی بہت زیادہ اموات ہوگئی تھیں۔ جس سے یہ جزیرہ خالی ہوگیا تھا۔ یہ جزیرہ جو غیر آباد تھا اور اس پر آسیبی ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔ یہ لڑکی کسی کی بدروح ہی ہوسکتی تھی.....

میں تو ہم پرست تو نہ تھا لیکن بدروحوں کا قائل تھا۔ بدروحوں کے بارے میں بہت ساری کہانیاں زدعام تھیں۔ طرح طرح کے قصے مشہور تھے اور کہانیاں تھیں جو سنتا تھا۔ رانی پونم کی آتما سے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ بہت سارے جادوگروں اور جادوگرنیوں نے بدروحوں کو اپنا موکل اور تابع بنایا ہوا تھا وہ ان سے ہر طرح کا کام لیتے بھی تھے۔ یہ عورت کوئی بدروح ہی ہوسکتی تھی۔ میری رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔

میں نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کرلیا۔ پھر میں نے سوچا کہ مجھے اچھی طرح تسلی کرلینا چاہئے۔ ایک جوان شخص ہونے کے ناتے ڈرنے کی کیا بات ہے.....؟ اور پھر میں جرائم پیشہ تھا۔ کبھی موت اور سنگین حالات سے ڈرا نہیں تھا اور ان کا مقابلہ مردانہ وار کر چکا تھا۔ جب رانی پونم کی آتما سے سابقہ پڑا تو میں خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کی بات اور تھی۔ میں نے دوسرے لمحے خود پر قابو پالیا، ڈر اور خوف دل سے نکال دیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ سامنا ہونے پر یہ بدروح کیا کرے گی؟

پھر میں بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ گیا۔ ندی کا پل عبور کر کے ایک گھنے درخت کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا اور اسے چوروں کی طرح دیکھنے لگا۔ اب میں اس کے اس قدر قریب تھا کہ مجھے اس سفید دوپٹے میں سے جھانکتے ہوئے خوب صورت ریشمی، گھنے اور چمک دار سیاہ بال بھی دکھائی دے رہے تھے..... اس قدر حسین لڑکی جو سپنوں اور تصور سے کہیں زیادہ حسین ہو وہ یقیناً اس دنیا کی لڑکی نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایک سے ایک حسین لڑکیاں دیکھی تھیں لیکن کبھی اس قدر حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

مجھے جنگل کی خصوصی تربیت اتم بابو نے دی تھی۔ وہ مجھے دو تین مرتبہ سندر بن جنگل میں لے گئے تھے۔ اتم بابو نے مجھے بتایا تھا کہ بعض جنگل ایسے ہیں جن میں انسان داخل نہیں ہوسکا۔ وہاں جاؤ تو قدم قدم پر حسین واہمے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لڑکی بھی ایک طرح سے ایک حسین واہمہ ہی لگ رہی تھی۔

میرے سارے بدن میں سنسنی بجلی کی طرح دوڑتی ہوئی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی تھی۔

میں نے پل بھر کے لئے سوچا کہ کیوں نہ دوڑ لگادوں.....؟ پھر میرے دل کے کسی کونے میں خوش کن خیالوں کی لہر آئی، پھر میرے کانوں میں رانی پونم کی آتما کی سرگوشی گونجی..... یہ تم کب سے اس قدر بزدل اور ڈرپوک ہوگئے ہو..... ڈرو نہیں..... میں

صرف یہ کہنے آئی تھی۔

میرے پیروں میں تجسس نے جیسے بیڑیاں ڈال دیں۔ میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ اور سوچا کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی نے اس لڑکی کو قیدی بنا کر رکھا ہوا اور وہ کسی کام سے کہیں گیا ہوا ہو.....؟ اب شاید وہ آتا ہی ہوگا.....؟ مجھے دیکھ کر میری جان لینے کی کوشش کرے گا..... ظاہر ہے وہ بندوق یا اسٹین گن سے مسلح ہوگا۔ میں یہ چاہتا تھا کہ اپنے بچاؤ کی تدبیر کروں۔

سورج مغرب کی وادی میں ڈوبنے لگا۔ کسی بھی افتاد سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑوں اور کسی ایسی جگہ کھڑا ہوجاؤں کہ مجھ پر کسی کی نگاہ نہ پڑ سکے۔ میں اپنے آپ کو اس کی نظروں سے بچاتا چھپاتا ہوا اس مکان کے عقب کی جانب سرعت سے اور بے آواز قدموں سے نکل گیا۔ یہ دیکھ کر مجھے ایک طرح سے اطمینان ہوا کہ یہاں کوئی شخص نہیں تھا اور نہ ہی اس بات کا خوف وخدشہ تھا کہ کوئی آدمی ادھر آسکتا ہے۔ کوئی بھی مرد اس لڑکی کو اکیلی چھوڑ کر کہیں جاسکتا ہے۔ کیوں کہ وہ فرار ہوکر جاسکتی ہے اور کہیں چھپ سکتی ہے اور اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ پھر میں یہ سب کچھ اور حوصلہ کرکے مکان کے عقبی حصے کی طرف آیا۔ پھر میں اس لڑکی کی جانب بڑھا۔

اس لڑکی نے آہٹ سن کر اپنا خوش نما سر اٹھایا تو ہم دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے میں پیوست ہوگئیں۔

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے دیکھتے ہی اس طرح اچھل پڑے گی۔ جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ اس کے چہرے پر استعجاب کے بجائے خوف کی زردی اور آنکھوں سے دہشت جھانکنے لگے گی اور پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی..... اور شاید مکان میں گھس کر دروازہ بند کرلے گی۔ کیوں کہ اسے سراپنی عزت کو میری طرف سے خطرہ محسوس ہوگا کہ میں اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اسے قابو میں کرکے بے بس کردوں گا..... کیوں کہ ایک مرد ذات کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے۔ وہ ایک ناگ کی طرح ہوتا ہے۔

لیکن وہ مجھے دیکھ کر چونکی اور نہ ہی اس کے چہرے پر خوف کا سایہ نظر آیا اور نہ ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ البتہ اس کے حسین چہرے کا نقوش اور دلکشی لمحے کے لئے متاثر ہوئی تھی۔ وہ بے فکر اور بے پرواسی لگی۔

گو میں کسی نہ کسی طرح حوصلہ کرکے اس واہمہ کے سامنے آتو گیا تھا لیکن میرے دل کے دھڑکنے کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ اس پر قابو پانا میرے لئے دشوار ہورہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ حسین آتما ایک انسان کو سامنے دیکھ کر دھواں بن جائے گی اور شام کے دھندلکے کی آغوش میں سما جائے گی۔

لیکن یہ آتما فضا اور دھندلکے میں تحلیل نہ ہوئی تو میرے لئے تعجب خیز تھا۔ ادھر میری حالت غیر اور بڑی ابتر اس خیال سے ہورہی تھی کہ یہ نجانے کیا کر بیٹھے.....؟ میں مسلح بدمعاش سے مقابلہ کرسکتا تھا لیکن ایک آتما سے نہیں..... مجھے پچھتاوا سا ہوا کہ میں نے کیوں اس کے سامنے آنے کا خطرہ مول لیا.....؟ لڑکی کے پنکھڑیوں جیسے ہونٹوں نے حرکت کی۔ اس نے شاید کچھ کہا تھا لیکن ایک لفظ بھی میرے پلے نہیں پڑا تھا۔ میں نے سوچا کہیں وہ کوئی منتر تو نہیں پڑھ رہی ہے۔ مجھ پر جادو کرنے کے لئے.....؟

لڑکی یک لخت اٹھ کھڑی ہوئی اور میری طرف دھیرے سے بڑھی۔ لیکن دو قدم چل کر لڑکھڑائی۔ اور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ اور گر پڑی..... اگر وہ شہر کی کسی سڑک..... کسی بازار میں اس طرح سے گزرتی تو میں کسی فلمی ہیرو کے انداز میں برقی سرعت سے لپک کر گود میں اٹھالیتا..... جانے کیوں میں اپنی جگہ ساکت وجامد کھڑا اسے زمین پر گرتا ہوا دیکھتا رہا مجھے اسے اٹھانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔

لڑکی میرے سامنے بے حس وحرکت پڑی تھی۔ نہ صرف وہ بے ترتیب بلکہ اس کا لباس اور بال بھی بے ترتیب ہوگئے تھے۔ میرے اندر کی حسین بیدار ہونے لگیں تو میں اس کی طرف بڑھا۔ پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ کسی تلوار کی طرح بے نیام سی لگ رہی تھی۔ پھر بالوں کو اس کے چہرے، شانے اور سینے سے ہٹا کر درست کئے۔ پھر میں نے بڑی آہستگی سے لڑکی کو مخاطب کیا۔

''کیا بات ہے.....؟ تم ٹھیک تو ہو نا.....؟''

لڑکی نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ اسنے حرکت کی تو اس کا سفید براق دوپٹا جس سے میں نے اس کا سر ڈھانپ دیا۔ اب اس کے منہ پر آگیا تھا۔ اور ناک اس میں چھپ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ناک پر سے دوپٹا ہٹادیا تاکہ اسے سانس لینے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔ لڑکی اب مجھ سے بہت قریب تھی۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی میری رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔ میرا دل اس بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا کہ کوئی لڑکی آکاش کی رانی کی طرح ہوسکتی ہے۔ میں نے کبھی کسی لڑکی میں ایسی پاکیزگی اور چہرے پر دیوی جیسا حسن نہیں دیکھا تھا۔ ایسا رعب، وقار اور تمکنت تھی جس نے مجھے سحرزدہ کردیا۔

جب کبھی بھی میں سندربن کے جنگل گیا تھا وہاں یہ بات دیکھی تھی شام ہوتے ہی فوراً تاریکی اپنا جال چاروں طرف ڈال دیتی تھی۔ یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ سورج کو غروب ہوئے تھوڑی دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ درختوں اور چٹانوں کی وجہ سے شام کا دھندلکا تاریکی سے ہم آغوش ہوگیا تھا۔ پھر میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاریکی میں مدغم ہوگیا۔

میں نے خوف زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھا تو ایسا لگا کہ کسی بھی لمحے کسی بھی سمت سے کچھ لوگ تاریکی میں سے نمودار ہوکر مجھے نرغے میں لے کر پکڑ لیں گے..... مجھے ایسا ہی محسوس ہورہا تھا کہ میرے گرد غیر محسوس انداز حصار قائم کیا جارہا ہے..... یہ شاید آدم خوروں کا جزیرہ ہے۔ یہ لوگ مجھے ذبح کرکے بھون کر کھا جائیں گے۔ یہ لڑکی ایک دم سے کسی لمحے غائب ہوسکتی ہے۔ پھر مجھے اس لڑکی کے وحشیانہ قہقہے سنائی دیں گے۔ میں نے جنگل کی پراسرار اور خوف ناک کہانیاں پڑھی تھیں..... سنی تھیں کہ جنگل میں دن ڈوبتے ہی بلائیں نمودار ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ ان کہانیوں کا خیال آتے ہی دل نے کہا فوراً یہاں سے نو دو گیارہ ہوجاؤ۔

گو کہ مجھ پر خوف ودہشت طاری تھی۔ لیکن ایک ان جانے جذبے نے مجھے جکڑ رکھا تھا اور اس لڑکی کو چھوڑ کر جانے نہیں دے رہا تھا۔ یہ انسانی جذبہ تھا۔ جس کا رس اتم بانو نے دے کر میرے وجود کی گہرائیوں میں بھر دیا تھا..... وہ مجھ سے کہتے تھے کہ کسی کو مصیبت میں مبتلا دیکھو تو اس کی مدد کرنے کے لئے جان پر کھیلنے سے دریغ نہ کرنا۔

میں نے اس پر جھک کر پھر ایک بار اس کا شانہ ہلایا۔ ''اب تم کیسی ہو.....؟ میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں؟''

اس لڑکی نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا..... یسے لگا جیسے اس میں بولنے کی سکت ہی نہ رہی ہو۔ میں نے پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھپ اندھیرے میں دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا پھر میں نے کان لگادیئے مجھے کئی آہٹ سنائی نہ دی۔ ایک گہری خاموشی کا طلسم چھایا ہوا تھا۔ وحشت اور ویرانی سی برس رہی تھی۔ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ میں نے ایک ہاتھ لڑکی کی گردن کے نیچے سرکادیا۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ اس کی کمر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ پھر دوبارہ ارد گرد دیکھ کر اپنی تسلی کی..... کہیں ایسا تو نہیں کہ دشمن میری حرکات وسکنات دیکھ رہا ہو.....؟ چند لمحوں کے بعد میں نے پھر اسے اٹھالیا۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ اس کا جسم اس قدر ہلکا پھلکا ہوگا۔ وہ مجھے ایک پانچ چھ برس کی بچی کی مانند لگی تھی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ دراصل لڑکی اس قدر ہلکی پھلکی نہیں ہے بلکہ میرے بازوؤں میں جو بے پناہ قوت ہے اس کے کارکن وہ بے حد ہلکی پھلکی محسوس ہوئی۔

دوسرا خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ نہ تو لڑکی ہلکے پھلکے وزن کی ہے اور نہ میرے بازوؤں میں بے پناہ طاقت ہے..... اصل بات یہ ہے کہ یہ آتما ہے..... آتما کوئی وزن ہی نہیں ہوتا جیسا کہ میں نے رانی پونم کی آتما میں محسوس کیا تھا..... میرے ہاتھوں میں کچھ نہ رہے گا۔ لیکن ایک بات یہ تھی کہ میں نے اس کا لمس اور وجود رانی پونم کی طرح محسوس کیا تھا۔ یہ میرے لئے عجیب وغریب اور ناقابل فہم سی بات ضرور تھی۔ جس نے مجھے چکرا دیا تھا۔

چند لمحے بیت گئے۔ میں اسے اٹھائے اسی طرح

کھڑا رہا کہ کیا کروں.....؟ وہ فضا کی تاریکی میں ابھی تک تحلیل نہیں ہوئی تھی بلکہ میرے بازوؤں پر بے سدھ پڑی مہک رہی تھی۔ سوندھی سوندھی خوشبو مجھے معطر کررہی تھی.....ابھی تک نہ تو کوئی آدمی ہی آیا تھا اور نہ ہی کوئی آہٹ سنائی دی تھی اور نہ کسی انسان کے پکارنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ ایسا لگ رہا تھا کہ اس جزیرے پر صرف ہم دونوں ہی موجود ہیں..... کسی تیسرے کا کوئی وجود نہیں.....

ساون کی رات تھی۔ فرحت بخش اور سرد سی تھی۔ خنکی بھی رچی بسی تھی۔ آلودگی تھی کہ بڑھتی جارہی تھی.....کسی پرفضا مقام پر یا کھلی جگہ ہی تازہ ہوا نصیب ہوئی تھی۔ اس ہوا نے مجھے تازہ دم کردیا تھا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں.....؟ کیوں کہ میں اسے دیر سے گود میں اٹھائے کھڑا ہوا تھا۔ لیکن مجھے کسی قسم کی تھکن محسوس نہیں ہورہی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس طرح میں لڑکی کو صبح تک اٹھائے کھڑا رہوں گا۔ مجھے ایک اور خیال بھی آیا کہ یہ آتما نہیں بلکہ لڑکی ہے.....وہ ایک غیر اور اجنبی مرد کے بازوؤں میں اس کا لمس اور وجود محسوس کرکے کسمسائی کیوں نہیں.....؟ پھر احساس ہوا کہ اس پر تو غشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ پھر میں اس مکان کی طرف بڑھا اور اس کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

جانے کیوں مجھے ایسا لگا کہ مکان کے اندر کوئی موجود ہے۔ میں نے پیچھے کی طرف دیکھا اور پھر کمرے کی طرف منہ کرکے زور سے آواز دی۔ کوئی ہے.....؟ ہے تو بھگوان کے لئے باہر آجاؤ.....'' لیکن مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔

اندھیرا ایسا گھپ تھا کہ کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا..... میں نے سوچا کہ اب لڑکی کو فرش پر لٹا دینا چاہئے۔ میں اسے بلاوجہ لئے کھڑا ہوا ہوں..... میں نے فرش پر گھٹنے ٹکائے اور بڑے آرام اور نہایت آہستگی سے اس طرح سے لڑکی کو فرش پر لٹایا جیسے وہ کانچ کی ہو۔ ذرا سی ٹھیس لگنے پر اس کی کرچیاں بکھر جائیں گی۔ اس پر ابھی تک غشی طاری تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

میں اس خیال سے باہر نکل کر ندی پر پہنچا کہ لڑکی کو پانی لاکر پلاؤں۔ وہاں پہنچا تو خیال آیا کہ کس چیز میں پانی لے جاؤں.....؟ پھر مجھے سکٹ کے اس ڈبے کا خیال آیا جو میں نے کسی خیال اور ضرورت کے تحت ساتھ لے لیا تھا اور اسے جگہ پر رکھ دیا تھا جہاں سے میں لڑکی کو اٹھایا تھا۔ پھر میں وہ ڈبا لانے کے لئے لپک گیا۔ خیال آیا کہ یہ گتے کا نہیں بلکہ ٹین کا ہے۔ میں نے اس میں ندی سے پانی بھرا۔ پھر میرے دل میں ایک انجانا سا خوف دامن گیر ہوگیا۔ میں نے دل میں اپنے آپ کو مخاطب کیا..... میں یہ کیا حماقت کررہا ہوں.....؟ مجھ سے بڑا احمق کون ہوسکتا ہے۔ جو جان بوجھ کر مصیبت میں گرفتار ہورہا ہے..... میں کیوں اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہا ہوں.....؟

پھر میں اس مکان کی طرف جاتے ہوئے یک لخت رک گیا۔ اور دوسری سمت دیکھنے لگا تاکہ اس جانب چلا جاؤں۔ اس لڑکی سے اپنی جان چھڑالوں..... جو میرے گلے میں طوق بن رہی ہے.....؟

میرے دل کے کسی کونے میں ایک خیال آیا کہ کہیں یہ مصیبت زدہ لڑکی تو نہیں.....؟

یہ ایک انسانی جذبہ تھا جو مجھ سے مخاطب تھا۔

اتنی حسین، دلکش اور نوجوان اور موہنی صورت کی لڑکی کو بیچ منجدھار میں کسی سنگ دل آدمی کی طرح چھوڑ کر نہ جاؤ..... کیا تمہیں اس پر ترس اور رحم نہیں آرہا ہے؟ بالفرض محال وہ موت کے منہ میں چل گئی تو تم ساری زندگی کرب ناک اذیت سے پچھتاتے رہو گے۔

اور پھر ضمیر کی خلش تمہیں جینے نہیں دے گی.....وہ کسی زہریلے اور خوفناک خنجر کی طرح تمہارے سینے میں پیوست رہے گی.....اس نیکی کو ہاتھ سے مت جانے دو.....

اس انسانی جذبے نے میرے دل میں خوف اور خودغرضی کو مٹا دیا۔ پھر میں اس مکان کی طرف چل دیا۔ میرے کان چاروں طرف لگے ہوئے تھے۔ میں کسی خوف زدہ ہرن کی مانند ہر آہٹ پر چونک چونک کر

دیکھنے لگا تھا۔

پھر میں اس مکان میں داخل ہوگیا۔ گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں اندازے سے اس جگہ بیٹھ گیا۔ جہاں میں نے لڑکی کو لٹایا تھا۔ لڑکی وہاں نہیں تھی میں نے ہاتھوں سے اس خیال سے فرش کو ٹٹولا کہ شاید وہ غشی کی حالت میں سرک گئی ہو..... لیکن وہ لڑکی غائب تھی۔

میں نے سوچا کہ کسی اور کمرے میں تو اسے لاکر لٹایا تو نہیں تھا.....؟

نہیں..... یہ وہی کمرا تھا۔ میرے سارے جسم میں خوف سے سنسنی دوڑ گئی۔ اب مجھے اس بات کا یقین ہوگیا کہ مجھے بڑی چالاکی، عیاری اور فریب سے جان گیا ہے.....اب میں اس کمرے میں محصور ہوگیا ہوں۔ آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ثابت ہوگی.....؟ میں ان کے جال میں آگیا تھا۔

میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ لڑکی کتنی بڑی اداکارہ تھی.....؟ اس نے کیسی زبردست اداکاری کی..... مجھے ذرہ برابر بھی شک اور گمان بالکل بھی نہ ہوسکا۔

میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس گھپ اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نکل جاؤں۔ یہ سنہرا موقع ہے۔

پھر اس خیال سے اپنے ارادے پر عمل نہیں کیا کہ شاید باہر کوئی کھڑا ہوگا.....؟

پھر میں نے سوچا کہ عقبی راستے سے نکل جاؤں۔ فرار ہونے کے لئے ایک راستہ تھا۔ لیکن دشمن بے وقوف نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے شاید وہاں بھی کوئی پہرہ لگا دیا ہوگا۔

میں ان سوچوں میں غلطاں تھا کہ کمرے میں رسیلی آواز گونجی۔ ''میں یہاں ہوں۔''

میں اس آواز کو سنتے ہی اچھل پڑا۔ یہ آواز نہیں تھی کوئی نغمہ تھا۔ میں نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا۔

دروازے پر میں نے ایک ہیولا دیکھا۔ ایسا لگا جیسے کسی نے کالا لبادہ پہن رکھا ہو۔ وہ ہیولا میری طرف بڑھا تو ایسا لگا جیسے کالا دیو میری طرف مجھے دبوچنے کے لئے آرہا ہو۔ کیوں کہ اس کا انداز ایسا ہی تھا۔

''تم نے تو مجھے ڈرا دیا.....'' میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ساتھ اور کون ہے.....؟'' لڑکی نے مترنم آواز میں پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے..... میں اکیلا ہی ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سچ سچ بتاؤ..... تم کتنے آدمی ہو.....؟'' اس نے پھر سوال کیا۔ اسے میرے جواب کا یقین نہ آیا ہو۔

''میں نے کہا نا کہ میں صرف اکیلا ہوں۔''

''تم کون ہو.....؟''

''میں ایک بدنصیب شخص ہوں..... پیشہ ور قاتلوں سے جان بچانے کے لئے فرار ہوا تھا۔''

''یہاں کس طرح پہنچے.....؟'' اس نے مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

''میں ایک موٹر بوٹ سے فرار ہوا تھا..... میری موٹر بوٹ طوفان کی زد میں آکر الٹ گئی۔ میں اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تھا۔ زندہ بچ جانے کی کوئی امید نہیں تھی۔ لیکن ابھی میری موت نہیں لکھی تھی..... سمندر کی لہروں نے مجھے اس جزیرے کے ساحل پر لاکر پھینک دیا۔ میں آج یہاں پہنچا ہوں..... شاید کل رات..... میں اکیلا دنیا بھر سے بھٹک رہا ہوں۔ تھکن سے چور چور ہورہا ہوں۔ جوڑ جوڑ درد کررہا ہے..... خوف نے میرے حواس معطل کردیئے ہیں..... اس وقت میں آرام کی ضرورت محسوس کررہا ہوں۔'' میں سانس لینے رکا۔ وہ میری باتیں خاموشی سے سنتی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''مجھے یہ بتاؤ کہ میں یہاں ایسے جاؤں تو خطرے والی کوئی بات تو نہیں ہے؟ میری جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا.....؟'' میں نے سرگوشی میں رک رک کر کہا۔ ''مجھے سکون کی ضرورت ہے۔''

''تم یہاں لیٹنا چاہو تو لیٹ سکتے ہو۔'' وہ دھیرے سے بولی۔

''مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو.....؟ سچ سچ بتاؤ کہ تم

انسان ہو یا کسی مرنے والی عورت کی بدروح.....؟"

"میں انسان ہوں....." وہ ہنسی اور بولی۔

"گھپ اندھیرے میں جیسے سات سر ایک ساتھ بول اٹھے۔ ہر سر قوس قزح کا ایک رنگ تھا۔ "میں بدروح نہیں ہوں؟ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ میں کوئی بدروح ہوں.....؟ تم نے شاید اس ویران اور سنسان جزیرے اور اس مکان میں اکیلی دیکھ کر یہ اندازہ کرلیا..... جب تم نے مجھے غشی کی حالت میں گود میں اٹھایا تھا تب بھی یہ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میں بدروح نہیں ہوں میں بھی اس پورے جزیرے میں تمہاری طرح اکیلی ہوں..... میں ایک عورت ہوں.....عورت ذات سے تمہیں کیا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ جب کہ عورت مرد سے خطرہ محسوس کرتی ہے تنہائی میں.....لیکن میں کسی اور خطرے کے متعلق تمہیں کچھ بتا نہیں سکتی..... کہہ نہیں سکتی..... کیوں کہ کوئی بھی افتاد کہہ کر نازل نہیں ہوتی....."

کیا کسی اور خطرے کا کوئی امکان ہے.....؟" میں نے دریافت کیا۔ "کیا کوئی آنے والا ہے؟"

"کسی خطرے یا مصیبت کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں..... یہ سب اچانک اور غیر متوقع طور پر آتے ہیں.....لیکن میں یہ جانتی ہوں کہ یہاں کوئی نہ کوئی ضرور آئے گا..... کیوں کہ تم آگئے..... وہ لوگ بھی یقیناً آئیں گے۔"

"کون لوگ.....؟ وہ کیوں آئیں گے.....؟" میرا لہجہ پریشان کن تھا۔

"وہ لوگ جو آنے والے ہیں.....وہ صرف مجھے لینے آئیں گے....." اس نے جواب دیا۔ "تمہیں خوف زدہ اور پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں.....تم زیادہ باتیں کرکے اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ چوں کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ لہٰذا لیٹ جاؤ۔"

"وہ تمہیں لینے کب آئیں گے.....؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم ان کا انتظار کررہی ہو.....؟"

"یہ تو میں بتا نہیں سکتی.....لیکن اتنا جانتی ہوں کہ وہ مجھے ہر قیمت پر یہاں سے لے جائیں گے۔"

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ باہر کی جانب جارہی ہے۔ میں نے ایک سائے کو دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

"تم اس وقت کہاں جارہی ہو.....؟" میں نے سراسیمگی سے کہا۔

"تم میری چنتا نہ کرو....." اس نے رک کر مترنم لہجے میں دلاسا دیا۔ "یہاں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے جو تم خائف ہورہے ہو.....تم سکون اور اطمینان سے لیٹ جاؤ۔"

"کیا تم سوؤ گی نہیں.....؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں سونے کے لئے جارہی ہوں..... میں کسی بھی جگہ جاکر سو جاؤں گی؟" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

پھر اس کا ہیولا دروازے میں سے کسی بدروح کی طرح غائب ہوگیا۔

مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا دشوار سا ہورہا تھا۔ میں کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر آرہا۔ اس لڑکی نے میرے وجود پر ایک ایسی بھرپور ضرب لگائی تھی کہ اس کی مار چاقو سے بھی کہیں تکلیف دہ تھی۔ میں اس لڑکی کو مصیبت زدہ سمجھ کر مدد کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں کوئی اور جذبہ کارفرما نہیں تھا۔ میری جگہ شاید کوئی اور ہوتا تو وہ اس تنہائی میں اس کے حسن اور بے پناہ کشش سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا..... میرے دل میں کوئی میل اور پراگندہ خیال نہیں آیا تھا.....لیکن وہ اس کے برعکس میرا خوف دور کررہی تھی۔ مجھے دلاسا دے رہی تھی..... میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی تاکہ تم ڈرو نہیں.....

میں فرش پر پیر پھیلا کر دراز ہوگیا۔ میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ مجھے اب تک یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اس جزیرے پر کب سے موجود ہے.....؟ اس سے بڑی مختصر سی ملاقات رہی تھی۔ میرے ذہن میں بہت سارے سوالات گردش کررہے تھے..... میں اسے چشم تصور میں دیکھتے ہوئے گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

(جاری ہے)

آتشی لہو

رضوان قیوم-راولپنڈی

جن نے جو کھا تھا وہ کر دکھایا، بالآخر ایک رات بچے کی روح کو جن اپنے ساتھ لے گیا جس کا ثبوت تھا کہ کمرہ جب کھولا گیا تو بچہ مردہ حالت میں پڑا تھا۔ جسے دیکھ کر لوگ.....

صدیوں پرانی پراسرار، ناقابل یقین، دل دہلاتی اور لرزہ براندام کرتی خوفناک کہانی

اس پراسرار ناقابل یقین کہانی کا تعلق 16ویں صدی سے ہے۔ 513ء میں پھاگوٹ سے 50 میل دور ایک مضافاتی علاقہ جسے کسی زمانہ میں سام نگر کہتے تھے۔ یہاں ایک ہندو راجہ یادھیو گنیش کی حکومت تھی۔ راجہ یادھیو گنیش کی رانی پریمیتا کے بطن سے بہت خوبصورت اوپر تلے دو بیٹے بڑا سونم داس اور چھوٹا مہتا پیدا ہوئے۔ راجہ یادھیو گنیش بذاتِ خود بڑا شریف اور اپنی رعایا کے حق میں بڑا مخلص اور رحمدل تھا۔ اسی طرح اس کی رانی پریمیتا بھی نرم دل، غریب پرور اور دربار شاہی کی پسندیدہ عورت تھی۔ وہ ہر منگل وار کے روز اپنے دربار میں اپنے دونوں بیٹوں سونم داس اور مہتا کو اپنی گود میں بٹھا کر، چاندی اور سونے کے سکے ان کے ہاتھوں سے غریبوں، مساکین، فقراء میں تقسیم کرواتی تھی۔

حسب معمول ایک بار وہ اپنے دونوں بچوں سونم واس اور مہتا کو لیے منگل وار کے روز اپنے دربار میں بیٹھی غریبوں، مسکینوں کو امداد بٹوار ہی تھی کہ اسی دوران ایک بہت بوڑھی عورت جس کی کمر انتہائی حد تک خمیدہ تھی۔ اس نے اپنے لرزتے ہاتھوں میں ایک بڑا سا چوبی ڈنڈا پکڑا ہوا تھا اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے اپنا وجود سنبھال نہ پا رہی تھی وارد ہوئی۔

رانی پریمیتا نے ترس کھا کر اسے فقراء کے ہجوم سے آواز دے کر آگے بلایا اور اسے نمستے کہا۔ بڑھیا نے جواباً اسے لیکن نہ جانے کیوں نمستے نہ کہا۔

رانی نے اپنی گود میں بیٹھائے ہوئے بچوں کو کہا کہ۔

''اس بزرگ عورت کو سونے کی اشرفیاں دو''۔

بڑھیا نے بغور بچوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں نہیں میں بھکاری نہیں ہوں''۔

''بھکاری نہیں ہو تو پھر کون ہو؟'' رانی نے بڑھیا سے پوچھا۔

بڑھیا بولی۔

''تم نے مجھ سے سوال کیا ہے کہ میں کون ہوں؟ اگر میں تمہیں اس کا جواب دے دوں تو تمہارے پاؤں سے زمین نکل جائے گی کہ میں کون ہوں!''

''دیکھو! تم ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ یہ بھیک کے سکے ان بچوں کے ہاتھوں سے لو اور اپنے پیچھے کھڑے فقیر کو امداد لینے کا موقع فراہم کرو''۔

''میں نے کہا ناں کہ میں کوئی فقیرنی اور تیری محتاج نہیں ہوں''۔

رانی نے اسے نحیف سا ڈانٹتے ہوئے کہا کہ۔

''تم اگر فقیرنی نہیں ہو تو لازماً حواس باختہ دیوانی بڑھیا ہو''۔

''دیوانی میں نہیں دیوانی تو تو اب ہونے والی ہے''۔

''کیا بکواس کر رہی ہو۔ اے سٹھیائی ہوئی بڑھیا!''

وہاں موجود رانی کے محافظوں نے جب یہ عجب صورتحال دیکھی تو بھاگتے ہوئے قریب آئے اور انہوں نے بدتمیز بڑھیا کے ہاتھوں کو سختی سے پکڑ کر جب اسے رانی سے دور لے جانے لگے تو بڑھیا نے چلا کر کہا۔

''مجھے رانی پریمیتا کو ایک بڑے راز کی بات بتانی ہے''۔

رانی نے دربار کے محافظوں کو کہا کہ۔

''اسے ایک لمحے کے لیے میرے قریب لاؤ''۔

اسے جب رانی کے قریب لایا گیا تو پریمیتا نے اس سے پوچھا۔

''بتلاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو اور تم کون ہو.....؟''

اس بڑھیا نے رانی سے کہا کہ۔

''تجھے پہلے تو میں یہ بتاتی چلوں کہ میں کوئی عام انسان نہیں بلکہ ایک چڑیل ہوں''۔

''چڑیل..... یہ تم کیا بات کر رہی ہو؟ نظر نہیں آتا کہ کس کے سامنے اور کہاں کھڑی ہو اور کیا کہہ رہی ہو۔ اس بھونڈے مذاق کے لیے تمہاری گردن بھی اتروائی جا سکتی ہے''۔

بڑھیا نے خوف کے بجائے بڑے اطمینان سے طنزیہ انداز میں کہا کہ۔

''یہ تو نہیں کر سکتی''۔

''بہت ہو گئی تیری گستاخی بند کر اپنی زبان ورنہ تیری منڈی تلوار سے اڑا دی جائے گی''۔

''اچھا اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو لو آزما لو، چلاؤ تلوار''۔

مہارانی پریمیتا نے اسے نرم لہجے میں کہا کہ۔

''راجہ یادھو گنیش کا یہ دربار کسی پر ظلم کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا یہاں محبت بانٹی اور امداد تقسیم کی جاتی ہے کسی پر تلوار نہیں چلائی جاتی ہے۔ میری نظر میں تم ایک قابل احترام مگر سٹھیائی ہوئی بزرگ عورت کے سوا کچھ بھی نہیں ہو''۔

تھوڑی دیر بعد اس بڑھیا نے اپنے حلق سے بڑی بھاری خوفناک آواز نکالی۔ وہ آواز اتنی دہشت ناک تھی کہ دربار میں موجود ہر شخص خوفزدہ ہو کر سہم کر رہ گیا۔

''رانی صاحبہ! اب آیا یقین..... تجھے کہ میں واقعی کوئی انسان نہیں بلکہ ایک چڑیل ہوں''۔

اب شاہی دربار میں موجود ہر ایک کے سانسوں کی کیفیت اندر کی اندر اور باہر کی باہر جیسی ہو گئی۔

رانی نے گھبرا کر اپنی گود میں بیٹھے ہوئے بچوں کو فوری طور پر محافظوں کو دیتے ہوئے کہا کہ۔

''انہیں محل کے اندر لے جاؤ۔ میں اس پراسرار بڑھیا سے چند مزید باتیں کر کے آتی ہوں''۔

پہلے سے سہمے ہوئے شاہی دربار میں موجود شرکاء کو رانی نے کہا کہ۔

''سب یہاں سے چلے جائیں''۔

رانی کے حکم کی تعمیل ہوئی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو اور کیا چاہتی ہو؟''

''میں یہاں کوئی تجھ سے خیرات لینے نہیں آئی بلکہ میں تجھے بھیک دینے آئی ہوں''۔

''کیسی بھیک.....؟'' رانی پریمیتا نے کھسیانی ہو کر پوچھا۔

بڑھیا نے اپنے گہرے سیاہ کالے مائل دانتوں کو نمایاں کرتے ہوئے کہا کہ۔

''تیری گود میں جو بچہ سونم ہے وہ تو انسانوں کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے اور جو مہتا ہے وہ اوپری مخلوق کا ''آتشی لہو'' ہے۔ اور اس کا باپ ''رجن نامی جن'' ہے''۔

''کیا بکواس کر رہی ہو.....؟''

مہارانی پریمیتا نے اپنی ناک کو ناگوار انداز میں اوپر اچکاتے ہوئے کہا۔

''تو نے پھر اپنی بکواس کا تسلسل جاری رکھا۔ یاد رکھ! اس قسم کا لفظ دوبارہ تیری زبان سے نکلا تو تیرے ساتھ وہ عبرتناک سلوک ہو گا جس کا سچی بات ہے میں دل سے نہیں چاہتی''۔

''اچھا تو اب کیا چاہتی ہے.....؟'' رانی نے اس سے اپنے وجود کے اندر صبر کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

بڑھیا نے پھر بھاری انداز میں رانی سے کہا کہ۔

''تو چند دن دل بھر کر ہماری مخلوق کے بچے مہتا سے کھیل لے، اسے ہم خود لے جائیں گے''۔

نصیحت

کوئی ملک اس وقت تک غلام نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اپنے لوگ غداری نہ کریں کیوں کہ اکیلا لوہا جنگل سے ایک لکڑی نہیں کاٹ سکتا جب تک لکڑی اس سے مل کر کلہاڑی نہ بنے۔

(ثناء۔ کراچی)

''نہیں..... نہیں تجھے ہمارا آتشی لہو دینا ہی پڑے گا''۔

''اگر نہ دوں تو.....''

یہ تو بات نہ کر ہمیں اپنا آتشی لہو، بخوبی لینا آتا ہے۔ وہ ہم تمہیں دکھلا دیں گے اور اگر تو نے آرام سے ہمارا بچہ دے دیا تو یہ تیرے پریوار اور پرجا (عوام) کے لیے بہت اچھا ہو گا اور یاد رکھ اگر تو نے ہمارا بچہ نہ دیا تو پھر تجھے اور تیری رعایا کو اس کی بھاری قیمت چکانی پڑے گی''۔

اس خوفناک صورتحال کے پیش نظر فوری طور پر راجہ یادھو گنیش کو خبر کی گئی۔ وہ فوری طور پر اپنے محل پہنچا۔ اس نے فوراً اپنے محل کے اردگرد سخت پہرہ لگوا دیا۔ دونوں بچوں کی حفاظت کے لیے خصوصی تربیت یافتہ محافظوں کا دستہ بھی مقرر کر دیا گیا۔

دربار میں عام آدمی اور فقراء کے داخلے پر سخت پابندی لگا دی گئی۔

ایک صبح مہتا جو رات کو سونے کے بعد علی الصبح اٹھا۔ اس نے اپنی ماں کو یہ خبر سنائی کہ رات کو میرے خواب میں ایک عجیب سا بھوت آیا تھا۔ جس نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے کہا کہ ''بیٹا میں جلد تمہیں لینے آؤں گا''۔

رانی اس کی بات سن کر رونے لگی۔ محل اور بچوں کے اردگرد پہرہ مزید سخت کر دیا گیا۔

عوام نے اپنے تئیں پرارتھنا شروع کر دی۔ انہوں نے راجہ کو یقین دلایا کہ وہ ہر قسم کی قربانی مہتا

کے لیے دینے کو تیار ہیں۔ نیز راجہ کو یہ بھی کہا کہ وہ ہر صورت میں ڈٹا رہے اور اسے ہرگز بھی جن کے حوالے نہیں کرنا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سونم داس کو کسی قسم کی جسمانی صحت کے حوالے سے رمق برابر کچھ بھی نہ ہوا جبکہ مہتا کو شدید گردن توڑ بخار نے لپیٹ لیا۔ اس کا جسم جلتے توے کی مانند پھکنے لگا۔ دربار ملک کے قابل ترین حکماء، دوادارو کے ٹوٹکے کرنے والوں کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن سب کچھ بے کار ثابت ہوتا رہا۔ نیز یہ بھی ایک ناگہانی آفت، قیامت کی مانند اس ملک کی عوام پر یوں برسی کہ اس راجہ کی سلطنت میں گردن توڑ بخار کی وبا مکڑی کے جالے کی مانند پھیل گئی۔ جس سے رعایا تیزی سے مرنے لگی۔

ماہر عاملوں نے راجہ کو بتایا کہ۔

"یہ اوپری مخلوق اپنے وجود کا ثبوت غصہ کی صورت میں دے رہی ہے"۔ ادھر مہتا کا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

ایک ماہر عملیات جس کا نام تاریخ میں "کرپال" لکھا ہے اس نے پریشان راجہ کو بتایا کہ۔

"میں نے اپنے علم کے ذریعہ رجن نامی جن سے بات کی ہے اس نے مجھے بری خبر بتائی ہے کہ جب تلک راجہ یادھیوگنیش بذاتِ خود ہمارے بچے کو احترام سے ہمارے حوالے نہیں کرتا ہم یونہی اس کی پرجا اور مہتا کی رگوں میں آگ انڈیلتے رہیں گے اور اس کی تپش کبھی کم نہ ہوگی بلکہ اور بڑھے گی"۔

اس کے بعد ہوا یہ کہ نافوق الفطرت مخلوق کی جانب سے پیدا کی گئی گردن تور بخار کی وبا سے راجہ یادھیوگنیش کی ایک چوتھائی رعایا موت کے منہ میں چلی گئی۔ ادھر مہتا کی اتنی حالت خراب ہوگئی کہ وہ عین موت کے دہانے پر کھڑا ہوگیا۔ جید حکماء نے بھی رانی پریمیتا کو اس کی زندگی کے بچنے کے بارے میں ناامیدی ظاہر کردی۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ اس نے زندگی اور موت کے درمیان لمبے لمبے آخری سانس لینا شروع کردیئے اور اس کے ہر سانس کے ساتھ رجن جن بے قصور عوام کی جانیں لے رہا تھا۔

جب عوام نے یہ دیکھا کہ ان کی دی گئی قربانیاں رائیگاں جارہی ہیں تو انہوں نے بھی راجہ کے خلاف بعاوت کردی اور اسے کہا کہ۔

"وہ مرتے بچے مہتا کو ضدی جن کے حوالے کر دے، یہ تو ویسے بھی مر رہا ہے۔ لہٰذا رانی پریمیتا کو صبر کا کڑوا گھونٹ پی لینا چاہیے"۔

رانی پریمیتا اس صورتحال سے نیم پاگل ہوگئی۔

ادھر راجہ یادھیوگنیش نے بھی یہ سوچ کر ہتھیار پھینک دیئے کہ میری عوام نے میری خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ دیا ہے۔ لہٰذا اسے بھی اب رجن جن کی بات مان کر اپنی بقایا مخلص رعایا کی جان بچانے کی خاطر مہتا کو اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اس کے سوا اسے کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔

اس قدیم تاریخ میں یہ لکھا ہے کہ ماہر عملیات جنات کرپال نے رجن اور راجہ یادھیوگنیش کے درمیان بچے مہتا کو اس کے حوالے کرنے کے دیگر معاملات طے کروائے۔ وہ اس طرح تھے کہ......

مہتا ایک علیحدہ تنہا کمرے میں سوئے گا اور سوتی حالت کے دوران رجن اسے اپنی دنیا میں لے جائے گا۔

معاہدے پر عمل کیا گیا۔ بالآخر رجن ایک رات مہتا کی آتما کو اپنے پاس لے گیا۔ کمرہ کھولنے پر مہتا کا مردہ جسم کمرے میں پڑا ملا تھا۔

اس کہانی کا تکلیف دہ پہلو یہ بھی ہے کہ رانی پریمیتا نے بچے کی جدائی کو برداشت نہ کرتے ہوئے انتہائی صدمہ کے عالم میں زہر کھا کر خودکشی کرلی تھی۔

اس کہانی کی تصدیق "فاھیان" ایک مشہور مورخ نے چینی زبان کے ایک جریدے نما کتاب میں کی۔

☠

ڈیتھ سٹی

گلاب خان سولنگی۔ کشمور

وہ کافی وسیع ریسٹورنٹ تھا جبکہ برقی روشنیوں کی وجہ سے وہ کافی روشن اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا سامنے والی دیوار پر اسے صرف اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا لیکن اسے کسی اور کا عکس بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ......

نیک خواہشات اور اچھی یادیں انسانی زندگی کی سرمایہ ہوتی ہیں، کہانی پڑھ کر تو دیکھیں

"**حیرت** ہے! نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات؟ یہ کیسا شہر ہے؟" رچرڈ نے خودکلامی کرتے ہوئے آس پاس کا جائزہ لیا اور ایک طرف چل دیا......

رچرڈ امریکن آرمی میں ایک سولجر تھا اور لانگ لیو پر اپنے آبائی قصبے کیپٹیل ٹاؤن میں آیا ہوا تھا۔ جو ریاست کیلی فورنیا کے نواح میں واقع تھا۔ کہنے کو تو وہ ٹاؤن تھا، مگر کسی پسماندہ افریقی ممالک کی طرح بیک ورڈ، جنگلوں میں گھرا ہوا اور بنیادی سہولیات سے محروم چھوٹا سا قصبہ تھا جسے ٹاؤن کا درجہ دیا گیا تھا۔

رچرڈ کا چھوٹا سا خاندان ان افراد پر مشتمل تھا۔ رچرڈ کا نانا مسٹر ہینگری گریٹ، رچرڈ کی بیوی سارہ اور چھوٹا سا بچہ مارٹن، بس رچرڈ کی یہی ساری دنیا تھی۔ رچرڈ نے جب آنکھ کھولی تو اپنے نانا کو پایا، ماں باپ کب گزرے اسے پتا ہی نہ چلا، نانا ہی نے اسے پالا پوسا اور اپنی کالج لائف کی گرل فرینڈ سارہ کو اپنا جیون ساتھی بنا کر وہ امریکن آرمی میں بھرتی ہوگیا اور ویسے بھی وہ مڈل کلاس طبقے سے تھا اس لئے فوج کی نوکری پر ہی اکتفا کرلیا۔ اپنی محدود خواہشوں کے ساتھ وہ اپنے مختصر سے کنبے کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزار رہا تھا۔

مارٹن کے پیدا ہوتے ان کی زندگی میں جیسے بہار آ گئی ہو۔ وہ اپنی بیوی اور بچے سے بے انتہا پیار کرتے تھے

اس لئے وہ اپنے ہم عصر دوستوں کے ساتھ نائٹ کلب' شراب اور جوئے جیسی خراب عادات سے پرہیز کرتا تھا۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتا تھا اور ایسی فضولیات میں نہیں پڑتا تھا اور اپنے دوستوں کو بھی منع کرتا رہتا تھا۔ مڈل کلاس ہونے کی وجہ سے وہ ہر مرتبہ نظر انداز ہوتا رہا' لیکن پھر بھی وہ اپنے کام سے مخلص تھا۔ وہ امریکی ماحول سے بخوبی واقف تھا' پروموشن کے نام پر وہ اپنے سینئرز کی خوشامد اور چاپلوسی اور اپنی خوبصورت بیوی کو ایسے ماحول سے دور کیپٹیل ٹاؤن جیسے بیک ورڈ قصبے میں رکھنا گوارا کیا لیکن اپنے آپ کو ایسے غلیظ ماحول کا حصہ نہیں بنایا جو ماحول امریکن آرمی میں بکثرت پایا جاتا ہے اور آئے دن میڈیا پر ایسے واقعات کے انکشافات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ خیر وہ اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے سرانجام دے رہا تھا۔

پچھلے دنوں رچرڈ طویل چھٹیوں پر آیا ہوا تھا' وہ اپنی بیوی اور بچے کو زیادہ سے زیادہ وقت دینا چاہتا تھا اس لئے وہ ہر وقت اپنے گھر میں موجود رہتا تھا۔

ایک دن اسے اپنے دفتر سے ایک آفیسر کا فون آیا "سوری رچرڈ' آپ کو چھٹی پر ڈسٹرب کیا' آئی ہوپ آپ کی چھٹی اچھی گزر رہی ہوگی' بس ایک چھوٹا سا کام تھا' اس لئے آپ کو زحمت دی"۔

رچرڈ نے جواب دیا "سر میں چھٹی پر ہوں یا ڈیوٹی پر' میں ایک سولجر ہوں آپ حکم کریں' کیا کام ہے؟"

دوسری طرف سے آواز آئی "رچرڈ آپ کو کل کیلی فورنیا کے ایک قصبے میں جانا ہوگا' وہاں پر ہمارے دفتر کی ایک برانچ ہے' آپ نے وہاں کے آفیسر انچارج سے ملنا ہے وہ آپ کو ایک پارسل دے گا آپ نے وہ پارسل اپنے پاس سنبھال کر رکھنا ہے اور چھٹی ختم ہونے پر وہ پارسل یہاں ہیڈ کوارٹر لے آنا' لیکن یاد رہے' وہ بہت قیمتی پارسل ہے' اس لئے بڑے محتاط انداز میں اسے سنبھال کر رکھنا ہے اور ہر وقت کانٹیکٹ میں رہنا ہے۔"

"یس سر! میں سمجھ گیا' آپ بے فکر رہیں' پارسل آپ تک پہنچ جائے گا' میں کل ہی آپ کے بتائے ہوئے پتے پر جا رہا ہوں اور وہاں پہنچ کر میں آپ سے رابطہ بھی کروں گا' او کے گڈ بائے"۔

سارہ نے مسرت کے ساتھ اس کا موبائل چھینا "یہ کیا رچرڈ' اتنے مہینوں بعد گھر آئے ہو اوپر سے آپ کے دفتر کے کام' آپ کا گھر تک پیچھا نہیں چھوڑتے' اتنا کام تھا تو چھٹی پر کیوں آئے....."؟

رچرڈ نے مسکرا کر بڑے ہی رومانٹک انداز میں سارہ کو اپنی باہنوں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا "ڈارلنگ! میرے اوپر دفتر والوں کا بھی حق ہے' لیکن تم سے تھوڑا..... بس صرف ایک دن ہی کی تو بات ہے' مجھے خوشی ہوگی کہ میں چھٹی پر ہوتے ہوئے بھی دفتر کے کسی کام آسکا' اور ویسے بھی اس قصبے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے' اس بہانے سے ہمیں تھوڑا گھومنے کا موقع بھی ملے گا' اور ہاں اگر وہ جگہ مجھے پسند آئی تو میرا پرومس ہے کہ اگلی دفعہ تم لوگوں کو بھی وہاں پر گھمانے ضرور لے جاؤں گا' اب خوش ہو"۔

وہ اپنے نانا کے کمرے میں گیا جو کہ اسٹڈی میں مصروف تھے "آؤ رچرڈ میرے پاس بیٹھو" رچرڈ نانا کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا "نانا جان آپ یہ ہر وقت ہارر ادب کیوں پڑھتے رہتے ہیں' میرا مطلب ہے کسی اور موضوع کی کتابیں.....؟" مسٹر ہینگری گریٹ نے چشمہ اُتارتے ہوئے ایک طویل ٹھنڈی آہ بھری "بیٹا! تمہارے خیال میں ڈر یا خوف کی کیا معنی ہے' یا لوگ ڈراؤنی باتوں پر' ڈراؤنے قصوں پر اور ڈراؤنی چیزوں کو دیکھ کر یا محسوس کر کے کیا سبق حاصل کرتے ہیں؟"

"نانا جان! مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ بچپن میں مجھے کسی شرارت یا ہوم ورک نہ کرنے پر آپ مجھے کسی چڑیل یا بھوت کا نام لے کر ڈراتے تھے اور میں ڈر کے مارے سہم جاتا تھا' اب حقیقی زندگی میں ان چیزوں کا وجود..... یہ ایک حل طلب سوالیہ نشان ہے؟"

"رچرڈ! میری ایک نصیحت یاد رکھنا! اگر کبھی حقیقی زندگی میں کسی مافوق الفطرت مخلوق کا سامنا ہو جائے تو جتنی جلدی ہو سکے وہاں سے نکل جانا' دیکھو ان چیزوں کا سایہ نہیں ہوتا اور ایسی مخلوق صرف مزاحمت کرنے پر سامنے والے پر وار کرتی ہیں۔"

رچرڈ نے اُٹھتے ہوئے کہا "نانا! اب میں بڑا ہو گیا ہوں' اور ویسے بھی میں اک سولجر ہوں' اب آپ کی ایسی باتوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں' رات بہت ہو گئی ہے اور آپ بھی اب آرام کریں' گڈ نائٹ۔" رچرڈ نے لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں آ کر نیند کی وادیوں میں کھو گیا۔

صبح سویرے وہ اٹھا اور سفر کی تیاری میں لگ گیا۔

"گڈ مارننگ" سارہ نے اسے صبح کا سلام کہا جبکہ چھوٹو ابھی تک سو رہا تھا کتنا کیوٹ لگ رہا تھا' رچرڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا جبکہ تھوڑی دیر بعد سارے افراد ناشتے کی ٹیبل پر جمع تھے۔ "نانا! کبھی آپ گرین سٹی قصبے گئے ہیں جہاں میں جا رہا ہوں۔"

مسٹر ہینگری گریٹ نے چائے کی چسکی لگاتے ہوئے جواب دیا "بیٹا میں نے بھی صرف نام سنا ہے' مگر وہاں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا' سنا ہے بہت سرسبز علاقہ ہے جو کہ جنگلات کے درمیان گھرے ہوئے اس شہر کو گرین سٹی اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کے آس پاس گھنے اور سرسبز جنگلات ہی جنگلات پائے جاتے ہیں' لیکن وہ بہت ہی خطرناک قسم کے جنگلات ہیں' اس لئے بیٹا اندھیرا ہونے سے پہلے آپ کو گرین سٹی پہنچنا ہوگا اور وہاں جا کر ہمیں فون ضرور کرنا۔" "نانا اس لئے تو میں جلدی جا رہا ہوں۔" رچرڈ نے پھر سارہ سے مخاطب ہو کر کہا "میرا سامان تیار ہے تو لے آؤ' اور ہاں وہ میرا ریوالور بھی تو سامان میں رکھا تھا؟"

وہ بولی "جی ہاں مسٹر رچرڈ عرف امریکن سولجر..... ارے میرے پیارے میاں! یہ آپ فوجی لوگ بھی ناں....."

"ارے بھائی دفتر کے کام سے جا رہے ہو' کسی جنگ پر نہیں۔" نانا درمیان میں بول پڑے "رچرڈ میاں! اگر اس کا لائسنس بھی لے جاؤ تو اس میں کوئی ہرج نہیں اور ویسے بھی علاقہ بہت پراسرار اور پرخطر ہے' مبادہ اس کی ضرورت پڑ جائے' اور ویسے بھی ہتھیار تو سولجر کی طاقت ہوتی ہے۔" سارہ نے اسے بیگ تھمادی وہ سب سے ملا اور گڈ بائے کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

کیپٹیل ٹاؤن کے چھوٹے سے بس اسٹاپ پر بڑی رونق اور چہل قدمی لگی ہوئی تھی' اس نے ایک بس ڈرائیور سے گرین سٹی کا پتہ پوچھا "صاحب وہاں تو کوئی بس نہیں جاتی' البتہ آپ کو کیلی فورنیا والی بس پکڑنی پڑے گی جو آپ کو راستے میں اتارے گی وہاں سے ایک ٹوٹا پھوٹا لنک روڈ ہے' جہاں اگر کوئی گاڑی مل گئی تو غنیمت' ورنہ پیدل ہی آپ کو سفر کرنا پڑے گا..... اور اگر آپ کو زیادہ جلدی ہے' تو وہاں سے ایک شارٹ کٹ بھی ہے جو جنگل میں سے گزرتا ہے۔"

رچرڈ نے کیلی فورنیا کی بس پکڑلی' شام کے وقت کنڈیکٹر نے آواز دی "گرین سٹی جانے والے اس اسٹاپ پر اتریں" بس نے بریک لگائی اور رچرڈ کے علاوہ کوئی بھی نہیں اترا پھر بس روانہ ہو گئی' بہت عجیب و غریب سٹاپ تھا' نہ وہاں کوئی لنک روڈ تھا اور نہ ہی کوئی آبادی' صرف دیوہیکل درخت ہی درخت تھے جن کے سائے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ "یار اتنا بڑا شہر ہوگا' وہاں کوئی سواری کیوں نہیں جاتی' اور یہ لنک روڈ کدھر غائب ہو گیا؟" وہ بیزاری سے خود کلامی کیے جا رہا تھا' وہ چند قدم آگے گیا تو اسے ایک بورڈ نظر آیا "گرین سٹی وس وے" بورڈ پر بنے تیر کا رُخ جنگل کے مغربی حصے کی طرف تھا' "شکر ہے گرین سٹی شاید نزدیک ہے جو یہاں سائن بورڈ لگا ہوا ہے..... کون پاگل کہتا ہے کہ اس ملک نے ترقی کر لی ہے' لگتا ہے مجھے پیدل ہی اس ویرانے میں سفر کرنا پڑے گا اور ویسے بھی اس ویرانے میں کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں ہے۔" وہ خود کلامی کرتا گیا اور جنگل کے مغربی حصے میں داخل ہو گیا' شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے' اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی جنگل میں تاریکی چھائی ہوئی تھی' پورا جنگل چرند پرند کی آوازوں سے گونج رہا تھا' وہ بے خوف ہو کر آگے بڑھتا جا رہا تھا' وہ موبائل پر سارہ سے باتیں کرنے میں مصروف تھا' کافی دیر وہ چلتا رہا' اب رات کی تاریکی چھا گئی تھی' اُس نے بڑا سا ٹارچ پکڑا ہوا تھا' جس کی روشنی میں وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا' وہ اب تک جنگل کے بھیانک ماحول سے بے نیاز ہو کر اپنا سفر جاری رکھا تھا' اپنی فوجی لائف میں وہ کافی مرتبہ ایسے سفر کر چکا تھا' اس لئے وہ جنگل اُسے ڈرانے میں اب تک ناکام رہا تھا' سردی کی شدت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا اس لئے اس نے بیگ میں سے ایک بڑا سا اوور کوٹ نکالا اور

زیب تن کیا۔ آخرکار چلتے چلتے اُسے دُور کہیں سے روشنی نظر آنے لگی اور جب جنگل کے حدود ختم ہوئے تو اُسے ایک چھوٹا سا لنک روڈ دکھائی دیا جس پر ایک سائن بورڈ لگا تھا۔

''ویلکم ٹو گرین سٹی' جسٹ 2 کلومیٹر''

رچرڈ بہت خوش ہوا' سامنے گرین سٹی کی لائٹیں دُور سے ہی چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں جبکہ وہ خوشی خوشی قدم اُٹھاتا ہوا سڑک پر گرین سٹی کی طرف رواں دواں تھا۔ دو کلومیٹر ختم ہوئے اور اب اس کے سامنے شاندار گرین سٹی کی عمارات اور بڑے بڑے پلازے دیکھ کر وہ چکرا سا گیا۔

''بہت خوب' اتنا بڑا شہر لوگوں کی آنکھوں سے اوجھل کیسے ہو سکتا ہے' جبکہ ہمارے ملک کے سائنسدانوں نے تو خلاؤں میں بھی بڑے بڑے سیارے ڈھونڈ نکالے ہیں' تو پھر یہ شہر...... ویری اسٹرینج؟''

سفر کی تھکاوٹ اور بھوک سے نڈھال رچرڈ نے سوچا سب سے پہلے پیٹ پوجا کی جائے بعد میں دوسرے کام' سو وہ کسی اچھے ریسٹورنٹ کی تلاش میں نکلے' وہ شہر کی مرکزی سڑک پر کھڑا شہر کا نظارہ کر رہا تھا' ہر طرف بلند و بالا عمارات' شاپنگ پلازے' سڑک پر کھڑی سینکڑوں گاڑیاں لیکن حیرت انگیز طور پر سب کے سب خالی' پورے شہر میں اُسے ایک بھی انسان نظر نہیں آیا تو وہ اضطرابی کیفیت میں بولا ''حیرت ہے! نہ کوئی بندہ' نہ بندے کی ذات؟ یہ کیسا شہر ہے؟'' آخرکار اسے ایک ریسٹورنٹ نظر آ ہی گیا جس کی روشنیاں دُور سے ہی دل کو بھا رہی تھیں' وہ بوجھل قدموں سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوا' وہاں اُسے کچھ آدمی دکھائی دیئے جو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے ٹیبل پر ایک لال رنگ کا مشروب پڑا ہوا تھا' شاید یہ یہاں کا مشہور مشروب ہوگا' تبھی تو ہر کسی کے سامنے پڑا تھا۔

خیر رچرڈ بھی ایک چیئر پر بیٹھ گیا' اس نے ادھر اُدھر کا جائزہ لیا' سبھی لوگ اس کی طرف گھور رہے تھے جبکہ اُن کی نظروں کی چبھن وہ شدت سے محسوس کر رہے تھے' عجیب قسم کے انسان تھے بالکل کسی مُردے کی طرح' چہرے کا رنگ زردی سفید اور آنکھیں زندگی سے عاری ماحول میں عجیب سی بے چینی اور خنکی تھی۔

''کیا کھاؤ گے جناب؟'' وہ ویٹر کی آواز سے یکدم چونکا' ایک مریل قسم کا ویٹر اس کے سامنے کھڑا تھا جس کی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ ''یار کوئی سبزی ہو تو لے آؤ اور وہ لال شربت بھی'' رچرڈ کو بہت پیاس لگی تھی۔

''یہاں صرف گوشت ملتا ہے اور وہ بھی صرف......؟ وہ کہتے کہتے رک گیا تو رچرڈ نے اسے بیزاری سے کہا ''صرف کیا'' وہ پھر گویا ہوا ''وہ بھی صرف انسان کا۔''

یہ سنتے ہی رچرڈ کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا ''کیا بکواس کر رہے ہو؟ بہت ہی بدتمیز قسم کے ویٹر ہو جو ایسا گھٹیا مذاق کر رہے ہو' کدھر ہے تمہارا منیجر' میں تمہاری شکایت کروں گا۔'' وہ بڑی بے پرواہی سے بولا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں صاحب! یہ جو آپ کے سامنے مشروب نظر آ رہا ہے ناں! وہ مشروب نہیں بلکہ انسانی خون ہے۔'' یہ سنتے ہی رچرڈ کا پارہ اپ ہو گیا وہ سیٹ سے اُٹھا اور منیجر کے کاؤنٹر کے پاس آیا ''منیجر صاحب! بڑا ہی بدتمیز ویٹر ہے آپ کا' کیا آپ نے انہیں تمیز نہیں سکھائی کہ کسٹمرز کے ساتھ کس طرح بات کرتے ہیں؟''

منیجر جو کہ اب تک سر جھکائے کھڑا تھا اپنا مُنہ اوپر کیا ''ہم معذرت خواہ ہیں' آپ کو زحمت اُٹھانا پڑی...... دراصل ہمارے ویٹر کو مذاق کرنے کی عادت ہے' آپ پلیز! اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ جایئے' میں کسی اور ویٹر کو بھیجتا ہوں' دراصل ڈیتھ سٹی۔ اوہ معاف کرنا گرین سٹی کے لوگوں کو گوشت بہت پسند ہے' اسی لیے یہ سبزی وغیرہ بہت کم بکنے والی آئٹم ہے اور ویسے بھی جو مزہ گوشت میں ہے' وہ سبزی کھانے میں کہاں۔'' لیکن اس کی آنکھوں سے بھی وحشت عیاں تھی۔

رچرڈ دوبارہ واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا' وہ سوچ رہا تھا کہ گفتگو کے درمیان اس منیجر نے گرین سٹی کو ڈیتھ سٹی کیوں کہا؟؟؟ ہوٹل میں بیٹھے دیگر لوگ مسلسل اسے گھورے جا رہے تھے جبکہ کن انکھیوں سے رچرڈ سب کا جائزہ لے تھا' وہ کافی وسیع ریسٹورنٹ تھا جبکہ برقی روشنیوں کی وجہ سے وہ کافی روشن اور خوبصورت دکھائی دے رہا تھا' سامنے والی دیوار پر اُسے اپنا عکس واضح دکھائی دے رہا تھا' لیکن حیرت انگیز طور پر اُسے کسی اور کا سایہ دکھائی نہیں دیا۔

سامنے سے آنے والے ویٹر کا بھی سایہ غائب تھا' اُسے اپنے نانا کے الفاظ یاد آنے لگے۔

''بیٹا مافوق الفطرت مخلوق یا جن بھوت کا سایہ نہیں ہوتا' ایسی مخلوق کو دیکھ کر وہاں سے فوراً نکل آنا۔''

پہلی مرتبہ اس نے اپنی پیشانی سے پسینہ خشک کیا' وہ دم بخود رہ گیا' ڈر کے مارے اس کی سٹی گم ہو گئی' خود کو بہادر سورما سمجھنے والا رچرڈ' ایک مجبور اور سہما ہوا لاچار انسان نظر آ رہا تھا' وہ جلد سے جلد وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا' اس نے موبائل چیک کیا لیکن کوئی بھی سگنل نہیں آ رہا تھا' سب اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے' اُسے بار بار اپنے نانا کی نصیحت یاد آ رہی تھیں' وہ اکیلا اُن سے لڑنے سے تو رہا' مگر اپنی جان بچانے کی غرض سے اُسے یہاں سے بھاگنا تھا' اب سارے لوگ اُٹھے اور سب کے سب رچرڈ کی طرف بڑھنے لگے۔ رچرڈ نے ریوالور نکالا اور ہوائی فائر کرتے ہوئے سب کو للکارا ''خبردار جو میرے نزدیک آئے' سب کو بھون ڈالوں گا'' لیکن جیسے کسی نے سُنا ہی نہ ہو اور وہ بدستور اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔

رچرڈ الٹے پاؤں دروازے کی طرف بڑھ رہا تھا' جبکہ ریوالور کا رُخ ان کی طرف کیا ہوا تھا' اس نے اب تک نہ جانے کتنے معرکے سرانجام دیئے تھے' لیکن اب کی بار اس کے سامنے عام انسان نہیں' بلکہ آدم خور درندے کھڑے تھے جو کسی بھی انسان کو منٹوں میں چٹ کر جاتے تھے۔

وہ ڈر کا مطلب سمجھ گیا تھا' اسے تو اپنی بیوی اور بچے کی فکر ستانے لگی کہ اسے کچھ ہو گیا' تو ان بے چاروں کا کیا بنے گا' اگر وہ تھوڑی اور دیر کرتا تو دروازہ بند ہو جاتا' لیکن اس نے سرعت کے ساتھ باہر والا دروازہ پار کر لیا اور اپنے پاؤں پر زور رکھتے ہوئے دوڑ لگا دی' وہ سرپٹ دوڑ رہا تھا' وہ خوف کے مارے پیچھے بھی نہیں دیکھ رہا تھا' اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے پورے شہر کے آدم خور اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

دوڑ دوڑ کر اس کا بُرا حال ہو گیا تھا' آخرکار وہ شہر کی حدود سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا' دور سے وہ روشنی کتنی اچھی لگ رہی تھی' لیکن اندر شہر کے حالات' رچرڈ نے آخری بار شہر کو دیکھا اور پھر جنگل میں داخل ہو گیا۔

[illegible]

آدمی تھا جسے شہر سے ڈر لگ رہا تھا' وہ جنگل سے بے خوف گزر رہا تھا' وہ رُکا نہیں بس چلتا گیا' چلتا گیا......

آخر وہ کیلی فورنیا والی مرکزی سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا' جہاں سے وہ بس میں اُترا تھا۔

اب صبح ہو چکی تھی وہ اکیلا سڑک کنارے کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ اسے دُور سے ایک کار نظر آئی' رچرڈ نے اسے اشارہ دیا' کار رُکی اور ایک ادھیڑ عمر شخص اُترا' رچرڈ نے آگے بڑھ کر اُسے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ وہ شخص رچرڈ کے ساتھ اس سائن بورڈ کی طرف آیا جس کا رُخ حیرت انگیز طور پر اب شمال کی طرف تھا' ''لیکن جس وقت میں بس میں سے اُترا تھا' تو اس ایرو کا رخ مغرب کی جانب تھا...... اب کیسے؟''

وہ شخص مسکرایا ''میرے دوست' بورڈ اپنی جگہ دُرست سمت ظاہر کر رہا ہے' کیوں کہ گرین سٹی ٹھیک یہاں سے دس کلومیٹر کی دوری پر شمال کی طرف واقع ہے اور اتفاق سے میں بھی وہیں جا رہا ہوں' لگتا ہے کسی نے آپ کے ساتھ مذاق کیا ہے' خیر چھوڑ دا سے آؤ میں آپ کو گرین سٹی ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' رچرڈ گرین سٹی سے اپنا پارسل وصول کر کے واپس اپنے گھر کیپٹیل سٹی آ گیا اور سب کو اپنے سفر کی روداد سنائی' پہلے تو سب پریشان ہوئے' مگر رچرڈ کو زندہ سلامت دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئے۔

کچھ عرصہ بعد رچرڈ کے نانا انتقال کر گئے اور اب وہ ساری کتابیں رچرڈ کے زیر مطالعہ تھیں' ایک دن وہ کتابیں دیکھ رہا تھا کہ اس کی نظر ایک کتاب پر پڑی جس کا نام تھا ڈیتھ (Death City) وہ سوچ رہا تھا یہ نام میں نے پہلے بھی کہیں سُنا ہے۔

''اوہ مائی گاڈ'' اسے سب کچھ یاد آ گیا ''تو کیا کتابی کردار زندہ ہو سکتے ہیں؟......'' رچرڈ نے ساری کتابیں دریابرد کر دیں اور اپنا مکان تبدیل کر کے وہ کیلی فورنیا میں ایک خوشحال زندگی گزارنے لگا۔

محبت کے قاتل

قاسم رحمان۔ ہری پور

لڑکی کمرے کا دروازہ لاک کرکے اندھیرے میں محو خواب تھی کہ اچانک اسے اپنے کان کے قریب سرگوشی سنائی دی۔ اپنی آنکھیں کھول دو اور جتنی جلدی ہوسکے میرے پاس آئو۔ میں قریبی قبرستان میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔

ایک خوبرو حسینہ کی دل دہلاتی خوفناک داستان حیرت جس نے لوگوں کو لرزا کر رکھ دیا تھا

ویران سڑک پر ایک کار فراٹے بھرتی ہوئی جارہی تھی۔ کار میں اس وقت دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں جو اپنی ایک دوست کی برتھ ڈے پارٹی پر گئی تھیں۔ وہ دونوں لڑکیاں آپس میں کزنز بھی تھیں ان میں ایک کا نام ہما اور دوسری کا نام فاریہ تھا۔

ہما اور فاریہ اپنے والدین کی اکلوتی اولادیں تھیں۔ فاریہ کے ابو سلیم فاروقی اور ہما کے ابو مشتاق فاروقی آپس میں بھائی تھے۔ سلیم فاروقی، مشتاق فاروقی سے بڑے تھے اور دونوں بھائی مل کر اپنے مرحوم والد احمد فاروقی کا بزنس سنبھالتے تھے۔

''یار ہما بہت دیر ہوگئی ہے، اب کار تیز چلاؤ۔'' فاریہ نے کہا۔ ڈر اس کے لہجے سے مترشح تھا کیونکہ جب بھی اسے گھر پہنچنے میں دیر ہوجاتی تو اس کی امی سہلی اس کی اچھی خاصی کلاس لے لیتی تھیں اور آج تو پونے گیارہ بج گئے تھے۔

''یار میں اور کتنا تیز چلاؤں مجھے خود ڈر لگ رہا ہے۔ ایک تو یہ ویران سڑک اور اوپر سے گھر والوں کا ڈر..... امی تو خیر نانو کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ لیکن آج تائی امی کے عتاب سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا۔'' ہما نے کہا۔

''رمشا خود تو سکون سے سوگئی ہوگی۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ایسی بے ڈھنگی خواہش کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ یار اگر اس کا برتھ ڈے نہ ہوتا تو سچ میں، میں نے اس کی بات نہیں ماننی تھی۔ دیکھو بات مانی تو اب ہم خود مصیبت میں ہیں۔'' فاریہ بولی۔

فاریہ کی بات سن کر ہما نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''بس کرو اب پچھتانے سے کیا فائدہ۔''

تھوڑی دیر گاڑی میں خاموشی رہی۔ ہما ڈرائیونگ کرتے کرتے اکتا گئی تھی۔ اور باہر انتہائی بے زاری سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جبکہ سامنے سے ایک بوڑھا شخص تیزی سے گاڑی کی طرف بھاگا چلا آرہا تھا۔

فاریہ نے اس بوڑھے کو دیکھ لیا تھا۔ گاڑی اور اس کا فاصلہ تھوڑا ہی رہ گیا تھا کہ پھر وہ بھی بے وقوف آگے سے ہٹنے کے بجائے مسلسل گاڑی کی طرف ہی آرہا تھا۔

فاریہ زور سے چلائی۔ ''ہما کار روکو سامنے دیکھو۔''

ہما پہلے تو اعصاب باختہ ہوگئی پھر اس نے سامنے دیکھا اور سامنے دیکھ کر اس نے بریک لگائی مگر تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

وہ بوڑھا زبردست طریقے سے کار سے ٹکرایا اور فضا میں اچھلتا ہوا دور جا گرا۔ ہما کا سر زور سے اسٹیئرنگ سے ٹکرایا۔ فاریہ بھی ونڈ اسکرین سے ٹکرائی لیکن وہ اپنے

ہوش وحواس میں رہی۔ جب کہ ہما بے ہوش ہوچکی تھی۔ اس کے ماتھے سے خون کی لکیر نمودار ہوچکی تھی۔ جب کہ سامنے پڑے ہوئے اس بوڑھے کے بارے میں فاریہ کوئی بھی رائے قائم کرنے سے قاصر تھی کہ وہ زندہ ہے یا زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا ہے۔

فاریہ نے ہما کا بازو پکڑ کر اسے جھٹکا دیا تو ہما ہوش میں آگئی۔ مگر اس کا سر مسلسل چکرا رہا تھا۔

''ہما ہما! تم ٹھیک تو ہو نا؟؟'' فاریہ بے چینی سے بولی، شدت پریشانی کی وجہ سے اس کی آنکھوں میں موتی جھلملانے لگے تھے۔

''ہاں..... بہتر ہوں..... وہ الو کا پٹھا کہاں ہے جس کی وجہ سے ایکسیڈنٹ ہوگیا؟'' ہما کمزور لہجے میں بولی۔

''وہ..... سامنے پڑا ہے پتا نہیں زندہ بھی ہے یا مرگیا؟'' فاریہ نے جواب دیا۔

''اوہ! اب کیا کریں۔'' ہما کے چہرے پر عجیب کشمکش کی کیفیات پیدا ہوگئی تھیں۔ ''میرے خیال میں پہلے آتر کر دیکھتے ہیں۔''

''ہما تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ کیا تمہیں پتہ نہیں کہ ہم کتنا لیٹ ہوچکے ہیں پہلے ہی.....'' فاریہ کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

''ہم لیٹ تو ہوچکے ہیں۔'' ہما نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن فاریہ یہ بھی سوچو کہ اگر وہ شخص زندہ ہے اور ہم اسے ابھی اسپتال نہ لے کر گئے تو وہ مرجائے گا۔''

''میں جو کچھ بھی کہہ لوں تم نے میری بات ماننی نہیں ہے۔ تو چلو دیکھتے ہیں۔'' فاریہ کوفت زدہ لہجے میں بولی۔

''اس کی نبض تو چل رہی ہے لیکن رک رک کر..... اس کو فوراً اسپتال لے کر جانا ہوگا۔'' ہما نے بوڑھے کی نبض چیک کرتے ہوئے کہا۔

''چلو پھر لیکن امی نے کچھ بھی کہا تو ذمہ داری تم پر ہوگی یہاں نیٹ ورک پرابلم ہے ورنہ میں کال کرکے انہیں بتادیتی۔''

☆.....☆.....☆

سوری! آپ نے اس بندے کو لانے میں دیر کردی، یہ اب نہیں رہا۔ ڈاکٹر نے بوڑھے کی دھڑکن اور نبض چیک کرنے کے بعد کہا۔

''ویسے یہ آپ کے کیا لگتے ہیں؟'' ڈاکٹر نے ایک بار پھر پوچھا جبکہ ہما اور فاریہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کریں۔

''ہمارے کچھ نہیں لگتے یہ..... بس ان کا ہماری کار کے ساتھ ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔'' فاریہ نے جواب دیا۔

"تو اب؟؟ آپ ایسا کریں کہ اپنے گھر چلی جائیں رات بہت ہوچکی ہے۔ آپ کی فیملی بھی پریشان ہوگی۔ میں لاش کو اسپتال کے ڈیڈ ہاؤس میں بھجوادیتا ہوں۔ کل دیکھتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔" ڈاکٹر بہت اچھا انسان تھا جو کہ ان کے ساتھ اتنا تعاون کررہا تھا۔

"تھینک یو ڈاکٹر پھر ہم صبح آجائیں گے۔ اللہ حافظ۔" فاریہ نے کہا اور ہما کو لے کر اسپتال سے باہر نکل آئی۔ ہما اپنے ماتھے کی بنڈیج کرواچکی تھی۔ لیکن اس وقت وہ بہت گم صم اور عجیب سی حالت میں تھی۔ حالانکہ وہ مشکلات کا سامنا کرنے والی لڑکی تھی۔ لیکن اس وقت نجانے اسے کیا ہوگیا تھا۔

"ہما کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

سر میں زیادہ درد ہورہا ہے۔" فاریہ تفکر سے بولی۔

"کیا کہا تم نے؟" ہما چونکتے ہوئے بولی۔

"میں پوچھ رہی تھی کہ کیا تمہارے سر میں بہت درد ہورہا ہے؟" فاریہ نے اپنا سوال دہرایا۔

"درد..... کہاں..... سر میں۔" ہما اپنے سر کو ہاتھ لگاتے ہوئے نا سمجھتے ہوئے بولی۔

"لگتا ہے انجکشن کی وجہ سے تمہیں نیند آرہی ہے۔ خیر اب ہم گھر پہنچنے والے ہیں۔" فاریہ نے کہا۔

"جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو سلمیٰ بیگم نے ان پر چڑھائی کردی۔ لیکن پھر ایکسیڈنٹ اور ہما کے ماتھے کی بینڈیج دیکھ کر پریشان ہوگئیں۔ فاریہ نے ان کو تسلی دلائی کہ اب ہما ٹھیک ہے تو سلمیٰ بیگم کی پریشانی ذرا کم ہوئی۔ فاریہ اس بوڑھے کی ڈیتھ کی بات کو گول کرگئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ہما آج یونیورسٹی نہ گئی تھی کل رات کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے اس کے ماتھے میں چوٹ آئی تھی اور آج صبح سر میں بھی درد ہورہا تھا اس لئے فاریہ کو اکیلے ہی یونیورسٹی جانا پڑا تھا۔ فاریہ کا ارادہ تھا کہ اپنی کلاسز لینے کے بعد وہ اسپتال جائے گی اور کل والے مسئلے کو حل کرے گی۔"

فاریہ کلاس میں بیٹھ گئی۔ کلاس اسٹارٹ ہونے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔ فاریہ کلاس میں اکیلی تھی کہ وہاں اچانک ساحر آگیا۔ "ساحر فاریہ کا کلاس فیلو ہونے کے ساتھ اس کا اچھا دوست بھی تھا۔

"کل تم گئی تھی رمشا کے برتھ ڈے پارٹی میں؟" ساحر نے اس سے پوچھا۔

"ہاں میں اور ہما دونوں گئی تھی۔ باقی ہمارے سب ہی دوست وہاں تھے سوائے تمہارے؟" مگر تم کیوں نہیں تھے؟" فاریہ نے پوچھا۔

"بس یار گھر میں کچھ کام تھا اس لئے میں نہیں آپایا؟ رمشا کچھ کہہ رہی تھی میرے بارے میں۔"

"ہاں اسے کافی غصہ تھا تم پر۔" فاریہ نے جواب دیا۔

"ہما نہیں آئے گی آج؟"

"نہیں آج وہ نہیں آئے گی اس کے سر میں شدید درد تھا۔"

"ٹھیک ہے....." ساحر بولا۔

اتنی دیر میں باقی سارے اسٹوڈنٹس بھی آگئے تھے اور ٹیچر بھی۔ ان کی کلاس اسٹارٹ ہوگئی۔

یونیورسٹی سے فارغ ہوکر فاریہ اسپتال آگئی اور اس ڈاکٹر سے ملی جس نے کل رات اس بوڑھے کو ٹریٹ منٹ دیا اور ان کے ساتھ اچھا خاصا تعاون بھی کیا تھا۔ اس ڈاکٹر کا نام آصف تھا۔

"کچھ پتہ نہیں چلا کہ وہ بوڑھا کون تھا؟ اس کا حلیہ بھی بہت عجیب سا تھا۔ گلے میں اتنی عجیب وغریب مالائیں اور ہاتھوں میں اتنی انگوٹھیاں اوہ..... خیر یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔" ڈاکٹر آصف، فاریہ کو بتارہا تھا۔

"تو اب کیا ہوسکتا ہے؟" فاریہ نے پوچھا۔

ڈاکٹر آصف پہلے کچھ لمحات تک چپ رہا پھر وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "اگر یہ بات میڈیا میں آگئی کہ آپ کی کار سے ایک بوڑھے کا ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ مرگیا تو جانتی ہیں کہ کیا ہوگا؟ لیکن اگر میں چاہوں تو یہ مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور کوئی پولیس کیس بھی نہیں بنے گا۔"

"تو بتائیں وہ حل کیا ہے؟" فاریہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"حل یہ ہے کہ اس بوڑھے کو میں کسی کے علم

لائے بغیر دفن کرادوں گا۔ اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" فاریہ نے پوچھا۔

"آپ کو میری شادی کروانی ہوگی۔" ڈاکٹر آصف نے اپنی شرط بیان کی تو فاریہ حیران رہ گئی۔

"میں، آپ کی شادی کرواؤں؟ کیوں آپ کے اپنے ماں باپ کہاں ہیں؟ یہ کیسی بے تکی شرط ہے۔" فاریہ حیرت اور غصے سے بولی۔

ڈاکٹر آصف بولا۔ "ریلیکس۔ اصل میں بات یہ ہے کہ وہ لڑکی جو کل آپ کے ساتھ آئی تھی۔ جس کی پیشانی زخمی تھی کیا نام تھا اس کا؟ ہاں ہما، مجھے ہما سے پیار ہوگیا ہے۔ اور غالباً ہما آپ کی بہن ہے۔"

فاریہ غصے سے بولی۔ "کیا بکواس ہے یہ، یہ پیار کا اظہار کرنے کا کون سا طریقہ ہے؟ وہ بھی شرطوں کے سہارے آپ میری کزن سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

آئی ایم رئیلی سوری اگر آپ میری باتوں سے ہرٹ ہوئی ہیں تو میرا مقصد آپ کو دکھی یا جذباتی کرنا نہیں تھا۔ آپ کا مسئلہ تو ویسے بھی حل ہوجائے گا۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی آپشن نہیں۔ آپ میرے کریکٹر کے بارے میں کسی سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔ مجھے سچ میں ہما سے پیار ہوگیا ہے اور اپنے پیار کو پانے کے لئے مجھے آپ کی مدد درکار ہے۔ اگر آپ میری مدد کریں گی تو ساری عمر آپ کو دعائیں دوں گا۔ اور کسی کی دعا کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔" دھیمے اور مضبوط لہجے میں وہ بولتا ہوا فاریہ کو اپنے پیار کی صداقت کا یقین دلا رہا تھا۔

فاریہ نے کہا۔ "دیکھتی ہوں کہ میں کیا کرسکتی ہوں۔" اور اپنا بیگ اٹھا کر ڈاکٹر کے آفس سے باہر نکل آئی۔

☆.....☆.....☆

کل رات کو جو حادثہ ہوا تھا اس کے بعد سے ہما بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ ہما کو خود بھی اپنے اندر یہ تبدیلی محسوس ہورہی تھی۔ اسے اپنے اندر ایک عجیب سی الجھن محسوس ہورہی تھی اور کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے ہما نے یہ بہتر سمجھا کہ تھوڑی دیر کے لئے سوجائے۔

عالم خواب میں ہما ایک ویرانے میں پہنچ گئی۔ اس ویرانے میں وہ مسلسل بھٹک رہی تھی اور اسے کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ پھر اچانک ہما نے کل رات والے اس بوڑھے کو دیکھا جو مرگیا تھا۔ اس بوڑھے کے ہاتھ میں ایک چمکتے دستے والا خنجر تھا اور وہ ہما کے پیچھے بھاگنے لگا۔ ہما بھاگ رہی تھی اور اس ویرانے میں اس کی چیخیں گونج رہی تھیں پھر اچانک وہ بوڑھا کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گرا اور زور سے چلایا۔ "ساحر کہاں ہو تم سامنے آؤ۔" اس کے بعد وہ بوڑھا بے ہوش ہوگیا اور ہما ہڑبڑا کے نیند سے بیدار ہوگئی۔

ہما کا سارا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا تھا۔ وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی جو کچھ دیر پہلے اس نے دیکھا تھا کیا تھا وہ سب، اور بوڑھے نے ساحر کا نام کیوں لیا تھا۔ ساحر سے اس بوڑھے کا کیا تعلق تھا؟

ہما ساحر کو اچھی طرح جانتی تھی۔ ساحر ان کا کلاس فیلو تھا۔ اور فاریہ، ساحر سے محبت کرتی تھی۔ فاریہ نے یہ بات ساحر کو نہیں بتائی تھی۔ البتہ اس نے یہ بات ہما سے شیئر کی تھی۔

ہما سوچ سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ کیا ہورہا تھا اس کے ساتھ۔ اسی وقت فاریہ بھی اسپتال سے واپس آگئی۔

"کیا بات ہے فاریہ؟ چہرہ کیوں اترا ہوا ہے تمہارا؟" ہما نے پوچھا۔

"ہما مجھے تم سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔" فاریہ نے ہما کے پاس بیٹھتے ہوئے اس سے کہا۔

"ہاں تو کرو کیا ضروری بات، رات والا مسئلہ تم سے حل نہیں ہوسکا کیا؟" ہما نے پوچھا۔

"وہ مسئلہ تو تقریباً ختم ہوچکا ہے۔" فاریہ نے کہا۔ "لیکن ایک اور پرابلم کری ایٹ ہوگئی ہے۔"

"پرابلم؟" ہما پریشانی سے بولی۔

"وہ اصل میں یہ بات ہے۔" فاریہ نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ "کل جو ڈاکٹر ہمارے ساتھ بڑا تعاون کررہا تھا ہماری مدد کرنے کی کوشش کررہا تھا وہ بلا وجہ نہیں کررہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک وجہ تھی۔"

ہما نے پوچھا۔ "کیسی وجہ۔"

"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے کہتا ہے کہ مجھے ہما سے پیار ہوگیا ہے۔" فاریہ نے کہا۔

"کیا؟؟" ہما شدتِ حیرت میں "کیا" کو اچھا خاصا لمبا کر کے بولی۔

"کیا جواب دو گی اسے۔" فاریہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہما کچھ لمحات سوچتی رہی پھر بولی۔ "بندہ ہینڈسم ہے۔ جاب بھی اچھی ہے مجھ سے پیار بھی کرتا ہے کس چیز کی کمی ہے فاریہ۔" ہما نے فاریہ کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولی۔

"صرف بس تمہاری ہاں کی۔" فاریہ خوش ہو کر بولی۔

ہما بھی سنسنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

پھر کئی مشکلات سے گزرنے کے بعد آصف نے ہما کو اپنے پیار کا یقین دلا ہی دیا تھا۔ ہما بہت خوش تھی لیکن اپنے اندر ہونے والی تبدیلی کی وجہ سے ہما کی خوشیاں ادھوری رہ گئی تھیں وہ بدل رہی تھی۔ نادانستہ طور پر وہ ان چیزوں کو پسند کرنے لگی تھی جن سے کبھی اسے کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ جب وہ دوسرے کو اذیت میں دیکھتی تو اسے مزا آتا تھا۔ یونیورسٹی میں ایک زور ہما بہت بے چین اور اداس تھی۔ اپنی کلاس سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنی ایک کلاس میٹ کو سیڑھیوں سے دھکا دیا تو وہ بے چاری سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آئی اور خون سے لت پت ہوگئی تھی۔ اس لڑکی کے بازو میں فریکچر بھی ہوگیا تھا۔ جب وہ لڑکی زینے سے گرتے ہوئے چلا رہی تھی تو اس کی چیخیں ہما کو سکون پہنچا رہی تھیں اور اتفاقیہ طور پر یہ سب ساحر نے بھی دیکھ لیا تھا لیکن ساحر نے کسی قسم کا کوئی ری ایکشن نہ دیا تھا بلکہ وہ پراسرار انداز میں مسکرانے لگا تھا۔

☆.....☆.....☆

رات گہری ہو چکی تھی ہما اور فاریہ ایک ہی کمرے میں ساتھ سوتی تھیں۔ اچانک ہما کو ایسے لگا جیسے کسی نے اسے گہری نیند سے جگایا ہو۔ ہما ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ لیکن ابھی تک اپنے پورے حواسوں میں نہ لوٹی تھی کہ اچانک اس کے کان میں ایک مانوس سی آواز آئی۔ "ہما باہر آجاؤ تمہارے گھر کے سامنے جو کافی شاپ ہے وہاں آجاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

نجانے اس آواز میں کیسا جادو تھا، کیسا سحر تھا کہ ہما نہ چاہتے ہوئے بھی بیڈ سے اتری اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ فاریہ اس سب سے بے نیاز سوئی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر میں ہما اس کافی شاپ میں آ گئی۔ وہاں اسے ایک آدمی مل گیا۔ نیلی پتلون کے اوپر پراسرار سے آدمی نے سیاہ رنگ کا کوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک تھا۔ کوٹ سے منسلک ٹوپی اس نے اپنے سر پر پہنی ہوئی تھی۔ ہما اس شخص کو پہچان رہی تھی۔ لیکن سمجھ نہ پا رہی تھی کہ وہ کون ہے؟

"آؤ میرے ساتھ۔" اس شخص نے آگے بڑھ کر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ ہما کی کلائی پکڑلی اور آگے بڑھ گیا۔ ہما اس کے سحر میں پوری طرح گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ اس شخص سے یہ بھی نہیں پوچھ پا رہی تھی کہ وہ اسے لے کر کہاں جا رہا ہے۔

اس شخص نے ہما کو اپنی کار میں بٹھایا اور کار کو آگے بڑھا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کی کار ایک گھر کے سامنے رکی۔

"چلو اترو نیچے۔" اس شخص نے بہت رعب سے کہا۔ ہما بغیر کچھ کہے کار سے نیچے اتر گئی۔

تھوڑی دیر میں وہ شخص ہما کو لے کر ایک کمرے میں داخل ہوا۔ اس کمرے میں رکھی ہوئی ایک ایک چیز پراسراریت سے بھرپور تھی۔ الماریوں میں رکھی موٹی موٹی کتابیں جن پر عجیب و غریب تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ سارے کمرے میں ڈھیروں موم بتیاں جلائی گئی تھیں۔ عجیب و غریب لوگوں کے پورٹریٹ دیواروں پر چسپاں تھے۔ اور سب سے بھیانک وہ کھوپڑی تھی جو کمرے کے وسط میں میز پر رکھی گئی تھی۔

"بیٹھ جاؤ یہاں" اس شخص نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو ہما بیٹھ گئی۔

"جو سوال میں تم سے پوچھوں گا مجھے اس کا من و عن جواب دینا ہے تم نے۔" اس شخص نے کہا اور ہما نے

اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہارا پورا نام؟"

"ہما فاروقی۔"

"تمہاری محبت؟"

"آصف خان۔"

"کیا تم اپنے اندر بدلاؤ محسوس کر رہی ہو؟"

ہاں میرے اندر تبدیلی آ رہی ہے۔" ہما بدستور اس پراسرار بندے کے سوالات کے جواب دے رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے ہما کی آواز کسی کنویں کے اندر سے آ رہی ہو۔

"تم یہ تبدیلی کب سے محسوس کر رہی ہو؟"

"اس روز سے جب اس بوڑھے کا ایکسیڈنٹ ہوا ہماری کار سے اور وہ مر گیا تھا۔"

پراسرار آدمی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی جیسے اسے اس کی مطلوبہ معلومات مل رہی ہو۔

"تم کیا تبدیلی محسوس کر رہی ہو؟"

"مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے پاس سپر پاورز آ گئی ہیں میں ہواؤں میں اڑ سکتی ہوں۔ اور حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے سکتی ہوں۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور تبدیلی؟"

"میرا انسانی خون پینے کا دل کرتا ہے۔"

ہما نے اتنی بڑی بات عام سے لہجے میں کہہ دی۔

"پراسرار شخص کے چہرے پر مسکراہٹ ذرا اور گہری ہوگئی۔

"اچھا تو پیو انسانی خون شروعات کرو۔"

"کس سے کروں شروعات؟" ہما مسلسل سوالات کے جواب دیتی جا رہی تھی۔

"اپنے آصف خان سے اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے تو اسے تمہارے لئے اپنی جان قربان کرنی پڑے گی۔" پراسرار بندے نے کہا۔

"اور اب اٹھو میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آؤں۔"

ہما اپنے گھر میں داخل ہوئی تو وہ ٹرانس کی کیفیت سے نکل آئی۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ دیر پہلے وہ ٹرانس میں تھی اور اسے، اس پراسرار شخص کے ساتھ ہوئی ساری بات یاد تھی۔ لیکن وہ پراسرار بندہ تھا کون؟ اور اس نے ہما کو آصف کے بارے میں ایسا مشورہ کیوں دیا تھا۔ اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ اس نے ہما کو ٹرانس میں لیا ہی کیوں تھا۔ ہما مسلسل سوچتے ہوئے اپنے کمرے تک پہنچ گئی اور دروازہ کھول کر اندر آئی۔ فاریہ جاگ چکی تھی۔

"ہما باہر کیوں گئی تھی اتنی رات کو؟" فاریہ نے ہما سے پوچھا۔

وہ دراصل میں تازہ ہوا کے لئے ذرا چھت پر گئی تھی۔" ہما دروغ کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

"اچھا ٹھنڈ لگ جائے گی یار سو جاؤ۔" فاریہ نے کہا۔

ہما بستر پر لیٹ تو گئی تھی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

"کیا مجھے فاریہ کے ساتھ یہ بات شیئر کرنی چاہئے۔" ہما سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی کیا یہ میری بات کا یقین کرے گی یہ تو مجھے پاگل سمجھے گی.....اف کیا کروں۔

پیاس بھی لگ رہی ہے..... مجھے اٹھ کر پانی پینا چاہئے..... ہما سوچ رہی تھی۔

اچانک ہما کے کان میں وہی پراسرار سرگوشی سنائی دی۔ "یہ پانی کی پیاس نہیں ہے خون کی پیاس ہے۔ تمہیں آصف خان کا خون پینا ہے آج، اس کے گرم لہو سے اپنے حلق کو تر کرنا ہے۔"

نجانے اس آواز میں ایسا کیا رعب و دبدبہ تھا کہ ہما نے تکیے کے نیچے سے اپنا سیل فون نکالا اور آصف خان کو میسج کیا۔ "میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں، ابھی اور اسی وقت کچھ ضروری کام ہے۔"

تھوڑی دیر میں آصف کا جواب آ گیا۔ "ایسا کیا کام ہے۔ خیر میری آج نائٹ شفٹ تھی میں اسپتال میں ہوں۔ آجاؤ یہیں بات کرتے ہیں۔"

ہما نے اپلائی کیا۔ "ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں۔" اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ بستر پر بے خبر پڑی فاریہ کو

کچھ علم نہ تھا کہ کیسا شیطانی کھیل شروع ہو چکا ہے۔

☆.....☆.....☆

شیطانی اور سفلی طاقتوں کے ماہر سادھو گنگا رام کا ازل سے ایک ہی جانی دشمن رہا تھا۔ وہ جانی دشمن صرف اپنی محبت کے لئے اس طلسمی میدان میں آیا تھا۔ اور وہ دشمن تھا ساحر جو کہ شلپا کا عاشق تھا۔ شلپا ایک ہندو لڑکی کی آتما تھی جسے سادھو گنگا رام نے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ شلپا کی مرتیو کے بعد اس کی آتما کو سادھو گنگا رام نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

ساحر نے شلپا سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ شلپا بھی اس کے عشق کا دم بھرتی تھی لیکن سادھو گنگا رام نے ان کی خوشیوں کا شیرازہ بکھیر دیا تھا۔ جب سے شلپا یہ سنسار چھوڑ کر گئی تھی ساحر بدل گیا تھا۔ اور اس کے دل میں صرف اور صرف یہ تھا کہ شلپا کے قاتل سے انتقام لینا ہے۔ اسے اپنی شلپا کی آتما کو اس پاپی سادھو کی گرفت سے نکالنا ہے۔

اور اس نے بہت سارے جاپ کئے خود کو سادھو گنگا رام سے مقابلے کے لئے تیار کیا تھا اور اس رات، اس نے سادھو گنگا رام پر ہلا بول دیا لیکن سادھو گنگا رام اپنی ہونے والی شکست کو محسوس کر کے وہاں سے بھاگ نکلا اور پھر ہما اور فاریہ کی کار سے ٹکرایا۔ مرنے سے پہلے سادھو گنگا رام نے ایسا جاپ کیا تھا کہ اس کی ساری شکتیاں ہما کو مل گئی تھیں۔

دوسری جانب ساحر، حیران ہو رہا تھا کہ گنگا رام کے مرتیو کے بعد بھی شلپا کی آتما آزاد کیوں نہیں ہوئی۔ اس رات ساحر نے ایک کٹھن جاپ کاٹنے کے بعد یہ پتہ لگا ہی لیا تھا کہ ہما اب ایک غیر معمولی لڑکی بن چکی ہے وہی ہما جو یونیورسٹی میں اس کی کلاس فیلو ہے، اور فاریہ کی بہن بھی ہے۔

کچھ دنوں کے بعد ساحر نے ہما کو ہپناٹزم کیا اور اس سے ساری معلومات لینے کے بعد ڈاکٹر آصف کے خون پینے کا مشورہ دیا بلکہ حکم دیا کیونکہ ساحر ہما کے لبوں کو انسانی خون کی لت لگانا چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار ہما انسانی خون پی لیتی تو وہ اپنی ساری شکتیوں کو پہچان لیتی اور یوں، ساحر کے لئے شلپا تک پہنچنا آسان ہو جاتا۔

ادھر گھر سے نکلنے میں ہما کو کسی قسم کی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑا تھا کیونکہ گھر میں صرف ہما تھی۔ فاریہ کی نانی بیمار تھی اور باقی گھر والے ان کی عیادت کے لئے دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہما اسپتال میں آ گئی اور ڈاکٹر آصف کے آفس میں داخل ہوئی۔

"ہما خیریت تو ہے نا؟" آصف کے لہجے میں تفکر تھا۔

ہما نے آصف کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور مڑ کر دروازہ لاک کیا اور ایک مرتبہ پھر واپس مڑی اور دھیرے دھیرے آصف کی طرف بڑھنے لگی۔

آصف، ہما کے پراسرار انداز کو دیکھ کر خوفزدہ بھی ہو رہا تھا اور حیران بھی۔

ہما پر اسراریت سے بھرپور سنسنی خیز لہجے میں بولی۔ "مجھے پیاس لگ رہی تھی۔"

"کیا۔ یہ سامنے جگ پڑا ہے اٹھا کر پانی پی لو۔" آصف حیران ہوتے ہوئے بولا۔

ہما دھیرے سے آگے بڑھی اس نے جگ دھیرے سے اٹھایا اور پھر اچانک زور سے دیوار کے ساتھ دے مارا۔

"ہما یہ کیا بدتمیزی ہے۔" آصف غصے سے بولا۔

ہما نے اچانک اپنے اسکارف میں چھپائی ہوئی چھری نکال لی۔ چھری کا چمکتا ہوا پھل یہ بتا رہا تھا کہ وہ کتنی تیز ہے۔

"تمہارے پاس یہ چھری کیوں ہے؟" آصف اب حقیقی معنوں میں ڈرنے لگا تھا۔

"مجھے پیاس لگی ہے اور میں نے تمہارا خون پینا ہے اس لئے۔" ہما نے کہا اور آگے بڑھ کر آصف کو دبوچ لیا۔ آصف حیران رہ گیا کیونکہ اس وقت اس نازک سی دھان پان لڑکی میں سو مردوں سے زیادہ طاقت آ چکی تھی۔ ہما نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری سے آصف کی گردن کاٹ دی۔ خون کا فوارہ ابل پڑا اور

ہما نے آصف کے نرخرے پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے، وہ بہت بے تابی سے خون پیتے ہوئے ایک جنونی چڑیل لگ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

فاریہ سوتی رہی عموماً اس کی نیند اتنی گہری نہیں ہوتی تھی لیکن ساحر نے اس پر بھی اپنا سحر کر رکھا تھا۔ اس لئے وہ نہ جان سکی کہ اس رات کیسے خونی کھیل کی ابتداء ہو چکی ہے۔ دوسری طرف ہما بھی اسپتال کے پچھلے گیٹ سے واپس نکلی تھی اور کچھ دیر میں اپنے گھر میں پہنچ چکی تھی۔

ہما گھر واپس آ کر سو گئی۔ عالم خواب میں ایک بار پھر اس نے اس بوڑھے (سادھو گنگا رام) کو دیکھا جو اُس کی وجہ سے موت کے منہ میں جا چکا تھا۔ سادھو گنگا رام، ہما سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تو نے میری شکتیاں حاصل کر لیں۔ میری شکتیوں میں میری سب سے مہان شکتی شلپا کی آتما ہے۔ وہ بہت شکتی شالی آتما ہے۔ میں نے برسوں کی تپسیا کے بعد اس شکتی کو اپنے وش میں کیا لیکن اب اس پر لوگوں کی بڑی نظریں ہیں۔ تجھے رکھشا کرنی ہے شلپا کی آتما کی۔ کیونکہ میں لوٹ کے آؤں گا اور تجھ سے اپنی شکتیاں واپس طلب کروں گا۔"

صبح ہو چکی تھی۔ وہ سیاہ ترین رات گزر تو گئی تھی لیکن اس بات سے کئی زندگیوں نے تباہی و بربادی کی طرف اپنے قدم بڑھا دیئے تھے، ہما بھی اب سارا سچ جان چکی تھی۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ فاریہ کو ان باتوں سے دور رکھے گی کیونکہ اگر اس نے فاریہ کو بتا دیا کہ آصف کو وہ قتل کر چکی ہے تو فاریہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گی۔

صبح ساڑھے نو بجے فاریہ کو پتا چلا کہ آصف کا مرڈر ہو گیا ہے۔ فاریہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ری ایکٹ کرے۔ اس نے ہما کو بتایا اور ہما نے ایسی اداکاری کی کہ فاریہ تو کیا پولیس کو بھی ہما پر شک تک نہ ہوا۔

☆.....☆.....☆

اس روز فاریہ اور ہما کو یونیورسٹی سے دیر ہو گئی تھی۔ وہ دونوں اپنی کلاس کی طرف بڑھ ہی رہی تھیں کہ

احسان فطرت.....!

کبھی کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ ہم بہت سے لوگوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں اور کبھی کبھی جب ہم ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنا چاہتے ہیں تو یہ احساس کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے کہ ہمیں سمیٹنے والا کوئی نہیں یا جب ہم سفر میں رہنا چاہتے ہیں اور بہت سی مسافتیں طے کر لیتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ یہ تو ایک بند گلی ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

جب ہم بے تحاشا رونا چاہتے ہیں کہ سارا کاجل بہہ جائے سارے منظر بدل جائیں سارے اندھیرے چھٹ جائیں، اجالا پھیل جائے تو آنکھیں بھی ساتھ نہیں دیتیں، آنسو بھی خشک ہو جاتے ہیں، آنکھیں بنجر ہو جاتی ہیں یا جب کبھی ہم بارش میں بھیگتے ہیں تو احساس ہی نہیں بھیگنے کا، لیکن بعض اوقات کسی کے طنز کا ایک چھینٹا پورے وجود کو بھگو دیتا ہے۔

جب کبھی کوئی تلوار سے وار کرتا ہے تو ہمیں تکلیف کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب کوئی ہمیں زبان سے گھاؤ دے تو ہمارے دل کے ہماری ذات کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو ہم انسانوں سے ڈرنے لگتے ہیں اور سائے کے پیچھے بھاگتے ہیں۔

(ایس امتیاز احمد)

انہیں ساحر مل گیا۔

''اوہ آپ دونوں تو کافی لیٹ ہوگئی ہیں۔ میں بھی لیٹ تھا سر نے مجھے کلاس سے باہر نکال دیا۔'' ساحر نے کہا۔

''اوہ میرے خیال میں اب نہ ہی جائیں، اتنی انسلٹ سے بہتر ہے کہ ہم یہ کلاس ہی بیک کرلیں کیوں ہما۔'' اپنی بات مکمل کرنے کے بعد فاریہ نے ہما کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔'' ہما نے ساحر کی طرف دیکھتے ہوئے فاریہ کو جواب دیا۔ ساحر ہما کی یہ حرکت دیکھ کر مسکرانے لگا۔

فاریہ جلدی سے بولی۔ ''چلو پھر میں صدف کے پاس جارہی ہوں۔ مجھے اس سے کچھ نوٹس چاہئے تھے۔ تم دونوں باتیں کرو اور فاریہ وہاں سے چلی گئی۔

فاریہ کے جانے کے بعد ہما ساحر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''سادھو گنگا رام سے تمہاری دشمنی کی کیا وجہ تھی؟''

''تو تمہیں سب پتا چل ہی گیا۔'' ساحر انتہائی دلیری سے بولا۔

''ہاں ساحر دیکھ لیا میں نے تمہارا اصلی چہرہ۔ اب مجھے بتاؤ کہ کیا وجہ ہے؟''

''میری شلپا کا قاتل تھا وہ۔ اس نے نہ صرف میری شلپا کی عزت پامال کی بلکہ اب اس کی آتما کو بھی اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ لیکن اب گنگا رام جہنم میں پہنچ چکا ہے۔ اور اب جہنم میں جانے کی اس کی باری ہے جس نے میری شلپا کی آتما کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے۔'' ساحر زہر خند لہجے میں بولا۔

''ہاہاہا..... ہما قہقہہ لگا کر ہنسی اور بولی۔ ''اب وہ وقت گیا جب تم مجھے اپنے سحر میں جکڑ لیتے تھے۔ یاد رکھو شلپا کی آتما، سادھو گنگا رام کی سب سے بڑی شکتی ہے اور اب اس شکتی کو میں اپنے حق میں استعمال کروں گی اور زندگی کا ہر سکھ پاؤں گی۔ وہ سب کچھ حاصل کروں گی جو آج تک کوئی حاصل نہ کرپایا..... جہاں تک کسی کی سوچ بھی پہنچ نہیں پائی۔''

''تم غلط راہ پر چل نکلی ہو ہما۔ اس دشمنی سے میرا کچھ نہ جائے گا۔ خسارے میں تم رہو گی۔ موت تمہارا مقدر بنے کہ اس سے پہلے مجھ سے صلح کرلو۔ شلپا کی آتما کو آزاد کردو۔ باقی اپنی شکتیوں کے بل بوتے پر دنیا پر راج کرنا۔''

ساحر مفاہمت کرتے ہوئے بولا۔

''نہیں ساحر، گنگا رام لوٹ کر آئے گا۔ اور مجھ سے اپنی طاقتیں واپس طلب کرے گا۔ لیکن میں اسے، اس کی طاقتیں اب لوٹانا نہیں چاہتی اور اگر میں نے شلپا کی آتما کو آزاد کردیا تو سادھو گنگا رام مجھ پر بھاری وار کرجائے گا۔'' ہما بولی۔

ہما کی بات سن کر ساحر نے کہا۔ ''تو تم ان شکتیوں کی حفاظت کے لئے انسانی خون پیو گی؟ جیسے تم نے اپنے عاشق کو مارا تھا ویسے..... اچھا تمہارا اگلا شکار کون ہوگا؟؟'' ساحر انتہائی زہریلے لہجے میں بولا۔

''ہاں..... پیوں گی اور اس کام کی طرف تم نے مجھے راغب کیا ہے۔ اس لئے ذمہ دار تم بھی ہو۔'' ہما نے غصے سے کہا۔

ساحر اب مسکرانے لگا۔ اور بولا۔ ''سوچو۔ تمہارا یہ سچ اگر تمہاری فیملی کو پتہ چلا گیا تو؟''

''تو کیا تم انہیں بتاؤ گے کہ میں کیا سے کیا بن گئی ہوں؟'' ہما نے جواب دینے کے بجائے الٹا ساحر سے پوچھا اور کہا۔ ''اور ہاں یہ بھی بتانا کہ تم کون ہو۔ اس دنیا کو بھی پتا چلے کہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا چھپا ہوا ہے۔ یونیورسٹی کا سب سے زیادہ لائق سمجھے جانے والا اسٹوڈنٹ دراصل ایک چھپا ہوا جادوگر ہے۔'' ہما نے ڈرے بغیر حساب برابر کردیا۔

''تو ٹھیک ہے اگر تم نے جنگ کا سوچ ہی لیا ہے تو مجھے منظور ہے۔ البتہ تمہاری بربادی پر مجھے افسوس ضرور ہوگا۔''

☆.....☆.....☆

ہما اور فاریہ پہلے ایک ہی کمرے میں رہا کرتی تھیں لیکن اب ہما نے اپنا کمرہ الگ کرلیا تھا۔ کیوں کہ آج ہما نے سوچا ہوا تھا کہ وہ شلپا کی آتما سے ملے گی۔

رات ساڑھے دس بجے کا عمل تھا۔ ہما نے اپنے

کمرے کے دروازے کو کنڈی لگائی اور ایک منتر پڑھا۔ ہما نہیں جانتی تھی کہ وہ ہندی منتر اس کو کیسے یاد ہوگیا حالانکہ اس نے اب تک کوئی منتر یاد نہ کیا تھا لیکن پراسرار طور پر ہما کے ذہن میں کئی منتر آگئے تھے۔

ہما نے منتر پڑھنا شروع کیا تو کمرے میں دھویں کا مرغولہ بن گیا اور پھر اس مرغولے سے شلپا کی آتما برآمد ہوئی۔ اس کا حلیہ بالکل ہندو لڑکیوں کی طرح تھا۔ اس کے بدن پر سفید رنگ کی ساڑھی تھی۔ کلائیوں میں سفید موتیے کے گجرے تھے اور بال بھیگے ہوئے تھے جیسے وہ ابھی نہا کر آئی ہو۔ مانگ میں چمکتا ہوا سندور اور گلے میں لٹکا ہوا منگل سوتر یہ ظاہر کررہا تھا کہ کسی مرد کے ساتھ اس کی شادی ہوچکی ہے۔ ہما اسے دیکھ کر حیران ہورہی تھی کہ وہ کہیں سے بھی ایک چڑیل نہیں لگتی تھی۔

''تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟'' شلپا نے سوال کیا؟

''کون ہو تم؟'' ہما نے انتہائی رعب سے سوال کیا۔

''میں تمہاری غلام۔'' شلپا درد بھرے لہجے میں بولی۔

''تمہاری خادمہ ہوں میں۔ اپنے منتروں کے جال میں تم نے میری آتما کو قید کررکھا ہے۔''

''اچھا تم مری کیسے مجھے اپنی پوری کہانی سناؤ۔''

''تو سنو کیسے کیسے درد اٹھائے میں نے زندگی میں اور مر کر میری آتما کو بھی شانتی نہ ملی۔

معصوم محبت کا اتنا سا فسانہ ہے
کاغذ کی حویلی ہے اور بارش نے بھی آنا ہے
کیا شرطِ محبت ہے کیا شرط ہے دنیا ہے
آواز بھی زخمی ہے گیت بھی گانا ہے
اس تک پہنچنے کی امید بہت کم ہے
کشتی بھی پرانی ہے اور طوفان کو بھی آنا ہے
یہ عشق نہیں آسان بس اتنا سمجھ لیجئے
اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کر جانا ہے

''میرا جنم ایک کٹر ہندو گھرانے میں ہوا۔ میری ماتا جی مندر میں شری کرشن بھگوان کی داسی تھیں۔ اپنی زندگی کے پینتیس برس وہ مندر میں داسی ہی رہیں۔ پھر انہیں مندر سے نکال دیا گیا کیونکہ ان کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ پتا جی اس مندر کے چھوٹے پجاری تھے۔ جس مندر کی داسی میری ماتا جی تھیں۔ مندر سے نکالے جانے کے بعد پتا جی نے میری ماتا جی کو شادی کا سندیسہ بھجوایا جو میری ماں نے سویکار کرلیا اور اگنی کے گرد سات پھیرے کرکے وہ دونوں سات جنموں کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔

شادی کے ایک برس بعد میں اس دنیا میں آئی۔ جب میری ماتا جی امید سے تھیں اسی وقت مندر کے بڑے پجاری نے یہ پیش گوئی کردی تھی کہ لڑکی پیدا ہوگی اور اس لڑکی کو سوئم شری کرشن نے اپنے لئے چن لیا ہے اور اس لئے وہ بھی مندر کی داسی ہی ہوگی۔

اور یوں جب میں چودہ برس کی تھی تب سے میں ہمیشہ کے لئے مندر میں آگئی۔ کچھ برس مندر میں ہی گزر گئے۔ پانچ سال گزرے کہ کچھ سیاح آئے اور وہ سیاح مندر کو دیکھنے کے لئے مندر میں آئے کیوں کہ وہ مندر جس میں، میں داسی تھی وہ سب سے بڑا مندر تھا۔ انہی سیاحوں میں ایک ساحر بھی تھا۔ اس نے مندر میں مجھے دیکھ لیا اور اسے مجھ سے پہلی نظر میں پیار ہوگیا۔

ساحر نے مجھ سے پیار کا اظہار کیا، پہلے تو میں نہ مانی کیونکہ میں خود کو کرشن جی کی امانت سمجھ رہی تھی لیکن بعد میں ساحر نے مجھے اپنے عشق سے پگھلا ڈالا۔ میں نے اور ساحر نے کچھ جو وقت گزارے وہ میرے جیون کے سنہرے دن تھے۔ جنہیں میں کبھی بھلا نہیں پائی۔

پھر یہ بات مندر کے بڑے پجاری کو پتا چل گئی اور میرے کئے کی سزا میرے ماتا پتا کو ملی۔ بڑے پجاری نے مشتعل ہوکر میرے ماتا پتا کو مروادیا۔ اور میں ساحر کے ساتھ شادی نہ کرسکوں اس لئے اس نے زبردستی مجھ سے شادی کرلی۔

ساحر ان دنوں دوسری جگہ گیا ہوا تھا اس لئے اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ مجھ پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ کچھ دنوں بعد بڑے پجاری کا ایک دوست اس سے ملنے مندر میں آیا۔ وہ سادھو گنگا رام تھا۔ اس کی بری

نظریں روز اول سے میرے جوان جسم پر تھیں۔ اس رات اس نے بڑے پجاری پر کوئی سحر کیا اور مجھ سے میری متاع حیات چھین لی۔ اس ظالم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجھے اور میرے پتی کو جان سے مار ڈالا۔

بڑے پجاری جیسے بھی تھے اب وہ میرے پتی تھے۔ میں بیچ منجدھار میں ڈول رہی تھی۔

ہمارا کریا کرم ہوگیا۔ لیکن سادھو گنگا رام نے میری آتما کو اپنی شکتیوں سے مکت نہ ہونے دیا اور یوں میں سادھو گنگا رام کی قیدی آتما بن گئی۔

ساحر نے یہ سب پتا لگالیا۔ چار برس اس نے شکتیاں حاصل کرنے میں لگائے اور کسی کو شک بھی نہیں ہونے دیا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ پھر ایک رات وہ سادھو گنگا رام سے جا ٹکرایا اور سادھو گنگا رام کو تم نے مار ڈالا۔ اس کی شکتیاں تمہارے پاس ہیں۔ میں تمہاری قید میں ہوں اب۔"

شلپا کی آتما نے ہما کو اپنی درد بھری کہانی سنا ڈالی۔

ہما کو محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھیں نم ہوگئی ہیں۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ یہاں سے۔" ہما نے جواب دیا اور شلپا کی آتما وہاں سے غائب ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

ایک ہفتہ بعد ہما کی ساری فیملی واپس گھر آنے والی تھی۔ فاریہ بہت خوش تھی۔ فاریہ اور ہما دونوں ہی نانو سے ملنا چاہتی تھیں لیکن اپنی اسٹڈیز کی وجہ سے نہیں جا پائی تھیں۔ ہما اس وقت چھت پر ٹہل رہی تھی۔ کل رات جو شلپا کی آتما نے اپنی درد بھری داستان سنائی تھی۔ اس نے ہما کو پگھلا ڈالا تھا۔ ہما کی سوچ بدل چکی تھی۔ وہ شلپا پر مزید کوئی ظلم ڈھانا نہیں چاہتی تھی اور ساحر بھی وقت کا ستایا ہوا تھا۔ لیکن ساحر نے پھر بھی ہما کے ساتھ غلط کیا تھا۔ ہما کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا فیصلہ کرے کیونکہ اگر وہ شلپا کی آتما کو آزاد کردیتی ہے تو اس کی اپنی بہن فاریہ ٹوٹ جائے گی۔ کیونکہ فاریہ نے ساحر کو بہت شدت سے چاہا تھا اور اگر ہما شلپا کی آتما کو مزید اپنی قید میں رکھتی تو یہ ظلم کی آخری انتہا تھی۔

ہما، شلپا کو آزاد کرنا چاہتی تھی لیکن فاریہ کی وجہ سے خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی اور ساحر نے اس کے ساتھ جو ذلت آمیز رویہ اپنایا تھا ہما اسے اگنور نہیں کر پا رہی تھی۔ اور اوپر سے ہما انسانی خون کے لئے بھی اب تڑپ رہی تھی۔

ہما کے دماغ میں جو سب سے بڑی بات آرہی تھی وہ یہ تھی کہ اگر سادھو گنگا رام لوٹ آیا اور اس نے اپنی شکتیاں طلب کرلیں تو کیا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

ہما کے ہاتھ میں چمکتا ہوا خنجر تھا۔ اور اس وقت وہ یونیورسٹی کے چینجنگ روم میں تھی۔ یہاں ایک لڑکی اپنا عبایا اتارنے آئی تھی اور ہما اس کے پیچھے آگئی تھی۔ اس وقت وہاں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی لڑکی نہیں تھی اور وہ لڑکی ہما کے ہاتھ میں خنجر اور آنکھوں سے ابلتے جنون کو دیکھ کر انتہائی خوفزدہ ہوگئی تھی۔ ہما تیزی سے آگے بڑھی اور اس نازک سی لڑکی کو بانہوں میں دبوچ لیا۔ اور اپنے خنجر سے اس لڑکی کا نرخرہ کاٹ کر رکھ دیا۔ خون کو دیکھ کر ہما پاگل سی ہوگئی وہ اس لڑکی کے نرخرے پر ہونٹ رکھ کر پینے لگی۔ اس وقت ہما ایک انتہائی وحشی اور جنونی چڑیل لگ رہی تھی۔ جسے اس لذیذ اور گرم خون کے سوا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا کہ فاریہ اس کو دیکھ رہی ہے۔

فاریہ کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔ وہ نفرت آمیز نگاہوں سے اپنی بہن کو دیکھ رہی تھی جو اس وقت ایک انسان کم اور چڑیل زیادہ لگ رہی تھی۔

فاریہ کے لئے اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن یہ وقت سمجھداری کا تھا۔ فاریہ نے اپنے بیگ سے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور ہما کی ویڈیو بنالی اور پانچ منٹ بعد چپ چاپ وہاں سے چلی گئی۔

ادھر ہما نے خون پینے کے بعد اس لڑکی کی لاش کو ایک طرف پھینکا اپنے منہ اور کپڑوں سے خون صاف کیا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ اب خون صاف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں کیونکہ فاریہ نے اس کا اصلی روپ دیکھ لیا تھا۔

☆.....☆.....☆

فاریہ کو، ساحر نے چینجنگ روم میں بھیجا تھا اور

فاریہ نے وہاں جا کر وہ تماشا دیکھ ہی لیا تھا جو ساحر اسے دکھانا چاہتا تھا۔

فاریہ نے گھر آکر وہ ویڈیو اپنے تمام گھر والوں کو دکھادی۔ ان لوگوں کو یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ہما ایسا روپ دھار چکی ہے۔

ایک گھنٹے بعد ہما بھی گھر واپس آگئی۔ سب فیملی ممبرز کو ایک ساتھ ہال میں دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔

"کیا بات ہے؟ آپ لوگ بہت پریشان لگ رہے ہیں۔" ہما حیرت سے بولی۔

"ہما ادھر آؤ میرے پاس۔" ہما کے ابو مشتاق فاروقی نے ہما کو اپنے پاس بلایا۔

ہما مشتاق فاروقی کے پاس گئی اور مشتاق فاروقی نے وہ ویڈیو ہما کو دکھادی اور انتہائی سختی سے ہما سے پوچھا۔

"کیا ہے یہ سب؟"

"مطلب آپ کو سب پتا چل گیا۔" ہما جان گئی تھی اب کچھ بھی چھپانا فضول ہے۔

"ہاں..... جان لیا ہم نے کہ کسی سنپولئے کو جنم دیا میں نے۔" ہما کی ماں رخسانہ بیگم غصے سے دھاڑی تھیں۔

"ہما میری طرف دیکھو۔" فاریہ نے ہما کو اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتاؤ کیوں لی تم نے ایک معصوم کی جان اور ڈاکٹر آصف کو بھی تم نے ہی مارا ہے نا، کیوں تم نے ایسا کیا۔"

ہما، فاریہ کے ہاتھوں کو ایک جھٹکے سے اپنے شانوں سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ "ہاں میں نے مارا ان دونوں کو۔ کیونکہ میرے منہ کو انسانی خون لگ چکا ہے۔ میں انسانی خون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور میں اپنی پیاس بجھانے کے لئے کسی کو بھی قتل کرنے سے گریز نہیں کروں گی۔"

"ہما کیا ہوگیا ہے تمہیں۔" سلیم فاروقی غصے سے بولے۔ "ہم انسان ہیں۔ تم ایک انسان ہو کر دوسرے انسانوں کا خون کیسے پی سکتی ہو۔"

"او یو شٹ اپ تایا ابو..... آپ کو درمیان میں بولنے کا حق کسی نے نہیں دیا۔" ہما انتہائی بدتمیزی سے بولی۔

"ٹھیک! تو تم بھی اس گھر میں رہنے کا حق کھو بیٹھی ہو، نکل جاؤ اس گھر سے۔" غصے کی وجہ سے مشتاق فاروقی کی آواز پھٹ گئی تھی۔ "بلکہ ٹھہرو میں تمہیں خود چھوڑ آتا ہوں۔" اور مشتاق فاروقی نے ہما کی کلائی پکڑلی اور گیٹ کھول کر اسے باہر دھکیل دیا اور گیٹ بند کردیا۔

گھر کے سب مکینوں کی آنکھیں برس رہی تھیں لیکن وہ مشتاق فاروقی کے کسی فیصلے کو نہیں بدل سکتے تھے کیونکہ مشتاق فاروقی کے فیصلے پتھر پر لکیر ہوا کرتے تھے۔ وہ واپس آکر بولے۔ "آج سے ہم ہما کے لئے مرگئے اور ہما ہمارے لئے مرگئی۔"

☆.....☆.....☆

شام کو ساحر نے فاریہ کو ملنے کے لئے بلایا تھا۔ فاریہ ساحر سے ملی اور ساحر نے شروع سے لے کر آخر تک ساری داستان فاریہ کو من وعن سنا ڈالی۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم شلپا سے پیار کرتے ہو؟" فاریہ نے ضبط کے آخری منزلوں کو چھوتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ وہ میری محبت ہے۔ ساری دنیا ایک طرف اور وہ ایک طرف۔ اس کی خاطر میں کہاں سے کہاں آگیا۔ وہ تو مرگئی ہے اب بس اس کی روح کو آزاد کروانا میری زندگی کا مقصد ہے۔ اگرچہ میں نے اس کے لئے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ لیکن اب میں سچے راستے پر چل کر اپنی منزل حاصل کروں گا۔ شلپا کی روح کو آزاد کرانے کے بعد اپنی ساری شکتیاں قربان کردوں گا اور یہاں سے بہت دور چلا جاؤں گا۔" ساحر نے کہا۔

"ساحر آج میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔" فاریہ بولی۔ "کیا بات؟"

"ساحر میں نے جب سے تمہیں دیکھا ہے تب سے مستقبل کا ہر خواب جو ایک لڑکی دیکھتی ہے۔ تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ میری زندگی فقط تم ہو۔ میں نے تمہیں ٹوٹ کر چاہا ہے، آئی رئیلی لو یو۔ لو یو سو مچ....." فاریہ نے آج اپنے پیار کا اظہار کر ہی ڈالا اور ساحر کے چہرے پر حیرتیں پھیلتی گئیں۔

☆.....☆.....☆

جس وقت ہما کو مشتاق فاروقی نے گھر سے نکالا تھا۔ اس سے تھوڑی دیر بعد تیز بارش شروع ہوگئی تھی۔ ہما سڑک پر پیدل چل رہی تھی اور بارش میں بھیگ رہی تھی۔ آج اس نے اپنا سب کچھ کھودیا تھا۔ اور تہی دامان رہ گئی تھی۔ زندگی نے اسے اتنی دکھوں کی سوغات دی تھی کہ اب زندگی سے دل ہی بھر گیا تھا وہ سادھو گنگا رام کی شکتیوں کے سہارے جینا نہیں چاہتی تھی ایسی شکتیاں جنہوں نے اسے آدم خور بناڈالا تھا۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ اس انسان سے بدلا لینا چاہتی تھی جس نے اسے اپنے سحر سے انسانی خون کی لت لگائی تھی۔ اس نے شلپا کی آتما کو حاضر کیا۔

''تم نے مجھے بلایا۔'' شلپا کی آتما ایک لڑکی کے روپ میں ہما کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''تم چاہتی تھی ناں کہ میں تمہیں آزاد کردوں۔ تو آج میں تمہیں آزاد کرتی ہوں۔ تم آج سے آزاد ہو۔ اپنے منتروں کے جال سے میں نے تمہیں آزاد کیا۔''

''یہ سن کر شلپا کے چہرے پر رونق پھیل گئی۔ ''بھگوان تمہیں زندگی کا ہر سکھ دکھائے۔'' اتنا کہہ کر شلپا کی آتما غائب ہوگئی۔ اور ہما کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

وہ ساحر کی موت کا تماشا شلپا کو بھی دکھانا چاہتی تھی۔ ہما نے زیر لب ایک پراسرار منتر پڑھا۔ تھوڑی دیر بعد ساحر کا گھر زمین بوس ہونے والا تھا۔ ہما اب مین روڈ پر آگئی۔ بارش تیز ہوتی جارہی تھی۔ تھوڑی دیر تک ہما اپنے گناہوں کو یاد کرتی رہی پھر جان بوجھ کر ایک ٹرک کے سامنے آگئی۔ ٹرک لوڈ تھا اور اس کی اسپیڈ اچھی خاصی تیز تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے ہما سے ٹکرایا۔ ہما سڑک پر پھسلتی چلی گئی۔ اس کا سر زور سے فٹ پاتھ سے ٹکرایا۔ اور اس کا دماغ تاریکیوں میں ڈوبنے لگا۔ اور اس کی روح اس کے جسم سے آزاد ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

ساحر فاریہ کو چھوڑنے کے لئے دروازے تک آیا اور فاریہ گھر سے باہر آگئی اور ساحر اندر مڑا سامنے شلپا کی آتما کھڑی تھی۔

''شلپا تم.....'' ساحر حیران تھا۔

''ہاں..... میں، ہما نے مجھے آزاد کردیا ہے۔''

'اوہ شلپا آج میری زندگی کا مقصد پورا ہوگیا ہے تم سوچ بھی نہیں سکتی کہ میں آج کتنا خوش ہوں.....'' ساحر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک زور سے زمین ہلنے لگی۔

''ساحر یہ کیا ہورہا ہے۔ تمہاری جان کو خطرہ ہے یہاں سے نکلو۔'' شلپا پریشان تھی۔

اس سے پہلے کہ ساحر کوئی جواب دیتا گھر کی دیواریں گرنے لگیں اور دو منٹ میں سارا گھر ملبہ بن چکا تھا۔ ساحر ان دیواروں تلے تھا جو کبھی اسے تحفظ مہیا کرتی تھیں آج ساحر ان دیواروں کے نیچے آکر مر چکا تھا۔ ساحر نے محبت کی تھی اور اپنی محبت کو اس نے سرخرو بھی کیا تھا۔ لیکن اس کے لئے ساحر نے غلط راستے کا انتخاب کیا تھا اور شاید اسی بات کی ساحر کو سزا ملی تھی۔

شلپا ایک آتما تھی اس لئے اسے کچھ نہ ہوا تھا۔ وہ کچھ فاصلے پر کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔ اسے ہما کی ساری چال سمجھ آگئی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ کیوں اب اس سنسار کو چھوڑ کر اسے روحوں کے سنسار میں جانے کا وقت آگیا تھا۔ اور شلپا خوش بھی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ اپنے اپنے گناہوں کی سزا کاٹنے کے بعد اس کی اور ساحر کی روحیں ضرور ملیں گی۔

☆.....☆.....☆

ادھر فاریہ کو ساحر اور ہما دونوں کی موت کا پتا چل گیا تھا۔ دونوں ہی اسے بہت عزیز تھے لیکن ان دونوں نے ہی تباہی کا راستہ خود اپنے لئے چنا تھا۔ موت نے ان دونوں کے منصوبوں کو خاک میں ملادیا تھا۔ محبت کے قاتلوں نے جہاں ساحر سے اس کی محبت چھینی تھی وہیں ہما نے اپنی بہن سے اس کا پیار چھین کر دنیا والوں کو بتادیا تھا کہ محبت کے قاتل روز اول سے ہیں اور دنیا فنا ہونے تک رہیں گے۔

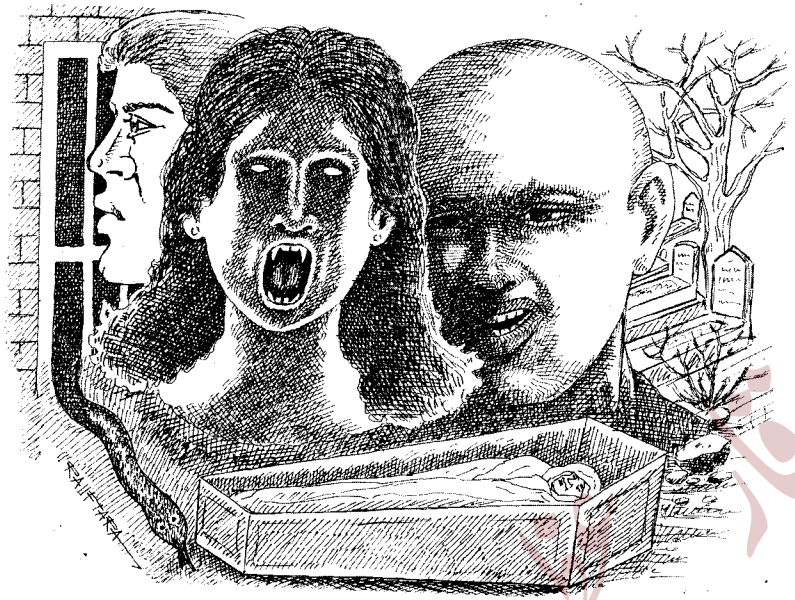

خبیث چڑیل

اقراء قریشی - راولاکوٹ

چڑیل کی بھیانک اور ڈرائونی آواز گونجی، نہیں چھوڑوں گی، اور اس کا حشر نشر کردوں گی، اس نے مجھے پریشان کیا ھے اب اس کا زندہ رھنا ممکن نہیں اور پھر دیکھتے ھی دیکھتے اچانک.....

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی خوفناک، دہشت ناک، ڈراؤنی کہانی

میں جیسے ہی کالج پہنچی تو دیکھا کہ کچھ لڑکیاں اسٹاف روم کے باہر کھڑی تھیں۔ میں ان کے قریب گئی تو پتہ چلا کہ وہ سب کی سب میری ہی کلاس فیلوز تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی جس کا نام انعم تھا وہ رو رہی تھی، لڑکیوں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ''اس کے ماموں کا انتقال ہوگیا ہے۔'' میں یہ سن کر آگے بڑھی اور اسے تسلی دی۔ مجھے اس سے پتہ چلا کہ کال آئی تھی۔ ماموں کا انتقال ہوگیا ہے۔ اب وہ گھر جارہی ہے۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئی کیونکہ میری کلاس شروع ہونے والی تھی۔

کالج میں پورا دن بہت مصروف گزرا۔ اور میں جب گھر واپس آئی تو میرے ذہن سے صبح والا واقعہ نکل چکا تھا۔ تین دن تک انعم کالج نہ آئی پھر وہ دوبارہ سے کالج آنا شروع ہوگئی۔ اسی طرح تین مہینے گزر گئے اور

پھر سے وہی معمول شروع ہوگیا۔

اور پھر ایک دن جب میں صبح کے وقت کالج پہنچی پتہ چلا کہ آج ایک ٹیچر جو کہ ہماری اردو کی کلاس لیتی تھیں۔ وہ چھٹی پر ہیں۔ ہماری کلاس کی لڑکیاں بہت خوش تھیں کیونکہ آج ہمیں ایک پریڈ فری ملنا تھا۔ صبح 11 بجے تک ہم کلاس میں مصروف رہے۔ پھر اردو کی کلاس اسٹارٹ ہوئی تھی جو کہ فری تھی، کچھ لڑکیاں کینٹین میں چلی گئیں جب کہ کچھ لڑکیاں گروپس بنا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ میں بھی اپنی چند دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔ انعم بھی ہمارے ساتھ ہی تھی۔

باتیں کرتے کرتے میں نے جنات کا ٹاپک شروع کردیا..... سب نے جنات کا نام سن کر ہنسی مذاق کرنا شروع کردیا۔ پھر انعم کہنے لگی۔ ”رداتمہیں پتہ ہے میرے ماموں کا انتقال کیسے ہوا؟“

میں حیرانگی سے کہنے لگی۔ ”کون سے ماموں؟“

انعم بولی۔ ”یار! وہ تمہیں یاد ہے جب ایک دن میں کالج آئی تھی اور رو رہی تھی۔“

اچانک مجھے کچھ ماہ پہلے والی بات یاد آئی اور میں نے کہا۔ ”ہاں! ہاں یاد آ گیا بتاؤ وہ کیسے فوت ہوئے تھے؟“

وہ کہنے لگی۔ ”آؤ کہیں اور بیٹھیں۔ یہاں بہت شور ہے۔“ پھر ہم دونوں اٹھ کر کچھ دور جا کر بنچ پر بیٹھ گئے۔

پھر وہ یوں گویا ہوئی۔ ”میرے ماموں بہت اچھے انسان تھے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ بہت ہی نیک تھے۔ وہ جاب پر جایا کرتے تھے۔ ہم ایک پہاڑی علاقے میں رہتے ہیں۔ اس لئے لوگ شام کو ہی گھروں میں چلے جاتے ہیں۔ میرے ماموں کی جاب ایسی تھی کہ وہ پہنچتے پہنچتے لیٹ ہوجایا کرتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ گھر لوٹ رہے تھے۔ ہمارا گھر جدھر ہے وہاں پہنچنے کے لئے سنسان راستے سے گزرنا پڑتا ہے۔ آس پاس صرف درخت اور جھاڑیاں ہیں۔ غرض کہ وہ جگہ بالکل جنگل جیسی ہے۔ میرے ماموں گھر لوٹ رہے تھے۔ مغرب کی اذان ہوچکی تھی۔ وہ اس سنسان راستے سے گزر رہے تھے۔ اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

اچانک کچھ دور جا کر انہوں نے دیکھا کہ ان سے کچھ فاصلے پر کوئی عورت ایک پتھر پر بیٹھی رو رہی ہے۔ ماموں کو صرف اس کی پشت ہی نظر آ رہی تھی۔

ماموں حیران ہوگئے کہ اس ویرانے میں اور شام کے وقت اکیلی عورت کیا کر رہی ہے۔ پہلے تو ماموں نے سوچا کہ ایسے ہی گزر جائیں لیکن انہیں لگا کہ ان کو اس عورت کو یوں اکیلا یہاں پر چھوڑ کر نہیں جانا چاہئے۔ اس عورت نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور اس کے بال کھلے تھے جو کہ اس کی کمر پر لہرا رہے تھے۔ ماموں نے وہیں سے اس عورت کو آواز دی۔ ”سنو! تم اس ویرانے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟ کہیں جانا ہے تو بتاؤ میں چھوڑ دوں؟“ لیکن اس عورت نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

ماموں نے اسے پھر آواز دی۔ ”رات ہوجائے گی کچھ دیر میں تم یہاں اس ویران جنگل میں کیا کرو گی، میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔“ لیکن وہ عورت ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ماموں آگے بڑھے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجھوڑا، جیسے ہی اس عورت نے گردن پیچھے موڑی تو ماموں ڈر گئے، اس عورت کا چہرہ بہت ہی بھیانک خوفناک تھا۔ اس کی آنکھیں باہر کو ابلی ہوئی تھیں۔ چہرے پر جھریاں تھیں اور منہ پر جگہ جگہ کٹ کے نشان تھے۔ جن پر خون لگا ہوا تھا۔ دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے اور لمبے تھے۔

ماموں ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ خوف سے ان کے ماتھے پر پسینہ آنے لگا۔ وہ عورت فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنی خون خوار آنکھوں سے ماموں کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”تو نے مجھے پریشان کر کے اچھا نہیں کیا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ تجھے ایسی بھیانک موت دوں گی کہ تو یاد رکھے گا۔“ پھر وہ ماموں کی جانب بڑھنے لگی۔

ماموں خوف کے مارے کانپ رہے تھے ماموں کی ایک عادت تھی کہ وہ ہر وقت باوضو رہتے تھے ماموں فوراً پیچھے ہٹے اور بھاگ کر تھوڑا دور پہنچے اور انہوں نے

وہیں مغرب کی نماز پڑھنا شروع کردی۔ وہ عورت ان کے گرد چکر لگاتی رہی۔ لیکن کلام الٰہی کے باعث انہیں کچھ نہ کہہ سکی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ غائب ہوگئی۔

ماموں نے نماز ادا کی اور قرآنی آیتوں کا ورد کرتے رہے۔ اور تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ جیسے ہی گھر پہنچے تو گھر والے انہیں دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ ان کی حالت بہت غیر ہو رہی تھی، نانی نے جلدی سے انہیں بٹھایا اور پانی لا کر دیا۔ جب انہوں نے پانی پیا تو ان کے حواس کچھ بحال ہوئے اور پھر انہوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں سب کو بتایا۔

ماموں کی بات سن کر نانی پریشان ہوگئیں اور قرآنی آیات پڑھ کر ان کے اوپر پھونک ماری۔ ماموں کو پھر بستر پر لیٹ جانے کو کہا اور سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

اگلے دن جب نانی اٹھیں اور ماموں کو دیکھنے ان کے کمرے میں گئیں تاکہ انہیں فجر کی نماز کے لئے اٹھا سکیں۔ نانی نے انہیں ہاتھ تھام کر ہلایا لیکن ماموں کا ہاتھ آگ کی طرح تپ رہا تھا۔ نانی نے ان کے ماتھے پر ہاتھ لگایا تو ماتھا بھی بہت زیادہ گرم تھا۔ نانی نے انہیں دوا دی اور ان کو رام کرنے کا کہہ کر خود نماز ادا کرنے چلی گئیں اور پھر نماز کے بعد نانی نے ماموں پر قرآنی آیات پڑھ کر دم کیا۔

اسی طرح دو دن گزر گئے۔ ماموں کا بخار کچھ کم ہوا۔ نانی نے انہیں جاب پر جانے سے روک رکھا تھا، چوتھے روز ماموں کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ دوبارہ سے جاب پر گئے۔ لیکن اب وہ کوشش کرتے کہ جلدی گھر آجائیں مگر پھر بھی دیر ہوجاتی تھی۔

کچھ دن گزرے کہ ایک رات ماموں سوتے ہوئے چلانے لگے۔ سب گھر والے دوڑے دوڑے آئے۔ ماموں بیڈ سے نیچے گرے ہوئے تھے۔ وہ چلا رہے تھے۔ ”مجھے مت مارو۔ چھوڑ دو مجھے۔“ نانی نے جلدی سے قرآنی آیات پڑھنا شروع کردیں اور ماموں کی جانب پھونک ماری۔ ماموں نے چلانا بند کردیا۔ اب وہ ڈر کے مارے کانپ رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے اوسان بحال ہوئے اور وہ پھر سے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

اب اکثر ان کے ساتھ ایسا ہونے لگا۔ ہر وقت ماموں ڈرے ڈرے رہنے لگے۔ سب سے بات کرنا چھوڑ دی۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے چلانے لگتے۔ کبھی اپنا سر دیوار کے ساتھ ٹکراتے۔ کچھ ہی دنوں میں وہ بہت ہی کمزور ہوگئے۔ لوگوں نے کسی عامل کو دکھانے کا مشورہ دیا۔

ایک عامل کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ ”اس دن شام کو ویران جگہ سے گزرتے ہوئے جس عورت سے ان کا سامنا ہوا تھا۔ وہ ایک خبیث چڑیل ہے اور وہ بہت ہی طاقتور ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھی لیکن ماموں نے اس کو بار بار پکارا جس کی وجہ سے وہ ان کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یہ ان سے مداخلت کی وجہ سے بدلہ لینا چاہتی ہے اور انہیں مار دینا چاہتی ہے۔“

یہ سن کر نانی پریشان ہوگئیں۔ انہوں نے عامل سے مسئلے کا حل دریافت کیا تو عامل نے ماموں پر دم کیا اور پانی بھی دم کر کے دیا۔

کچھ دن ماموں کی حالت سنبھلی لیکن پھر سے وہی کچھ یعنی رات کے وقت سوتے میں ڈرنا، رونا، شور کرنا وغیرہ وغیرہ شروع ہوگیا۔ سب گھر والے بہت پریشان تھے۔ ماموں دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے تھے۔ لگتا ہی نہ تھا کہ وہ پہلے والے خوش مزاج ماموں ہیں۔ اب وہ چڑچڑے رہنے لگے تھے۔ آنکھوں کے گرد گہرے حلقے بن چکے تھے۔ اب وہ پہلے جیسے نہیں رہے تھے۔

دو تین اور عاملوں سے بھی رابطہ کیا لیکن ماموں کا پیچھا وہ چڑیل چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ نانی پورا دن ماموں کے لئے دعائیں کرتی رہتی تھیں۔ ماموں کی جاب بھی چھوٹ گئی تھی۔ ماموں ہر وقت اپنے کمرے میں بند رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی ترک کردیا تھا۔ نانی زبردستی تھوڑا بہت کھلا دیتی تھیں۔ اب بچے بھی ان کے پاس

جانے سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہ ماموں کو اس حالت میں دیکھ کر خوف کھاتے تھے۔ گھر میں بھی عجیب سی فضا پھیلی ہوئی تھی۔

پھر ایک دن ایک بابا جی نے بتایا کہ ''ماموں کو فلاں بزرگ کے پاس لے جائیں یہ ٹھیک ہوجائیں گے۔''

ان دنوں گھر میں بھی عجیب وغریب آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی کوئی برتن ٹوٹ جاتا۔ کبھی گھر میں کسی اور کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ اب گھر میں بھی سب ڈرے ڈرے رہنے لگے۔ گھر کے فرد ذرا سی آہٹ پر چونک جاتے تھے۔

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ ایک دن میری امی نے نانی سے سوال کیا جو کہ ماموں کی خراب طبیعت کے باعث میکے میں تھیں۔ امی نے پوچھا۔ ''اماں کیا۔ پھر سے وہی سب کچھ ہورہا ہے؟'' میں اس سوال پر حیران رہ گئی کہ یہ امی کس چیز کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔

میں نے نانی سے پوچھا۔ ''نانی! امی کس چیز کے بارے میں پوچھ رہی ہیں۔'' کیا دوبارہ شروع ہوگیا؟'' نانی کہنے لگی۔ ''ردا! یہ جو کچھ ہمارے گھر میں ہورہا ہے یہ آج سے نہیں ہے بلکہ یہ سب ہمارے بزرگوں سے جڑا ہے۔ تمہارے نانا کے نانا جی نے اپنے دور میں کچھ عمل سیکھے انہیں عامل بننے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کے باعث وہ عملیات کی کتابیں خرید لاتے انہیں پڑھتے اور عمل کرنے کی کوشش کرتے۔ جیسا کہ تمہیں پتہ ہے کہ عامل بننا آسان نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنے کمرے میں بند ہوجاتے اور عمل کرتے رہتے۔ سب کے منع کرنے کے باوجود بھی وہ نہ مانتے۔

اسی طرح کچھ عمل جو کہ انہوں نے جنات کو قابو کرنے کے لئے کئے تھے۔ وہ غلط ہوگئے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ تمہارے نانا جنات اور چڑیلوں کو قابو کرنے کے لئے ایک کتاب لے آئے اور سب کو دکھانے لگے۔ اور کہنے لگے۔ ''آج میں چڑیل کو قابو کرکے دکھاؤں گا میں رات کو یہ عمل کروں گا کوئی مجھے تنگ نہ کرے۔'' ان کو منع بھی کیا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم تھے۔

رات کو تقریباً بارہ بجے انہوں نے عمل کرنا شروع کیا۔ پہلے تو کچھ نہ ہوا لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے ایک الفاظ زور زور سے پڑھنا شروع کردیا۔ کمرے میں جو موم بتیاں جل رہی تھیں وہ اچانک بجھ گئیں۔ ایک زور دار دھماکے کی آواز آئی پھر نانا جی کی چیخ کی آواز آئی۔ سب دوڑتے ہوئے ان کے کمرے میں پہنچے لیکن جب اندر داخل ہوئے تو اندر کا منظر دیکھ کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ لائٹ آن کی تو دیکھا کہ تمہارے نانا زمین پر گرے ہوئے تھے۔ ان کی شہ رگ کٹ چکی تھی۔ ہر طرف خون ہی خون بکھرا پڑا تھا۔

اچانک ایک بھیانک آواز سنائی دی۔ ''کسی کو نہیں چھوڑوں گی۔ سب کو مار ڈالوں گی۔'' اور پھر ایک دم خاموشی چھا گئی۔

پھر اس دن سے ہمارے گھر میں عجیب وغریب صورت حال پیدا ہوگئی۔ سب ڈرے ڈرے رہنے لگے۔

ایک رات کے وقت دروازے پر اتنی زور دار دستک ہوئی لگتا تھا کہ ابھی دروازہ ٹوٹ جائے گا۔ سب نے اونچی آواز میں آیات کا ورد کرنا شروع کردیا۔ سب حیران تھے کہ اتنی برستی بارش میں کون ہوسکتا ہے۔ لیکن کسی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ باہر جا کر دیکھے۔ پوری رات دستک ہوتی رہی کوئی بھی سو نہ سکا۔ اب ہر وقت سب کی زبان پر کلام الٰہی جاری رہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ایک بزرگ ملے جنہوں نے پانی پر دم کیا اور بولا کہ ''یہ پانی پورے گھر میں چھڑک دیا جائے۔'' اور سب کو پانچ وقت کی نماز پڑھنے کو کہا۔ اس طرح ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا مل گیا اب ان بزرگ کا انتقال ہوچکا ہے۔'' اور یہاں تک بول کر نانی خاموش ہوگئیں۔

میں وہاں سے اٹھ گئی اور گھر کے کام کاج میں مصروف ہوگئی۔

☆.....☆.....☆

رمضان کا مہینہ شروع ہوچکا تھا۔ ماموں کی اب بھی وہی حالت تھی۔ انہیں کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ پورا دن ایسے ہی پڑے رہتے۔ کوئی قریب جاتا تو مارنے کو دوڑتے۔ ہر کوئی ماموں کی حالت سے مایوس ہوچکا تھا۔ پھر ایک دن کسی کے کہنے پر ماموں کو ایک دور دراز جگہ پر ایک بزرگ کے آستانہ پر لے گئے۔ آستانے پر بہت رش تھا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد ہماری باری آئی۔ ماموں کو ان بزرگ کے سامنے بیٹھا دیا۔

ماموں بزرگ کے سامنے بیٹھے تھے۔ نانی نے بزرگ کو ساری کہانی سنائی پھر بزرگ نے ماموں کے گرد ایک حصار کھینچا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد ماموں کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ اور ایک عجیب وغریب آواز میں ماموں کہنے لگے۔ ''کیوں بلایا ہے مجھے یہاں؟'' ماموں کی آواز بہت ہی بھاری تھی۔

بزرگ کہنے لگے۔ ''کیوں اس کے پیچھے پڑی ہے۔ چھوڑ دے اس کو۔''

وہ چڑیل ماموں کی آواز میں کہنے لگی۔ ''نہیں چھوڑوں گی جو حشر اس کے نانا کا کیا تھا اس کا بھی وہی حشر کروں گی۔ اس نے مجھے کیوں پریشان کیا۔ اسے میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اور تو بھی سن لے اگر تو میرے راستے میں آیا تو تجھے بھی مار ڈالوں گی۔'' پھر اس نے بزرگ کی طرف اشارہ کیا اور بزرگ کو ایک جھٹکا لگا اور وہ گر پڑے۔

یہ دیکھ کر وہ چڑیل قہقہے لگانے لگی۔ بزرگ بھی خوفزدہ ہوگئے اور نانی سے کہنے لگے۔ ''یہ کام میرے بس کا نہیں ہے آپ انہیں گھر لے جائیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔''

جاتے جاتے چڑیل کہہ گئی۔ ''اس کو میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ مار ڈالوں گی اسے، اس کی زندگی کے کچھ دن ہی بچے ہیں۔ پھر اس کو اس کی سزا مل جائے گی۔'' اور پھر وہ چڑیل غائب ہوگئی اور ماموں بے ہوش ہوگئے۔

ماموں کو ہم گھر لے آئے۔ نانی ہر وقت روتی رہتیں اور بیٹے کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتیں۔

رمضان کا بابرکت مہینہ اختتام کو تھا۔ دو دن بعد عید تھی۔ ماموں کی اب بھی وہی حالت تھی۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکے تھے۔ عید آئی اور گزر گئی۔ لیکن ہمیں کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ اب ہم لوگ بھی اپنے گھر واپس چلے گئے۔ نانی ماموں کی دیکھ بھال کے لئے اکیلی رہ گئیں۔ امی کی مجبوری تھی، زیادہ دن میکے میں رکنا ممکن نہ تھا۔ امی ماموں کی وجہ سے فکرمند تھیں لیکن ظاہر نہ کرتیں۔ وہ کسی کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں اسی طرح دن گزرتے رہے۔

ایک دن نانی کی کال آئی وہ کہنے لگیں۔ ''ماموں کی طبیعت ہر روز بگڑتی جارہی ہے اب تو ایک نوالہ بھی نہیں کھاتے۔ سمجھ نہیں آتا کیا کروں۔ جو کھاتے ہیں وہ بھی قے کردیتے ہیں۔'' امی نے نانی کو تسلی دی۔ امی ہر روز ماموں کی حالت کے بارے میں پوچھتیں لیکن ماموں کو ٹھیک نہ ہونا تھا وہ نہ ہوئے۔

جب ماموں کے انتقال کی خبر مجھے ملی تو میں گھر پہنچی، ماموں چارپائی پر پڑے تھے۔ ان کی گردن پر زخم کے نشان تھے۔ آنکھیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی نے گلا دبا کر مارا ہو، میں بھی رونے لگی۔ ہر کوئی گھر میں رو رہا تھا۔ ہم سے ایک بہت اچھا انسان بچھڑ چکا تھا۔

ماموں کی تدفین کردی گئی۔ نانی کو سب تسلی دے رہے تھے لیکن نانی چپ تھیں۔ ماموں کا سوئم ہوگیا اور ہم اپنے گھر واپس آگئے۔ وہ چڑیل اپنا بدلہ لے کر جاچکی تھی۔''

یہ سناتے ہوئے انعم رو رہی تھی۔ میں نے اسے تسلی دی۔ انعم پھر بتانے لگی۔ ''اب وہ آوازیں آنا بند ہوگئی ہیں۔ ماموں کے انتقال کے ساتھ ہی سب عجیب و غریب چیزیں ختم ہوگئی ہیں۔'' انعم اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ ہماری اگلی کلاس شروع ہوچکی تھی۔ ہم دونوں جلدی سے اٹھیں اور کلاس روم کی جانب بڑھ گئیں۔ مجھے اب کبھی بھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

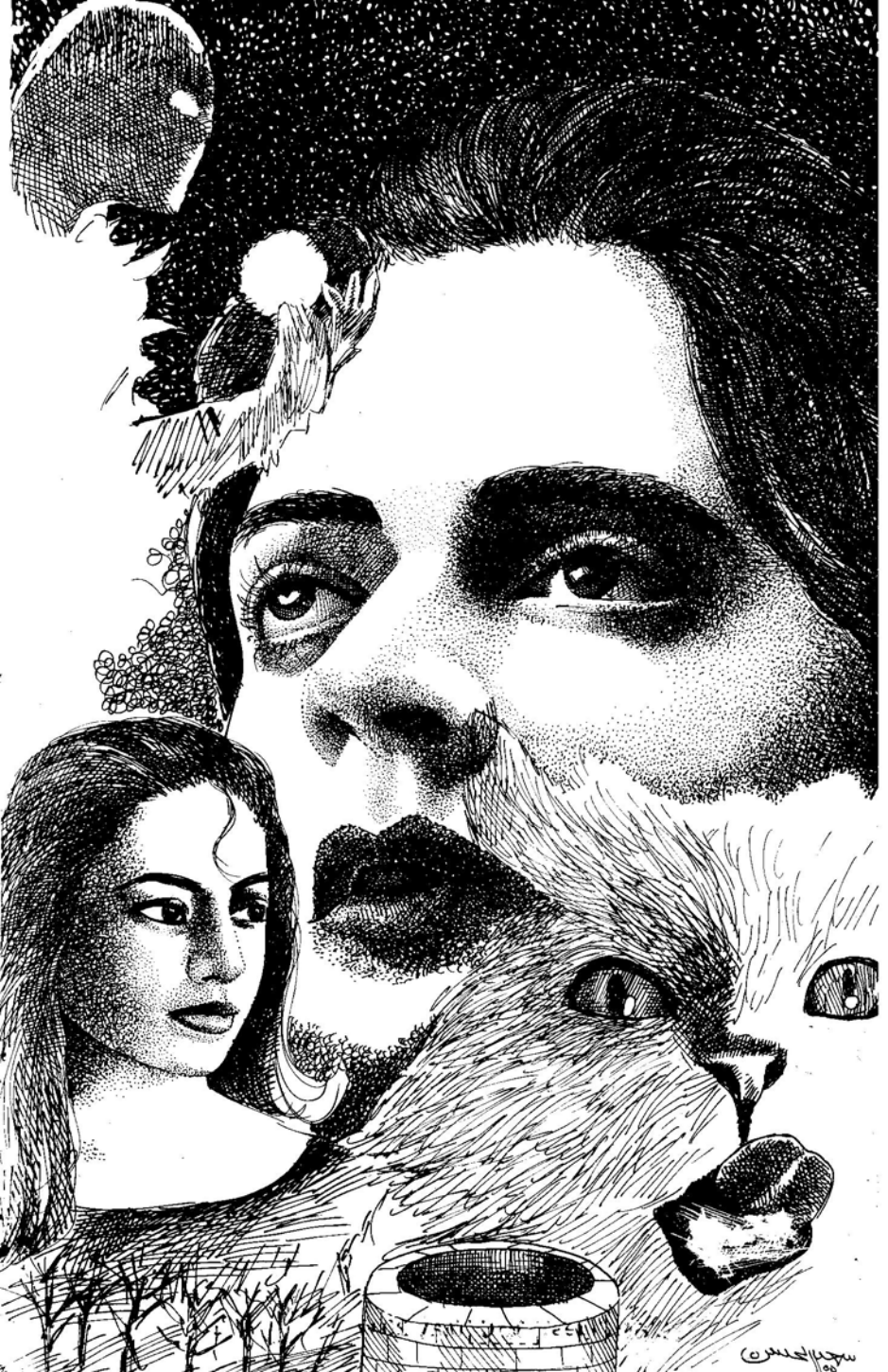

اِسرار

محمد خالد شاہان-صادق آباد

قسط نمبر 10

نقطہ نقطہ لفظ لفظ سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش جسم و جاں کو انگشت بدنداں کرتی اور دلوں کو تھراتی ہوئی خونچکاں بھونچکاں اور لھولھان کہانی جو کہ پڑھنے والوں پر سکتہ طاری کردے گی۔

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر چنگھاڑتی گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی کہانی

"**حوصلہ** شون حوصلہ۔" میں نے کہا۔

وکیل کے تاثرات بڑے عجیب تھے۔ شاید اسے شون کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا تھا۔ بڑی مشکلوں سے شون کی حالت اعتدال پر آئی۔ کچھ دیر کی گہری خاموشی کے بعد..... وکیل شون سے مخاطب ہوا۔

"شون صاحب یہ صورت حال میرے منصوبے سے متصادم ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کوئی اور قدم اٹھانا چاہئے۔ آپ کی کیا رائے ہیں۔"

"جو قدم بھی اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ۔ میرا خیال ہے کہ اب یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

تو انعم سے پہلے نادر بول پڑا۔ کیوں کیا اب یہاں سرنگ کھودنے کا ارادہ ہے۔"

"جی نہیں جس طرح ہم لوگ یہاں آئے تھے۔ ویسے ہی یہاں سے نکل بھی جائیں گے۔ باتوں سے آپ بہت بڑے جادوگر لگتے ہیں۔ نادر کا لہجہ طنزیہ تھا۔

وکیل کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "مائی ڈیئر نادر اگر میں تم لوگوں کو ان سلاخوں کے پیچھے لے کر آ سکتا ہوں تو یہاں سے باہر بھی لے جا سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب! آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ہم سب کی سوالیہ نظروں کا مرکز وکیل ہی تھا۔ "مطلب یہ کہ یہاں ہمیں ان لوگوں نے قید نہیں کیا۔ بلکہ ہم خود قید ہوئے ہیں اور ایسا میں نے بہت سوچ بچار کے بعد کیا ہے۔ وگرنہ یہ لوگ ہم پر کبھی بھی قابو نہ پا سکتے تھے۔

"وکیل چند لمحوں کے بعد پھر گویا ہوا۔" دراصل بات یہ تھی کہ چوری چھپے دلاور ہاؤس میں داخل ہو کر اور بغیر کسی کی نظروں میں آئے دلاور کی خواب گاہ تک پہنچنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ سو میں نے ایک منصوبہ بنایا۔ دلاور بڑی حد تک ہم سب سے خائف ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہماری موت کے درپے تھا۔ اس کی طرف سے بھیجے گئے موت کے ہرکارے یہاں تک آنے والے ہر راستے پر گھات لگائے بیٹھے تھے۔ اور کچھ لوگ ہماری کوٹھی کی نگرانی پر مامور تھے۔ ہم وہاں سے نکلے تو ہم سے پہلے ہمارے اس طرف آنے کی خبر ان لوگوں تک پہنچ گئی۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں نے شریم صاحب، شون، ندیم عباس اور انعم کو ہی راستے میں دھر لینے کی کوشش کی مگر یہ لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہم لوگ ان سے بچ کر اس لئے حویلی میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ ہم نے شہر سے نکلنے سے پہلے ہی گاڑی بدلی تھی۔ ہمارا ساتھی ٹونی جو کہ اب بھی دلاور ہاؤس میں ہے۔ اس نے مجھے خبر دی تھی کہ دلاور ویسے تو ہمیں زندہ قابو کرنا چاہتا ہے۔ مگر اس طرح کی ایک کوشش اسے پہلے ہی بہت مہنگی پڑ گئی تھی۔ اس لئے وہ دوبارہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتا

تھا۔سو اس نے ہماری موت کا پروانہ جاری کردیا۔ میں نے سوچا کہ اگر ہم بے بس ہوجاتے تو دلاور ہمیں موت کے گھاٹ اتارنا کبھی بھی گوارا نہیں کرے گا۔ بلکہ ہمیں زندہ پکڑ کر اپنے سامنے اذیتیں دے دے کر مارے گا۔ اس لئے میں نے دلاور کے ساتھ ایک ڈرامہ کھیلا۔

خیرو کو کہہ کر میں نے چائے میں بے ہوشی کی دوا ملادی۔ اور خیرو کو دلاور کے پاس بھیج دیا کہ جا کر دلاور کو بتاوے کہ "کھیر تیار ہے۔ ہاتھ صاف کرلو۔" حالانکہ اس میں رسک بھی بہت تھا۔

مگر مجھے یقین تھا کہ نتیجہ میری توقع کے مطابق نکلے گا۔ اور وہی بات ہوئی۔ دلاور کے آدمی ہمیں از خود دلاور ہاؤس کے اندر قید خانے تک لے آئے۔ میرا خیال تھا کہ جب دلاور یہاں آئے گا تو ہم اس کو بندی بنالیں گے اور تابوت لے اڑیں گے۔ مگر یہاں صورت حال میرے توقع کے خلاف نکلی، میں سمجھ رہا ہوں کہ یہ لوگ ہمیں بھوکا پیاسا رکھ کر جسمانی اور اعصابی طور پر اس حد تک ناکارہ کردیں گے کہ ہم میں ہلنے جلنے کی سکت نہ رہے۔ تب دلاور ہمارے سامنے آئے گا اور ایسی صورت میں ہم بچ نہ سکیں گے۔ لہٰذا اس سے پہلے ہمیں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنا ہوگی۔" یہ بول کر وکیل خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی۔

پھر کاوش کی آواز سنائی دی۔ "وکیل تمہارا منصوبہ تو بڑا ہی جاندار تھا۔ لیکن اگر ذرہ بھی کہیں کوئی کمی بیشی ہوجاتی تو اس وقت ہم سارے عالم بالا میں بیٹھے ہوتے۔"

"میرے ہوتے ہوئے ایسا ممکن نہ تھا۔" وکیل مسکرایا۔ "تم بھی تو ہمارے ساتھ ہی یہاں مردوں کی طرح آئے تھے۔ اگر وہ لوگ ہمیں ہلاک کرنا چاہتے تو ہمارے ساتھ ساتھ تم بھی مرجاتے۔ میں یہاں تو تم لوگوں کے ساتھ آیا ضرور ہوں۔ مگر مردوں کی طرح نہیں بلکہ اپنے ہوش وحواس کے ساتھ آیا ہوں۔"

"کیا مطلب تم نے بھی تو چائے پی تھی۔"

"ہاں چائے ضرور پی تھی۔ مگر شاید اس دوران کسی نے نوٹ کیا ہو کہ چائے پینے سے پہلے میں نے کپ میں ایک گولی ڈال لی تھی۔ وہ بے ہوشی کی دوا کا اثر زائل کرنے کے لئے تھی۔"

"بڑے خبیث ہو۔ تم جاسوسی کے سب ریکارڈ توڑ ڈالو گے۔ بہرحال اب یہ بتاؤ کہ اب کیا پروگرام ہے۔ کیا یہاں سے نکلا جاسکتا ہے۔"

"یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ اصل مسئلہ کچھ اور ہے۔"

"وہ کیا!" ہم سب پوری طرح وکیل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ دلاور کے عجائب خانے کو جانے والا راستہ دلاور کی خواب گاہ سے جاتا ہے۔ یہ تو تم لوگوں کو علم ہے۔"

"ہاں بالکل۔ وہ آپ نے بتایا تھا۔ مسئلہ کیا ہے۔"

"دلاور کی خواب گاہ میں ایک اور بھی خفیہ راستہ ہے۔ جو دلاور ہاؤس سے باہر ایک کوٹھی میں جا کر نکلتا ہے۔ جو یہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ہے۔

ہم لوگ عجائب خانے سے تابوت نکال کر دلاور کی خواب گاہ سے ہی اس دوسرے راستے کے ذریعے دلاور ہاؤس سے باہر نکل جائیں گے۔"

"یہ تو سارا مسئلہ ہی حل ہوگیا۔ سارے راستے ہی سیدھے ہوگئے۔" میں نے مسرت سے کہا۔

"شریم صاحب پہلے مکمل بات سن لیں۔ مسئلہ ابھی تو انہوں نے بیان کیا ہی نہیں۔" نادر نے مجھے ٹوکا۔

"دلاور کی خواب گاہ تک پہنچنے کا یہ علم نہیں کہ یہ قید خانہ دلاور کے کون سے حصے میں ہے۔ اور اس کا راستہ کہاں جا کر نکلتا ہے۔"

"ہاں یہ بات بھی ہے۔"

"دلاور کی خواب گاہ تک پہنچنے کا کوئی مسئلہ نہیں، اللہ وارث ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

اور میں نے سنگین مسئلے کو نظر انداز کردیا۔ میرے لئے یہ احساس ہی بڑا خوش کن تھا کہ "میں نفران تک پہنچنے والا ہوں اور قاری صاحب سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے والا ہوں۔ اس طرح نفران بھی اس بدروح کی قید

سے نجات حاصل کرلے گی۔"

"تو پھر کیا خیال ہے کہ یہاں سے نکلا جائے؟" وکیل نے سب کی طرف تائید بھری نظروں سے دیکھا۔

"اگر ایسا ممکن ہے تو انتظار کس بات کا ہے۔" ندیم نے کہا۔

"سوچ لیں باہر نکل کر ہم میں سے کوئی بھی یا سبھی گولی کا شکار بھی ہوسکتے ہیں۔" وکیل بڑے خوب صورت طریقے سے ہمیں ذہنی طور پر خطرات سے نمٹنے کے لئے تیار کررہا تھا۔ "یہاں فاقوں سے اکتا کر ایڑیاں رگڑتے ہوئے بے بسی کی موت مرنے سے بہتر ہے کہ یہاں سے باہر نکل کر گولی کا شکار ہوجائیں۔" نادر نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"تو ٹھیک ہے پھر تیار ہوجاؤ۔" وکیل نے کہا۔ اور رخ بدل کر انعم سے مخاطب ہوا۔ "تالا کھولنا ہے۔" انعم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پیر ہن اتار کر وکیل کو پکڑادی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سلاخوں والے دروازے کے قریب آگیا۔ اور پہلے وکیل نے کوئی آہٹ محسوس کرنے کی کوشش کی۔ پھر سے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر پکڑلیا۔ اور پن کی ہول میں داخل کردی۔ ہم سب کی نظریں وکیل پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر تک تو وہ پن والے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا۔ پھر اچانک ایک ہلکی سی آواز سے تالا کھل گیا۔ ہم سب اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ وکیل نے تالا ہٹایا۔ اور آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ پھر پہلے باہر نکل کر دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔ پھر ہمارے دروازے تک آگیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم لوگ بھی حوالات سے باہر تھے۔

"آجاؤ۔" وکیل بائیں طرف کو چل پڑا۔ چند قدم کے فاصلے پر نظر آنے والی دیوار پر دونوں طرف سلاخوں والی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں۔ چند ایک میں کچھ زندہ کم مردہ قسم کے لوگ بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ ہم دبے پاؤں آگے بڑھتے رہے۔

آخری حوالات کی کوٹھری میں بائیں ہاتھ پر ایک کونے میں چھ سنگی زینے تھے۔ جن کے اختتام پر ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ وکیل نے ہمیں احتیاط کا اشارہ کیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا زینے کی طرف بڑھ گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے تھے۔ البتہ انعم تیزی سے میرے عقب سے نکل کر وکیل کے بالکل قریب پہنچ گئی۔

آخری زینے پر آکر وکیل نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے کی جھری سے اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ سیدھا ہوا اور انعم کو اشارے سے بتانے لگا کہ "بظاہر تو اندر ایک آدمی ہے مگر زیادہ بھی ہوسکتے ہیں۔ اور میں اندر جارہا ہوں۔ میرے جانے کے بعد تمہیں کیا کرنا ہے۔"

اور ہم سنسنی کا شکار تھے۔ وکیل نے ایک گہری سانس کھینچی اور پھر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتا ہوا برق رفتاری سے اندر داخل ہوگیا۔ انعم اچھل کر کھلے ہوئے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

اندر سے دوبار عجیب وغریب آوازیں بلند ہوئیں۔ پھر کسی کے کراہنے کی آواز ابھری۔ اور ساتھ ہی کراہنے والا دروازے سے آ ٹکرایا۔ انعم پہلے ہی اس کی منتظر تھی۔ اس نے بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ کر اس آدمی کی گردن گرفت میں لی۔ اور اسے اپنی طرف کرلیا۔ ایک چیخ کی آواز آئی۔ اور بندہ اچھل کر فرش پر آرہا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ پتہ نہیں کہ انعم کے ہاتھوں میں کیا جادو تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کسی بھی گرانڈیل انسان کی گردن کو صرف چھوتی تھی اور اس کی ہڈی ٹوٹ جاتی تھی۔

"آجائیں۔" اس نے بڑے مطمئن انداز میں کہا۔

اور ہم زینہ طے کرتے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ یہ ایک اچھا خاصا کمرہ تھا۔ جس کی در و دیوار کے ساتھ کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ تیسری دیوار کے ساتھ سادہ صوفہ رکھا ہوا تھا۔ دو ایک الماریاں دیواروں کی کچھ زنجیریں، ہک اور نہ جانے کیا کیا تھا وہاں، یقیناً یہ تشدد والا کمرہ تھا۔ جہاں دلاور اپنے سامنے انسانوں کے ساتھ

جانور جیسا سلوک کرتا تھا۔ چوتھی دیوار کے ساتھ سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں۔ اور سیڑھیوں کے اختتام پر ایک ٹھوس لکڑی کا دروازہ تھا۔ وکیل ایک طرف پڑی بندوق اٹھا رہا تھا۔ بندوق اٹھا کر اس نے ندیم عباس کو دے دی۔ ”خیال رہے کہ دلاور ہاؤس کے اندر اگر گولی چلنے کی آواز گونج اٹھی تو پھر ہمارا یہاں سے بچ کر نکلنا تقریباً ناممکن ہوجائے گا۔“ اور بندوق ندیم کو تھماتے ہوئے وہ بولا۔

اور پلٹ کر ایک آہنی الماری کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ لاک تھی۔ وکیل نے کالر میں لگائی ہوئی پن نکالی اور لاک کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر کی کوشش میں لاک کھل گیا۔ وکیل کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے ایک نظر ہماری طرف دیکھا۔ اور الماری کے دونوں پٹ کھول دیئے۔

پوری الماری مختلف قسم کے ہتھیاروں سے بھری ہوئی تھی۔ وکیل چند لمحے تک تو کچھ سوچتا رہا۔ پھر اس نے ایک جھکڑی اٹھائی۔ اور کاوش کی جانب اچھال دی۔ جو اس نے فضا میں ہی قابو کرلی۔ ”سنبھال لو کام آئے گی۔“ پھر اس نے الماری میں نظر آنے والے تین خنجر نکال لئے۔ ایک خنجر اس نے انعم کو تھما دیا۔ دوسرا خود سنبھال لیا۔ اور تیسرا خنجر ہماری طرف کرکے سوالیہ نظروں سے ہمیں دیکھنے لگا۔ تیسرا خنجر نادر نے اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ ”اب اس دروازے سے ہم نکل کر دلاور ہاؤس میں داخل ہوجائیں گے۔“ وکیل نے سیڑھیوں کے آخر میں نظر آنے والے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کچھ اندازہ نہیں کہ یہ تہہ خانہ دلاور ہاؤس کے کس حصے میں واقع ہے اور اس دروازے سے نکلنے کے بعد ہم دلاور ہاؤس کے کون سے حصے میں نکلیں گے۔ اور اب یہ بھی اندازہ نہیں کہ باہر رات کا وقت ہے۔ یا دن کا۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اگر ہم لوگ کسی بھی طرح دلاور کی خواب گاہ تک پہنچ گئے تو یوں سمجھو کہ ہم سب خطرے سے محفوظ ہوجائیں گے۔ لہٰذا ذہن میں رہے کہ ہماری پہلی کوشش یہی ہونی چاہئے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر خواب گاہ تک پہنچ جائیں۔ لیکن اگر اس دوران۔“

”نہیں ہم لوگوں کو پہلے خواب گاہ میں نہیں پہنچنا۔“ ندیم نے وکیل کی بات کاٹ دی۔ ”پہلے ہمیں دلاور ہاؤس کے لنگر خانے کا رخ کرنا چاہئے۔ بھوک نے جسم کی ساری توانائی چوس لی ہے۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جارہا۔“

”تو ٹھیک ہے تم یہاں لیٹ کر آرام کرو۔ ہم لوگ دلاور کی خواب گاہ کی طرف جارہے ہیں۔“ نادر نے سپاٹ لہجے میں کہا اور پھر وکیل سے مخاطب ہوا۔ ”آپ آگے کہیں۔“

”میں کہہ رہا تھا کہ ہماری کوشش ہونی چاہئے کہ کسی کی نظروں میں آئے بغیر اپنی منزل تک پہنچ جائیں۔ لیکن اگر کہیں کسی سے سامنا ہوجائے تو ہماری پوری کوشش ہوگی کہ کسی قسم کے کھڑاک کے بغیر خاموشی سے اسے ٹھکانے لگائیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ نادر نے پوری طرح وکیل کی بات کی تائید کی۔ ”مزید کچھ اس کے علاوہ کاوش نے پوچھا۔

”نہیں بس۔ تو پھر آگے چلیں۔“ نادر نے کہا۔ اور وکیل سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ انعم اس کے ساتھ تھی۔ اس کے پیچھے نادر اور آخر میں کاوش ندیم شون اور میں۔ ہم دبے پاؤں زینہ طے کرتے ہوئے دروازے تک پہنچے۔ وکیل نے دروازے پر دباؤ ڈال کر چیک کیا۔ وہ بند تھا، نہ کوئی لاک نہ ہینڈل نہ کنڈی بس سپاٹ دیوار تھی۔

”الیکٹرونک سسٹم۔“ وکیل نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور دروازے پر ہاتھ رگڑنے لگا۔ مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ کچھ دیر کی کوشش کے بعد وکیل دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظریں دائیں ہاتھ دیوار پر نظر آنے والے اس درز نما خلا پر جمی ہوئی تھی۔ جو چور دروازے کے بالکل ساتھ سے شروع ہوتا تھا۔ خلا کی چوڑائی دو انچ اور لمبائی دروازے جتنی تھی۔ چند لمحے اس خلا کو گھورنے کے بعد وکیل اپنے پیروں میں موجود اسٹیل لائن کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جو غالباً دروازے کی موومنٹ کے لئے تھی۔

”کیا کوئی مسئلہ ہے؟“ کاوش نے کہا۔

”دروازہ بجلی کے ذریعے کھولتا ہے اور نہ کسی ہک کا نشان ہے اور نہ ہی کوئی بٹن وغیرہ دکھائی دے رہا ہے۔“ وکیل نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ خنجر تینوں کے ہاتھوں میں دبے ہوئے تھے۔ ”پھر اب کیا ہوگا۔“ اچانک وکیل نے ساتھ ہی ایک تار کو دیکھ کر خنجر سے اسے کاٹ دیا اور دروازہ بے انداز آواز میں کھل گیا۔ اب باہر جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔ کھلے دروازے کی دوسری جانب سبز رنگ کا پردہ جھول رہا تھا۔ وکیل نے اپنا خنجر اٹھایا اور جلدی سے کھڑا ہوگیا۔ اس نے ہلکا سا پردہ ہٹا کر دوسری جانب دیکھا۔ پھر پلٹ کر آہستہ سے انعم سے مخاطب ہوا۔ ”اکیلا لالو سامنے بیٹھا شراب پی رہا ہے اور اس کا رخ بھی ہماری جانب ہی ہے۔ آواز نہیں ہونی چاہئے۔“ خنجر اس نے انعم کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور انعم سر ہلاتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھ گئی۔ وکیل ایک طرف ہوگیا اور وہ پردے کی اوٹ سے دوسری طرف جھانکنے لگی۔

کچھ دیر بعد اس نے اچانک پردہ ہٹایا اور اندر داخل ہوگئی۔ ہمارے دل دھک سے رہ گئے۔ اگر لالو چیخ پڑا تو ابھی مسلح افراد یہاں آجائیں گے اور ہم اوپر، پردہ ہٹا کر انعم کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ ”آجائیں۔“ اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ اور ہم حیران و پریشان اندر داخل ہوگئے۔ اتنی جلدی کیا ہوسکتا ہے۔ صرف چند سیکنڈ ہی تو گزرے تھے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بالکل سامنے ٹیبل پر شراب کے لوازمات دکھائی دے رہے تھے۔ اور ٹیبل کے ساتھ ہی لالو عجیب بے تکے انداز میں پڑا تھا۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا۔ یقیناً اس کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ ”نادر اس کو تہہ خانے میں پھینک دو۔“ وکیل نے نادر کو مخاطب کیا۔

”انعم دروازہ۔“ وکیل نے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کیا تو انعم نے لپک کر دروازہ بند کردیا۔ ایک طرف کھڑکی بھی تھی۔ جو کاوش نے بند کرکے آگے پردہ لگا دیا تھا۔ نادر نے لالو کے نیم مردہ وجود کو ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹا اور اس نے اسے تہہ خانے کی سیڑھیوں پر لڑھکا دیا۔ وکیل نے آگے بڑھ کر نہ جانے کیا کیا کہ کھلا ہوا دروازہ بے آواز بند ہوگیا۔

”اب ہم لوگ کدھر جائیں گے۔“

”ہمیں بائیں باغ کا رخ کرنا ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ کھڑکی باغ میں ہی کھلتی ہے۔“ میں نے فوراً کہا۔

”لگتا ہے کہ قسمت کی دیوی بھی مہربان ہے۔ کیونکہ باہر اندھیرا ہے۔ یقینی بات ہے کہ رات کا وقت ہے۔“ وکیل نے دیواروں پر نظر دوڑائی۔ بائیں ہاتھ دیوار پر کلاک دکھائی دے رہا تھا۔ جس کی سوئیاں ڈھائی بجے کا وقت بتا رہی تھیں۔ یعنی رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔

”اور ہمارے پاس اب ڈھائی گھنٹے ہی ہیں اس کے بعد اجالا پھیل جائے گا۔ ہمیں ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر تابوت لے کر یہاں سے نکلنا ہوگا۔ ورنہ خاصی مشکل ہوجائے گی۔ ابھی تو دلاور بھی اپنی خواب گاہ میں ہی ہوگا۔ اور ہمارا کام مزید آسان ہوجائے گا۔ اس نے مجھے انسانی سروں کا تحفہ بھیجا تھا۔“ وکیل کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔

”ہم جتنی جلدی کریں گے ہمیں اتنی ہی آسانی ہوگی۔ اس رات کے اندھیرے میں جو کرنا چاہتے ہو کرگزرو۔ صبح کی روشنی کے ساتھ حالات خطرناک ہوجائیں گے۔“ شون نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”تو پھر اللہ کا نام لے کر آگے آجاؤ۔“ وکیل کھڑکی کی طرف بڑھا۔ اور انعم سے مخاطب ہوا۔ ”لائٹ آف کردو۔“ انعم نے فوراً آگے بڑھ کر دو بٹن پریس کئے تو کمرے میں گاڑھا اندھیرا ابھر آیا۔ اندھیرے میں پہلے پردے کی سرسراہٹ ابھری۔ پھر کھڑکی کھلنے کی ہلکی سی آواز، کھڑکی کھلتے ہی چاند کی کرنیں تاریکی کو منور کرگئیں۔ کھڑکی کے پلو میں تو شیشے لگے ہوئے تھے۔ البتہ فریم قدیم طرز کا تھا۔ نہ جالی نہ سلاخیں اور یقینی بات تھی کہ دلاور ہاؤس کی تمام کھڑکیاں اسی طرز کی ہوں گی۔ اور یہ ہمارے حق میں بہتر ہی تھا۔ دلاور کی خواب گاہ تک پہنچنے میں کسی قسم کی دقت نہ ہوتی۔“ شریم صاحب آپ کا اندازہ درست ہے۔ یہ واقعی باغ ہے۔“ وکیل نے کہا۔ ”چلیں آگے بڑھیں۔“ نادر کا لہجہ ایسا تھا کہ جیسے وہ جلد از جلد اپنا

کام ختم کر کے دلاور ہاؤس سے نکلنا چاہتا ہو۔

وکیل نے اپنا سر باہر نکال کر چاند کی مدہم روشنی میں ماحول کا جائزہ لیا اور پھر کھڑکی سے باہر کود گیا۔ اس کے بعد نادر، پھر میں، میرے بعد شون اور پھر کاوش ندیم عباس اور انعم باری باری کود گئے۔ دیوار کے ساتھ جانے کون سی جنس کے پھول دار پودے لگے ہوئے تھے کہ فضا میں بڑی ہی مسحور کن خوشبو رقص کرتی پھر رہی تھی۔ چاند کی روشنی میں باغ میں لگے درختوں کے ہیولے یوں لگ رہے تھے جیسے بے شمار پہرے دار کھڑے ہوں۔ ہم پھول دار پودوں کے ساتھ دبکے بیٹھے تھے۔ ''اب آگے بڑھیں یا یہاں ہی بیٹھیں رہنے کا ارادہ ہے۔'' نادر نے بیزاری سے کہا۔ ''یہاں لازمی دو چار پہرے دار ہوں گے۔ پہلے ہمیں ان کو دیکھنا ہوگا۔ اور ان کو ٹھکانے لگانا ہوگا۔'' وکیل نے یہاں بیٹھنے کی معقول وجہ بتائی۔ ''آپ آگے بڑھیں جب کوئی سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔''

''نادر عجلت میں اٹھائے گئے قدم ہمیشہ الٹے پڑتے ہیں۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تو یہاں بیٹھے رہنے سے کیا ہوگا۔ کیا وہ خود چل کر آئیں گے۔ لو بھائی ہم آگئے ہیں ٹھکانے لگا دو۔''

''نادر میں دلاور کی خواب گاہ کا بھی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کیونکہ پہرے دار اگر ہوں گے تو اس کے آس پاس ہی ہوں گے۔ عقبی طرف کھلنے والی کھڑکی کے قریب ہی کہیں۔'' نادر خاموش ہو رہا۔

کچھ دیر تک ہم دم سادھے بیٹھے رہے۔ ''یہ دائیں طرف ذرا دیکھیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ کوئی انسان ہے۔'' وکیل کی سرگوشی پر ہم لوگ دائیں طرف متوجہ ہوگئے۔ کچھ ہی فاصلے پر وہ متحرک ہیولہ دکھائی دے رہا تھا۔ جو یقیناً پہرے دار ہی تھا۔ اور اس کا رخ ہماری سمت پر تھا۔ ''ہاں یقیناً یہ کوئی پہرے دار ہے اور راؤنڈ لے رہا ہے اور آ بھی ادھر ہی رہا ہے۔''

جسموں میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں۔ اور ہم بڑے پودوں میں سمٹنے لگے۔ ''انعم ہوشیار رہنا۔'' وکیل نے سرگوشی کی۔ اور ہم آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تقریباً بیس قدم کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ وکیل سرگوشی میں بولا۔ ''ہوشیار وہ آ رہا ہے۔'' اور ہم پودوں میں گھس کر بیٹھ گئے۔ پہرے دار بڑی ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔ دھیمی آواز میں کوئی گانا گنگنا رہا تھا۔ وہ بالکل ہمارے قریب آ گیا۔ صرف تین قدم کے فاصلے پر اور پھر واپس پلٹ گیا۔ اس کے پلٹتے ہی وکیل اپنی جگہ سے اٹھا اور جھکے جھکے انداز میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا کہ موت اس کے تعاقب میں ہے۔ اور صرف چند قدم کے فاصلے پر اس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وکیل نے اچانک عقب سے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اور اسے ساتھ لئے نیچے گھاس پر آ رہا۔ ہم سب تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ اس کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔ وکیل گھٹنوں کے بل ایک طرف بیٹھ گیا۔ پہرے دار بری طرح تڑپ رہا تھا۔ اس کی شہ رگ سے خون ابل رہا تھا۔ اور کٹی ہوئی شہ رگ سے بڑی بھیانک آواز آ رہی تھی۔ وکیل نے خون آلود خنجر اس کے کپڑوں سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''اسے پودوں کے عقب میں ڈالنا ہے۔'' اور وکیل نے اس کی ٹانگیں اپنی گرفت میں لے لیں۔

''اور یہ کارتوس والی پیٹی بھی اتار لو اس کی۔ ہو سکتا ہے کہ کہیں ضرورت پڑ جائے۔'' ندیم نے جلدی سے اس کی کمر سے بندھی ہوئی پیٹی اتار کر اپنی کمر سے باندھ لی۔

وکیل اور نادر نے اس کا بے حس ہوتا وجود اٹھا کر پودوں کے عقب میں ڈال دیا۔ ہم ایک بار پھر آگے کی طرف رینگ گئے۔ تھوڑا آگے رینگنے کے بعد ہمیں ایک بار پھر اپنی جگہ رکنا پڑا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک گھنے درخت کے نیچے دو کرسیوں پر دو ہیولے بیٹھے دکھائی دیئے۔ اور ان کے بولنے کی ہلکی ہلکی آوازیں ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں۔ ''سب لوگ یہاں رکیں گے۔ انعم تم میرے ساتھ آ جاؤ۔'' وکیل نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اور آگے رینگ گیا۔ انعم بھی کسی ناگن کی طرح گھاس پر رینگتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ دونوں اس کی پیٹھ پر پہنچ گئے تھے۔ اور ہم اپنی اپنی جگہ دم سادھے بے حس و حرکت پڑے تھے۔

اچانک وکیل اور انعم عقب سے ان دونوں پر جھپٹے۔ وکیل کا خنجر والا ہاتھ بلند ہوا۔ ایک ہلکی سی چمک پیدا ہوئی تھی۔ انعم نے جلدی سے دوسرے کی گردن دبوچی تھی۔ سو فیصد اس بیچارے کو علم بھی نہیں ہوگا کہ کب اور کیسے اس کی گردن کی ہڈی ٹوٹی۔ آگے کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ سو ہم جلدی سے آگے بڑھ گئے۔ دونوں کے بڑبڑاتے ہوئے جسموں کو نادر اور ندیم نے اٹھا کر پودوں کے عقب میں ڈال دیا۔ کارتوسوں کی ایک پیٹی ندیم نے اپنی کمر کے ساتھ باندھی اور دوسرے کندھے سے لٹکا لی جبکہ ایک بندوق لاشوں پر پھینک دی گئی اور دوسری میں نے اٹھا لی۔

''یہ ایک پیٹی مجھے دے دو۔'' میں نے ندیم کو مخاطب کیا۔ اور اس نے کارتوس کی پیٹی کندھے سے اتار کر مجھے تھما دی۔ جو میں نے کمر کے گرد باندھ لی۔ ''یقینی بات ہے کہ یہ کھڑکی دلاور کی خواب گاہ کی ہے۔'' وکیل نے عقب میں نظر آنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ جس سے غائب بلب کی مدہم روشنی جھلک رہی تھی۔ ''پھر کیا ارادہ ہے اب ہمیں اس کھڑکی سے اندر داخل ہونا ہے مگر خیال رہے کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔ چلیں آگے بڑھیں۔'' ہم سب اکٹھے ہی کھڑکی کی طرف آگے بڑھے۔

دل بری طرح دھڑک رہا تھا کہ اگر ہمیں کسی نے دیکھ لیا یا دلاور چیخ پڑا، شور مچ گیا تو انجام کیا ہوگا۔

سب سے پہلے وکیل ہی اندر داخل ہوا۔ اس کے بعد انعم پھر کاوش وہ اندر پہنچے تو میں نے انہیں اپنی بندوق تھمائی اور خود بھی اچھل کر اندر داخل ہو گیا۔ پھر باری باری شون، نادر، نعیم عباس بھی اندر آ گئے۔ ندیم نے وہ آہنی کھڑکی بند کی اور پردے کھینچ دیئے۔ اچھی خاصی وسیع و عریض خواب گاہ تھی۔ ہمارے قدموں تلے بڑا قالین تھا۔ دیواروں پر پردے جھول رہے تھے۔ ایک طرف جہازی سائز کے پلنگ پر دلاور بڑے چوڑے ہو کر لیٹے پڑے خراٹے سے سو رہا تھا۔ نہ جانے کون سے جذبے کو کون سے احساس کے تحت اسے دیکھتے ہی میرا خون کھول اٹھا۔ رگوں میں چنگاریاں سلگ اٹھیں۔

انعم فوراً اس کے سرہانے موت کی دیوی بن کر کھڑی ہو گئی۔ وکیل اس کے دائیں طرف اور میں بائیں طرف۔ وکیل نے اشارہ کیا۔ اور کاوش نے دیوار پر بٹن پریس کرنا شروع کر دیئے۔

اچانک ہمارے سروں پر لٹکتا ہوا فانوس روشن ہو گیا۔ پوری خواب گاہ تیز روشنی میں لبالب بھری ہوئی تھی۔ خدشہ تھا کہ آنکھ کھلتے ہی ہم لوگوں کو دیکھ کر وہ چیخ پڑے گا۔ مگر ہم نے اسے چیخنے کا موقع ہی نہ دیا۔ روشنی کی کرنوں نے اس کے پپوٹوں پر دستک دی۔ تو اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا گیا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

انعم ایسی ہی صورت حال کے پیش نظر اس کے سر پر کھڑی تھی اس نے عقب سے اس کی گردن دبوچی اور اپنی جانب کھینچ لی۔ میں اچھل کر پلنگ پر چڑھ گیا۔ انعم نے پتہ نہیں اس کی گردن کی کون سی رگ دبائی تھی کہ اس کا منہ غار کی طرح کھل گیا۔ مگر اس کے حلق سے چیخ نہ نکل سکتی تھی۔

میں نے برق رفتاری سے بندوق کی نال اس کے کھلے ہوئے منہ میں گھسیڑ دی۔ نادر اور وکیل نے جھپٹ کر اس کے دونوں بازو گرفت میں لے لئے اور میں نے اپنا پاؤں اس کی پنڈلی پر رکھ دیا۔ بس پل بھر میں وہ بری طرح ہمارے قابو میں آ چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت اور دہشت کی وجہ سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی۔ چہرے پر خوف اور تکلیف کے آثار تھے۔ ''آواز نہیں دلاور اگر تمہاری سانس کی بھی آواز بلند ہوئی تو یاد رکھنا کہ دوسرا سانس لینے سے پہلے تمہاری روح تمہارے وجود کو چھوڑ دے گی۔'' مجھے اپنی آواز بڑی نامانوس لگی تھی۔ دلاور نے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی تو میں نے بندوق کی نال اس کے منہ سے نکال لی۔ انعم نے فوراً بائیں ہاتھ سے اس کے بال گرفت میں لے لئے اور دائیں ہاتھ سے خنجر اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ''اٹھو ہمیں اپنے عجائب خانے کی سیر کراؤ۔'' میں نے کہا۔

''کک۔ کک۔ کیوں؟'' اس کی حالت بڑی ہی

خراب تھی۔ انعم نے خنجر کا دباؤ ذرا سا بڑھا دیا تو اس کا منہ کھل گیا۔ ''کیوں جاننے کے چکر میں اپنی زندگی گنوا بیٹھو گے۔''

''تت تم لوگ تہہ خانے سے کیسے نکلے...... لالو کہاں ہے؟'' پھر میں نے بندوق کی نال اس کے سینے پر ماری تو وہ کراہ کر رہ گیا۔

''اور اگر اب تم نے زیادہ بک بک کی تو مجبوراً ہم تمہیں ہمیشہ کی نیند سلا دیں گے۔ اٹھو۔''

وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو انعم نے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی نادر نے لپک کر اسے عقب سے دبوچا اور خنجر اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔ ''تم لوگ یہ سب ٹھیک نہیں کر رہے یہاں سے زندہ واپس نہ جا سکو گے۔''

''برخوردار فی الحال تو تم اپنی خیر مناؤ۔ چلو اپنے عجائب خانے کا راستہ کھولو۔'' نادر نے حقارت سے کہا۔

دلاور بائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ موجود تجوری نما الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ''تو وکیل اس کی پسلیوں پر خنجر کی نوک رکھتے ہوئے بولا۔ ''دلاور اتنا ذہن میں رکھنا کہ اگر تم نے مکاری دکھانے کی کوشش کی تو ہمارے ساتھ جو ہوگا وہ بعد میں ہوگا اس سے پہلے تمہاری روح اوپر کو چلی جائے گی۔'' دلاور نے گھبرائے ہوئے انداز میں وکیل کی طرف دیکھا۔ پھر الماری سے پیچھے ہٹ گیا۔ ''عجائب خانے کا راستہ ساتھ والے ہال سے جاتا ہے۔''

''ہوں کافی سمجھدار ہو چلو ادھر چلو۔'' دلاور تیزی سے پلٹ گیا۔ بغلی دیوار کے درمیان میں کافی کشادہ گیٹ نما دروازہ تھا۔ جس میں لڑیاں جھول رہی تھیں۔ دلاور اس طرف بڑھ گیا۔ ''آ جاؤ سب۔'' وکیل نے کہا۔

ہم خواب گاہ سے ساتھ والے ہال میں آ گئے۔ دلاور نے ایک طرف دیوار پر لگی اپنی قد آدم تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ''ادھر سے راستہ جاتا ہے نیچے۔''

''دیکھو سوچ لو۔'' وکیل نے اس کے چہرے کے سامنے خنجر لہرایا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''تو ٹھیک ہے آگے بڑھو۔''

دلاور تصویر کی طرف بڑھ گیا۔ تصویر کا فریم سونے کا تھا۔ اور فریم کے چاروں کونوں پر سونے کی ایک ایک آنکھ بنی ہوئی تھی۔ جن کی پتلیوں کی جگہ یاقوت سجائے گئے تھے۔ دلاور نے ایک مخصوص انداز میں چارو یاقوتوں کو گھمایا۔ پھر فریم کو بارڈر سے پکڑ کر کھینچا۔ فریم نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اور کسی دروازے کی طرح کھل گیا۔ اندر گہرا اندھیرا تھا۔ مگر فریم کے کچھ مزید کھلتے ہی کسی خود کار نظام کے تحت اندر روشنی پھیل گئی۔ کشادہ سیڑھیاں کہیں گہرائی میں جاتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر انتہائی قیمتی سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا۔

چلو آگے بڑھو۔'' نادر نے دلاور کی پیٹھ پر گھٹنا مارا۔ اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ پھر ہم سب کے اندر داخل ہوتے ہی نادر نے فریم بند کیا۔ اور ساتھ ہی اندر اندھیرا پھیل گیا۔ گھپ اندھیرے میں تیزی سے سیڑھیاں طے کرنے کی مدھم سی آواز بلند ہوئی۔ غالباً دلاور بھاگ رہا تھا۔ لیکن قالین کی وجہ سے ہلکی ہلکی دھپ دھپ کی آواز آ رہی تھی۔

''کھول دو۔ دروازہ کھول دو۔'' وکیل کی تیز آواز ابھری اور نادر نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ اندھیرا ایک بار پھر روشنی میں بدل گیا۔

دلاور آخری زینے پر تھا۔ وہ دائیں طرف کو بھاگ گیا۔ اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ''دلاور رک جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے۔'' وکیل چیختا ہوا اس کے پیچھے بھاگا۔ ہم بھی سب اندھا دھند زینے طے کرتے ہوئے نیچے بھاگ گئے۔ یہ تقریباً بارہ بائی بارہ کا ایک کمرہ نما حصہ تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ پر دیوار کی جگہ باریک سا پردہ دکھائی دے رہا تھا۔ پردے کے دونوں کونوں پر چاندی کے قد آدم مجسمے پڑے ہوئے تھے۔ پردے کی حرکت بتا رہی تھی کہ دلاور ادھر ہی گیا ہے۔ ہم بھی ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ پردہ ہٹا کر دوسری طرف آ گئے۔ اور وہاں آ کر ہماری سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ایک جہاں حیرت ہمارے سامنے تھا۔ ایک تحیر خیز دنیا بکھری پڑی تھی۔ وہ کوئی فسوں

روحانی
شمع جنتری
2017ء
مؤلف۔ اقبال احمد مدنی

مسلسل کامیابیوں کے بائیسواں سال

پاکستان کی واحد منفرد اور مستند جنتری جس میں دیئے گئے مستقل اور نئے عنوانات آپ کو ہر وقت چونکا دیتے ہیں اور جسے پڑھ کر آپ پر حیرت طاری ہو جاتی ہیں کہ پاکستان میں چھپنے والی جنتریوں اور تقادیم میں سارے مضامین یکجا نہیں ہوتے اور اگر ہوتے ہیں تو بھی اس سے قارئین مکمل استفادہ حاصل نہیں کر سکتے ان کے علم کی پیاس نہیں بجھتی۔ اس سال کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں ۔جنتری، پاکستان میں سبز انقلاب، مذہبی تقریبات و تعطیلات، خواتین کے مزاج پر چاند کے اثرات، اثرات قمر، تواریخ ماہ، سعد و نحس، شمس در بروج، قمر در بروج، آج کا دن کیسا گزرے گا، ہر کام میں کامیابی یا ناکامی کے لئے سعد اور نحس تاریخیں، قمر در عقرب کے اوقات، داخلہ کی جدول، 2017ء میں یہ کام کریں یا نہ کریں، نقشہ سحر و افطار، تاریخ عیسوی سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، تاریخ ہجری سے دن معلوم کرنے کا طریقہ، 176 سالہ شمسی ہجری کیلنڈر، فہرست عرس ہائے بزرگان دین، تسویت البیوت مختصر، تسویت البیوت پاکستان، عملیات جسمانی امراض، تعارف رفتار سیارگان، یونانی رفتار سیارگان کو ہندی رفتار سیارگان میں تبدیل کرنا، جدول نظرات سیارگان، انعامی بانڈ یا انعامی اسکیموں سے لکھ پتی یا کروڑ پتی بنے گا کون، 2017ء علم الاعداد کی روشنی میں، عملیات محبت، نوروز عالم افروز (عالمی پیشگوئیاں)، نوروز ہجری کا پھل، نوروز عددی کا پھل، نوراتہ کا پھل، نوروز کا پھل، نوروز چینی کا پھل، چینی سال کیسا رہے گا، سبزیوں سے خطرناک بیماریوں کا علاج، جسم کی نشونما میں معدنیات کا اہم کردار، شادی شدہ خواتین گھر کو جنت کا نمونہ کیسے بنائیں ، رنگ بولتے اور بتاتے ہیں، بھوسے سے شوگر کا علاج، بیل گری کھائیں صحت و تندرستی پائیں، روزانہ رات کو پاؤں کے تلوؤں پر تیل لگائیں اور صحت و تندرستی کے نوراز پائیں، (رجعت سیارگان کے اثرات، نقشہ یا تحویلات کواکب، آپ کامیابی کیسے حاصل کریں، اپنے اسم اعظم اور اسمائے نبوی کے حروف باطن معلوم کیجئے، سات دن میں ہمزاد کو قابو کرنے کا عمل ،عملیات تسخیرات، شرف و ہوط سیارگان، شرف و ہوط قمر، رجعت و استقامت سیارگان، کیا تیسری عالمی جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، کیا اس کائنات میں ہم اکیلے ہیں، زمین سے مشابہ سینکڑوں نئے سیارے دریافت، روم کے اسلامی دارالحکومت بننے کی پیشگوئی سے یورپ پریشان، بارہ برجوں کے حالات 2017ء آخریات، مجھے امید ہے کہ اتنے سارے عنوانات سے آپ کے علم کی پیاس یقیناً بجھ جائے اور آپ مزید مفید مشوروں سے مجھے نوازیں گے تاکہ جنتری کو بہتر سے بہتر خطوط پر استوار کیا جائے اور آپ کے استفادوں کا کاررواں یونہی رواں دواں رہے۔

دعا گو
اقبال احمد مدنی

قیمت۔/150 روپے

شمع بک ایجنسی
نوید اسکوائر اردو بازار کراچی
Ph:32773302

نگری تھی۔ جہاں ہم راستہ بھٹک کر پہنچ گئے تھے۔ کچھ ایسی آرائش و زیبائش تھی وہاں کی ایسے ایسے نادر نایاب اور عجیب و غریب نمونے اور حیرتوں کا سامان وہاں موجود تھا کہ ہم سحر زدہ سے ہو کر رہ گئے۔ ہمارے پاؤں جیسے دبیز قالین میں دھنس کر رہ گئے اور چند ثانیوں کے لئے تو ہم دلاور اور اپنے آپ تک کو بھول گئے۔

یہ ایک اچھا خاصا اور وسیع تر ہال تھا۔ ہمارے سامنے چند قدم کے فاصلے پر چونے کا بنا ہوا گوتم بدھ کا دیو قامت مجسمہ پڑا تھا۔ جو گوتم بدھ کے گیان کی اکاسی کرتا تھا۔ اس مجسمے کے ساتھ ہی ایک قطار کی صورت گوتم کے چند اور مجسمے تھے۔ کانسی پیتل اور سونے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ دیواروں پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ اور ان شیشوں کے پیچھے دیواروں پر بنی ہوئی الماریوں میں ہزار ہا نادر نمونے تھے۔ نسوانی مجسمے، جو مجھے زندہ جاوید عورتیں زیادہ لگتی تھیں۔ استخوانی ڈھانچے، قدیم معبدوں، عبادت کے لئے استعمال ہونے والے قدیم ہتھیار، جوتے، قدیم لبادے، مٹی کی کھوپڑیاں، ہیروں کے بنے ہوئے چراغ اور شمع دان بیش قیمت بنے ہوئے تاج اور مالائیں۔ زندہ کلبلاتے عجیب و غریب ہیبت ناک جانور، ہال کے وسط میں سرخ یاقوتی پتھروں سے بنا فرعون کا مجسمہ غرض وہاں اتنا کچھ تھا جسے احاطہ تحریر میں لانا ناممکن۔

یہ دیکھ کر ایک تو ہم اپنی اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ پھر وکیل تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اور کہا۔ ”دلاور سامنے آجاؤ، چھپنے سے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔“ وکیل نے پھر بلند آواز سے کہا۔ ہم لوگوں کو بھی جیسے اچانک ہوش آ گیا۔ اور ہم سب بھی جیسے آگے بڑھ گئے۔

”دلاور بے موت مارے جاؤ گے۔ سامنے آجاؤ۔“ وکیل نے ایک بار پھر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ظاہری بات تھی کہ دلاور سامنے آنے کے لئے تو نہیں چھپا تھا۔

ہم سب ہال میں پھیل گئے۔ پر شاید دلاور آنکھ مچولی کھیلنا چاہتا تھا۔ سب کی نظریں دلاور کی کھوج میں تھیں۔ مگر میری نظر نفران کی تابوت کی تلاش میں تھی۔ مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اور میری بے چینی میں اضافہ ہوا جا رہا تھا۔ مگر اس وقت نہ تو تابوت دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی وہ سونے کا مجسمہ۔

میں پوری توجہ سے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر حقیقتاً مجسمہ یا تابوت وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے ذہن میں ہزاروں وسوسے ابھر رہے تھے۔ اور میرا دل ڈوب رہا تھا۔ جس تابوت کے لئے، جس مجسمے کے لئے میں موہنجوداڑو سے یہاں آیا تھا۔ اتنا بڑا کھڑاک پالا تھا۔ جس کے لئے اتنی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ اور ہم سب موت کے منہ میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ اسے یہاں ہونا چاہئے تھا۔ مگر وہ یہاں نہیں تھا۔ میرا دل کہنے لگا کہ کہیں دلاور نے اس کا سودا آگے نہ کر دیا ہو۔ کہیں کسی کو تحفے میں نہ دے دیا ہو اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہماری وجہ سے دلاور نے اسے کہیں اور جگہ رکھ دیا ہو۔

بہر حال ہم ساتوں ہال کے دوسرے کونے تک آ پہنچے۔ انہیں دلاور دکھائی دیا نہ تابوت۔ ”وکیل صاحب۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے وکیل کو مخاطب کیا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ مجسمہ اور تابوت یہاں پر ہی ہیں پر یہاں وہ نظر تو نہیں آ رہا۔“

وکیل نے ایک نظر ہال میں دوڑائی اور پھر گویا ہوا۔ ”ذرا دلاور کو دیکھ لیں پھر معلوم ہو جائے گا۔“

ٹھیک اسی وقت داخلی جانب سے ایک چھناکے کی آواز بلند ہوئی۔ تو ہم سب چونک پڑے۔ دلاور ایک طرف مجسموں کی اوٹ سے نکلا تھا۔ اور بے دھیانی میں ایک پیتل کے مجسمے سے ٹکرا گیا۔ اور وہ مجسمہ شیشے کے کیس پر گرا تھا۔ ایک لمحے کو دلاور بھی بوکھلا گیا۔ اس نے پلٹ کر گھبرائے ہوئے انداز میں ہماری طرف دیکھا نادر نے میرے ہاتھ سے بندوق لے کر اس کی طرف تان لی۔

”دلاور اپنی جگہ سے ہلنے کی حماقت مت کرنا۔ ورنہ بھیجا اڑا دوں گا۔“ دلاور نے یہی مناسب سمجھا کہ بھیجہ اڑا لیا جائے۔ وہ بجائے رکنے کے سیڑھیوں کی طرف بھاگ پڑا۔ ہمارے درمیان فاصلہ اتنا تھا کہ ہم بھاگ کر اسے پکڑ نہیں سکتے تھے۔

دلاور کمرے والے پردے تک پہنچا تھا کہ نادر نے ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی آواز سے کانوں کے پردے جھنجھنا اٹھے۔ درمیان میں ایک تابوت نما شیشے کا کیس چھناکے کی آواز پیدا کرتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ شیشے کے ٹکڑے قالین پر بکھر گئے اور دلاور بھی لڑکھڑا کر گر پڑا۔

”ارے احمق یہ کیا کیا۔“ وکیل نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ تو نادر نے پرسکون آواز میں جواب دیا۔ ”بھاگتے ہوئے دلاور کی لاش ہی سہی۔“

”اب یہاں سے فوراً نکلنے کی کوشش کرو۔ ورنہ ہماری لاشیں بھی نہ ملیں گی۔“ وکیل نے خشک لہجے میں کہا۔ اور سامنے کی طرف دوڑ پڑا۔ ”وکیل صاحب تابوت کہاں ہے۔“ میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ پوچھ لیا۔ تو وکیل رک گیا۔

”شریم صاحب جان بچی سو لاکھوں پائے۔ پہلے جان بچانے کی کوشش کریں۔“ گولی کی آواز پر پورے ہاؤس کے گارڈز ابھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ زندہ بچ کر نکل گئے تو دوبارہ بھی تابوت کے لئے کوشش کی جا سکتی ہے۔ بھاگیں۔“ اور پھر میں بھی دوڑ پڑا۔ اگر وہ اوپر جا کر دروازہ بند کر دیتا تو بھی ہم زندہ نہ بچتے۔ نادر نے دوڑتے ہوئے صفائی دینے کی کوشش کی مگر کسی نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ سب کو اپنی زندگیوں کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔

گولی دلاور کے سینے میں لگی تھی اور پار ہو گئی تھی۔ وہ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ ہم اس کے سر پر پہنچے تو وہ ہمیں وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ نادر نے رکتے ہوئے اس کی طرف بندوق سیدھی کی تو وکیل نے اسے دھکا دے دیا۔ ”کیا حماقت ہے۔ کچھ عقل سے بھی کام لو۔“

”جب ایک دھماکہ ہو گیا ہے تو دوسرا بھی سہی۔ کم از کم اس کا تو خاتمہ ہو جائے۔“

”آگے بڑھو۔“ وکیل نے تیز لہجے میں کہا۔ اور ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھ گئے۔ اور دو تین زینے پھلانگتے ہوئے اوپر آ گئے۔ خواب گاہ کا دروازہ بری طرح پیٹا جا رہا تھا۔ اور باہر سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ اوپر روشن دان سے صبح صادق کی ہلکی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ وکیل برق رفتاری سے الماری کی طرف بڑھا۔ اس نے دونوں پٹ کھولے اور بیٹھ کر الماری کے نیچے خانے سے کچھ تلاش کرنے لگا۔

اچانک پائیں باغ والی کھڑکی کو کسی نے دھڑ دھڑ کایا۔ اور ہمارے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔ دروازے پر بھی دشمن عقبی کھڑکی پر بھی دشمن ہم چوہوں کی طرح پھنس گئے تھے۔ وکیل کیا ڈھونڈ رہے ہو۔ کاوش نے تیز لہجے میں کہا۔ مگر وکیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح الماری کے خانوں میں ہاتھ مار رہا تھا۔ اچانک ایک چھناکے کی آواز آئی اور شیشے کی کرچیاں خواب گاہ میں بکھر گئیں۔ کھڑکی خونخوار چہروں سے بھری ہوئی تھی۔ نادر اور ندیم دونوں نے جھٹکے سے اپنی اپنی بندوقیں سیدھی کیں۔ مگر صرف فائر نادر نے کیا۔

ایک دھماکہ اور چند چیخیں بلند ہوئیں اور کھڑکی کا فریم خالی ہو گیا۔ ٹھیک اسی وقت وکیل کے حلق سے مسرت انگیز آواز خارج ہوئی اور اچانک اس الماری نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔

اب اس کی جگہ ایک تاریک خلا دکھائی دے رہا تھا۔ ”آجاؤ جلدی۔ جلدی کرو۔“ وکیل نے تیزی سے کہا اور ہم سب اسی خلا میں داخل ہو گئے۔ سب سے آخر میں وکیل اندر آیا۔ بارہ زینوں کے بعد ہموار فرش تھا۔ مگر اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں ایک ہلکی سی آواز ابھری اور اندھیرا روشنی میں بدل گیا۔ الماری خود میکانکی انداز میں اپنی جگہ پر واپس آ گئی۔ اور خلا بند ہو گیا۔

ہمارے سامنے ایک طویل سرنگ نما راستہ تھا۔ آؤ وکیل سرنگ میں دوڑ پڑا۔ ”اب جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہمیں ان کی حدود سے نکل جانا چاہئے۔ ورنہ پچھتانے کا بھی موقع نہ ملے گا۔“ اس نے دوڑتے ہوئے کہا۔

”تمہیں اس راستے کا کیسے علم ہوا؟“ کاوش نے پوچھا۔

”مجھے دونوں راستوں کا علم تھا۔ اس لئے جب دلاور الماری کی طرف بڑھا تو میں نے اسے ٹوک دیا تھا۔“

"صبح کی روشنی پھیل گئی ہے۔ اور خطرہ بھی۔" شون کی بات پر ندیم نے دوڑتے انہیں ایک ذرا گھور کر دیکھا۔ اور پھر نظریں ہٹالیں۔ بیچارے سارے خواب دھرے کے دھرے رہ گئے۔ تقریباً ایک فرلانگ کے بعد سرنگ دائیں طرف مڑگئی۔ "جلدی تیز دوڑو۔" وکیل نے کہا اور ہم نے اپنی رفتار تیز کردی۔ ادھر سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس سرنگ کا اختتام ایک دروازے پر ہوا۔ دروازہ عام سی نوعیت کا تھا۔ وکیل نے جلدی سے کنڈی کھولی اور ہماری طرف پلٹتے ہوئے بولا۔ "یہاں محتاط رہنا ہوگا۔ اس کوٹھی میں بھی مسلح افراد موجود ہوں گے۔" ہم نے اثبات میں اپنے سر ہلادیئے۔ وکیل نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ دوسری جانب اندھیرا تھا۔ وکیل ہمیں آگے آنے کا اشارہ دیتے ہوئے اندھیرے میں داخل ہوگیا۔ ہم نے بھی اس کے پیچھے قدم بڑھادیئے۔ گہرا اندھیرا سرنگ میں آنے والی روشنی سے مجروح ہورہا تھا۔ ہم صرف ایک دوسرے کے ہیولے ہی دیکھ پا رہے تھے۔ وکیل دائیں طرف کو بڑھا تھا۔ ایک بوجھل سکوت اندھیرے میں پھیلا ہوا تھا۔ اتنا دوڑنے سے ہماری سانسیں بری طرح پھول گئی تھیں۔ وقتی طور پر ممی اور تابوت کا خیال بھی ہمارے ذہن سے نکل گیا۔ دماغ میں صرف اور صرف اتنی سوچ سانس لے رہی تھی کہ دلاور بری طرح زخمی ہوا تھا اور اس کے گارڈ زخمی کتوں کی طرح ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ ان سے بچنے کے لئے ہمیں جلد سے جلد اس جگہ کی حدود سے باہر جانا ہوگا۔

اچانک دائیں جانب سے روشنی کا سیلاب امڈ پڑا اور ہم سب بھی اچھل پڑے۔ وکیل ایک بڑا سا پردہ اٹھائے کھڑا تھا۔ دوسری جانب تیز روشنی تھی۔ اور ایک ہال دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے دور نظر آنے والے کونے تک تین قطاروں میں صوفے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کے باعث ہم اپنے اطراف کا بخوبی جائزہ لے سکتے تھے۔ ہم لپک کر وکیل کی طرف آگئے۔ "یہاں ہال میں کوئی نہیں ہے آپ لوگ آجاؤ۔" وکیل نے مدھم لہجے میں کہا اور ہم ہال میں آگئے۔ ساتھ ہی ایک دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ وکیل تیزی سے اس کی طرف بڑھ گیا۔ "آجائیں۔"

"کچھ آگے کا بھی پتہ ہے کہ کدھر کو جانا ہے۔" کاوش نے پوچھا۔

"کچھ پتہ نہیں۔" بس آجائیں جدھر قدم لے کر چلیں گے ادھر جائیں گے۔"

"دیکھنا کہیں موت کی طرف نہ لے جائے۔ ہمارے دل میں تو ابھی بہت ارمان باقی ہے۔" ندیم عباس نے دزیدہ نظروں سے انعم کی طرف دیکھا مگر اس کی توجہ دوسری جانب تھی۔ "فکر نہ کرو، بھائی ان کے ساتھ ساتھ ارمان بھی پرواز کرجائیں گے۔" وکیل مسکرایا۔

وکیل نے دروازے کے کی ہول سے جھانکا اور مسرت انگیز لہجے میں بولا۔ "قسمت ہم پر مہربان ہے۔ راستہ بالکل صاف ہے اور ہے بھی عقبی سائیڈ اور سب سے بری یہ بات ہے کہ دو ہیوی انجن لینڈ گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ ویسے بھی ہم سب ایک ہی گاڑی میں سما جائیں گے۔" وکیل نے تیز لہجے میں کہا۔

"کاوش تم میرے آگے ساتھ بیٹھو گے اور انعم تم عقبی سمت، بندوق سنبھال لو ہوسکتا ہے ضرورت پڑ جائے۔" وکیل پہلے کاوش پھر انعم سے مخاطب ہوا۔ اور انعم نے فوراً نادر سے بندوق لے کر سنبھال لیا۔ میں نے اپنے کمر سے بندھی کارتوس پٹی اتار کر انعم کو تھمادی۔ جو اس نے اپنی نازک سی کمر کے گرد رکھ کر اور بندوق لوڈ کرلی۔ ہمارے اعصاب ایک سنسنی سی کیفیت کا شکار تھے۔ وکیل نے معمولی سا دروازہ کھولا۔ اور باہر جھانکنے لگا۔

"آجاؤ۔" اس نے کہا۔ اور ہم سب آگے بڑھ گئے۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی ایک طویل برآمدہ آتا تھا۔ جس کا اختتام دائیں ہاتھ کافی دور جا کر ایک دروازے پر ہوتا تھا۔ جبکہ بائیں ہاتھ بھی چند قدم کے فاصلے پر ایک کمرہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے کے ساتھ ہی آگے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ جس کی دوسری طرف ایک وسیع پلاٹ تھا۔ جس کی حد بندی پھول دار

پودوں اور بیلوں سے کی گئی تھی۔ صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ مگر ابھی سورج طلوع ہونے میں کچھ دیر تھی۔

وکیل میرا خیال ہے کہ ہمیں دیوانگ پھلانگ کر بھاگ جانا چاہئے۔ اگر ہم گاڑی استعمال کریں گے تو یہاں موجود لوگوں کو فوراً اس کا علم ہوجائے گا اور ہمارے لئے فرار ہونا مشکل ہوجائے گا۔ پھر گیٹ بھی تو بند ہوگا۔ ہم گاڑی لے کر کدھر سے نکلیں گے۔" کاوش نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"نہیں یہ اور بھی خطرناک ثابت ہوگا۔ دیوار تک پہنچنے سے پہلے ہی ہم لوگ نظروں میں آجائیں گے اور پھر دیوار بھی دیکھ لو خاصی بلند ہے۔ دیوار پر چڑھنے کا ہمیں موقع نہیں ملے گا۔ اور فرض کرلو ہم لوگ دیکھ لئے جانے کے باوجود دیوار پھاند کر نکل جائیں گے بھی تو پیدل کہاں تک جاپائیں گے۔ اگر ایک بار ہم یہاں کی حدود سے نکل گئے۔ پھر ہمارے لئے کوئی خطرہ نہ رہے گا۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہاں ہمارے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔" نادر نے کہا۔

"یہ ممکن نہیں۔" وکیل نے فوراً تردید کی۔ "تو پھر ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" پہلے وکیل آگے بڑھا۔ اس نے ایک گاڑی کا بونٹ اٹھایا۔ اور چند تاریں توڑ ڈالیں۔ ہم لوگ دوسری گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ نادر ندیم اور شون انعم عقبی حصے کی طرف سوار ہوگئے۔ جبکہ وکیل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور کاوش اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ انعم اور ندیم چونکہ دونوں مسلح تھے۔ اس لئے وہ عقبی دروازے کے ساتھ والی سیٹوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور ہم تینوں آگے کی سیٹوں پر۔ انعم پوری طرح چوکنا دکھائی دے رہی تھی۔ وہ عقابی نظروں سے عمارت کے کونے کھدروں کا جائزہ لے رہی تھی۔ جبکہ ندیم کی نظریں اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔

اچانک گاڑی کا انجن غرا اٹھا۔ سنسنی کے کیڑے ہماری رگوں میں حرکت کرنے لگے۔ گاڑی نے ایک جھرجھری لی اور ٹرن لیتے ہوئے عمارت کی دائیں سمت گھوم گئی۔ اور پھر اچانک ایک دھماکہ ہوا اور ایک چھناکے کی آواز بلند ہوئی۔ اور ونڈ اسکرین کی کرچیاں اڑ کر عقبی حصے تک آئیں۔ گاڑی بری طرح ڈگمگائی تھی۔ میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ مگر گولی نجانے کدھر لگی تھی۔ البتہ گاڑی کی ڈگمگاہٹ اور بڑھ گئی۔

"ہوشیار۔" وکیل حلق کے بل چیخا تھا۔

ٹھیک اسی وقت عقبی طرف سے دو آدمی اندرونی حصے سے نکلتے دکھائی دیئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں۔ ابھی انہوں نے اپنی بندوقیں گاڑی کی طرف سیدھی بھی نہ کی تھیں کہ انعم نے فائر داغ دیا۔ ان میں سے ایک اچھل کر گرا اور دوسرا بھاگ کر ستون کی اوٹ ہوگیا۔

"تم فائر نہ کرنا۔" ندیم کو بندوق سیدھی کرتے دیکھ کر انعم چیختے ہوئے بولی اور ندیم نے نالی جھکالی۔ اچانک بریک بری طرح چرچرائے یوں لگا جیسے ابھی گاڑی الٹ جائے گی۔ مگر وکیل اچھا ڈرائیور ثابت ہوا۔ گاڑی دوسری جانب گھوم گئی اور ہم ایک دوسرے سے ٹکرا کر سنبھل گئے۔ برآمدے میں گرا ہوا ایک شخص تیزی سے اٹھا۔ اور ایک طرف فرش پر پڑی بندوق کی جانب بڑھ گیا۔ یہ یقیناً وہ ہی تھا۔ جس نے سامنے سے فائر کیا تھا۔ اور غالباً گاڑی کی زد سے بچنے کے لئے اس نے برآمدے میں چھلانگ لگائی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنی بندوق اٹھا کر پلٹتا اور ہم پر فائر کرتا انعم نے اس کی پیٹھ میں سوراخ کر ڈالا اور وہ بیچارہ منہ کے بل ڈھیر ہوگیا۔ "اسے لوڈ کرو۔" انعم نے اپنی بندوق ندیم کی گود میں ڈالی اور اس کی بندوق جھپٹ لی۔ ایک طرف پک اپ ٹائپ کی گاڑی کھڑی تھی۔ جس کے قریب چار مسلح افراد کھڑے تھے۔ اور منہ پھاڑے ہماری گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ یقینی بات تھی کہ یہ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر تھا۔ ان کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی انعم نے ان پر فائر کردیا۔ تین چار بھاگ کر ادھر ادھر ہوگئے۔ وہ پک اپ کی اوٹ میں ہوگئے۔ جبکہ تین ڈھیر ہوگئے۔ چند لمحوں کے توقف سے انعم نے دوسرا فائر بھی داغ دیا۔ یکے بعد دیگر دو دھماکے ہوئے۔ ایک تو فائر کا تھا۔ دوسرا پک اپ کے ٹائر برسٹ ہونے کا تھا۔ انعم نے

بندوق ندیم کی گود میں پھینک دی اور دوسری لوڈ بندوق اس کے ہاتھ سے لے لی۔

اچانک بلند ہونے والی وکیل کی دھاڑ نے ایک لمحے کو تو ہمیں بوکھلا کر رکھ دیا۔ ''انعم'' بیک وقت ہم پانچوں نے اگلی جانب دیکھا۔ میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ کچھ فاصلے پر ایک بڑا سا سلاخ دار گیٹ تھا اور اس گیٹ کے سامنے کھڑا چوکیدار اپنی بندوق ہماری گاڑی کی جانب سیدھی کررہا تھا۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں میں نے اسے دیکھا۔

انعم آسمانی بجلی کی طرح ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی، بندوق کی نال میرے سامنے سے فرنٹ کی جانب بڑھی۔ ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے گاڑی دونوں ٹائروں پر بری طرح لہرائی کہ میں اپنی سیٹ سے اچھل کر نادر سے ٹکرایا۔ اور انعم لڑکھڑا کر میرے اوپر آگری۔ یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ پہلے گاڑی لہرائی تھی یا فائر ہوئے تھے۔ انعم کے فائر سے میرے کانوں کے پردے پھٹنے کے قریب ہوگئے۔

''سنبھلو'' وکیل ایک بار پھر چیخا۔ ہم ابھی اٹھ ہی رہے تھے کہ گاڑی ایک دھماکے کی آواز سے گیٹ سے ٹکرائی۔ شون ندیم اور نادر مجھ سے آ ٹکرائے۔ میرے سر اور کندھے میں شدید چوٹ آئی تھیں۔ گاڑی برق رفتاری سے ریورس ہوئی۔ انعم اور ندیم پھرتی سے پیچھے ہٹے۔ البتہ میں نے نیچے بیٹھے بیٹھے ہی مضبوطی سے سیٹ کو تھام لیا۔ ٹھیک اسی وقت عقبی جانب سے یکے بعد دیگر چار فائر ہوئے۔ ندیم کے حلق سے ایک اذیت آلود کراہ خارج ہوئی۔ اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ ندیم عباس تت تم ٹھیک ہو۔ نادر نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ندیم میں اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ پایا۔ میری نظریں اس کے کولہے سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ جس سے خون ابل رہا تھا۔ انعم نے اندھا دھند فائر عقبی جانب جھونک دیئے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ پھر بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی سی تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑی۔ انعم بندوق لوڈ کررہی تھی۔ نادر لپک کر ندیم عباس کے قریب ہوگیا۔ جس کے چہرے پر شدید تکلیف کے تاثرات رقم تھے۔

گاڑی ایک بار پھر دھماکے کی آواز سے گیٹ سے ٹکرائی۔ جھٹکا کچھ اتنا شدید تھا کہ یوں لگا کہ جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر آگرا ہو۔ انعم کے قدم اکھڑ گئے۔ نادر پشت کے بل گرا۔ اور شون کے حلق سے بھی ایک ہلکی سی آواز خارج ہوئی۔ مگر اس دفعہ نہ تو گاڑی ریورس ہوئی۔ اور نہ ہی رکی تھی۔ گیٹ اکھڑ گیا تھا۔ جہاں گیٹ کے راڈ وغیرہ ستونوں میں نصب تھے۔ وہاں سے سیمنٹ اور اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔ تقریباً بیس قدم تک گاڑی گیٹ کو دھکیلتی ہوئی آگے لے گئی۔ پھر گیٹ ایک طرف گر پڑا۔ اور گاڑی ڈولتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کچھ اندازہ نہ تھا کہ ہم بستی کے کون سے حصے میں ہیں اور آگے کس سمت جانا ہے۔ لیکن وکیل کو اس کا علم تھا۔ اور اب یہ ذمہ داری بھی اس کی تھی۔ میں سر کر ندیم کے قریب ہوگیا۔ شدت ضبط سے اس کے جبڑے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور تکلیف کی شدت سے اس کا پورا وجود لرز رہا تھا۔

''ندیم عباس تم۔ تم ٹھیک ہو۔'' میں نے کہا۔ نادر اور انعم بھی قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ ''شریم بھائی لگتا ہے کہ گو..... گولی کولہے کی ہڈی کو تت توڑ گئی ہے۔'' ندیم کی آواز کپکپا رہی تھی۔ اس کا نچلا دھڑ خون میں لت پت ہوچکا تھا۔ اور گاڑی کا فرش رنگین ہورہا تھا۔

''شریم صاحب خیریت تو ہے؟'' وکیل نے عقب نما آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے بولنے سے پہلے ہی انعم تیز لہجے میں بولی۔ ''انکل ندیم عباس کو گولی لگ گئی ہے۔ خون بھی بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ گاڑی تیز چلائیں۔ ہمیں فوراً کسی اسپتال تک پہنچنا ہے۔'' انعم کے لہجے میں اضطراب تھا۔

خوف آلود اندیشے تھے اور چہرے پر فکرمندی تھی۔ اس کا یہ روپ ہمارے لئے نیا تھا۔

''کیا گھاؤ خطرناک ہے؟'' کاوش نے تشویش سے پوچھا۔

''گولی کولہے کے اندر رہ گئی ہے۔ اور غالباً ہڈی

کو توڑ گئی ہے۔ اگر فوراً آپریشن نہ کیا گیا تو بارود کا زہر پھیلنا شروع ہوجائے گا۔'' میں نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ خون ایک طرف سے بہہ رہا تھا۔ یقینی بات ہے گولی اندر تھی۔ پھر کولہے کو ہاتھ لگانے سے ندیم تڑپ اٹھتا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ ہڈی میں فریکچر آیا ہے۔

''وکیل صاحب کیا یہاں کوئی نزدیک میں اسپتال ہے۔'' نادر نے وکیل کو مخاطب کیا۔

''نہیں اور اسپتال تک پہنچنے کے لئے ہمیں کم از کم تین گھنٹے چاہئیں۔''

''بہت دیر ہوجائے گی وکیل صاحب ندیم کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔ اگر بروقت طبی امداد میسر نہ آئی تو اس کی جان کو خطرہ ہے۔''

''ان علاقوں میں کوئی اسپتال نہیں ہے۔ چھوٹی سی ایک ڈسپنسری ہے۔ اور وہ بھی دلاور ہاؤس کے قریب اور اسے وہاں سے بھی کوئی خاص فائدہ نہ ہوگا۔ جبکہ اسے فوری آپریشن کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ہمیں جلد از جلد شہر تک پہنچنا ہوگا۔ اور اس میں ہمیں تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔''

''انکل آ..... آپ کچھ کریں ناں۔'' انعم نے بے قراری سے کہا۔

''بیٹا یہاں میں مجبور ہوں کچھ نہیں کرسکتا۔ بس دعا کرسکتا ہوں۔ تم لوگ بھی دعا کرو۔'' وکیل نے گھمبیر آواز میں کہا۔

انعم یاس و حسرت سے ندیم عباس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک معصوم بچے کی سی بیچارگی سمٹ آئی تھی۔ ''آ..... آپ اتنا پریشان کیوں ہورہی ہیں۔'' ندیم نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کی لیکن مسکراہٹ بھی جیسے اسے بوجھ محسوس ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملانے لگے۔ ''کیونکہ میں بھی انسان ہوں اپنے سینے میں پتھر نہیں رکھتی۔ میرے سینے میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت کا ایک نرم ٹکڑا دھڑکتا ہے۔'' وہ بولی۔ خون اب بھی بہہ رہا تھا۔ مگر اب اس کے اخراج کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا زخم والا حصہ دبا دیا۔ ندیم کے حلق سے ایک مدھم سی کراہ خارج ہوئی۔ چہرے کے تاثرات میں ایک ڈرتناؤ پیدا ہوا۔ پھر اعتدال پر آگئے۔ میں نے زخم والے مقام کو اچھی طرح دبا دیا۔ مجھے خود احساس ہوا کہ خون پینے کی رفتار کم ہوگئی ہے۔ ندیم عباس کے زرد چہرے پر تکلیف کے بجائے سکون کے لطیف سائے اترنے لگے تھے۔ نادر پر بھی سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ وہ یک ٹک ندیم کو گھور رہا تھا۔ جس کے سینے کا زیر و بم اتنا دھیما پڑھ چکا تھا کہ بغور دیکھنے سے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ سانس لے رہا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ مگر میں کچھ بھی نہ بولا۔ میری آنکھیں بھی خاموش تھیں۔

نادر کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہ تھی۔ وقت کے بنجر ماتھے پر زرد لمحوں کی بارش ہورہی تھی۔ حقیقت کی شکل بڑی سفاک اور بھیانک تھیں۔ ہم سبھی اس سے نظریں چرانے کی کوشش کررہے تھے۔ مگر وہ تو ہمارے اندر کے سناٹوں میں پھیل چکی تھی۔ اور اپنے اندر سے آنکھیں بچا کر دامن چھڑا کر آج تک کب کوئی مفرور کار استہ تلاش کر پایا ہے۔

گاڑی جس طوفانی رفتار سے زندگی کی سرحدوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔ زندگی اس سے بھی زیادہ برق رفتار سے موت کی سرحد کے قریب ہوتی جارہی تھی۔ ہمارے ضبط جواب دینے لگے۔ حقیقت ہماری روح کو رگیدے جارہی تھی۔ ندیم کی لمحہ بہ لمحہ متغیر ہوتی حالت ہمیں وحشیں مارنے پر مجبور کررہی تھی۔ وقت کے پر بھی جیسے کسی ماورائی قوت نے کتر ڈالے تھے۔ ایک ایک لمحہ کچھوے کی طرح رینگ رینگ کر گزر رہا تھا۔ اور ہمارے ذہنوں کو کچوکے لگا رہا تھا۔ گاڑی کی اندرونی فضا میں ندیم عباس کے خون کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اور ہماری دھڑکنیں اس مہک کے بوجھ کے نیچے جیسے ہر ثانیہ دبی جارہی تھیں۔ زبان کو گویا اس مہک نے مفلوج کردیا تھا۔

''نا..... ندیم.....'' انعم کی آواز نے خاموشی کی چادر

پرناخن طرازی کی مگر ندیم بے حس وحرکت پڑا رہا۔ انعم نے خوفزدہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے تاثرات تائید طلب نہیں بلکہ شدید طلب تھے۔ ہم نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ دوبارہ ندیم کی جانب متوجہ ہوگئی۔ ''ندیم..... ندیم بولو۔'' اس نے ندیم کو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ ندیم نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے انعم کی طرف دیکھا۔ ایک غیر محسوس سی مسکراہٹ اس کے خشک ہوتے ہونٹوں پر سرک آئی۔ اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔ ''اب کیا ہے۔ خود ہی تو کہا تھا۔ خاموش ہوجاؤ۔ اب سکون سے سونے تو دو۔ اس کی آواز بڑی مدھم تھی۔

''نہیں تم بولو مجھ سے باتیں کرو۔ خاموش مت رہو۔'' انعم کی آواز کپکپا گئی۔ ''میرا بولنا آپ کو اچھا نہیں لگے گا انعم جی۔''

''تم بولو جو کہنا چاہتے ہو بولو میں برا نہیں مناؤں گی۔ مگر مگر تم خاموش نہ رہو۔''

''اب بولا نہیں جارہا۔ پیا..... پیاس لگ رہی ہے۔ زبان سا..... ساتھ نہیں دے رہی۔ انعم جی..... اگ..... اگر میری کوئی بات آپ کو بری یا..... نا..... ناگوار گزری ہو اب تک تو..... تو مجھے معاف کردینا.....'' ندیم عباس نے اٹک اٹک کر جملہ پورا کیا۔ خون کے ضائع ہونے نے اس پر اتنی نقاہت طاری کردی تھی کہ وہ آنکھیں بھی پوری طرح کھول نہیں پارہا تھا۔

''بس تم بولتے رہو۔'' ایک لمحے کو ندیم کی آنکھیں پوری طرح وا ہوگئیں۔

''آپ اس وقت بہت پیاری لگ رہی ہیں۔''

''بکواس نہیں کرو۔'' انعم روہانسی ہوکر بولی۔ اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ندیم کی آدھ کھلی آنکھیں بھی بند ہوگئیں۔ ''ندیم خان ندیم۔'' انعم نے ایک بار پھر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی پلکیں قدرے اٹھ گئیں۔ نادر ہاتھ سے اس کی پیشانی پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

''ندیم ہمت نہیں ہارنی بس۔ ہم اسپتال پہنچنے ہی والے ہیں۔'' اس کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ میں بدستور ندیم کا زخم دبائے بیٹھا تھا ندیم نادر کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''نا..... نادر بھائی یاد ہے آپ نے ایک بار کہا تھا کہ ''انعم جی کو زیادہ زچ نہ کیا کرو۔ ورنہ اس کے ہاتھوں پٹ جاؤ گے۔''

''ہاں یاد ہے اور میں نے بڑے دعوے سے کہا تھا کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ انعم کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گی۔ جانتے ہیں میں نے یہ دعویٰ کیوں کیا تھا کیوں کہ چند لمحوں بعد ندیم کے لبوں میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ مجھے اس کے دل تک رسائی مل گئی تھی۔ مگر یہ بہت مضبوط اعصاب کی مالک ہیں کہ روز اول سے لے کر آج تک انہوں نے مم..... محبت کا اقرار نہیں کیا ہے۔'' پھر وہ انعم سے مخاطب ہوا۔ ''کیوں انعم..... کیا..... کیا ان لمحوں میں بھی تم خاموش رہوگی۔''

''آ..... ج..... تو اقرار کرلو تم بھی مجھ سے محبت کر..... تی ہو.....'' ندیم یکا یک آپ سے تم پر آ گیا۔

انعم کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے تھے۔ ''انعم اقرار کرلو۔ تسلیم کرلو۔ نزاع کی قید سے نجات دلادو۔ انعم..... انعم محبت کا اقرار کرلو۔'' ندیم کی آواز ڈوب گئی۔ پلکیں جھک گئیں۔ ہونٹوں کی لرزش تھم گئی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ ''ندیم آنکھیں کھولو میں سننا چاہتی ہوں مجھ سے باتیں کرو۔'' انعم کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ ''ندیم ہوش کرو۔''

نادر بھی تڑپ اٹھا۔

''ندیم آنکھیں کھولو۔'' نادر مضطرب لہجے میں بولا۔ ''ندیم آہستہ سے کسمسایا۔ ''میرا دل ڈوب رہا ہے۔ دم..... دم گھٹ رہا ہے۔ پپ پانی..... پینا ہے۔'' وہ ڈوبتی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

انعم مضطرب انداز میں گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔ مگر سڑک کے دونوں اطراف بے آب وگیاہ میدان پھیلے ہوئے تھے۔ بس کہیں کوئی اکا دکا جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور دور تک پانی کے آثار نہ تھے۔

''انکل۔'' وہ وکیل سے مخاطب ہوئی۔ ندیم کی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ پانی چاہئے اس کے لئے۔''

''یہاں آس پاس پانی تو دستیاب نہ ہوگا البتہ جہاں کہیں پانی نظر آیا وہاں گاڑی روک دوں گا۔ وکیل کا لہجہ سنجیدگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''شہر اور کتنی دور ہے انکل؟''

''ابھی ہمیں شہر پہنچنے میں گھنٹہ اور لگ جائے گا۔''

اتنی دیر ہوگئی ہے۔ ہمیں نکلے ہوئے اور ابھی گھنٹہ اور لگے گا۔'' نادر نے کہا۔

''انکل گاڑی تیز چلایئے۔'' انعم بے قراری سے بولی۔ حالانکہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ وکیل کی ایک لمحے کی غفلت ہم لوگوں کو موت کے منہ میں پہنچا سکتی ہے۔ ''ندیم آنکھیں کھولو میرے دوست کوئی بات کرو۔''

نادر کی حالت دیدنی تھی۔ انعم جی اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ میں نے ندیم کی کلائی پکڑی۔ اس کی نبض بہت دھیمی پڑ چکی تھی۔

''ندیم آنکھیں کھولو۔ پلیز خدا کے لئے آنکھیں کھولو۔ مجھ سے..... مجھ سے کوئی بات کرو ندیم۔'' انعم رو رہی تھی۔ اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ مگر وہ بے حس وحرکت پڑا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہوچکی تھی۔ اور اس کی رنگت بالکل زرد پڑ چکی تھی۔

''اگر ندیم کو کچھ ہوگیا تو میں اس بستی کا نام ونشان تک مٹاڈالوں گا۔'' نادر وحشت بھرے لہجے میں بولا۔

''بڑے بول نہیں بولا کرتے۔'' شون پہلی بار گویا ہوئے۔ ''کچھ اگر کرسکتے ہو تو اس کے لئے دعا کرو۔ اس نے خود اس اذیت کو آواز دی ہے۔ یہ اسے سزا مل رہی ہے۔ اس نے مقدس ہستیوں کے متعلق غلط الفاظ استعمال کئے؟''

''ارے ایسی کی تیسی ان ممیوں کی۔'' نادر غصے سے دھاڑا۔ ''اگر اس کو کچھ ہوگیا تو میں ممیوں کے اجسام کو بھی آگ میں جھونک دوں گا۔''

''سوچ سمجھ کر.....'' شون نے کچھ کہنا چاہا مگر نادر پر وحشت سوار تھی۔ وہ ان کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ ''بس۔ بس شون صاحب بہت سن لیں آپ کی بے سروپا باتیں۔ بند کرلیں آپ اپنا پٹارہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں فراموش کر بیٹھوں کہ آپ بزرگ ہیں۔'' نادر مالک ملک رہا تھا۔ شون بس نفرت سے اسے گھورتے رہ گئے۔ میں نے نادر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ رخ بدل کر وکیل سے مخاطب ہوا۔ ''وکیل صاحب اس بیل گاڑی کی رفتار کچھ تیز کرلیں۔''

''نادر کچھ ہوش سے کام لو۔ اس طرح حواس باختہ ہونے سے کچھ نہیں ہوگا۔ گاڑی کی رفتار پہلے ہی سے خطرناک حد تک تیز ہے۔''

''شریم صاحب میں۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو میں دلاور کو نہیں چھوڑوں گا۔ آپ میرا راستہ نہیں روکنا۔''

''کچھ نہیں ہوگا اسے ہم ابھی اسپتال پہنچ جائیں گے۔'' میں نے اسے تسلی دینا چاہی حالانکہ میرے اپنے اندرونی حالات خراب تھے۔ انعم تھوڑا سرک کر آگے ہوئی تو میں تھوڑا سا سائیڈ پر ہوگیا۔

''میں تم سے محبت کرتی ہوں ندیم، تم سن رہے ہو نا میں اپنی محبت کا اعتراف کررہی ہوں۔ جاہل تھی کم عقل تھی کہ اپنے اندر پنپنے والے جذبوں کو نہ سمجھ سکی مگر آج آج سمجھ گئی ہوں۔ جان گئی ہوں۔ ندیم مجھے تم سے محبت ہے۔ بے انتہا محبت۔''

انعم پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوگئی تھی کہ اسے اپنے اردگرد کی کچھ خبر ہی نہ تھی۔ اسے یہ بھی احساس نہ تھا کہ وہ جس سے مخاطب ہے وہ ہوش وحواس میں نہیں۔ اس کی آنکھوں سے بہنے والے شفاف آنسو ندیم کے چہرے پر گر رہے تھے۔ وہ سسک رہی تھی۔

وہ پھوٹ کر رو رہی تھی ہماری اپنی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کافی دیر یونہی گزر گئی۔ اچانک گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی۔ اور کچھ ہی دیر بعد گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی

''کیا ہوا وکیل صاحب۔'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''پیٹرول ختم ہوگیا۔''

''اوہ نو!'' میرے ہونٹ سختی سے بھنچ گئے۔ نادر ایک جھٹکے سے نیچے اترا۔ اور جا کر ٹینکی چیک کرنے لگا۔

''اب..... اب کیا ہوگا۔'' انعم وحشت زدہ انداز

میں بڑبڑائی۔ میں خاموشی سے نیچے اتر آیا۔ دور دور تک کسی گاڑی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ تاحد نظر ویرانی اور سناٹا تھا۔ ندیم کی حالت اتنی نازک تھی کہ ہمارے لئے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا اور صورت حال بڑی ہی بھیانک شکل اختیار کرگئی تھی۔ بے چینی اور پریشانی سے مجھے اپنے سر میں درد محسوس ہونے لگا۔ ہم یہاں پھنس کر رہ گئے تھے۔ وکیل اور کاوش بھی اتر آئے تھے۔ دونوں کے چہروں پر بھی پریشانی تھی۔

"بہت برا ہوا بڑے نازک وقت پر یہ کاوٹ آگئی ہے۔" کاوش ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ "یہاں سے سواری ملنا بھی بہت مشکل ہے۔ گھنٹوں بعد کوئی گاڑی گزرتی ہے۔" وکیل نے کہا۔ "ندیم کی حالت بہت خراب ہے۔ ہر گزرتا لمحہ اسے زندگی سے دور کررہا ہے۔ اگر ہمیں یہاں زیادہ وقت گزرا تو وہ بے ہوشی کے عالم میں ہی دم توڑ دے گا۔"

"تو پھر کیا کیا جائے، تمام صورت حال آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ ایسے میں بھلا کیا کیا جاسکتا ہے۔"

انعم اور شون بھی گاڑی سے اتر آئے۔ نادر تلملاتا ہوا ہمارے قریب آگیا۔ "ٹینکی بالکل سوکھی پڑی ہے۔ پیٹرول کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا ہے۔ اس پیٹرول کو بھی ابھی ختم ہونا تھا۔ یہاں رکنے سے بہتر ہے کہ ندیم کو کاندھے پر ڈال کر آگے بڑھا جائے۔" نادر نے کہا۔

"شہر یہاں سے بیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی یہ دم توڑ دے گا۔"

"تو یہاں کھڑے رہنے سے وہ زندہ رہے گا۔"

"ارے وہ دیکھو لگتا ہے کوئی گاڑی آرہی ہے۔" بیک وقت ہم سب کی نظریں اس جانب اٹھ گئیں۔ شہر کی طرف سے واقعی کوئی گاڑی آرہی تھی۔ میرے وجود میں مسرت کی لہریں دوڑ گئیں۔ ایسی صورت حال میں یہ تائید غیبی کسی کرشمے سے کم نہیں تھی۔ "ہاں یقیناً گاڑی ہے۔ اسے روکنا ہوگا۔" نادر نے کہا۔ قریب آنے دو دیکھتے ہیں۔ ہم سب بے چینی سے گاڑی کے قریب آنے کے منتظر تھے۔ ہماری گاڑی بالکل سڑک کے درمیان رکی تھی اور سڑک کے اطراف میں اتنی جگہ نہ تھی کہ آنے والی گاڑی گزر سکتی۔ سو یقیناً جب تک ہم اس گاڑی کو ایک طرف نہیں ہٹاتے وہ گاڑی گزر نہیں سکتی تھی۔

نادر اور انعم تھوڑا آگے ہو کر اپنی گاڑی کے قریب جا رکے۔ آنے والی گاڑی جب بالکل قریب پہنچی تو ہماری مسرت دو چند ہوگئی۔ گاڑی پک اپ تھی اور ہم سب باآسانی اس میں سوار ہوسکتے تھے۔ ڈرائیور نے قریب آکر بریک لگائے تو وکیل آگے بڑھ گیا۔ "کیا مسئلہ ہے گاڑی بیچ راستے میں کیوں کھڑی کر رکھی ہے۔" ڈرائیور نے سر کھڑکی سے باہر نکال کر کہا۔ اس کے برابر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ نادر پلٹ گاڑی کی عقبی طرف آگیا۔ "پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔"

"اگر آپ کے پاس کوئی گیلن پیٹرول کا ہو تو دے دیں۔" وکیل نے نارمل انداز میں کہا۔ وہ ڈرائیو گیٹ کے پاس پہنچ گیا تھا۔ "ہم ٹینکی فل رکھتے ہیں فالتو پیٹرول نہیں۔"

"چلیں ٹینکی سے ہی تھوڑا نکال دیں۔ ہم نے شہر پہنچنا ہے۔"

"ارے بھائی کیسے نکال دیں ہم نے مال اتار کر واپس بھی جانا ہے۔" اس کی بات مکمل ہوتے ہی وکیل نے گیٹ کھولا۔ اور اس کو گریبان سے دبوچ لیا۔ پھر وہ چیختا ہوا سڑک کے دائیں طرف گرا۔ دوسرا آدمی اپنی سائیڈ کا دروازہ جلدی سے کھول کر نیچے اترا تھا۔ وہ وکیل کی طرف بڑھا پر راستے میں ہی اسے انعم نے جالیا۔ وہ بھی دور جا گرا۔ ابھی وہ اٹھے ہی تھے تو نادر بندوق لئے اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "چلو ندیم کو اٹھاؤ جلدی کرو۔" نادر اور انعم چند ہی لمحوں میں ندیم کو اٹھا لائے۔ وکیل نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ کاوش اس کے برابر ہی تھا۔ ہم ایک بار پھر طوفانی رفتار سے شہر کی طرف بڑھ گئے۔ نادر نے عقبی طرف کے دونوں پٹ بند کردیئے۔

انعم ندیم کے سینے پر اپنے کان لگا کر اس کی دھڑکن کا اندازہ کررہی تھی۔ میں نے ندیم کی نبض چیک کی حیرت انگیز اور ناقابل یقین طور پر اس کی نبض پہلے سے بہتر تھی۔

نادر میری صورت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "نبض بہتر ہوگئی ہے۔ موت سے لڑ رہا ہے۔" گاڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ ہمارے دل بہت بری طرح دھڑک رہے تھے۔ قلب و ذہن امید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھا۔ انعم کی حالت دیدنی تھی۔ ان لمحوں مجھے ان پر بڑا ترس آرہا تھا۔ تقریباً دس منٹ بعد گاڑی مین روڈ پر چڑھ آئی۔ میری انگلیاں ندیم کی نبض پر تھیں۔

یکا یک اس کی نبض ایک بار پھر سے ڈوبنے لگی۔ نادر میرے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔ "چراغ بجھنے سے پہلے بہت پھڑپھڑاتا ہے۔" اس نے گھمبیر لہجے میں کہا۔ پھر رخ بدل کر وکیل سے مخاطب ہوا۔ "وکیل صاحب گاڑی فوراً کسی اسپتال لے چلیں۔"

"اگر ہم یونہی کسی اسپتال گئے تو بہت مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ دلاور بھی زخمی ہوا ہے۔ ہم لوگ فوراً دھر لئے جائیں گے۔ البتہ شہر شروع ہوتے ہی ایک پرائیویٹ اسپتال آتا ہے۔ اس کا مالک اختر ہے۔ اور میرا احسان مند بھی ہے۔ سو ہم اس وقت ادھر ہی جارہے ہیں۔ بنا کسی پریشانی کے ندیم کا آپریشن ہوجائے گا۔"

"جیسا آپ مناسب سمجھیں جب اسپتال ہی جانا ہے تو جلدی کریں۔" ہم لوگ ابھی شہری آبادی سے کچھ دور ہی تھے۔ کہ سامنے سے پولیس کی دو تین گاڑیاں دکھائی دیں۔ اور زن کی آواز سے ہماری گاڑی کے قریب سے گزر گئیں۔ اچھے وقت پر یہاں ہم آگئے ہیں۔ ورنہ ہم مسائل میں گھر جاتے۔ وکیل نے کہا۔

ہم سامنے دیکھ رہے تھے کہ میں اچانک چونک پڑا۔ تھوڑی دور سڑک پر گاڑیوں کی طویل قطار کھڑی تھی۔ کچھ پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ راستہ بلاک تھا۔

"یہ ایک اور مصیبت پیدا ہوگئی۔" وکیل نے جھنجھلاتے ہوئے انداز میں کہا۔

"یقیناً دلاور پر قاتلانہ حملے کی اطلاع پولیس تک بھی پہنچ گئی ہوگی۔" "اب کیا ہوگا؟" نادر نے کہا۔

"انکل گاڑی روکنے کے بجائے رکاوٹیں اڑا دیں۔ پہلے ندیم کو اسپتال پہنچا دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔" انعم نے کہا۔ "بس تھوڑا سا انتظار۔" وکیل گاڑی آگے لے گیا۔ پولیس والے ایک ایک گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے۔ مسافروں سے سوال جواب کررہے تھے۔ ایک جوان آفیسر خود گاڑیوں میں جھانک رہا تھا۔ ڈرائیوروں اور سپاہیوں کو جھاڑ پلا رہا تھا۔

اچانک وکیل نے گیئر بدلا۔ اور گاڑی قطار سے نکال کر آگے لے گیا۔ ہماری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اگر کوئی سپاہی عقبی دروازہ کھول کر اندر دیکھ لیتا تو ہم بری طرح پھنس جاتے۔ ندیم خون میں لت پت موت کے کنارے پر تھا۔ گاڑی کو یوں قطار توڑ کر اپنی طرف آتا دیکھ کر سپاہی چونک پڑے تھے۔ کئی ایک نے ہماری گاڑی کی طرف بندوق سیدھی کرلی۔ وکیل نے ان کے قریب جا کر بریک لگائے۔ اور کھڑکی سے سر باہر نکال کر آگے لے گیا۔ اور پولیس آفیسر سے مخاطب ہوا۔ "آفیسر پلیز! پہلے میری گاڑی چیک کرلیں۔ میں ذرا جلدی میں ہوں۔"

آفیسر کے بگڑے ہوئے تاثرات وکیل کی صورت دیکھتے ہی اعتدال پر آگئے۔ وہ مسکراتا ہوا قریب آگیا۔ "وکیل صاحب آپ اور سنائیں کیسے ہیں کدھر سے آرہے ہیں۔"

"ابھی تک تو ٹھیک ہے مگر اب حالات بتا رہے ہیں کہ ٹھیک نہیں رہے۔" وکیل نے معنی خیز انداز میں کہا۔ اور وہ آفیسر ہنس پڑا۔ "ویسے یہ سب کیا ہے؟ کس سلسلے میں اتنی چیکنگ ہورہی ہے۔" وکیل کے لہجے میں تعجب تھا۔

"ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ دلاور کو چند افراد نے قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ایک کوٹھی میں انہوں نے چند افراد کو ہلاک بھی کیا ہے۔ ان مجرموں کا ایک ساتھی بھی زخمی ہوا ہے۔ بس اسی چکر میں لگے ہوئے ہیں۔"

"چلیں پھر پہلے میری گاڑی چیک کرلیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مجرم میں ہی ہوں۔ دراصل میں جلدی میں ہوں۔" وکیل نے ہنستے ہوئے کہا۔

"وکیل صاحب اب آپ ہمیں ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔"

"انسپکٹر صاحب ہم نے کیا کرنا ہے۔" وکیل کے معنی خیز لہجے پر آفیسر ایک بار پھر ہنس پڑا۔

"جائیں آپ!" آفیسر ایک طرف ہٹ گیا۔ اور سپاہیوں سے مخاطب ہوا۔ جانے دو انہیں وکیل نے شکریہ کہتے ہوئے گاڑی آگے بڑھادی۔ اور ہماری جان میں جان آئی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔ انعم ندیم کا سر گود میں رکھے بیٹھی تھی۔

تقریباً دس منٹ بعد وکیل نے گاڑی ایک عمارت کے کھلے گیٹ کی طرف موڑ دی۔ اور اندھا دھند اندر لیتا چلا گیا۔ چند ایک افراد سامنے آئے۔ اور اچھلتے ہوئے ایک طرف ہٹ گئے۔ ایک طرف بورڈ پر اسپتال کا نام لکھا ہوا تھا۔ وکیل گاڑی عمارت کے بالکل سامنے لے گیا۔ گاڑی کے بریک بری طرح چیخے تھے۔ اور گاڑی کے بریک بری طرح سے چرچرائے تھے۔ اور گاڑی اس بری طرح گھومی تھی کہ اس کا عقبی حصہ عمارت کی طرف گھوم گیا تھا۔ ہم خود لڑھک کر ایک دوسرے سے ٹکرائے تھے۔ مگر ہم نے سنبھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ نادر نے جلدی سے دروازہ کھول دیا۔ میں نے اور نادر نے ندیم کو باہر نکالا۔ پھر میں نے اس کا نیم مردہ وجود بازوؤں پر اٹھایا اور اندرونی جانب دوڑ پڑا۔ وکیل ہم سے پہلے اندر داخل ہو چکا تھا۔ "آپریشن روم چلو تم۔" اس نے پلٹ کر جیسے چیختے ہوئے کہا۔

اور ایک طرف کو دوڑ گیا۔ نادر اور انعم میرے آگے آگے تھے۔ شون اور کاوش میرے ساتھ۔ سیڑھیاں چڑھتے ہی دائیں ہاتھ استقبالیہ تھا۔ جہاں ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ لوگ منہ پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑی جس طوفانی انداز میں آکر رکی تھی اس پر سبھی کی توجہ ہوگئی تھی ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

ایک طرف سے دو وارڈ بوائے ہماری طرف دوڑتے ہوئے آگئے۔ "آپریشن روم۔" نادر جذباتی لہجے میں ان سے مخاطب ہوا۔ "یہ یہ تو پولیس کیس ہے۔" ان میں سے ایک نے بولنا چاہا تو نادر نے اس کی گردن اپنے چوڑے پنجے میں دبوچی اور چیختے ہوئے بولا۔ "آپریشن روم کدھر ہے۔"

"اس طرف۔" اس نوجوان نے کہا۔ اور میں اس طرف دوڑ پڑا۔ نادر اور انعم بدستور میرے آگے تھے۔ راستے میں کچھ ڈاکٹر اور نرسیں بھی آئیں اور وہ پوچھتے رہ گئے۔ "مسئلہ کیا ہے۔ کیا ہوا ہے؟" مگر ہم بغیر کچھ کہے رکے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ایک جگہ رکتے ہوئے نادر پلٹ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آجائیں اس طرف۔" وہ دائیں طرف راہداری میں پلٹ گیا۔ میرے قدم بھی رکے نہیں۔ اس طرف بالکل نکڑ پر ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔ جس کی پیشانی پر لکھا ہوا تھا۔ آپریشن روم اوپر لگا ہوا سرخ بلب روشن تھا۔ نادر نے آگے بڑھ کر لات ماری اور دروازہ کھل گیا۔ ہم پانچوں اندر داخل ہوگئے۔ کاوش نے عقب سے دروازہ بند کردیا۔ ایک طرف پردوں کی اوٹ میں تین ڈاکٹر اور نرسیں آپریشن میں مصروف تھیں۔ ہمارے یوں اندر گھس آنے پر وہ سبھی چونک پڑے۔ "یہ یہ کیا بے ہودگی ہے۔ کون ہیں آپ اور..... اور آپ اندر کیسے آگئے۔" ایک ڈاکٹر نے ترش لہجے میں کہا۔ "ہم ڈاکٹر ہیں اور ایک مریض کو لے کر آئے ہیں اور دروازے سے آرہے ہیں۔ کیا آپ کو دکھائی نہیں دیا۔"

نادر اس ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ اور میں نے آگے بڑھ کر ایک ٹیبل پر ندیم کو لٹادیا۔ "کیا بدتمیزی ہے باہر جائیں آپ یہ کوئی طریقہ ہے۔" ڈاکٹر پردے کی اوٹ سے نکل کر سامنے آیا۔

تو نادر نے اسے کندھے سے پکڑ کر ایک طرف دھکیل دیا۔ "زیادہ بکواس کی ضرورت نہیں۔ کہیں ہم تمہیں بات کرنے کا سلیقہ نہ سمجھادیں۔ ہمارے ساتھی کو گولی لگی ہے اس کا فوری آپریشن کرنا ہے۔"

اچانک دروازہ ایک زور کی آواز سے کھلا اور نادر کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔ آنے والا وکیل تھا۔ اور اس کے ساتھ دو اور افراد تھے۔ ایک جوان آدمی تھا۔ اور دوسرا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ ڈاکٹر فوراً آنے والے اس آدمی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "سر۔ سر یہ دیکھیں یہ لوگ۔" اس نے ڈاکٹر کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی۔ "مجھے علم ہے یہ لوگ اجنبی نہیں ہیں۔ میرے محسن ہیں۔ ان کی پوری مدد کرو۔" آنے والا یقیناً اختر تھا۔ "جی سر۔"

ڈاکٹر قدرے حیران تھا۔ اختر اپنے ساتھ آنے والے دوسرے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "دیکھو یہ میرا ذاتی کیس ہے۔ خیال رہے کہ اس بارے میں کوئی خبر اسپتال سے باہر نہیں جانی چاہئے۔"

"جی بہت بہتر....."

"ہمیں آپریشن کا سامان اور پازیٹو بلڈ کی ضرورت ہے فوری۔" میں نے اختر سے کہا۔

"نہیں ان کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کردو۔" اختر ایک ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ اور وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" کاوش کی آواز پر ہم سبھی چونک پڑے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ندیم کی نبض تھامے کھڑا تھا۔ اور اس کے چہرے پر گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں کے لئے آپریشن روم میں موت کی سی خاموشی چھاگئی۔ دھڑکنیں ساکت ہوگئیں۔

اور ایک لمحے کو جیسے سانس تھم گئی۔ "کک کیا مطلب آپ کا؟" میں ہکلایا۔ "یہ بہت لڑا، مگر اب ہار گیا۔" کاوش نے گھمبیر آواز میں کہا اور ندیم کی کلائی چھوڑ دی۔ میں تڑپ کر ندیم کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی۔ مگر نبض نبض تو انگلیوں کے نیچے آہی نہیں رہی تھی یا شاید انگلیاں نبض کو ڈھونڈ نہیں پا رہی تھیں۔ میں دیوانوں کی طرح ندیم کی کلائی کو ٹٹولنے لگا۔ مگر نبض ہوتی تو انگلیاں اسے محسوس کرتیں، اس کی نبض تو تاریک پاتال میں اتر گئی تھی۔

سرد لمحوں کی گرفت ختم ہو چکی تھی۔ وہ موت سے لڑتے لڑتے زندگی ہار بیٹھا تھا۔ جا چکا تھا۔ ہم سب کو چھوڑ کر، اس کا جسم مردہ ہو چکا تھا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے موت نے اس کی نہیں میری روح قبض کرلی ہو۔ میں اس کی سرد اور زندگی سے خالی کلائی تھامے اپنی جگہ سکتے کی سی کیفیت میں کھڑا رہ گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے سلب ہوگئی تھیں۔

اچانک نادر آگے بڑھا۔ اور ندیم کے سینے پر دباؤ ڈالنے لگا۔ اس پر ایک وحشت سوار ہوگئی تھی۔ کبھی وہ اس کا سینہ دبانے لگتا۔ اور کبھی منہ سے ندیم کے منہ میں سانس بھرنے کی کوشش کرتا۔ اب بھلا اس سے کیا ہونے والا تھا۔ وہ تو بے ہوشی کے عالم میں ہی دم توڑ چکا تھا۔ میں نے بے جان ہاتھوں سے اس کی کلائی چھوڑ دی۔

موت ہم سے زیادہ تیز رفتار نکلی تھی۔ جو اس کی زندگی کا گھونٹ بھر گئی تھی، میں نے رخ پھیر لیا۔

انعم دو قدم کے فاصلے پر کسی سنگی مجسمے کی طرح بے حس و حرکت کھڑی میری ہی جانب دیکھ رہی تھی۔ مجھے پلٹتا دیکھ کر اس کے ہونٹ لرزے مگر کوئی آواز نہ نکل سکی۔ انعم زور و قطار رونے لگی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں جیسے دریا رواں ہوگئے تھے۔ ہم سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ شون جیسے خشک مزاج شخص کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ ندیم کا مزاج اس کی عادت و اطوار اس کی شخصیت ہی ایسی تھی کہ اس کے مرنے پر پتھر بھی رو پڑے تھے۔ میرے لئے وہاں کھڑا رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ سو میں جلدی سے باہر نکل گیا۔ سانس کی نالی میں جیسے کوئی گولا سا پھنس گیا تھا۔ دم گھٹ رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ چلتے چلتے اچانک سینہ ایک زوردار آواز سے پھٹ جائے گا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا اسپتال کی عقبی طرف نکل آیا تھا۔ یہاں ایک وسیع پلاٹ تھا۔ کافی لوگ موجود تھے۔ کچھ گھاس پر لیٹے ہوئے تھے۔ پلاٹ کا مشرقی کونا کافی سنسان تھا۔ میں اس طرف بڑھ گیا اور کونے میں پڑے سنگی بنچ پر جا بیٹھا۔ ندیم کی موت حالانکہ غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کے باوجود اعصاب اس دھچکے سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئے تھے۔ دل و دماغ پر مایوسی اور دکھ کا انتہائی زیادہ بوجھ آپڑا تھا۔ قلب و ذہن کی کیفیت خراب تھی۔

مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ندیم کی موت کا ذمہ دار میں ہوں۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے۔ ممی کا عشق مجھے ہی چڑھا تھا۔ یہ کہانی میری بستی سے شروع ہوئی تھی۔ بہرحال اب کیا کرسکتا تھا۔ بہت دیر تک میں وہاں سوچوں میں غرق رہا۔ پھر وکیل کی آواز نے میری

سوچوں کے تار بکھیرے۔ ''شریم صاحب۔'' اور میں چونک پڑا۔ وکیل اور کاوش دونوں میرے عقب میں موجود تھے۔ ''شریم صاحب۔'' وکیل دوبارہ گہری سنجیدگی سے گویا ہوا۔ ''ندیم کی موت کا مجھے بھی دکھ ہے۔ وہ ایسا جوان تھا ایسی طبیعت اور مزاج کا مالک تھا کہ تھوڑے ہی وقت میں میرے دل میں اتر گیا تھا مگر اس کی موت کا مجھے بہت دکھ ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ کاوش نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کردیا۔

چند لمحوں کے بعد وکیل گویا ہوا۔ ''ندیم کی ڈیڈ باڈی میں نے سردخانے میں رکھنے کا کہہ دیا ہے۔ بعد میں کوئی فیصلہ کرلیں گے۔ میرے کچھ آدمی بھی آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں واپس چلنا چاہئے۔''

''چلئے۔'' ہم پھر دوبارہ اسپتال کی عمارت میں آگئے۔ باقی ساتھی ڈاکٹر اختر کے کمرے میں تھے۔ وکیل نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور ہم باہر نکل آئے۔ کمپاؤنڈ میں دائیں طرف ایک ڈارک کلر کی ہائی ایس کھڑی تھی۔ جس کے قریب ہی دو خوش پوش جوان کھڑے تھے۔ ہمیں اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ ہوشیار کھڑے ہوگئے۔ ''مظہر۔'' وکیل نے قریب پہنچ کر ایک کو مخاطب کیا۔ ''تم وہ پک اپ لے جاؤ۔ اور کسی سنسان سڑک پر چھوڑ دینا۔ اور خود واپس آجانا۔''

''اور تم خود ہمیں لے کر چلو۔'' آخری الفاظ وکیل نے دوسرے جوان سے کہے۔ وہ جلدی سے گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ کی طرف آگیا۔ ہم سب ہائی ایس میں سوار ہوگئے۔ گاڑی بے آواز حرکت میں آئی۔ اور گیٹ سے نکل کر سڑک پر دوڑتی ہوئی دوسری گاڑیوں کے ہجوم میں شامل ہوگئی۔

نادر کے چہرے پر مکمل سکوت تھا اور انعم کے چہرے پر ویرانی، شون تو ویسے بھی زیادہ ترکم گو تھے۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وکیل کی کوٹھی پر ہم پہنچ گئے۔ راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ سبھی اپنی اپنی ذات میں گم تھے، گاڑی رکتے ہی ہم سب نیچے اتر آئے۔ سورج مغرب کی جانب جھکنے لگا تھا۔ ہم گزشتہ تین دنوں سے بھوکے پیاسے تھے۔ احساس تو تھا مگر ندیم کی موت نے ہماری بھوک پیاس کی طلب کو وقتی طور پر دبا دیا تھا۔ کوٹھی کے لان میں دو کرسیوں پر دو آدمی اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ ہم سب کے گاڑی سے اترتے ہی وہ تینوں اپنی جگہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ عورت پر نظر پڑتے ہی وکیل واضح طور پر چونک پڑا تھا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنے تاثرات پر قابو پالیا تھا۔ وہ عورت ہماری جانب بڑھ آئی۔ وکیل کے آگے بڑھتے قدم رک گئے۔

''ایسا ہے کہ آپ لوگ جا کر آرام کریں۔'' پھر اس کا لہجہ بڑا ہی عجیب تھا۔ ''انعم بیٹا تم انہیں ان کے کمروں تک پہنچا دو۔ اور خود بھی ذرا فریش ہولو۔ نہا دھولو کچھ آرام کرو۔'' وہ کچھ اس انداز میں بات کررہا تھا جیسے لفظوں کے چناؤ میں اسے دقت ہورہی ہو۔ انعم نے ایک گہری نظر قریب آنے والی عورت پر ڈالی اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ ہم نے بھی قدم آگے بڑھادیئے۔ ہمارے کمروں تک وہ ہمارے ساتھ آئی۔ دروازے پر ذرا ٹھٹک کر رکی پھر وحشت زدہ سی وہاں سے ہی پلٹ گئی۔ نادر اور کاوش دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ میں اور شون دوسرے کمرے میں لیٹ گئے۔ ہمارے درمیان کوئی قابل ذکر بات نہ ہوئی۔ کافی دن کی بے آرامی اور تھکن تھی۔ طبیعت پر یاسیت اور سنجیدگی طاری تھی۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

شام تک صورت حال یہی رہی تقریباً مغرب کے وقت میں باتھ روم میں گھس گیا۔ اور دیر تک ٹھنڈے پانی کے نیچے کھڑا رہا۔ نہا دھو کر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد جب میں باہر نکلا تو اعصاب بڑی حد تک پرسکون ہوگئے تھے۔ مگر ذہن کا بوجھ کم نہ ہوا تھا۔ ندیم کی تصویر جیسے آنکھوں میں جم کر رہ گئی تھی۔ وکیل کے اصرار پر ہم سب رات کے کھانے پر اکٹھے ہوگئے۔ مگر باوجود کوشش کے کوئی بھی کھانا کھانے پر توجہ نہ دے سکا۔ سوائے وکیل کے وہ بہت ہی سکون سے کھانا کھا رہا تھا۔ اب ان کے چہرے پر

پہلے جیسی سنجیدگی نہ تھی۔ وکیل بڑے ہی مضبوط ارادے کا مالک تھا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی تھی کہ ندیم کے خیال کو ہمارے ذہن سے نکال دے مگر۔

بہرحال کافی بھی ہم سب نے اکٹھے بیٹھ کر پی تھی۔ اور مجھے یقین تھا کہ وکیل نے کافی میں سکون آور دوا ملادی تھی۔ شاید پرسکون نیند کی بھی کیونکہ اس کے بعد ہم زیادہ دیر نہ بیٹھ سکے۔ اور اپنے کمروں میں آکر بے سدھ ہوکر سوگئے۔ اگلے دن ہم لوگ نہا دھو کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ وہ عورت آدھمکی۔ جسے گزشتہ روز لان میں وکیل دیکھ کر چونکا تھا۔ ''وکیل صاحب آپ لوگوں کے ناشتے کی ٹیبل پر منتظر ہیں۔ چلیں۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر ہم سب ہی ڈائننگ ہال پہنچ گئے۔

وکیل اور انعم وہاں پہلے سے ہی موجود تھے۔ وکیل نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ہمیں تعظیم دی۔ البتہ انعم اپنی جگہ لاتعلق سی بیٹھی رہی۔ ''طبیعت کیسی ہے آپ لوگوں کی۔'' وکیل نے فریش لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ طبیعت تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔'' وکیل بیٹھ گیا۔ اور وہ عورت بھی۔ ناشتے کے دوران ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ایک ملازم برتن سمیٹ کر لے گیا اور کافی کے برتن ہمارے سامنے سجادیئے۔ ''اب آپ نے آئندہ کیا سوچا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے۔'' وکیل نے اچانک کہا۔

میں نے کافی کا کپ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہم لوگ جلد سے جلد ندیم کی باڈی لے کر واپس موہن جوداڑو جانا چاہتے ہیں۔'' میرا لہجہ سنجیدگی لئے ہوئے تھا۔ ''لگتا ہے کہ آپ لوگوں نے اچانک ہی یہ فیصلہ کرلیا ہے۔''

''ہاں ایسا ہی سمجھ لیں۔''

وکیل کچھ دیر کو خاموش ہوگیا۔ ''اور وہ ممی.....''

''چھوڑیں اس قصے کو وکیل صاحب میں اب مزید کسی بھی قسم کے نقصان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کافی کی چسکی لی۔ ''جو دھچکا لگ چکا ہے وکیل صاحب۔ شاید ساری زندگی میں اپنے اندر سے اس غم کو نہیں نکال پاؤں گا۔ اب جلد سے جلد میں جا کر اسے وہاں سپرد خاک کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ اس مٹی کی امانت ہے۔ اس کی پر اس کا حق ہے۔ آپ اگر اس سلسلے میں ہماری مدد کرسکیں تو ہم مشکور ہیں۔''

''یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں با آسانی حل ہوجائے گا۔''

''تو بس پھر جلدی ہوسکے آپ اس کا بندوبست کردیں۔''

''آپ کب تک واپس جانا چاہتے ہیں۔''

''اگر دن میں بندوبست ہوجائے تو ہم رات کی فلائٹ سے نکل جائیں گے اور اگر آج رات کو ہوجائے تو ہم صبح تک پہنچ جائیں گے۔''

''ایسا تو لگتا ہے کہ ہمارے شہر سے بالکل ہی بیزار ہوگئے ہیں۔'' وکیل دھیرے سے مسکرایا۔

''یہاں کی فضا میں ہمیں ندیم کے خون کی مہک آتی ہے۔'' میں نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے ٹیبل پر رکھ دیا۔

''چند ایک روز تو لگ ہی جائیں گے کیونکہ۔'' وکیل کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ''خیر آیئے میرے ساتھ، میں نے آپ لوگوں کے لئے ایک تحفہ لے کر رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی آپ کے ساتھ ہی جائے گا۔'' وکیل اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے ایک لمحے کو سوچا۔ پھر میں نے بھی جگہ چھوڑ دی۔ باقی افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ وکیل ہمیں لے کر اپنی لائبریری نما اسٹڈی روم میں آگیا۔ اور جب میں دروازے سے اندر داخل ہوا تو بے اختیارے میرے قدم ٹھٹک کر رک گئے۔ سنسنی کی ایک تیز لہر میری ریڑھ کی ہڈی کو جھنجھوڑ گئی۔

دائیں ہاتھ صوفے کے درمیان کارپٹ پر ایک سیاہ آبنوسی لکڑی کا بنا ہوا تابوت پڑا تھا۔ کچھ دیر کے لئے میں مبہوت کھڑا رہ گیا۔ میری نظریں اسی تابوت سے چپکی ہوئی تھیں۔ بلاشبہ یہ وہی تابوت تھا جو میں نے اہرام کے اندر سے دریافت کیا تھا۔ نفران کا تابوت جس کی تلاش میں میں یہاں تک آگیا تھا۔ جس کی وجہ سے تمام کھڑاک پھیلا ہوا تھا۔ کئی لوگ ہلاک ہوئے تھے۔

ندیم عباس بھی موت کا شکار ہوگیا تھا۔ اسی تابوت

کے لئے، وکیل کے ہونٹوں پر ایک دلچسپ مسکراہٹ تھی۔ انعم اور وہ عورت البتہ بے تاثر چہرے لئے کھڑے تھے۔ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر تابوت کا ڈھکن الٹا دیا۔ اندر وہ ہی سنہری مجسمہ تھا۔ خوب صورت تیکھے نقوش کی مالک دوشیزہ کے ہونٹوں پر ایک سحر انگیز مسکراہٹ، سبھی آگے بڑھ آئے۔ شون کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''تحفہ پسند آیا شریم صاحب۔'' وکیل کی آواز پر میں چونک پڑا۔

''یہ یہاں تک کیسے پہنچا اسے یہاں کون لایا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''آیئے میں آپ کو پوری تفصیل بتاتا ہوں۔'' ہم پھر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ پھر وکیل نے اسی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''یہ سب اس کا کمال ہے۔ یہ میرا دلاور ہاؤس میں آخری پتہ تھا۔ دلاور کے زخمی ہونے کے بعد اب اس کی بھاگ دوڑ میں اور ہماری تلاش میں لگے رہے کہ اس کو وہاں موقع مل گیا اور اس نے دلاور کے بھائی کو جو عیاش طبیعت تھا۔ کسی نہ کسی طرح اپنے قابو میں کیا۔ اور یہ تابوت لے کر یہاں آ گئی۔ دلاور کے بھائی کو بھی اسی وجہ سے اس نے وہاں ہی مار دیا کہ کہیں بعد میں یہ کوئی خطرہ نہ پیدا کر دے۔ یہ اتنا بڑا کام اس نے اکیلے ہی کیا ہے۔''

''زبردست حیرت انگیز کتنے آرام اور سکون سے یہ تابوت یہاں تک لے آئی اور وہ بھی بنا خوف وخطر۔''

جبکہ وکیل بول پڑا۔ ''کاش یہ ایک حسن اتفاق رہا وگرنہ اگر ذرا سی بات بھی لیک آؤٹ ہو جاتی تو اس بیچاری کی لاش تک کا نہ پتہ چلتا کہ کدھر گئی۔''

''ہاں یہ بات تو ہے۔ قدم تو انتہائی خطرناک تھا۔ اب ہمیں جلد سے جلد یہاں سے لوٹ جانا چاہئے۔'' شون کی گھمبیر آواز ابھری۔ شاید وہ کچھ اور کہتے کہ نادر خشک لہجے میں بول پڑا۔

''آگے مزید کچھ مت کہیے گا۔ شون نے انتہائی ناگواری سے نادر کو گھورا مگر کچھ بولا نہیں۔

''اس تابوت کو یہاں سے موہن جوداڑو لے جانا اتنا آسان نہ ہوگا۔'' نادر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ''آپ لوگ تابوت لے جائیں میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ جب تک میں دلاور سے ندیم کے خون کا بدلہ نہیں لے لیتا۔''

اس بات پر وکیل بولا۔ ''اب ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دلاور زخموں کی تاب نہ لا کر مر گیا ہے۔'' یہ سن کر سب خوش ہوئے اور پھر وکیل نے کہا۔ ''آپ لوگ آرام کریں میں آپ لوگوں کے جانے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وکیل باہر نکل گیا۔

دو روز یونہی گزر گئے۔ تیسرے روز وکیل اپنے ساتھ تابوت بھی لے گیا تھا۔ پھر دو روز اور گزر گئے۔ اس کے بعد تیسرے یعنی چھٹے روز وکیل اچانک آیا۔ تو میں وکیل سے مخاطب ہوا۔ ''وکیل صاحب اب آپ بتائیں کہ آپ کے انتظامات کہاں تک پہنچے ہیں۔''

''سب کچھ فائنل ہے۔ میں نے ایک اسپیشل تابوت بنوایا ہے۔ نیچے مجسمہ اور اوپر باڈی اجازت نامہ بھی لے چکا ہوں۔ میں نے ہر طرح کے انتظامات کر دیئے ہیں۔ ہاں اگر کوئی غلطی ہو جائے تو معاف کرنا۔''

''وکیل صاحب یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ہمیں شرمندہ مت کریں۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کچھ رسمی سی باتیں ہوئیں، کاوش نے وکیل کو اس کے پیشے کا احساس دلا کر معاوضے کی بات کرنا چاہی تو وہ بھڑک اٹھا۔

وکیل نے اتنا کہا کہ ''انعم بھی سب کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔ اس کی بھی خواہش ہے کہ وہ ندیم کی آخری رسومات میں ساتھ رہے۔''

ہم نے بخوشی یہ بات قبول کر لی۔ وکیل نے پھر مسکراتے ہوئے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ہمارے پاسپورٹ نکال کر ہمارے حوالے کر دیئے۔ اور تابوت لے جانے کا اجازت نامہ بھی رات بارہ بجے کی فلائٹ تھی۔ حسب معمول رات کا کھانا ہم نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ پھر وکیل ہمیں ایئرپورٹ تک چھوڑنے آیا۔ کسی جذبے کسی خیال کے تحت انعم کی آنکھ سے آنسو چھلک

پڑے۔ پھر جب فلائٹ کی روانگی کا اعلان ہوا تو ہم اپنا سامان سنبھالے وکیل سے ملے اور اس کے بعد اس سے رخصت ہو لئے۔ جاتے جاتے وکیل نے کہا۔ ''شریم صاحب آپ سب کی ایک امانت میرے پاس ہے۔ پر مجبوری ہے کہ نہ بتا سکتا ہوں اور نہ دے سکتا ہوں۔ بس کچھ دنوں تک میں خود ہی آپ کی وہ امانت لے کر آؤں گا۔ اور ہاں جاتے ہوئے پھر ایک بار کہوں گا کہ ندیم کے خیال کو بھولنے کی کوشش کرنا۔

اور میں جلد ہی آپ کی امانت لے کر آؤں گا۔ اسے دیکھ کر آپ کی زندگی میں انقلاب آ جائے گا۔''

پھر ہم وکیل سے رخصت لے کر آگے بڑھ گئے۔ یکا یک طبیعت پر ایک بوجھل سی یاسیت طاری ہوگئی۔ نجانے وہ کون سے عوامل تھے۔ جن کے باعث دل دکھنے لگا تھا۔ جہاز میں سوار ہوتے وقت کلیجہ کٹ رہا تھا۔ مگر میں خود اپنی کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وکیل آخری وقت تک اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر جہاز حرکت میں آیا۔ اور کچھ ہی دیر بعد یہاں سے بلند ہوتا چلا گیا۔

ہم اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے چکے تھے۔ سو دوسرے ڈاکٹرز دونوں گاڑیاں لے کر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ تو علم نہیں کہ تابوت کی چیکنگ ہوئی کہ نہیں، بہرحال ہمیں انتظار کا شکار نہ ہونا پڑا۔

آصف ویگن لے کر آیا تھا۔ اور سفیان مرسڈیز، تابوت ویگن میں رکھوانے کے بعد ہم لوگ مرسڈیز میں بیٹھے۔ انعم بھی ساتھ تھی اور گاڑی موہن جوداڑو کی طرف چل پڑی۔ دماغ پر ایک سوگواریت سی طاری تھی۔ ہم سب افسردہ اور ملول تھے۔ جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے تھے تو ندیم عباس مسلسل ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں شاید ایسی کوئی مشین فٹ تھی جو مسلسل قہقہے اچھالتی رہتی تھی۔ لیکن آج ہمارے ساتھ وہ بھی تو واپس آیا تھا مگر کس صورت میں۔ ''ہاں ایک سرد اور اکھڑی ہوئی لاش کی صورت میں۔'' اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔ ہمارے کیا خود اس کے اپنے خواب وخیال میں نہیں آیا ہوگا۔ کہ اس کی واپسی اس انداز میں ہوگی۔

ہم اسپتال پہنچے تو جیسے ندیم کی موت کا علم ہوا۔ وہ رو دیا ہم نے سب کو یہی کہانی سنائی کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک کے باعث ہوئی ہے اور ہم جہاں گئے تھے کیوں گئے تھے۔ اس حقیقت کا علم ہمارے سوا اور کسی کو نہیں تھا۔ اور دوسرے دن دوپہر کے وقت اس کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ ہمارے ساتھ انعم بھی پیش پیش رہی۔ سوگوار سی ایک زندہ لاش کی طرح۔

نفران کا تابوت میں نے اپنے بنگلے میں رکھوا کر خواب گاہ کو لاک کر دیا تھا۔ اور خود کاوش کے بنگلے میں سونے لگا تھا۔

شون چلے گئے تھے اور کہہ گئے تھے۔ ''جب میری ضرورت پڑے تو بلا لینا۔''

اس ممی اس تابوت کی وجہ سے کافی قتل ہوئے تھے۔ اگر یہ بات باوعدہ میں قاری اسد سے نہ کیا ہوتا کہ نفران کو اس بدروح کی قید سے آزاد کرواؤں گا۔ تو ایسا کبھی نہ ہوتا۔ پر مجبوری تھی۔ جو لکھا ہوتا ہے وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ جس دن نفران کی ممی کو تابوت سے نکالا گیا تو اس دن کافی تباہی نہ ہو جائے۔

بہرحال کچھ عرصے بعد جب ندیم کا غم ہلکا ہوا تو ایک روز صبح ہی صبح میں نے شون کو فون کر دیا۔ دوسرے روز صبح ہی صبح شون آ پہنچے۔ میں اپنے بنگلے میں ہی موجود تھا۔ کاوش اور انعم بھی وہیں تھے۔ جبکہ نادر شون کو لے کر آ پہنچا تھا۔ ہم سب انعم سمیت بیڈ روم میں موجود تھے۔ دائیں ہاتھ صوفے کے پاس وہ تابوت موجود تھا۔

''شون صاحب میں اس مجسمے سے متعلق اسرار سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں اور اس کے لئے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت تھی۔''

''شوق سے میں تیار ہوں۔'' شون خوش دلی سے بولے۔ ''بلکہ مجھے تو شدت سے اس دن کا انتظار تھا۔''

چلیں پھر اللہ کا نام لے کر اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر تابوت کے پاس پہنچ گیا۔

(جاری ہے)

اجلا من

پرویز احمد دولو-میاں چنوں

شام کا چولھا جلا اور کھانے پکنے شروع ہوچکے تھے کہ اچانک دھڑا دھڑ گھر کی ساری دیواریں زمین بوس ہوگئیں، پھر چولھے میں شعلہ بھڑکا اور پھر ایک ہیولہ نمودار ہوا۔

جو لطف و مزہ نیک پارسا سچی اور پاکیزہ زندگی میں ہے وہ برائی میں نہیں..... حقیقی کہانی

"میں ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں ضرور ایسا ہوں جسے خوبصورت کہا جائے۔"

مجھ پر پہلی نظر پڑتے ہی بہت سی خوبصورت حسینائیں ایک بار دانتوں میں انگلی دبا کر اف اتنا "خوبصورت" کہنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔

غربت کی چکی میں پستے ہوئے ہوش کی نگری میں قدم رکھتے ہی پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لالے پڑ گئے' والدین کے ساتھ روزی روٹی کے چکر میں گرداب کی طرح گھومنے لگا۔

گاؤں کے چوک میں چھوٹی سی دکان بنالی۔

کام کا مجھے اتنا شوق تھا کہ دور سے ہی مطلوبہ نقص پہچان کر اشیاء ٹھیک کرنا شروع کردیتا بیچ چوراہے پر دکان تھی بہت سی دوشیزائیں اسی چوک سے گزر کر ادھر ادھر رشتے داروں کے پاس جاتیں یا دکانوں سے سودا سلف خریدتیں۔

ان کے گزرنے سے کتنی ہی دید کی پیاسی نگاہیں شکاری گدھوں کی طرح نوچنے کی کوشش کرتیں جب سے میں نے دکان بنائی تھی، من چلے دوشیزاؤں کے لیے چشم براہ ہوتے اور دوشیزائیں چور نگاہوں سے میرے چہرے کے طواف کرنے لگیں۔

پھر ایک وقت آیا کہ لڑکیاں مجھ پر یوں ٹوٹ کر برسنے لگیں جیسے شدید بارش میں اولے پڑتے ہیں بچوں کے ہاتھوں دوپہر اور شام کو کڑھائی والے رومالوں میں بندھے کھانے دکان پر آنے لگے' بلے انڈے' گڑ کی پنجیری' گاجر حلوہ' شہر سے منگوائی گئی برفی بھی کثیر مقدار میں ملنے لگی' مقابلے میں کھانے آنے لگے' میری دکان پر شاگردوں کی طرح صبح سے شام گئے تک بیٹھنے والے پیچو اور ریاض کی چاندی ہوگئی۔

طرح طرح کے مرغن اور لذیذ کھانے کھا کھا کر میرا اور کھانا بھیجنے والوں کا شکریہ ادا کرنے لگے مجھے پانے کے لیے لڑکیوں کے درمیان مقابلہ بازی شروع ہوگئی' ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے لڑکیاں مختلف حربے آزمانے لگیں۔

غریب کی محبت بھی اس کی طرح ویران' اجڑی اور بیابان ہوتی ہے' ایک دن گاؤں کی ملکہ کا وہاں سے گزر ہوا' میری دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کی گاڑی پنکچر ہوگئی۔

نزدیک ترین دکان میری تھی' ڈرائیور نیچے اترا اور مجھے ٹائر کھولنے کا حکم دیا' ٹائر اتار کر میں پنکچر لگانے میں مصروف تھا کہ ملکہ گاڑی سے باہر آگئی' میرے قریب

پہنچتے ہی میرے چہرے کی رعنائیوں میں کھوگئی' اس کی محویت اس وقت ٹوٹی جب میں پنکچر لگا کر فارغ ہوا۔

ملکہ دکان سے تو چلی گئی مگر مجھے پانے کے لیے کتنے ہی منصوبے ذہن میں ترتیب دینے لگی، اگلے دن حویلی سے بلاوا آگیا کہ "چھوٹی مہارانی نے بلایا ہے بائے سائیکل خراب ہے اسے ٹھیک کرنا ہے" بائے سائیکل تو بہانہ تھا مقصد مجھے اپنے پیار کے جال میں مقید کرنا تھا۔

حویلی میں خوب آؤ بھگت کی گئی' پیار و محبت کے قصے کہانیاں سنائے گئے' پیار نہ کرنے کی صورت میں گاؤں بدر کرنے اور چہرے پر تیزاب پھینکنے کی دھمکیاں دی گئیں۔ اونچی حویلی' لمبی چوڑی جائیداد اور گاڑیوں کی قطار کا رعب ڈالا گیا۔

جن غریب لڑکیوں کو اپنے دل کے مکان میں مہمان بنا چکا تھا جب دھمکیاں اور لالچ کی بازگشت ان کے کانوں تک پہنچی تو کئی لڑکیوں نے خودکشی کرنے کی دھمکی دی' کئی منت سماجت اور پیار کے واسطے دے کر ہر ممکن حویلی سے دور رکھنے کا تردد کرنے لگیں' لیکن اس سماج میں بڑے لوگوں کا دل جس چیز پر آجاتا ہے وہ ان کو آسانی سے نہ ملے تو زور زبردستی کرکے چھین لیتے ہیں' کیونکہ معاشرے کے مجبور لوگوں سے نمٹنے کے تمام وسائل اور سہولتیں ان کی دہلیز کی اونی' کنیز ہوتی ہیں۔

ملکہ نے مجھے دولت کے ترازو میں تولنے کی کوشش کی' جب میں کسی طور اپنے آپ کو بیچنے کے لیے تیار نہ ہوا تو اس نے وہ طریقہ استعمال کیا کہ مجھے جان بچانی مشکل ہوگئی' اور آخر کار مجبور ہوکر مجھے زندگی کی بھیک کے لیے حویلی کے دروازے پر دستک دینی پڑی، ایک دن دکان میں کام کررہا تھا کہ اچانک آگ بھڑک اٹھی جس نے میرا سب کچھ خاکستر کردیا۔

سامان کے ساتھ پکی دیواریں فوم کی طرح جل کر جھڑنا شروع ہوگئیں' زندگی کا کل اثاثہ یہی دکان تھی' نقصان پر سخت پریشان اور رو رہا تھا کہ حویلی کا ملازم ہزار روپے والے نوٹوں کی گڈی لے کر آگیا۔

"مالکن نے بھیجا ہے' انہیں آپ کے نقصان کا بہت افسوس ہے' مزید امداد کے لیے آپ کو حویلی بلا رہی ہیں"

میرا سب کچھ جل چکا تھا' نوٹ ہاتھ میں آتے ہی مجھ میں زندگی کی خوشیوں نے ڈیرے ڈال لیے' غیبی امداد پر بہت خوش ہوا' اور مالکن کا شکریہ ادا کرنے حویلی پہنچ گیا۔

مالکن پہلے ہی میری منتظر تھی' مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں رنگوں کی بہار اتر آئی' تنہائی پاتے ہی ایک دوسرے میں کھوگئے' پیار و محبت کی "پینگوں" میں

ہلکورے لینے لگے‘ پھر تو آئے روز میں حویلی کے چکر لگانے لگا‘ ملکہ مجھ سے خوش اور میں اس سے خوش ہمارے پیار و محبت کی داستان میری چچازاد زینب جو میری منگیتر بھی تھی اس کی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

دو چار بار اس نے مجھے حویلی جانے سے منع کیا مگر مجھے تو نشہ لگ چکا تھا‘ واپسی پر ہمیشہ روپے لے کر لوٹتا تھا‘ اس لیے زینب کو کوئی اہمیت نہ دی‘ زینب نے مجھ سے مایوس ہو کر زندگی سے روٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔

گندم میں رکھنے والی زہریلی گولی کھا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کرلیا اور لمحوں میں اس جہان سے کوچ کر گئی۔ اس کی المناک موت نے مجھے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا‘ دل کو ایسا روگ لگا کر میں نے حویلی جانے کو زینب کی موت کی وجہ قرار دیا‘ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حویلی جانے سے توبہ کرلی۔

دو چار دن جب حویلی نہ گیا تو اگلے دن شام کو ملازم بلانے آ گیا‘ مگر میں نے جانے سے صاف انکار کردیا‘ اور ملکہ کو اپنی خوشیوں کا قاتل قرار دیا میرا پیغام ملتے ہی ملکہ آپے سے باہر ہوگئی‘ گاؤں کے ”کمیں“ کی یہ جرأت کہ چودھرانی کے کہنے پر حویلی نہ آئے۔

اگلے دن شام کے وقت ماں کھانے کی تیاری میں مشغول تھی کہ کچے مکان کی دیواریں زمین بوس ہوگئیں۔

سب سامان نیچے دب کر ناقابل استعمال ہوگیا‘ ساری جمع پونجی مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی‘ اڑوس پڑوس کے لوگ سخت حیران اور افسوس کرنے لگے‘ اگلی صبح جب میں نے اٹھنا چاہا تو پاؤں نے حرکت کرنے سے انکار کردیا‘ سوئے ہوئے میری آہیں بلند ہونے لگیں۔

کچی اینٹوں کو جوڑ کر چولہا بنایا گیا اوپر توا رکھ کر جب ماں روٹی پکانے لگی تو ”توے“ سے روٹی کی بجائے دھوئیں کا مرغولہ اٹھا اور آسمان کی طرف جانے لگا‘ اس دھوئیں سے آگ کے شرارے نکل کر بارش کی مانند برسنے لگے‘ جن کی وجہ سے گھر کا صحن تپنے لگا‘ پہنے ہوئے کپڑے روئی کی طرح جلنے لگے‘ بڑی مشکل سے ان کو اتار کر دور کیا، اس دوران تمام جسم جل گیا‘ درد سے برا حال ہوگیا۔

اچانک پریشانیوں نے یوں گھیرا کر نجات کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آرہا تھا ملکہ سے مجھے سخت نفرت ہوچکی تھی‘ وہ ایک خود غرض‘ ہوس پرست عورت تھی‘ جو صرف حرص کی پجاری تھی‘ پانے کے لیے لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنا فخر محسوس کرتی۔

پپو اور ریاض نے بھی مجھے کئی بار ملکہ کی دوستی سے منع کیا تھا ان کا کہنا نہ ماننے کی وجہ سے میں ان سے ہاتھ دھو چکا تھا۔

وہ نوجوان شریف، سیدھے سادے‘ سچے اور مخلص انسان تھے‘ برائیوں سے خود بھی دور رہتے‘ مجھے گناہوں کی زندگی سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جب میں نہ مانا تو چھوڑ کر چلے گئے‘ کیونکہ بدنامی کی دلدل میں میرے ساتھ غرق نہیں ہونا چاہتے تھے‘ عشق کی مات کھانے پر جب ملکہ نے مجھے تگنی کا ناچ نچایا اور میرا سب کچھ جلا کر برباد کردیا تو یہ دوست ایک بار پھر رحمت کا فرشتہ بن کر نازل ہوئے۔ ریاض کے پیر و مرشد باباجی حسین شاہ کے پاس مجھے لے گئے جب میں ان کے دربار میں پہنچا تو طبیعت سخت خراب ہوگئی‘ غشی کے دورے پڑنے لگے‘ پہنے ہوئے کپڑوں میں آگ لگ گئی‘ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے‘ سر کے بال پیتل کی تاروں کی طرح تپ کر سر کی جلد کو جلانے لگے‘ چمڑے کے جوتے لوہے کی چادر کی طرح تپ کر پاؤں جلانے لگے سخت اذیت میں مبتلا تھا کہ اس دوران باباجی گھر سے تشریف لائے‘ ان کے آنے کی دیر تھی کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں معطر فضاؤں میں اڑ رہا ہوں‘ ہر طرف خوشبو کے جھونکوں نے ماحول کو خوابیدہ کردیا‘ گرمی کے عذاب سے نجات مل گئی‘ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا‘ ہشاش بشاش محسوس کرنے لگا۔

تکلیف یوں دور ہوئی جیسے مجھے آج تک چھینک بھی نہ آئی ہو‘ انتہائی عاجزی‘ انکساری اور ہوش و حواس سے باباجی کے پاؤں چھوئے‘ ان کی زیارت

ہمدردی کا صلہ

ایک چھوٹے سے شہر میں ایک غریب لڑکا اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے اسکول واپسی پر گھر گھر جا کر چیزیں فروخت کرتا تھا۔ ایک دن اس کی کوئی بھی چیز فروخت نہیں ہوئی۔ بھوک کی وجہ سے اس کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ لیکن وہ کسی سے کھانے کے لیے کچھ مانگنے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک گھر پر اس نے دستک دی تو دروازہ ایک نوجوان عورت نے کھولا۔ اس نے لڑکے کی شکل دیکھ کر بھانپ لیا کہ وہ بھوکا ہے۔ خاموشی سے بغیر کوئی سوال کیے لڑکے کو دودھ کا گلاس تھما دیا۔ دودھ پی کر لڑکے نے اس کی قیمت دریافت کی تو عورت نے کہا۔ ”ہمدردی اور مہربانی کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔“ لڑکا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ اس بات کو ایک عرصہ گزر گیا۔ وہ عورت ایک شدید خطرناک قسم کی بیماری میں مبتلا ہوگئی اس کی بیماری کسی کے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ شہر کے ایک بڑے ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور ایک نظر میں پہچان لیا۔ اس نے پوری توجہ سے اس کا علاج کیا۔ عورت کی جان بچ گئی۔ ڈاکٹر نے اسپتال والوں سے کہا۔ اس عورت کا بل اسے بھجوا دیا جائے۔ اسپتال والوں نے بل بھجوا دیا۔ ڈاکٹر نے بل کے ایک کونے پر کچھ لکھا اور واپس اس عورت کو بھیج دیا۔ جب بل کا لفافہ اس عورت کو ملا تو اس نے ڈرتے ڈرتے لفافہ کھولا اس کا خیال تھا کہ اس بھاری بل کی ادائیگی کے لیے اسے اپنے اثاثے فروخت کرنا ہوں گے۔ بل پر ایک جملہ لکھا تھا۔ مکمل ادائیگی۔ ایک گلاس دودھ، زندگی میں بےلوثی سے کیا گیا کوئی بھی کام کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتا۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں ہر اچھا یا برا اس کا بدلہ جلد یا دیر ہمیں ضرور ملتا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے بغیر کسی صلے کی توقع یا تمنا کے کسی کی خوشی کے لیے کسی کی ہمدردی کے لئے کام کیا جائے۔

(انتخاب۔ شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

سے آنکھوں کو ٹھنڈا کرنے لگا۔

صحت مند‘ خوش باش دیکھ کر پپو‘ ریاض اور میرے گھر والے سخت حیران تھے۔

باباجی نے دست شفقت سر پر پھیرا تو تاثیر روح تک اتر گئی‘ دل کی دنیا ہی بدل گئی‘ آنکھوں کے نور نے چودہ طبق روشن کردیئے۔

اپنے آپ کو کسی اور ہی دنیا میں موجود پایا‘ جہاں ہر طرف خوشیاں‘ بہاروں کے رنگ پیار و محبت کے چمکتے جگنو اور رشتوں کی مالا میں بنے پیارے عزیز تھے اور میں ان کے درمیان خوش و خرم ان کے پیار و محبت سے مستفید ہو رہا تھا۔

جبکہ دوسری طرف ملکہ گھر میں پیچ و تاب کھا رہی تھی‘ جس نجومی اور عامل سے تعویذ لئے اور مجھ پر جادو کروایا تھا‘ بھیگی بلی بنا اس کے پاؤں میں پڑا تھا‘ خوف و ہراس سے تھر تھر کانپ کر ملکہ کو باباجی کے کرامات سے مستفید ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔

”جو بھی باباجی کے دربار میں گیا ہے‘ برائی اس کے وجود سے یوں دھل جاتی ہے جیسے صابن سے کپڑا صاف ہو جاتا ہے‘ اگر میں نے مزید جادو ٹونہ کیا تو نہ آپ رہیں گی اور نہ ہی میں، ان کی ذات بہت مقدس‘ مہربان اور رحمدل ہے‘ آپ سے گزارش کرتا ہوں‘ برائیوں کا راستہ چھوڑ کر راہ راست پر آ جاؤ، اللہ تعالیٰ کے محبوب کے دربار میں جاؤ گی تو ہر قسم کی برائی سے بچ جاؤ گی اور جو لطف و مزہ نیک‘ پارسا‘ سچی اور پاکیزہ زندگی میں ہے وہ برائی کی زندگی میں نہیں۔

برائی سے تن اور من دونوں پلید ہو جاتے ہیں اور ان پلید اجسام کا ٹھکانہ جہنم کی بھڑکتی آگ ہے۔

اس آگ سے بچ جاؤ، سکھ کے لئے جتنی قیمت چکانی پڑے چکا دو اور سکھ خرید لو۔ ملکہ جی اپنا من اجلا کرلو۔“

عامل جادوگر کی بات ملکہ کی سمجھ میں آ گئی۔

اگلے دن وہ بھی باباجی کے دربار میں پہنچ کر من کی پلیدی دور کرنے لگی۔

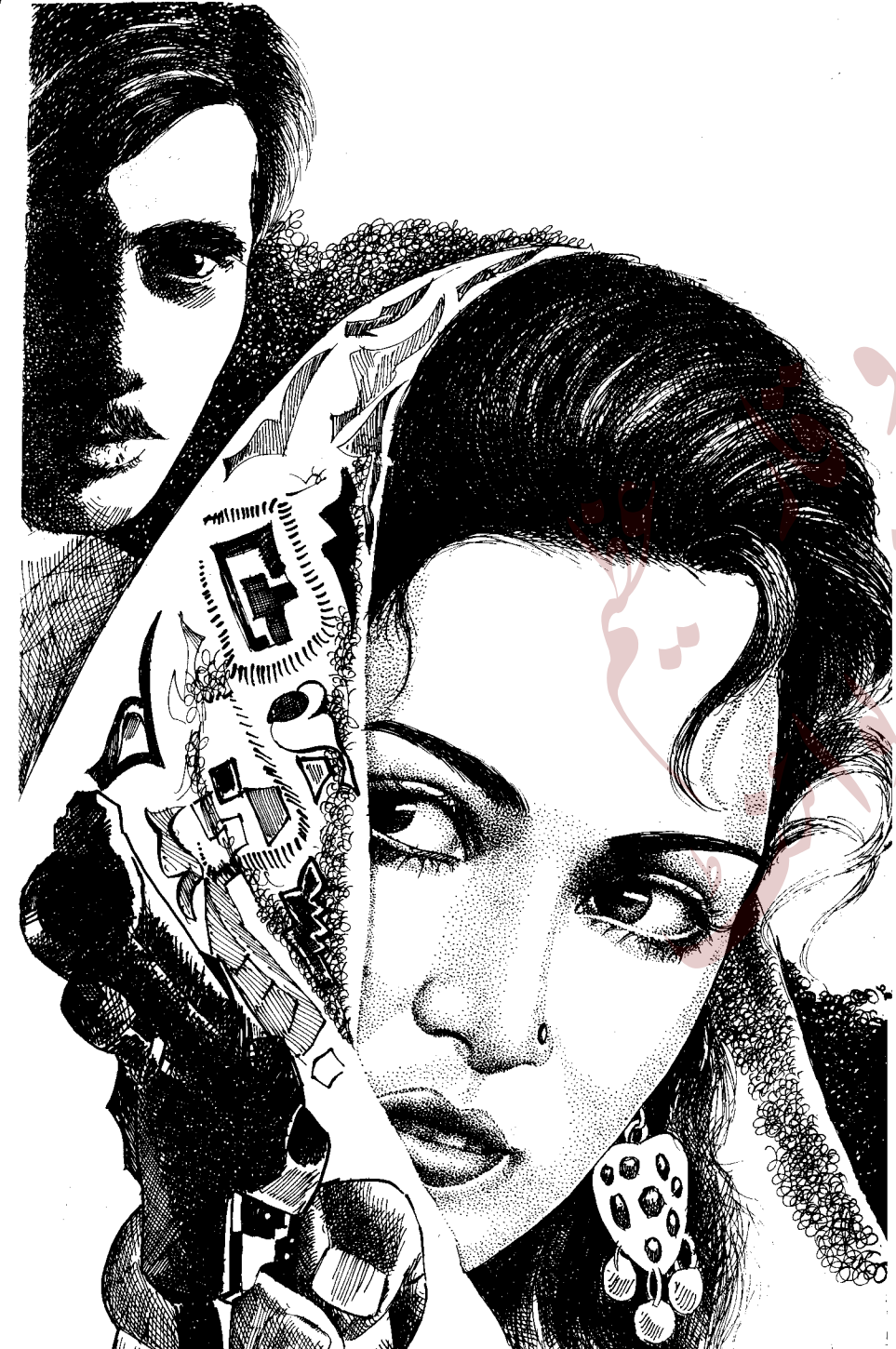

عیش محل

شہزادہ چاند زیب عباسی

آخری حصہ

خود غرضی اور مطلب پرستی کی بھینٹ چڑھتی رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جنم لیتی جسم و جاں و رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، پل پل لرزہ براندام و سہما دینے والی تاریخ کے جھروکوں سے جھلمل کرتی اپنی نوعیت کی جادوئی دنیا کی ناقابل یقین شاہکار کہانی جو کہ پڑھنے والوں کو ہر ایک لفظ پر چونکا کر رکھ دے گی۔

دل و دماغ کو مبہوت کرتی کہانی جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی

گولی ساجد خان کے پسٹل والے ہاتھ پر لگی اور پسٹل اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ گولی لگنے سے ساجد خان کی ہتھیلی میں سوراخ ہو چکا تھا۔ جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک لمحوں میں ہوا تھا۔ تابش نے اٹھتے ہوئے شانی کی کنپٹی پر پسٹل رکھ دیا جبکہ حسین ساجد خان کی پشت پر جا پہنچا اور دائیں بازو سے اس کی گردن کے گرد شکنجہ کس کر پسٹل کی نال اس کی کنپٹی سے لگادی۔ کمرے میں ایک منٹ کے اندر ہی تین افراد موت کے گھاٹ اتر چکے تھے۔ گولیاں چلنے کی آواز سے کمرہ گونج اٹھا تھا۔ اس کا نتیجہ جلد ہی نکلا اور دو رائفل بردار اندر داخل ہوئے۔ جنہیں تابش نے پہلی ہی فرصت میں اڑا دیا۔

''تم انہیں دھوکے سے یہاں کیوں لائے؟'' ساجد خان نے غصے سے شانی کی طرف دیکھا۔

''اس میں شانی کا قصور نہیں، یہ تو خود موت کے منہ میں ہے۔ اس کے جسم سے ریموٹ کنٹرول بم بندھا ہوا ہے۔ اب تم بھی گن پوائنٹ پر ہو۔ ہم آج سر پر کفن باندھ کر تمہیں لے جانے آئے ہیں۔ چاہے اس کے لئے ہمیں یہاں لاشوں کے ڈھیر لگانے پڑیں۔'' حسین نے سفاک لہجے میں کہا اور ساجد خان کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔

کوریڈور میں جاتے ہی دو رائفل بردار ان کے سامنے آگئے اور ساجد خان پریشانی کو گن پوائنٹ پر دیکھ کر وہ بھی ششدر رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کوئی ان کے ٹھکانے میں گھس کر ان کے گینگ لیڈر کو اس طرح گن پوائنٹ پر لے جا سکتا ہے۔

تابش اور حسین نے ان دونوں کی گردن کے گرد شکنجے کس رکھے تھے اور ان کی پشت کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اگر وہ گولی چلاتے تو گولی ساجد خان اور شانی کو ہی لگتی۔ رائفل بردار تذبذب میں تھے کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ اس سچویشن کا فائدہ تابش اور حسین نے اٹھایا اور چشم زدن میں پسٹل کی نال سیدھی کر کے ٹریگر دبا دیا۔ دونوں گولیاں ٹارگٹ پر لگیں۔ اور دونوں رائفل برداروں کی پیشانی میں سوراخ ہو گئے۔ یہاں سے وہ ان دونوں کو دھکیلتے ہوئے آگے بڑھے رائفل برداروں کی لاشیں پھلانگتے ہوئے انہوں نے رائفلیں بھی اٹھالی تھیں۔ ''ساجد خان تم نے اس روز ذکر کیا تھا کہ تم نے اپنے ٹھکانے کے تالاب میں آدم خور مچھلیاں پال رکھی ہیں۔ مجھے اس تالاب تک لے چلو میں مچھلیاں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' حسین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

شانی اور ساجد خان جان بچانے کی خاطر کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے اشاروں پر چل رہے تھے۔ وہ انہیں لئے ہوئے ایک محرابی دروازے کے سامنے پہنچے۔ یہاں بھی دو رائفل بردار موجود تھے۔ جنہیں تابش نے ایک ہی برسٹ میں مار گرایا۔ اور محرابی دروازے سے گزر کر وہ ہال میں پہنچے۔ یہاں ایک خاصا گہرا تالاب بنا ہوا تھا۔ تالاب کے کناروں کے گرد تین فٹ کی گرل نصب تھی۔ تالاب کا پانی گہرا ہونے کی وجہ سے مچھلیاں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ بقول ساجد خان کے آدم خور مچھلیاں پانی کی گہرائی میں موجود ہوتی ہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو تالاب کی گرل کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اور ان کی طرف رائفلیں تان لیں۔

''ساجد خان اور شانی تمہارے دونوں طرف موت ہے۔ یا تو گولیوں سے مرو گے یا آدم خور مچھلیوں کی خوراک بنو گے۔'' حسین نے سفاک لہجے میں کہا، اس دوران تابش محرابی دروازے کو اندر سے لاک کر چکا تھا۔

''جب مرنا ہی ہے تو میں اس بیلٹ سے چھیڑ چھاڑ کروں گا۔ میرے ساتھ تم لوگ بھی مرو گے۔'' شانی ہذیانی لہجے میں چلایا۔

''بے وقوف آدمی یہ اصل کے مشابہ نقل ریموٹ بم ہے۔ ہم نے صرف تمہیں اپنے اشاروں پر نچانے اور ڈرانے کے لئے یہ ڈرامہ رچایا تھا۔'' حسین ہنسا۔

شانی کا خون کھول اٹھا۔ گویا ان دونوں نے اسے بے وقوف بنا کر استعمال کیا تھا۔ اور اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مگر اب وہ سوا دل ہی دل میں کڑھنے اور بے بسی سے دانت پیسنے کے سوائے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے رائفلیں سنگل موڈ پر کر لیں۔ ''شانی اور ساجد خان اذیت ناک موت سے بچنا چاہتے ہو تو تالاب میں چھلانگ لگا دو۔'' حسین نے سفاک لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' وہ چلائے اور ایک قدم آگے بڑھایا، ان دونوں نے بیک وقت ٹریگر دبایا۔ تو دونوں کے دائیں گھٹنوں میں گولی لگی۔ وہ چیختے ہوئے نیچے گر گئے۔

تابش اور حسین چند قدم آگے بڑھے۔ ''چلو جلدی سے تالاب میں چھلانگ لگاؤ ورنہ تمہارا دوسرا گھٹنہ بھی بیکار ہو جائے گا۔'' تابش نے ٹریگر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ حسین نے بھی ساجد خان کو یہی دھمکی دی۔

شانی اور ساجد خان کے چہرے موت کے خوف سے زرد پڑ چکے تھے۔ موت بانٹنے والے خود ان سے زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔ ادھر شاید ان کے کچھ کارندے محرابی دروازے کے باہر موجود تھے جو کہ ان کی چیخ و پکار سن کر اس مضبوط دروازے کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تابش اور حسین کو سنگین نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ادھر شانی اور ساجد خان کے گھٹنوں سے بہنے والا خون فرش کو رنگین کر رہا تھا۔

تابش اور حسین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو سمجھایا، آگے بڑھ کر چیختے چلاتے ساجد خان کو حسین نے اٹھا کر سر سے بلند کیا۔ ادھر شانی کے ساتھ بھی تابش نے یہی سلوک کیا پھر ان دونوں نے تالاب کے قریب جا کر ان دونوں کو تالاب کے پانی میں پھینک دیا چھپاکے کی آواز کے ساتھ پانی میں ہلچل مچی شاید آدم خور مچھلیوں نے انسانی لہو کی بو پا لی تھی۔

ہال ساجد خان اور شانی کی چیخوں سے گونج اٹھا۔ اور تالاب کا پانی ان کے خون سے سرخ ہونے لگا۔ ساجد خان نے دشمن کو اذیت ناک موت دینے کی غرض سے آدم خور مچھلیاں نہ جانے دنیا کے کون سے کونے کے سمندر سے منگوائی تھیں۔ اور اب خود ان کی خوراک بن چکا تھا۔ ادھر محرابی دروازہ ٹوٹنے ہی والا تھا کہ عمارت کے باہر گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر دو طرفہ فائرنگ ہونے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ دو پارٹیاں آپس میں برسر پیکار ہیں۔ لرزہ خیز انسانی چیخیں بھی سنائی دیتی رہیں پھر محرابی دروازے کے باہر گولیاں چلنے کی آوازیں اور چیخیں گونجیں اس کے ساتھ ہی باہر سے زاہد خان کی آواز گونجی۔ ''حسین دروازہ کھولو۔''

''یہ یہاں کیسے آیا؟'' حسین بڑبڑایا۔ تابش نے دروازہ کھول دیا۔

باہر زاہد خان اور نصف درجن رائفل بردار موجود تھے۔ ''تم کیا سمجھتے ہو میں تم سے غافل تھا۔ میرا ایک کارندہ دور ہی دور سے تمہاری نگرانی کر رہا تھا۔ جب تم شانی کی طرف گئے تو اس نے مجھے اطلاع دے دی تھی مگر مجھے پہنچنے میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ اس دوران تم ساجد خان کے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ بہر حال ساجد خان کے تمام کارندے مارے جا چکے ہیں۔ ساجد خان کو شاید تم لوگوں نے مار دیا ہے۔'' زاہد خان نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''وہ دونوں آدم خور مچھلیوں کی خوراک بن چکے ہیں۔'' حسین نے اطمینان سے جواب دیا۔ باہر زاہد خان کی پراڈو جیپ موجود تھی۔ وہ اس کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔ چند روز مہمان نوازی میں گزارنے کے بعد انہوں نے زاہد خان سے جانے کی اجازت طلب کی جو انہیں بڑی مشکل سے ملی۔

وہ خود انہیں اپنی جیپ پر پہلے پارس کی قبر پر لے گیا۔ جہاں حسین نے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کیا، یہ اس کے بیٹے اس کے لخت جگر کی قبر تھی۔ جو باپ کا نافرمان تھا۔ اندھیروں کا مسافر بنا۔ اور پھر زندگی سے محروم ہو گیا۔ سچ ہے ماں باپ کا نافرمان دنیا اور آخرت دونوں میں خوار رہتا ہے۔ اس کے باوجود حسین اسے یاد کر کے روتا رہا۔

پھر اپنے وطن آنے کے لئے دونوں تیار ہوئے تو زاہد خان نے انہیں الوداع کہا۔ وہ جیپ کے ذریعے واڑنا بارڈر پہنچے تو وطن کی سوندھی مٹی کی خوشبو پاتے ہی انہوں نے بے قابو ہو کر زمین چومی اور سجدہ شکر ادا کیا۔

ایک روز آرام کے بعد شاداب نگر کا رخ کیا اور وہاں ایک ہوٹل میں کرائے پر کمرہ حاصل کیا۔ یہ ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ جو فیروز پور سے ملحق تھا۔ اس وقت وہ ہوٹل کے کمرے میں موجود باتیں کر رہے تھے کہ تابش نے کہا۔ ''حسین بھائی آپ کیوں میری خاطر خود کو خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ یہ جنگ میری ہے اور مجھے ہی لڑنے دیں۔''

''ایک طرف بھائی کہہ رہے ہو اور دوسری طرف غیروں والی بات کر رہے ہو۔ غیر ملک میں میری خاطر تم بھی تو ساجد خان سے ٹکرا گئے تھے۔ اس وقت تو میں نے بھی تمہیں نہیں روکا اور نہ ہی اسے تمہارا احسان جانا کہ یہ دوستی کا فرض تھا۔'' حسین نے اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تو تابش شرمندہ ہو گیا۔

''حسین بھائی اب جب کہ میں جان چکا ہوں کہ میرے والدین کا قاتل شکرا ہے تو میں اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' تابش نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے لیکن اسے کیفر کردار تک پہنچانے کے لئے ہمیں جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا۔ اسے شانی کی عبرت ناک موت کی اطلاع بھی مل چکی ہوگی اور شاید وہ یہ بھی جان چکا ہو کہ اس کی موت میں تمہارا ہاتھ ہے ایسی صورت میں وہ کسی درندے کی طرح بپھرا ہوا ہوگا۔ میری تو خیر ہے وہ مجھے جانتا تک نہیں۔ خطرہ صرف تمہارے لئے ہے۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں ڈرا رہا ہوں۔ میرا اصول ہے کہ دشمن کو للکار کر مارو۔ ویسے بھی لڑائی میں جس کا حوصلہ اور اسٹمنا مضبوط ہوتا ہے جیت اس کا نصیب ہوتی ہے۔ مجھے میدان جنگ میں بڑے بڑے زخم بھی لگے مگر میں نے مرہم پٹی کے بجائے انہیں یونہی کھلا رہنے دیا۔ اور کچھ روز بعد زخم خود بخود ٹھیک ہو گئے۔ زندگی میں کچھ بننا ہے تو دکھ درد اور تکلیف سہنا سیکھو۔ انسان جب ان دکھوں درد اور تکلیف کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتا تو اسے درد اور تکلیف میں بھی راحت ملتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تو سنا ہی ہوگا۔ تھر کے ریگستانوں میں بھی ہماری طرح کے انسان رہتے ہیں۔ جہاں سورج آگ برساتا ہے۔ اور ریت انگاروں کی طرح دہکتی ہے۔ مگر وہاں رہنے والے اس گرمی کے عادی ہوتے ہیں انہیں یہ شدید گرمی محسوس نہیں ہوتی۔

برفانی سمندر میں بھی جاندار رہتے ہیں جو اس یخ بستہ پانی میں سانس لیتے ہیں۔ تم نے حبس دم کے ماہروں کے بارے میں سنا بھی ہوگا۔ میں نے خود ایک بار ایک حبس دم کے ماہر کو دیکھا تھا۔ جسے سات روز قبر میں دفن رکھا گیا سات روز بعد اسے جب اس قبر سے

نکالا گیا تو نہ صرف وہ صحیح سلامت تھا بلکہ صحت مند بھی تھا۔ حالانکہ ان سات دنوں میں اس نے نہ تو کچھ کھایا اور نہ ہی پانی پیا۔

میں اکثر برفانی علاقوں میں ڈیوٹی کے دوران محض ایک پتلی قمیض پہن کر گھومتا تھا۔ تب بھی مجھے سردی نہیں لگتی تھی۔ میں زندگی بھر نرم بستر کے بجائے فرش پر سویا ہوں۔ میرے ساتھی مجھے آئرن مین کہتے تھے۔''

حسین اپنی زندگی کے تجربات بتانے کے ساتھ ساتھ اسے سمجھانے لگا۔

بالآخر ان کے درمیان یہی طے پایا کہ وہ فیروز پور کے جنگلات کے راستے سے فیروز پور میں رات کے اندھیرے میں داخل ہوں گے اور شیش محل میں جا کر بے خبری میں شکرا کی گردن دبوچ لیں گے۔

دوسرے روز شام کو وہ فیروز پور کے پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے اس پہاڑی علاقے کو پار کر کے وہ جنگل میں داخل ہو جائے۔ ان کی پشت پر سفری بیگ موجود تھے جن میں آتشیں ہتھیاروں کے علاوہ دیگر لوازمات بھی موجود تھے۔ ان سنسان علاقے میں سرِشام ہی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس لئے ان کے ہاتھوں میں ٹارچیں موجود تھیں۔ ویسے بھی راستہ تنگ اور ناہموار تھا۔ کہیں کہیں سینکڑوں فٹ گہری کھائیاں تھیں ذرا سی غفلت انہیں زندگی سے محروم کر سکتی تھی۔

وہ اس پہاڑی سلسلے کو پار کر کے اس جنگل میں داخل ہو گئے۔ انہیں شیش محل تک پہنچنے کے لئے اس جنگل سے گزرنا تھا۔ یہ دشوار راستہ انہوں نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ یہاں سے وہ شکرا کے کارندوں کی نظر میں آئے بغیر با آسانی شیش محل تک پہنچ جاتے۔ وہ اس دشوار گزار پہاڑی راستے پر سفر کر رہے تھے۔

اچانک ان کے سامنے ایک غار کا دہانہ آ گیا۔

'یار یہ تو کوئی غار معلوم ہوتا ہے۔ آؤ ذرا دیکھیں تو سہی اس غار میں کیا ہے۔'' ایڈونچر پسند حسین نے فطری تجسس کے تحت کہا۔ اور غار میں قدم رکھا۔

ابھی انہوں نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ ٹارچ کی روشنی میں انہیں تربوز سے مشابہ کوئی چیز نیچے پڑی دکھائی دی۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو ان کے دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گئے یہ کٹا ہوا انسانی سر تھا۔ جس سے خون اب تک ٹپک رہا تھا۔ ''حسین بھائی واپس چلو۔ یہ نہ جانے کس بلا کا مسکن ہے۔ جس کا شکار یہ شخص بنا ہوگا۔'' تابش نے خوف سے لرزتے ہوئے کہا۔

''تابش بزدلوں والی بات مت کرو اب تو میں اس غار کو دیکھ کر ہی رہوں گا۔'' حسین نے مضبوط لہجے میں کہا۔ تو تابش کو اس کے ساتھ آگے بڑھنا ہی پڑا۔

راستے میں انہیں اس طرز کے کٹے ہوئے انسانی سر دکھائی دیئے۔ ان میں بہت سی کھوپڑیاں پرانی اور بوسیدہ تھیں۔ غار میں عجیب سی بساند تھی۔ ان کا جی متلانے لگا۔ مگر وہ دل کڑا کر کے مسلسل آگے بڑھتے رہے۔ تابش مسلسل آیت الکرسی کا ورد کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک کشادہ جگہ جا پہنچے۔ جہاں ایک ہیبت ناک بت ایستادہ تھا۔ خون میں بھیگا ہوا بت اور انسانی لہو کی بو اور بت کے قدموں میں پڑے انسانی سر دیکھ کر تو تابش کے ساتھ ساتھ حسین کے بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

پھر ٹارچ کی روشنی میں انہیں ایک اور بھی دل دہلانے والا منظر دکھائی دیا۔ یہ مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی انسانی لاش تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کٹے ہوئے انسانی اعضاء سے لہو کی ایک بوند بھی دکھائی نہ دے رہی تھی، اور جہاں یہ کٹے ہوئے انسانی اعضاء پڑے تھے وہ جگہ بھی صاف ستھری تھی۔

پھر اچانک ہی عجیب قسم کی آوازیں غار میں گونجنے لگی تھیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ اس خوفناک شور شرابے سے ان کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے پھر ان دونوں نے اپنی زندگی کا حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ کٹے ہوئے پاؤں خود بخود ٹانگوں سے جڑ گئے۔ پھر انسانی سر متحرک ہوا اور گردن سے جڑ گیا۔

انہوں نے ڈر کر نظریں موڑیں تو ایک اور

خوفناک اور حیرت انگیز منظر دکھائی دیا۔ پتھر کے اس خوفناک بت کی آنکھیں کسی زندہ انسان کی طرح چمکنے لگی تھیں پھر انہوں نے اس بت کی گردن کو ہلتے ہوئے محسوس کیا۔

''حسین بھائی بھاگو اس شیطانی جگہ سے۔'' تابش چیخا تو ساکت و جامد کھڑے حسین کو ہوش آیا وہ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر دوڑے۔ ان کے عقب میں چیخ و پکار کی آوازیں مسلسل گونج رہی تھیں۔ آیت الکرسی پڑھتے ہوئے وہ اس غار سے باہر نکلے اور مسلسل دوڑتے رہے۔ ڈر اور خوف سے ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ مڑ کر پیچھے دیکھتے مسلسل بھاگنے سے ان کی ٹانگیں شل ہو چکی تھیں۔ اور بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ وہ رکے بغیر بھاگتے ہوئے اس پہاڑی علاقے سے گزر کر جنگل میں داخل ہو گئے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد وہ رکے بغیر جنگلی درندوں کے خطرے کو نظر انداز کر کے آگے بڑھتے رہے۔ خیریت گزری کہ راستے میں ان کا سامنا کسی خطرناک درندے سے نہیں ہوا۔ اور وہ رات کے آخری پہر اس خطرناک جنگل کے آخری سرے میں پہنچ گئے پر ان کے سامنے وہ جھونپڑی بھی آ گئی۔

جہاں آخری بار بابا مدثر اسے شیش محل کے زندان سے فرار کروا کر یہاں تک لائے تھے۔ پھر یہاں سے وہ بابا مدثر کے کہنے پر بھاگا تھا جھونپڑی سے کچھ فاصلے پر اس نے اور بابا مدثر نے اس مظلوم لڑکی کو دفنایا تھا۔ جو شانی کی درندگی کا نشانہ بنی تھی۔ اسے اس جھونپڑی کے سامنے رکتا دیکھ کر حسین نے پوچھا۔ ''اس جھونپڑی میں ایسی کون سی بات ہے جو تم یہاں رک کر جھونپڑی کو اس قدر غور سے دیکھ رہے ہو۔''

''یہیں بابا مدثر نے مجھے الوداع کہا تھا۔ وہی بابا مدثر جنہوں نے مجھے شکرا کے زندان سے رہائی دلوائی تھی۔ اگر اس روز بابا مدثر میری مدد نہ کرتے تو صبح اس دم خور شیر کو میرے پنجرے میں چھوڑ دیا جاتا اور وہ دم خور شیر مجھے لمحوں میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا۔'' تابش نے جواب دیا اور قدرے توقف سے کہا۔ ''یہیں قریب ہی بابا مدثر کی بیٹی کی قبر بھی ہے۔ جو شانی کی درندگی کا شکار ہوئی تھی۔ آؤ وہاں فاتحہ خوانی کریں۔''

قبر کے پاس انہیں ایک میلے کچیلے لباس میں بوڑھا دکھائی دیا۔ جس کے سر اور داڑھی کے بال جھاڑ جھکاڑ کی طرح بڑھے ہوئے تھے۔ دبلا پتلا بوڑھا قبر کی طرف رخ کئے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ ''بابا جی آپ کون ہیں اور یہاں کس سے باتیں کر رہے ہیں؟'' حسین نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ بوڑھا ان کی طرف مڑا۔

''بابا مدثر آپ۔'' تابش کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

وہ بیچارہ بیٹے اور پھر بیٹی کے غم میں پہلے سے زیادہ کمزور اور بوڑھا دکھائی دے رہا تھا۔ تابش کی طرف دیکھے بنا بابا مدثر نے اپنے لبوں پر انگلی رکھی اور آہستگی سے کہا۔ ''شش خاموش میری بیٹی سو رہی ہے۔ جاگ جائے گی۔'' پھر وہ زار و قطار روتے ہوئے بیٹی کی قبر سے لپٹ گیا۔ ''اب تجھے وہ شیطان نہیں لے جا سکتے سو جا بیٹی سو جا۔ میں آ گیا ہوں ناں۔'' اس کی آواز میں ایک ایسا کرب تھا کہ حسین اور تابش کا دل کانپ اٹھا۔ بابا مدثر اولاد کے غم میں پاگل ہو چکا تھا۔ خود ان دونوں کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے تھے۔

''بابا تمہاری بیٹی کا قاتل شانی اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔'' تابش نے بابا مدثر کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ اور اسے سہارا دے کر جھونپڑی میں لے آیا۔ بابا مدثر گم صم تھا۔ کچھ دیر بیٹھے بیٹھے وہ لیٹا اور سو گیا۔ خود وہ بھی تھکے ہوئے تھے۔ انہیں بھی نیند آ گئی۔

صبح وہ اٹھے تو بابا مدثر جھونپڑی میں نہیں تھا۔ ''شاید بابا بیٹی کی قبر پر گیا ہے۔'' تابش نے کہا تو حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خود اپنے اکلوتے بیٹے کا صدمہ جھیل چکا تھا۔ بابا مدثر کا غم سمجھتا تھا۔ وہاں چند میلے کچیلے برتن اور ڈبے رکھے تھے۔ ایک ڈبے میں نہ جانے کب کی رکھی ہوئی چینی اور دوسرے ڈبے میں چائے کی پتی تھی۔ انہوں نے جھونپڑی کی طرف آتے ہوئے راستے میں ایک کنواں دیکھا تھا۔ کنویں سے پانی نکال کر برتن دھوئے، تابش نے ایک برتن میں پانی بھرا، حسین نے

سوکھی لکڑیاں چنیں اور جھونپڑی میں لے آئے۔ قہوہ تیار کرکے خود بھی پیا اور بابا مدثر کو بھی لے جا کر پلایا۔ انہوں نے اسے دوبارہ جھونپڑی میں لے جانا چاہا۔ مگر بابا مدثر نے وہاں سے ہلنے سے انکار کردیا۔ وہ تابش کو اب تک نہیں پہچانا تھا۔ بیٹی کے صدمے نے اسے جذبات اور احساسات سے عاری کردیا تھا۔ ویسے بھی وہ دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ دن کو پیٹ پوجا کے لئے انہوں نے جنگل کا رخ کیا۔ اور درختوں سے پھل توڑ کر کھائے اور کچھ بابا مدثر کے لئے جھونپڑی میں لے آئے۔ ''اب کیا ارادے ہیں سرکار؟'' حسین نے پوچھا۔

''یہ جھونپڑی فیروز پور کی آبادی سے کافی دور ہے۔ فیروز پور کے باسی یہاں کا رخ نہیں کرتے۔ اور نہ ہی شکرا کے کارندے یہاں آتے ہیں۔ ہمارا اس وقت فیروز پور جانا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنے کے متوازن ہوگا۔ دن ڈھلنے کے بعد شام کو میں فیروز پور جاؤں گا وہاں ایک دکاندار سے پچھلی دفعہ میری جان پہچان ہوئی تھی۔ وہ بھی شکرا کو ناپسند کرتا ہے بلکہ وہ کیا فیروز پور کے سارے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس کے ڈر کی وجہ سے خاموش ہیں۔ میں اس دکاندار سے حالات معلوم کرکے لوٹوں گا۔ پھر مل بیٹھ کر کوئی پلاننگ کریں گے۔'' تابش نے تجویز پیش کی۔

کچھ دیر پس وپیش کے بعد حسین نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ویسے بھی اندھا دھند شکرا کی طرف جانا مناسب نہ تھا۔ سورج غروب ہوتے ہی تابش وہاں سے نکلا، ان کے درمیان یہی طے پایا تھا کہ تابش حالات کا جائزہ لیتے ہی لوٹ آئے گا۔

ابھی تابش نے ایک کلومیٹر کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک اس کے سامنے ایک ہیولا نمودار ہوا جس نے ایک بوڑھے شخص کا روپ دھار لیا۔ دراز قد اور صحت مند بوڑھا جس کے سر اور بھنویں تک سفید تھیں۔ اسے دیکھتے ہی تابش کی ریڑھ کی ہڈی میں سردی لہر دوڑ گی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی پراسرار بوڑھا تھا۔ جس کی ٹکڑوں میں بٹی لاش وہ پہاڑی کے غار میں دیکھ چکا تھا۔ اب اسے اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ کر اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ''تت تم زندہ ہو، کک کون ہو تم؟ بھبھ بھوت ہو؟'' اس نے خوف سے لرزتے ہوئے پوچھا۔

بوڑھے نے شیطانی قہقہہ بلند کیا۔ ''میں بدری نارائن ہوں۔ مہان آقا کا مہمان سیوک۔ تم اپنے متر کے ساتھ میرے استھان پر پدھارے تھے۔ اس سے میں تمہاری سیوا نہیں کرسکتا تھا۔ اسی کارن اب یہاں آیا ہوں۔'' اس نے کوئی منتر پڑھتے ہوئے تابش کی طرف ہاتھ جھٹکے۔

تابش نے پلٹ کر بھاگنا چاہا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں۔ پھر وہاں عجیب سی دھند چا گئی۔ اور تابش ہوش وخرد سے محروم ہوگیا۔ جب اسے ہوش آیا تو خود کو اندھیری جگہ پر پڑے پایا۔ وہاں اس قدر اندھیرا تھا کہ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اٹھا اور ہاتھوں سے ٹٹول کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا۔ کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہوگیا۔ یہ طویل وعریض ہال نما تہہ خانہ جس کا فرش جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا۔ تہہ خانے کے عین وسط میں پتھر کا ایک قد آور بت ایستادہ تھا۔ اس تہہ خانے میں کوئی کھڑکی یا دروازہ نہ تھا۔ فرش پر کہیں کہیں کائی بھی جمی ہوئی تھی۔

پھر اچانک اسے چیں چیں کی عجیب قسم کی آوازیں سنائی دیں اور بہت سی آنکھیں اندھیرے میں چمکتی نظر آئیں۔ پھر ہال کے ایک کونے میں کسی درز سے معمولی سی روشنی کی کرن پڑی تو وہ لرز اٹھا۔ ہال میں ایستادہ بت وہی ہیبت ناک بت تھا۔ جو اس نے بدری نارائن کے غار میں دیکھا تھا۔ اور اندھیرے میں چمکنے والی آنکھیں سیکڑوں کی تعداد میں موٹے موٹے چوہے تھے بلی کی جسامت کے خونخوار چوہے جو تہہ خانے کے فرش میں لاتعداد سوراخوں سے نکل رہے تھے۔

اس اندھیرے میں شیطان کے بت کی آنکھیں بھی چمک رہی تھیں۔ گویا بدری نارائن نے اسے اذیت ناک موت مارنے کے لئے یہاں قید کیا تھا۔ اس تہہ خانے سے بظاہر باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ خونخوار چوہے فرش پر دندناتے پھر رہے تھے۔

اب تابش نے بھی موت کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اور اس ہیبت ناک بت کے سامنے آسن جما کر بیٹھ گیا اور اپنے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لئے۔ دوران تربیت حسین نے اسے مراقبے کی تربیت بھی دی تھی۔ وہ یکسو ہو کر بیٹھ چکا تھا اور سارے خیالات کو جھٹک کر دل ہی دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتا رہا۔ پھر حیران کن واقعہ پیش آیا۔ چوہے خود بخود وہاں سے جانے لگے۔ اور چند گھنٹوں بعد اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تہہ خانے میں اب صرف چند ہی چوہے تھے جو دور ہی دور سے اسے دیکھ رہے تھے جبکہ سیکڑوں چوہے اپنے بلوں میں واپس جاچکے تھے۔ وہ اپنی ثابت قدمی اور استقامت سے موت کو شکست دے چکا تھا۔

اس نے دوبارہ آنکھیں بند کیں اور مراقبے میں گم ہوگیا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس تہہ خانے میں وہ کب تک بھوکا پیاسا مراقبے میں محو رہے گا، انسانی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ پہلا دن گزرا، دوسرے دن وہ نقاہت سے نڈھال ہونے لگا اور تیسرے روز تو مراقبے کے دوران اس کی بھوک اور پیاس سے حالت غیر ہونے لگی۔

اچانک وہ تہہ خانہ روشن ہوگیا۔ اچانک ہونے والی روشنی سے اس کی بند آنکھوں میں چبھن ہونے لگی۔ تابش نے آنکھیں کھولیں تو دھک سے رہ گیا چند قدم کے فاصلے پر جبران جن اور بدری نارائن موجود تھے۔ بدری نارائن کے ہاتھ میں تلوار موجود تھی۔ ''تابش تم انسان نہیں کسی مردے کی پلید آتما ہو۔ جو کہ ان خونخوار چوہوں سے بھی بچ نکلے۔ پر نتو اب میں اپنے مہان آقا (شیطان) کے چرنوں میں تمہاری بلی دوں گا۔'' وہ تلوار سونتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

تابش جو آسن جمائے بیٹھا تھا۔ اٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری اور نقاہت سے دوبارہ گر پڑا۔ اور بے بسی سے نعوں میں تلوار تھامے بدری نارائن کو دیکھنے لگا۔ تین دن کی بھوک پیاس نے اس کی حالت اس قدر غیر کردی تھی کہ وہ اپنے قدموں پر کھڑا بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ بدری نارائن اور جبران سے مقابلہ تو دور کی بات تھی پھر بدری نارائن آگے بڑھا اور جبران نے تابش کے سر کے بال پکڑ کر اسے چت لٹا دیا۔ موت تابش کے سامنے کھڑی تھی۔

☆.....☆.....☆

ادھر حسین جھونپڑی میں موجود تابش کا بے تابی سے انتظار کررہا تھا۔ تابش اب تک نہیں لوٹا تھا۔ اسے گئے ہوئے بہت دیر ہوچکی تھی اور رات نصف سے زائد بیت چکی تھی۔ اس کے دل میں یہی خدشہ تھا کہ کہیں وہ شکرا کے ہتھے تو نہیں چڑھا۔ جب رات گزر گئی اور صبح ہوگئی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ اب اس میں مزید انتظار کی تاب نہ تھی۔ اس کا دوست تابش خطرے میں تھا۔ تابش نے غیر ملک میں اس کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی۔ صبح آٹھ بجے کے قریب وہ فیروز پور کی حدود میں داخل ہوچکا تھا۔ صبح ہوتے ہی گاؤں کی ویران گلیاں آباد ہوچکی تھیں۔ وہ اس جگہ اجنبی تھا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تابش کو کہاں ڈھونڈے وہ چلتا ہوا سڑک پر پہنچا۔ ایک طرف سے پراڈو آرہی تھی۔ جس میں ڈرائیور کے ساتھ ایک دراز قامت درشت چہرے والا ادھیڑ عمر شخص بیٹھا تھا۔ جیپ کی پچھلی نشست پر دو رائفل بردار موجود تھے جن میں سے ایک سیاہ روتھا۔ حسین نے سوچا کہیں یہ شکرا اور اس کے ہرکارے تو نہیں پھر یہ سوچ کر لاپرواہ ہوگیا کہ شکرا اور اس کے ہرکارے اسے جانتے ہی نہیں۔ تو انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ وہ شانی اور ساجد خان کی موت کا ذمہ دار ہے۔

پراڈو اس کے قریب سے گزرتی ہوئی لمحہ بھر کے لئے آہستہ ہوئی۔ پراڈو سواروں نے اس پر اچٹتی ہوئی ایک نظر ڈالی اور پراڈو آگے بڑھ گئی۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑا دور جاتی پراڈو کو دیکھتا رہا۔ پھر آگے روانہ ہوگیا۔ اور بازار میں پہنچ گیا۔ ایک طرف پرچون کی دکان تھی جس میں دکاندار دو تین افراد کو سودا سلف دے رہا تھا۔ حسین دوکان پر پہنچا اور دکاندار کو سلام کیا۔ گاؤں دیہاتوں میں لوگ عموماً ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔

اجنبی فوراً نظروں میں آجاتا ہے۔ ایک اجنبی کو سامنے پا کر دکاندار اور گاہک اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ''باؤ جی تسی دسوں کی خدمت کراں۔'' دکاندار نے استفسار کیا۔

''میرا نام حسین ہے میں اپنے دوست کے ساتھ جنگل میں سیر و تفریح اور شکار کی غرض سے آیا تھا۔ اتفاقاً ہم بچھڑ گئے۔ وہ چھریرے بدن کا درمیانے قد و قامت کا نوجوان ہے رنگت گندمی ہے۔ دراصل وہ تابش سے پہلے بھی اکیلا فیروز پور آیا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ فیروز پور میں ایک دکاندار سے اس کی جان پہچان اور دوستی ہوچکی تھی۔ میں نے سوچا شاید وہ اسی دکاندار سے ملنے گیا ہو۔'' حسین نے تابش کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا۔ اسے اس بازار میں دوسری کوئی پرچون کی دکان دکھائی نہ دی تھی اس لئے اس کے خیال میں یہی وہ دکاندار ہوسکتا تھا جس سے ملنے کا کہہ کر تابش اس سے رخصت ہوا تھا۔

حسین سے اس وقت ایک یہی غلطی سرزد ہوئی تھی کہ وہ اس سے اس دکاندار کا نام نہ پوچھ سکا جس سے ملنے وہ جا رہا تھا اس نے اس خیال سے بھی اس سے دکاندار کا نام نہ پوچھا تھا کہ تابش نے ویسے ہی چند گھنٹوں میں لوٹ آنا تھا۔

''باؤ جی جو حلیہ آپ نے بتایا ہے اس حلیئے کا نوجوان کئی مہینے پہلے یہاں آیا تھا اس نے اپنا نام تابش بتایا تھا۔ پھر اچانک نہ جانے وہ کہاں چلا گیا پھر کبھی میں نے تابش بابو کو نہیں دیکھا۔'' دکاندار نے جواب دیا۔

حسین نے سودا سلف لیتے ایک تنومند شخص کو تابش کے نام پر چونکتے دیکھا۔ مگر اس نے زیادہ توجہ نہ دی، ویسے بھی وہ تابش کی اچانک گمشدگی سے پریشان تھا۔

''بیٹھو بابو جی مجھے تابش بابو کے رشتہ دار لگتے ہو۔'' دکاندار نے خلوص سے کہا تو حسین اس کا شکریہ ادا کر کے دکان سے نکلا کچھ دیر فیروز پور میں گھومنے کے بعد بابا مدثر کی جھونپڑی میں لوٹ گیا اور وہیں تابش کا انتظار کرنے لگا۔

دوسرے روز وہ پھر اس امید پر بازار میں اسی دکاندار کے پاس گیا کہ شاید تابش آج وہاں آیا ہو مگر اسے مایوسی ہوئی وہ شام تک دکاندار کے ساتھ بیٹھا رہا اس دوران دکاندار نے اس کی خوب خاطر تواضع کی، وہ رات کو دوبارہ بابا مدثر کی جھونپڑی میں لوٹ گیا۔

تیسرے روز وہ صبح آٹھ بجے اٹھ کر جھونپڑی سے باہر نکلا اس کا ارادہ فیروز پور جانے کا تھا اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر آج اسے تابش نہ ملا تو وہ شیش محل کا رخ کرے گا۔

اچانک ایک طرف سے ایک جیپ آتی دکھائی دی۔ جیپ میں پانچ پولیس اہلکار موجود تھے۔ یہ باوردی اہلکار تھے ان میں سے ایک انسپکٹر رینک کا آفیسر تھا۔ جیپ اس کے قریب رکی اور پولیس اہلکاروں نے اسے گھیر کر اس طرح رائفلیں تان لیں کہ جیسے وہ کوئی بہت بڑا گینگسٹر یا ٹارگٹ کلر ہو۔ ''کیا بات ہے تم لوگوں نے مجھ پر گنیں کیوں تان لی ہیں؟'' حسین نے درشت لہجے میں استفسار کیا۔

''ذرا ہولے بول باؤ پولیس کے سامنے اونچا نہیں بولتے۔'' اس نے غصے سے کہا اور اسے ہتھکڑی پہنادی۔

''یہ کیا کررہے ہو میرا جرم کیا ہے؟'' حسین چلایا۔ اسے ان پولیس اہلکاروں پر غصہ آرہا تھا۔ جو بغیر کسی جرم کے اس پر چڑھ دوڑے تھے۔ مگر وہ ان سے الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود آرمی کا سابقہ آفیسر تھا۔ اس لئے قانون کا احترام کررہا تھا۔ ورنہ فیروز پور کے ان پولیس اہلکاروں کو وہ لمحوں میں چھٹی کا دودھ یاد کرواسکتا تھا لیکن وہ پولیس اہلکاروں پر ہاتھ اٹھا کر قانون شکنی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے خاموش رہا۔

پولیس اہلکاروں نے اسے جیپ میں سوار کیا اور ہتھکڑی کا دوسرا سرا جیپ میں نصب ایک جنگلے سے باندھ کر لاک کردیا۔ ''یہ کیا کررہے ہو۔'' حسین غرایا۔

''خاموش رہ اوئے اب اونچی آواز میں بولا تو یہیں کٹ لگادوں گا۔'' انسپکٹر نے دانت پیستے ہوئے کہا اور سپاہیوں کو جھونپڑی کی تلاشی لینے کو کہا، کچھ ہی دیر بعد وہ اندر سے حسین کا بیگ اٹھا لائے انسپکٹر نے زپ کھولی۔ بیگ میں موجود گولیاں اور پسٹل دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''ارے تو تو دہشت گرد نکلا۔ ویسے بھی محرم کا مہینہ ہے۔ تمہارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں

ور تم لوگوں کا کیا پلان تھا۔ شاید تم خودکش حملہ یا بم لاسٹ کرنے والے تھے۔''

''بکواس بند کرو۔ میں خود آرمی کا ریٹائرڈ آفیسر وں۔ یہ اسلحہ لائسنس یافتہ ہے۔'' حسین نے غصیلے لہجے یں کہا۔

''لگتا ہے تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بچو! کچھ دیر عد تم خود کو وزیر اعلیٰ کہو گے۔ خیر گھبراؤ مت میرا نام بھی کرم الٰہی ہے۔ بڑے بڑے مجرم سیدھے کئے ہیں تم کس غ کی مولی ہو۔'' اس نے قہقہہ لگایا' کرم الٰہی کا نام سنتے ی حسین کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

کرم الٰہی تابش کا دشمن اور راشی پولیس انسپکٹر تھا۔ ہ مجرموں کا سرپرست اور جعلی پولیس مقابلوں کا ماہر تھا۔ مگر اب وقت حسین کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔ ان پولیس اہلکاروں نے اسے جیپ کے جنگلے سے اس طرح لاک کیا تھا کہ وہ مزاحمت نہیں کرسکتا تھا۔ پولیس اہلکار جیپ میں سوار ہوئے، ڈرائیور نے جیپ چلائی ہی تھی کہ بابا مدثر دوڑتا ہوا جیپ کے سامنے آگیا۔ ''میرے عامر کو چھوڑ دو۔ میں اسے نہیں لے جانے دوں گا۔'' بابا مدثر کی ذہنی طور پر پھر بہک گئی تھی۔

''اچھا تو تو نے اسے پناہ دی تھی۔ شکرا صاحب نے تجھے پاگل جان کر ڈھیلا چھوڑ دیا تھا۔ مگر تو نے تو بہت کل پرزے نکال لئے۔'' کرم الٰہی نے دانت پیستے ہوئے کہا اور ہولسٹر سے پسٹل نکال کر چشم زدن میں ٹریگر دبادیا۔ گولی بابا مدثر کی پیشانی میں لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی مانند گر پڑا۔

''خبیث انسان تم نے یہ کیا کیا۔'' حسین بپھر کر اٹھا ہی تھا کہ ایک سپاہی نے رائفل کا بٹ اس کے سر پر رسید کیا۔ حسین کی آنکھوں کے سامنے سورج سا طلوع ہوا اور وہ ہوش و خرد سے محروم ہوگیا۔ اسے دوبارہ ہوش آیا تو وہ اکیلا جیپ کے جنگلے کے ساتھ بندھا ہوا تھا اس بار بے ہوشی کے عالم میں اس کا دوسرا ہاتھ بھی جیپ کے جنگلے سے باندھ دیا گیا تھا۔

جیپ سے باہر کرم الٰہی اور چاروں سپاہی موجود تھے ان کے قریب ایک سیاہ رو شخص اور ادھیڑ عمر درشت چہرے والا وہ دراز قامت شخص بھی موجود تھا جسے حسین نے فیروز پور میں پراڈو میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ ''میرا نام شکرا ہے تم کیا سمجھتے تھے کہ یہاں تمہیں کوئی نہیں پہچانے گا۔ شانی کی موت کے دوسرے روز ہی مجھے شانی اور ساجد خان کے دونوں قاتلوں کی تصویر ای میل کے ذریعے بھجوادی گئی تھی۔'' اس نے جیب سے اس کی اور تابش کی تصویر نکال کر دکھائی یہ وہی تصویر تھی۔ جو جابر خان نے داؤد خان کے گھر پر حملے سے پہلے اپنے ڈیجیٹل کیمرے سے کھینچی تھی اور پھر پرویز خان کو سینڈ کردی تھی۔ شاید ساجد خان کے گروہ کے کسی کارندے نے ساجد خان کی موت کے بعد شکرا کو بھجوائی تھی۔ ''تم نے اور تابش نے مل کر میرے شانی کو بے دردی سے مارا ہے۔ مجھے تو اس کی لاش کے بجائے اس کا ڈھانچہ ہی ملا تھا۔ جسے آدم خور مچھلیاں کھا چکی تھیں۔ اب میں تمہیں عبرت ناک موت دوں گا۔ پھر تابش کی باری ہے۔''

شکرا نے سفاک لہجے میں کہا اور ایک شخص سے رائفل لے کر حسین کا نشانہ لیا۔ اور ٹریگر پر انگلی رکھ دی۔ ''اب تم اپنی زندگی کے لئے بھیک مانگو گے۔'' وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔

''شکرا میرا نام حسین ہے۔ میں حق کی خاطر اپنی جان قربان کرسکتا ہوں۔ مگر سر نہیں جھکاؤں گا۔ میں مسلمان ہوں۔ چاہے جان چلی جائے تم جیسے شیطانوں کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔'' حسین نے مضبوط لہجے میں کہا تو شکرا نے دانت بھینچتے ہوئے ٹریگر دبادیا۔

گولی حسین کے سینے میں لگی۔ کرم الٰہی اور سپاہیوں نے بھی فائر کھول دیا۔ تڑتڑاہٹ کی گونجدار آواز کے ساتھ کئی گولیاں حسین کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔

☆......☆......☆

ادھر ہال کے فرش پر تابش بے بس پڑا تھا۔ جب کہ بدری نارائن ہاتھوں میں تلوار لئے اس سے محض چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ جبران جن بدری نارائن کے عقب میں اپنے اصل روپ میں موجود تھا۔ اس کا سر

20 فٹ کی بلندی سے زائد چھت کو چھو رہا تھا۔ جب کہ شکل وصورت اس قدر وحشت ناک تھی کہ عام انسان اسے دیکھ لیتا تو ڈر کے مارے اس کا سانس تک رک جاتا۔ تابش کو اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔

اچانک گڑگڑاہٹ کی زوردار آواز گونجی اور ہال نما تہہ خانے کا فرش اور در و دیوار اس طرح لرزنے لگے کہ جیسے وہاں زلزلہ آ گیا ہو۔ جبران جن اپنے دیوہیکل اور بھاری بھرکم وجود کے ساتھ لڑکھڑایا۔ جب کہ بدری نارائن اوندھے منہ گر پڑا۔ پھر ہال کی ایک دیوار کا کچھ حصہ گر پڑا۔

تابش چونک پڑا۔ وہاں شلپا اور ایشال ایک جیسے لباس میں موجود تھیں۔ ایک ہی جیسی شکل وصورت ایک ہی جیسا قد وقامت اور پھر ایک ہی جیسا لباس، خود تابش کے لئے بھی پہچاننا مشکل ہو گیا تھا کہ ان میں سے ایشال کون سی ہے اور شلپا کون سی ہے؟ ایشال اور شلپا کے ہاتھوں میں عجیب ساخت کے تیر کمان موجود تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دونوں نے ماہر تیراندازوں کی مانند نشانہ باندھ رکھا تھا۔ تیر کا آخری سرا ان کے کان کی لو کو چھو رہا تھا جب کہ نوک کا رخ بدری نارائن کی طرف تھا۔ بدری نارائن بت کے آگے اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ بت اور بدری نارائن کے بیچ تابش چت لیٹا ہوا تھا۔ عمارت اب بھی لرز رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت گر جائے گی۔ بدری نارائن کی نظر ان کی طرف پڑی تو وہ ایک طرف ہٹا۔ شلپا اور ایشال نے ایک ساتھ ہی تیر چھوڑے تو دونوں تیر سنسناتے ہوئے شیطان کے دیوہیکل بت کی دونوں آنکھوں میں لگے اور ہال میں عجیب قسم کے شور وغل کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہزاروں بدروحیں چیخ و چلا رہی ہوں۔ تابش کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، شیطان کے بت کی آنکھوں سے خون بہہ رہا تھا۔

دونوں لڑکیوں نے دوبارہ تیر کمان میں کسے اور بت کا نشانہ لے کر ایک ساتھ تیر چھوڑے اس بار دونوں تیر بت کے سینے میں لگے۔ پتھر کا بت اپنی جگہ سے ہلا اور لرزنے لگا۔ ”پاپن یہ تم نے کیا انیائے کیا۔“ بدری نارائن چیخا اور بدحواس ہو کر ہال کی گری ہوئی دیوار سے باہر بھاگا۔ جبران نے بھی اس کی تقلید کی۔

”تابش جلدی سے یہاں سے باہر نکلو۔“ وہ دونوں چیخیں۔ تابش جو اس دوران ہمت کر کے اٹھ چکا تھا۔ گرتا پڑتا ٹوٹی ہوئی دیوار سے باہر نکلا۔ اور شیطان کا بت لرزتا ہوا اوندھے منہ گرا۔ اور عمارت زمین بوس ہو گئی۔ ہر طرف گرد وغبار کا بادل سا چھا گیا تھا۔ جب گرد وغبار کے بادل صاف ہوئے تو ایشال اور شلپا تابش کے دائیں بائیں کھڑی تھی۔ جب کہ وہ خود یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان دونوں میں سے ایشال کون سی ہے؟ مگر اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔

جب کہ بدری نارائن خونخوار نظروں سے دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ ”پاپن تم نے میرا جیون نشٹ کر ڈالا۔ پرنتو اب بچو گی تم بھی نہیں۔“

”بدری نارائن یہ سمے کی بات ہے اور اب سے تمہارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔ میں پاربتی دیوی کی داسی ہوں۔ ورشوں کی تپسیا اور گیان دھیان کے بعد دیوی نے مجھے شکتی پراپت کی ہے۔ میں تمہارے بارے میں جانکاری حاصل کر چکی ہوں۔ جو منش اپنے دھرم کا نہیں رہتا وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ تم ہندو دھرم کے پجاری تھے۔ پھر اپنے دھرم سے ہٹ کر شیطان کے چیلے بن گئے اور اس کی پوجا کرنے لگے۔ تم ہر پچاس سال بعد شیطان کے بت کے سامنے اپنا جیون بلیدان کر دیتے تھے۔ اس بلی دان سے پہلے تم کسی منش کی ہتھیا کر کے اس کا سر دھڑ سے الگ کر دیتے تھے پھر شیطانی طاقت سے تمہارا سر اس کے دھڑ سے جڑ جاتا۔ اور تمہیں نیا جیون مل جاتا اور تمہاری پلید آتما اس منش کے شریر میں داخل ہو جاتی۔ یہ تمہارے لئے کوئی دشوار عمل نہ تھا۔ کیوں کہ تم بھی آتما شکتی کے ماہر تھے۔ اور پھر طاغوتی قوتیں بھی تمہاری مددگار تھیں۔ تم نے چار بار اس طرح نیا جیون اور جوان شریر حاصل کیا۔ میں جانتی ہوں تمہارے چہرے کی عمر ڈھائی ورش 250 سال اور شریر کی عمر پچیس سال

ہے۔ یہ جوان شریر تم نے چند روز پہلے ہی حاصل کیا ہے۔

پھر تمہاری ملاقات شکرا سے ہوئی اور شکرا نے تمہاری سہائتا (مدد) سے اپنے پتا سمان بھائی اور ماتا سمان بھابھی کی ہتھیا کی۔ وہ بھی تمہاری طرح شیطان کو پوجنے لگا۔ تمہارا بھتیجا تابش بابا مدثر کی وجہ سے بچ نکلا۔ بھگوان کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ جوان ہوتے ہی تابش کے سینے میں شیش محل اور اپنی ماتا پتا کی ہتھیا کا آخری منظر آنے لگا۔

وہ سینے میں دونوں قاتلوں شکرا اور کالیا کو بھی دیکھ چکا تھا۔ پھر ایک میگزین میں شیش محل کے بارے میں فیچر پڑھ کر وہ اپنے متر خاور کے ساتھ فیروز پور پہنچا۔ جہاں شانی میرے پتا کی ہتھیا کر چکا تھا تابش اور خاور کی مداخلت سے میں بچ نکلی۔ خاور بیچارہ مارا گیا اور تابش جان بچانے کے لئے جنگل میں جا گھسا۔ جہاں جبران جن اس کا دوست اور پھر ایشال کی وجہ سے اس کا دشمن بنا، وہ ایمان کا کمزور نکلا اور اپنے دھرم سے پھر کر تمہاری طرح شیطان کی پوجا کرنے لگا۔ اس روز جب تابش اپنے متر (دوست) حسین کے ساتھ تمہارے استھان میں داخل ہوا تو تم بلیدان دے چکے تھے۔ تمہارا سر کسی منش کے کٹے ہوئے شریر کے قریب پڑا تھا۔ پھر اس شریر سے تمہارا سر جڑتا دیکھ کر تابش اور حسین غار سے بھاگ نکلے۔

جب تمہاری آتما اس منش کے شریر پر قابض ہوئی تو وہ دونوں جنگل میں پہنچ چکے تھے۔ تم اپنی شکتی بڑھانے اور جیون برقرار رکھنے کے لئے ہر اماوس کی رات کسی نہ کسی منش کی بلی دینے کے بعد اس کے خون سے شیطان کے بت کو اشنان دیتے تھے۔ پھر تم نے تابش کو اغوا کیا۔ اس کا بلیدان دینا چاہا۔

آدم خور چوہے ایک کھیل تھا۔ جو تم نے تابش کو رانے کے لئے رچایا۔ مگر وہ اپنی ہمت اور حوصلے سے ں میں ثابت قدم رہا۔ آج تم تابش کی بلی دینے الے تھے۔ تب مجھے جانکاری ہوئی۔ میں اس سے پہلے ا ایک کٹھن جاپ سے جان چکی تھی۔ کہ تمہارا جیون اور پیانٹ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ شیطان کے اس بت کی آنکھیں ایک ہی وقت میں اور ایک ساتھ پھوڑ دی جائیں۔

تب میں نے فولاد کے تیر کمان تیار کروائے اور ایشال کو مختصر وقت میں تیر کمان چلانے کی تربیت دی۔ اور شیطان کی آنکھیں پھوڑنے کے ساتھ ساتھ بیک وقت اس کے سینے پر تیر برسائے۔ اس عمارت کا مسمار ہونا اس میں دیوی کی سہائتا شامل تھی۔ آج تم کسی منش کی بلی نہیں دے سکے۔ شیطان کا بت تباہ ہو چکا ہے۔ اور سمے گزر چکا ہے۔ اسی کارن تم اپنی بہت سی شکتیوں سے محروم ہو چکے ہو۔“

ان دونوں میں سے ایک کو بولتا دیکھ کر جبران بے قراری سے بولا۔ اور اس کے قریب کھڑی ایشال کی طرف بھاگ کر اس کی کلائی تھام لی۔ یہ سب اتنا اچانک ہوا کہ بدری نارائن کو مداخلت کی مہلت ہی نہ ملی اور وہ جبران کو نہ روک سکا۔

ایشال کی کلائی کا اس کا ہاتھ میں آنا تھا کہ جبران کے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو ہاتھ میں پکڑ لیا ہو۔ اس نے چیختے ہوئے پیچھے ہٹنا چاہا۔

مگر ایشال نے دوسرا ہاتھ جبران کی کلائی پر ڈال کر اس کی کلائی پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”جبران جو شلپا بن کر بول رہی تھی دراصل وہ شلپا نہیں ایشال تھی۔ اس نے میرے کہنے پر شلپا بننے کا ڈھونگ رچایا۔ اصل شلپا تو میں ہوں۔ میرا مقصد یہی تھا کہ تم ایشال سمجھ کر مجھے قابو کرنے کی خاطر پکڑنے کی کوشش کرو میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہی۔ تم ایک طاقتور جن ہو۔ جب کہ میں آدم زادی ہوں۔ گویا آج مقابلہ مٹی اور آگ کا ہے۔ اگر ہمت ہے تو مجھ سے اپنی کلائی چھڑا کر دکھاؤ۔ تمہیں یاد ہوگا میں نے ایک بار تم سے کہا تھا کہ ”منش کو اس سنسار میں تمام مخلوقات پر برتری حاصل ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔“

تابش جو خاموش کھڑا تھا بول اٹھا تو وہ دونوں مسکرا دیں۔ جبران جواب کیا دیتا اس کی اپنی حالت غیر

ہو چکی تھی۔ شلپا نے کوئی منتر پڑھتے ہوئے اپنے دائیں ہاتھ کی انگلی کو جنبش دیتے ہوئے جبران کی طرف پھونکا۔ اور اس کی کلائی چھوڑ دی۔ جبران کا بھاری بھرکم وجود دھڑام سے زمین پر گرا۔ اور اس کا جسم کوئلے کی طرح سیاہ ہونے لگا اور پھر راکھ میں تبدیل ہو گیا۔

یہ ایک سرکش جن کا عبرت ناک انجام تھا۔ بدری نارائن پھٹی پھٹی نگاہوں سے یہ حیرت انگیز منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی نے جبران جیسے خوفناک جن کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دیا تھا۔ لیکن وہ بھی شیطان کا چیلا تھا۔ تن کر اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''اب کیا وچار ہیں مہاراج؟'' اس نے استہزائیہ نظروں سے بدری نارائن کو دیکھا۔

''تم بالش بھر کی چھوکری بدری نارائن سے یدھ لڑو گی۔'' اس نے شلپا کی طرف دونوں ہاتھ جھٹکے تو چھوٹے چھوٹے بچھو اور سانپ سے مشابہ ہیبت ناک قسم کے جانوروں کا غول شلپا کی طرف لپکا مگر اس کی انگلی کی جنبش سے ان خونخوار جانوروں کے جسم میں آگ لگ گئی۔ وہ جل کر راکھ ہو گئے۔ ''بدری نارائن تمہارے یہ بیر تو گئے کام سے اب کیا وچار ہیں۔'' شلپا بولی۔

بدری نارائن نے جواب دینے کے بجائے اچھل کر مداریوں کے سے انداز میں دونوں ہاتھ جھٹکے اور گول گول گھومنے لگا تو شلپا نے اکڑوں بیٹھ کر انگلی سے زمین میں مثلث کا زاویہ بنایا۔ اور اس مثلث میں انگلیوں کی پوریں ماریں تو خوفناک قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔ تابش اور ایشال کو اپنے کان کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ ''تمہارے پانچ بیر بھی گئے کام سے۔'' بدری نارائن ہنسا۔

''وہ گئے نہیں میں نے انہیں پیچھے ہٹا لیا تھا۔ شلپا نے دوبارہ مثلث پر انگلیاں رکھیں تو کچھ دیر بعد شور وغل تھم گیا۔ اور سکوت سا چھا گیا۔ ''بدری نارائن تیرے یہ بیر بھی گئے۔'' شلپا نے سرد لہجے میں کہا۔

بدری نارائن نے اس کے بعد بھی اس پر کئی خوفناک جادوئی حملے کئے مگر اسے اپنے ہر حربے میں ناکامی ہوئی۔ پے در پے شکست سے بدری نارائن اشتعال میں آ چکا تھا۔ پھر اس نے زمین پر تھوکا اور مٹی اٹھا کر شلپا پر پھینک دی۔ شلپا کا جسم شعلوں میں گھر گیا۔ تابش اور ایشال خوف سے چیخ پڑے۔ اس آگ نے لباس سمیت اس کا جسم جلا کر سیاہ کر ڈالا تھا۔ اور پورے جسم پر آبلے نمودار ہو چکے تھے۔ مگر شلپا کے چہرے پر کرب اور اذیت کے بجائے پرسکون مسکراہٹ تھی۔ اس نے کوئی منتر پڑھتے ہوئے اپنے جسم پر دونوں ہاتھ پھیرے تو اس کا جسم پہلے کی طرح صاف شفاف اور اجلا ہو گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا لباس بھی آگ لگنے کے باوجود صحیح سلامت تھا۔ ''بدری نارائن اب کیا وچار ہیں؟'' شلپا نے اپنا سوال دوبارہ دہرایا۔

''اب تمہاری باری ہے۔'' بدری نارائن نے پرسکون لہجے میں کہا۔ شکست کے باوجود اس میں اب بھی دم خم باقی تھا۔

''اپنے مہان شیطان آقا کو کیوں نہیں بلاتے۔'' شپا نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ تو بدری نارائن تلملا گیا۔ ''وہ ضرور میری سہائتا کرے گا۔'' بدری نارائن کو اب بھی شیطان اور کالے جادو پر اعتماد تھا۔

''بدری نارائن یہ تمہاری بھول ہے۔ شیطان کا کام انسان کو بہکانا ہے وہ انسان کو بہکا کر اپنے راستے پر لے آتا ہے۔ شیطان انسان کا دوست نہیں دشمن ہے۔'' اس بار تابش نے کہا۔

''تو خاموش رہ ملیچھ۔'' بدری نارائن نے اسے جھڑکا تو تابش نے لاحول پڑھا۔ شلپا نے زمین پر بیٹھ کر پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑے اور زیر لب بڑبڑانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ پھر اس نے انگلی سے زمین پر مثلث کا زاویہ بنایا اور اٹھ کر بدری نارائن کی طرف دائیں ہتھیلی ہوا میں لہرائی تو بدری نارائن کا دایاں ہاتھ کٹ کر ایک طرف جا گرا۔ وہ کربناک انداز میں چیختا ہوا ایک طرف بھاگا۔

شلپا نے دوبارہ انگلی سے اس کی طرف اشارے کئے۔ بدری نارائن کے جسم میں جگہ جگہ چھید ہونے لگے۔ اس کا لباس اپنے ہی لہو میں بھیگ گیا۔ پھر شلپا نے

اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو دائیں بائیں گھمایا۔ تو بدری نارائن کا سر کٹ کر ایک طرف جا گرا اور خون میں لت پت دھڑ دوسری طرف جا گرا، یہ دلدوز منظر دیکھتے ہی ایشال خوف سے چیخ پڑی۔ خود تابش بھی دنگ رہ گیا۔

''بدری نارائن اور جبران نشٹ ہو چکے ہیں۔ پر اس کے بدلے مجھے بہت کچھ کرنا پڑا۔'' وہ غم زدہ لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب؟'' تابش چونکا۔

''بدری نارائن اور جبران کی موت کے بعد میں اپنی تمام شکتیوں سے محروم ہو چکی ہوں۔ پتا جی نے اپنی کتاب میں سنسکرت زبان میں یہی ہدایت لکھی تھی کہ ایک سے ایسا آئے گا جب میرا ہونے والا جیون ساتھی یعنی تم خطرے میں ہو گے۔ تب اگر میں نے اس کے دشمن یعنی بدری نارائن کو نشٹ کیا تو میں آتما شکتی سمیت اپنی تمام شکتیوں سے محروم ہو جاؤں گی۔ یوں سمجھ لو کہ اب میں عام سی لڑکی ہوں۔''

''شلپا تم نے مجھ پر اور ایشال پر بہت سے احسان کئے ہیں۔ میں چاہوں بھی تو تمہارے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔'' تابش نے عقیدت سے شلپا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''لیکن افسوس میں تمہاری خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ میں صرف ایشال کو چاہتا ہوں۔''

شلپا اداسی سے مسکرائی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ''میں تمہارے متر کو نہیں بچا سکی۔ وہ راکھشش اس کی ہتھیا کر چکے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' تابش تڑپ اٹھا۔

''جس سمے میں اس دشٹ بدری نارائن سے برسرپیکار تھی۔ اس سمے شکرا اور کرم الٰہی نے دھوکے سے حسین صاحب کے جسم کو جیپ کی گرل سے باندھ کر ان کا جسم گولیوں سے چھلنی کر دیا۔''

حسین کی موت کا سن کر تابش کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ''نہیں یہ جھوٹ ہے۔'' وہ بے یقینی سے گردن ہلانے لگا۔

''یہ سچ ہے تابش۔'' اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے متر کی لاش اسپتال کے سرد خانے میں موجود ہے۔ اس سے زیادہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔ کیوں کہ میں اپنی تمام شکتیوں سے محروم ہو چکی ہوں۔''

''تابش اس وقت فیروز پور جانا چاہتا تھا۔ مگر شلپا کے مشورے پر وہ شلپا اور ایشال کے ساتھ مراد آباد جا پہنچا۔ راستے میں دو ہمشکل لڑکیوں کو لوگ حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ خود عثمان صاحب جو کہ سید رسول صاحب کے دوست تھے وہ اور ان کے گھر والے ایشال اور شلپا کو دیکھ کر ششدر رہ گئے تو تابش نے مختصر الفاظ میں انہیں اپنی روداد سنا ڈالی۔ وہ رات انہوں نے عثمان صاحب کے گھر بسر کی اور صبح ایشال کو وہیں چھوڑ کر شلپا اور تابش نے فیروز پور کا رخ کیا۔ ویسے بھی عثمان صاحب کی بیٹی ثمینہ ایشال کی بچپن کی سہیلی تھی۔

☆.....☆.....☆

ادھر کرم الٰہی نے حسین کی موت کے بعد جیپ کی آہنی گرل سے بندھی حسین کی لاش کو ہتھکڑیوں سے آزاد کیا۔ اور جیپ سے باہر نکال کر زمین پر لٹانے کے بعد ایک غیر قانونی رائفل اپنی جیپ سے نکالی رومال سے فنگر پرنٹ صاف کرنے کے بعد رائفل حسین کے ہاتھ میں تھمائی پھر اپنی جیپ کی اگلی نشست کے نیچے سے خودکش جیکٹ اور غیر قانونی ہتھیار اس کی لاش کے پاس ڈال کر افسران بالا کو اطلاع دی کہ اس نے حسین نامی دہشت گرد کو ہلاک کر دیا ہے۔ جس کے قبضے سے خودکش جیکٹ سمیت بہت سے غیر قانونی ہتھیار برآمد ہوئے ہیں۔

اسی روز ملک بھر کے الیکٹرک اور پرنٹ میڈیا پر حسین کی تصویر سمیت خبر آ گئی۔ ایس ایس پی حسن خان ڈرائنگ روم میں بیٹھا ایک نجی چینل پر خبریں دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس پولیس مقابلے کی سلائیڈنگ نیوز چلنے لگی بریکنگ نیوز میں خاتون رپورٹر تفصیلات بتا رہی تھی، غلام حسین کی تصویر پر سرخ نشان مارک کر دیا تھا۔ حسین خان پھٹی پھٹی نگاہوں سے غلام حسین کی تصویر دیکھ رہا تھا۔

خاتون رپورٹر کہہ رہی تھی۔ ''فیروز پور پولیس اسٹیشن کے انسپکٹر کرم الٰہی اور اس کے عملے نے ایک مشکوک شخص کو

بیگ اٹھائے فیروز پور کے بازار کی طرف جاتے دیکھا تو اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ دہشت گرد نے پولیس پارٹی پر فائرنگ کی اور جوابی فائرنگ میں ہلاک ہوگیا۔ دہشت گرد کے بیگ سے ناٹن ایم ایم پسٹل رائفل اور خودکش جیکٹ سمیت بہت سے غیر قانونی ہتھیار ملے ہیں۔ انسپکٹر کرم الٰہی کا کہنا ہے کہ حسین کا تعلق دہشت گرد تنظیم سے تھا۔ اور وہ خودکش حملے کے ذریعے دہشت گردوں کی واردات کرنا چاہتا تھا۔ مزید تفتیش جاری ہے۔''

حسن خان کے ذہن میں آندھیوں کے جھکڑ سے چل رہے تھے۔ وہ آرمی کے اس سابق جانباز افسر کو کیسے بھلا سکتا تھا۔ آج وہ اس مقام تک حسین ہی کی وجہ سے پہنچا تھا۔ حسن خان کا والد فیکٹری ورکر تھا۔ جو فیکٹری میں ہی ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ فیکٹری مالک نے چند ہزار کی امداد کے بعد طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ تو بیوہ ماں نے معاشی ضروریات کی خاطر دس سالہ حسن کو ایک ہوٹل میں کام پر لگادیا۔ جہاں چائے پیتے ہوئے حسین نے اسے دیکھا ان دنوں وہ حاضر سروس تھا۔

حسن کے حالات جاننے کے بعد وہ اس کی بیوہ ماں سے ملا اور ہر ماہ گھر کے اخراجات کے لئے معقول رقم دینے کے ساتھ ساتھ حسن کے تعلیمی اخراجات بھی ادا کرتا رہا۔ جب تک حسن اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہوگیا۔ غلام حسین خاموشی سے ان کی مدد کرتا رہا۔ پھر حسن خان پولیس ڈپارٹمنٹ میں بھرتی ہوگیا۔ ایمانداری اور فرض شناسی کی بدولت وہ ترقی کرتا ہوا ایس ایس پی کے عہدے پر جا پہنچا۔ پھر اس کا ٹرانسفر فیروز پور کے قریب واقع ایک قصبے میں ہوا تو اس کا حسین سے ملنے ملانے کا سلسلہ رک گیا ورنہ وہ ہر ماہ اس سے ملنے جاتا تھا۔

پارس کی گمشدگی کے وقت بھی وہ غلام حسین سے ملا تھا۔ پھر اسے کہیں سے معلوم ہوا کہ حسین صاحب پارس کی تلاش میں پڑوسی ملک جارہے ہیں اور اب یہ خبر اس کا ذہن تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا کہ حسین جیسا فرض شناس آرمی کا اہلکار دہشت گرد ہوسکتا ہے۔ پھر وہ کرم الٰہی جیسے افسر کو جانتا تھا جو راشی اور مجرموں کا ساتھی تھا۔

آرمی کے ان افسران تک جب اس پولیس مقابلے کی خبر پہنچی جو غلام حسین کے ساتھ سروس کرچکے تھے۔ تو انہیں بھی شک ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ان ہی افسران میں سے میجر رضوان جو غلام حسین کے ساتھی رہ چکے تھے اور حسن خان سے بھی دعا سلام تھی وہ اس روز حسن سے ملے اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ حسین صاحب کسی سازش کا شکار ہوئے ہیں۔

ایس ایس پی حسن نے افسران بالا کی اجازت سے ایماندار پولیس اہلکاروں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی تشکیل دی اور انکوائری کا حکم دیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ پڑھتے ہی SSP حسن کا شک یقین میں بدل گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق غلام حسین کی کلائیوں پر ہتھکڑی کے نشانات تھے۔ اگر غلام حسین کرم الٰہی کے للکارنے پر نہیں رکا اور پولیس پارٹی پر گولی چلائی تو پھر اس کی کلائیوں پر ہتھکڑی کے نشانات کیوں تھے۔ صاف ظاہر تھا۔ اسے ہتھکڑیوں سے جکڑ کر بے دست و پا کرنے کے بعد گولیوں سے چھلنی کیا گیا تھا۔ ورنہ کرم الٰہی جیسا ادنیٰ پولیس انسپکٹر آرمی کے سابق کمانڈو کو اتنی آسانی سے نہیں مار سکتا تھا۔ لیبارٹری رپورٹ کے مطابق غلام حسین کے ہاتھوں پر بارود کے نشانات بھی نہیں پائے گئے۔ سچ ظاہر ہوچکا تھا۔

SSP حسن نے کرم الٰہی اور چاروں پولیس اہلکاروں جو اس سازش میں شریک تھے ان کی گرفتاری کے آرڈر دے کر پولیس پارٹی روانہ کی۔ کرم الٰہی کو SSP کے آفس میں موجود ایک سپاہی جو اس کا پرانا ساتھی اور اسی کی طرح راشی تھا۔ فون پر اطلاع دی کہ جلد از جلد انڈر گراؤنڈ ہوجاؤ ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ کیونکہ غلام حسین کے قتل کا مقدمہ درج کردیا گیا ہے۔ یہ اطلاع سنتے ہی کرم الٰہی کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب فیروز پور سمیت کہیں بھی اسے جاتے امان نہیں ملے گی کیونکہ SSP حسن خان ایک سخت گیر ایماندار افسر تھا۔ اور پھر معاملہ آرمی کے ایک ریٹائر اہلکار کا تھا۔ جسے وہ جعلی پولیس مقابلے میں قتل کرچکا تھا۔

وہ اس سازش میں شریک چاروں سپاہیوں سمیت شیش محل جا پہنچا۔ کیونکہ غلام حسین کے قتل کا حکم اسے شکرا نے ہی دیا تھا۔ اور اس قتل کے لئے اسے شکرا نے دو لاکھ روپے دیئے تھے۔ شکرا اسے رات کے پہر سپاہیوں سمیت سادہ لباس میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اور اس طرح اس وقت آنے کا سبب پوچھا۔

''شکرا صاحب غضب ہوگیا۔ SSP حسن خان، غلام حسین کے جعلی مقابلے میں ہلاک ہونے کی سچائی جان چکا ہے۔ میرے اور ان سپاہیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوچکے ہیں۔ اور پھر آرمی کے افسران اعلیٰ کا دباؤ بھی ہے۔ اب میرا بچنا مشکل ہے خدا کے لئے مجھے بچالو، اگر ہم میں سے کوئی پکڑا گیا تو آپ بھی مشکل میں پھنس جائیں گے۔ کیونکہ غلام حسین کا انکاؤنٹر میں نے آپ کے کہنے پر ہی کیا ہے۔'' کرم الٰہی نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''تم لوگوں کو یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں۔'' شکرا نے اسے غصے سے گھورا۔

''نہیں جی۔'' کرم الٰہی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ شکرا نے کالیا کو سیاہ شیشوں والی پراڈو لانے کا حکم دیا اور ان پولیس اہلکاروں کو ساتھ لے کر احاطے میں پہنچا جہاں کالیا پراڈو کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود تھا۔ پولیس اہلکاروں کو پچھلی نشست پر بٹھا کر وہ خود فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھا۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے۔ اندر سے باہر تو دیکھا جاسکتا تھا لیکن باہر سے اندر کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے شکرا مطمئن تھا۔ وہ انہیں لے کر بابا مدثر کی جھونپڑی میں جا پہنچا۔ جو جنگل کے بالکل قریب اور فیروز پور کی آبادی سے دور تھی۔

پانچوں پولیس اہلکار اس وقت نہتے تھے۔ جھونپڑی کے قریب پہنچتے ہی شکرا نے کالیا کے شانے سے آٹومیٹک رائفل اتاری چشم زدن میں برسٹ موڈ پر کرکے چاروں سپاہیوں پر فائر کھول دیا۔ ''شکرا صاحب یہ آپ نے کیا کیا؟'' وہ خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''بیکار گھوڑوں کو ہمیشہ گولی ماردی جاتی ہے۔ یہ چاروں دردسر بن جاتے اور پھر پانچ افراد کو پناہ دینا آسان بات نہیں۔'' شکرا نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''بہرحال تم گھبراؤ مت پولیس کا دھیان میری اور اس جھونپڑی تک نہیں جائے گا جب تک تم یہیں چھپے رہو معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد اس مسئلے کا کوئی حل سوچیں گے۔''

کرم الٰہی اور کالیا نے مل کر بڑا سا گڑھا کھودا چاروں سپاہیوں کی لاشیں گڑھے میں ڈالنے کے بعد دو روز سے پڑی بابا مدثر کی لاش بھی گڑھے میں ڈالنے کے بعد گڑھے کو مٹی سے بھر دیا۔ اور کرم الٰہی کو جھونپڑی میں چھوڑ کر وہ کالیا کے ہمراہ شیش محل واپس لوٹ گیا۔

اسی روز شہر سے آئی پولیس پارٹی فیروز پور پہنچی۔ لیکن کافی تلاش کے باوجود انہیں کرم الٰہی اور چاروں سپاہیوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

☆.....☆.....☆

ادھر تابش شلپا کے ساتھ فیروز پور پولیس اسٹیشن جا پہنچا اسے اپنی گرفتاری کا آج کوئی ڈر نہ تھا۔ ویسے بھی

اچھی باتیں

☆ کسی کو دکھ دینے والا کبھی خود بھی خوش نہیں رہا۔

☆ کسی کی بے بسی پر مت ہنسو، کل کو یہ وقت تم پہ بھی آسکتا ہے۔

☆ کسی کی آنکھ تمہاری وجہ سے نم نہ ہو کیوں کہ تمہیں اس کے ہر آنسو کی ایک ایک بوند کا قرض چکانا ہوگا۔

☆ مظلوم کی آہ سے ڈرو، کیونکہ آہ کسی کی بھی ہو عرش کو ہلا دیتی ہے۔

☆ دوسروں کو اس طرح معاف کرو جیسے اللہ تمہیں معاف کردیتا ہے۔

☆ عظیم ہوتے ہیں وہ لوگ جو اپنے غم چھپا کر دوسروں کے سامنے مسکراتے ہیں۔

(عبدالجبار رومی انصاری-لاہور)

حسین صاحب کی موت کا سن کر وہ اپنے حواس میں نہ تھا۔ فیروز پور پولیس اسٹیشن میں اس وقت ایک سب انسپکٹر کے ساتھ SSP حسن خان بھی موجود تھا۔ جب تابش کمرے میں داخل ہوا۔ SSP نے اسے استفساریہ نگاہوں سے دیکھا۔ ”میں اپنے دوست کا آخری دیدار کرنا چاہتا ہوں۔“ تابش کی آنکھوں سے غلام حسین کا ذکر کرتے ہی آنسو چھلک پڑے۔ اس کا اداس چہرہ اور نم آنکھیں دیکھ کر حسن بھی متاثر ہوا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

”حسین صاحب سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟“

”وہ میرے دوست بھائی باپ سبھی کچھ تھے۔ انہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب ساری دنیا مجھے ٹھکرا چکی تھی۔“ تابش نے گلوگیر لہجے میں کہا اور اپنی روداد سنا ڈالی۔

حسن خان حیرت اور دلچسپی سے تابش کی ناقابل یقین کہانی سنتا رہا۔ حسن ہی کی زبانی تابش کو اصل حالات کا علم ہوا۔ حسین صاحب کے قاتل فی الحال روپوش ہیں۔ پولیس ان کی تلاش میں ہے اور انشاءاللہ وہ جلد ہی قانون کی گرفت میں ہوں گے آج شام کو حسین صاحب کی میت ان کے آبائی گاؤں پہنچائی جائے گی۔ تم چاہو تو ساتھ جا سکتے ہو۔“ شام کو وہ خصوصی طیارے میں حسین صاحب کی میت لے کر ان کے آبائی گاؤں پہنچے ان کی موت کی خبر سنتے ہی گاؤں کا ہر فرد رو رہا تھا۔ حسین صاحب زندگی میں ہر ایک کے کام آتے تھے۔ گاؤں میں مسجد اسکول اور سڑکیں تک انہوں نے اپنی ذاتی رقم سے بنوائی تھیں۔ حسین صاحب کا آخری دیدار کرتے ہوئے تابش دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ان کے چہرے پر ایک عجیب قسم کا نور تھا۔ حسین صاحب کی تدفین کے بعد وہ دوسرے روز واپس لوٹ گئے۔

تابش اور شلپا SSP کے ساتھ فیروز پور واپس لوٹ گئے، حسن خان پولیس اسٹیشن گیا۔ نیا انسپکٹر چارج لینے پہنچ چکا تھا۔ حسن خان اسے چارج دے کر ہیڈ کوارٹر روانہ ہو گیا۔

تابش شلپا کے ہمراہ فیروز پور بازار میں ثناءاللہ نامی دکاندار کے پاس جا پہنچا۔ یہ وہی دکاندار تھا۔ جس سے وہ پہلی بار فیروز پور آ کر ملا تھا۔ ثناءاللہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھا۔ اور دکان سے باہر نکل کر تابش سے بغل گیر ہو گیا۔ پھر شلپا پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ”باؤ جی آج تو بھرجائی کو بھی لے آئے ہو۔ چلو گھر چلتے ہیں۔ بھابھی کا بیچ بازار میں اس طرح کھڑے رہنا مناسب نہیں۔“ لفظ بھرجائی سنتے ہی شلپا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا جبکہ تابش گڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

”ثناءاللہ کی بیوی نازش بھی ثناءاللہ کی طرح سادہ لوح اور مخلص تھی جبکہ اس کے دونوں معصوم بیٹے بے انتہا شریر تھے۔ ثنااللہ نے ان کی ضیافت گھر کے پلے دیسی مرغے سے کی۔

کھانے کے کچھ دیر بعد باتوں کے دوران ثنااللہ نے کہا۔ ”تابش بھائی چار روز پہلے میری دکان پر غلام حسین نامی شخص آیا تھا۔ اسے تمہاری تلاش تھی اور وہ خود کو تمہارا رشتہ دار بتا رہا تھا۔“ حسین کے ذکر پر تابش کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”کیا ہوا خیریت تو ہے۔“ ثناءاللہ گھبرا گیا۔

تابش نے مختصر الفاظ میں حسین پر ڈھائے جانے والے ظلم کی داستان سنا ڈالی۔

”اس پولیس مقابلے کے بارے میں، میں نے بھی سنا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ شہر سے کچھ پولیس اہلکار بھی آئے تھے۔ انہیں کرم الٰہی اور اس کے ساتھیوں کی تلاش تھی۔ ابھی پرسوں کی بات ہے۔“ اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

”میں نے کرم الٰہی اور چار سپاہیوں کو سول کپڑوں میں شیش محل کی طرف جاتے دیکھا۔ پھر رات کو جب میں عشاء کی نماز کے بعد گھر جا رہا تھا تو شکرا کی سیاہ شیشوں والی پراڈو دیکھی۔ جس کا رخ جنگل کی طرف تھا۔“ تابش کا ماتھا ٹھنکا اور اس کا ذہن تانے بانے بننے لگا۔ ”ضرور کرم الٰہی اپنے ساتھی اہلکاروں کے ہمراہ شکرا کے ساتھ جنگل میں بابا مدثر کی طرف گیا ہو گا۔ پھر نہ جانے ان دونوں نے بابا مدثر کے ساتھ کیا

دک کیا ہو گا۔“ وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ چاروں ...ہی بابا مدثر سمیت کسی نامعلوم گڑھے میں دفن ہیں جو ...ز محشر ہی اس گڑھے سے برآمد ہوں گے۔

رات دس بجے کے قریب۔ جب ثناء اللہ کے ...اٹے گونج رہے تھے۔ اس نے اپنے سفری بیگ سے ...نجر نکال کر پنڈلی سے باندھ دیا۔ اور پسٹل اپنے لباس ...ں چھپا کر دبے قدموں کمرے سے باہر نکلا اور بیرونی ...روازہ کھولنے کے بجائے دیوار پھلانگنا مناسب سمجھا کہ ...ندر سے دوبارہ دروازہ مقفل کرنے والا کوئی نہ تھا اگر گھر ...کے کسی فرد کو جگاتا تو وہ اس کا ارادہ بھانپ کر رات کے ...ں پہر گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔

وہ نصف شب کے قریب بابا مدثر کی جھونپڑی ...یں داخل ہوا۔ نرم گرم بستر پر سونے والا راشی پولیس ...سپکٹر سخت اور کھردری زمین پر آنے والی شامت سے بے خبر سو رہا تھا۔

تابش نے اپنے لباس سے پسٹل نکال کر ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اس نے لاک پن ہٹا کر اس کے پہلو میں ٹھوکر رسید کی۔ کرم الٰہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ تابش کو اپنی طرف پسٹل تانے دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیں اڑنے لگیں۔ ”کیوں کرم الٰہی عرف انکاؤنٹر اسپیشلسٹ موت کو سامنے دیکھ کر کیسا لگ رہا ہے۔ تم نے دھوکے سے حسین کو شہید کیا تھا۔ میں تمہیں للکار کر کتے کی موت ماروں گا۔ تمہارے وہ چاروں ساتھی کہاں چھپے ہیں اور اس جھونپڑی میں رہنے والا بابا مدثر کہاں ہیں؟“ تابش نے اس کی ٹانگوں کے بیچ اسٹریٹ کک رسید کی۔

وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا جھکا۔ درد کی شدت سے اس کے چہرے کے تاثرات بگڑ گئے تھے۔ چند لمحے بعد وہ سیدھا ہوا۔ اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

”بتاؤ تمہارے وہ ساتھی اور بابا مدثر کہاں ہیں ورنہ تمہارے جسم کی ایک ایک بوٹی الگ کر دوں گا۔“ تابش نے سفاک لہجے میں کہا۔

”حسین کو گرفتار کرتے وقت وہ بوڑھا جیپ کے سامنے آ گیا تھا۔ جسے میں نے گولی مار دی۔ اور میرے ساتھی چاروں سپاہیوں کو شکرا نے کل رات قتل کر دیا۔ پھر کالیا اور میں نے گڑھا کھود کر اس بوڑھے اور سپاہیوں کی لاشیں اس گڑھے میں دفن کر دیں۔“ تابش کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے دایاں پاؤں آگے بڑھایا اور اپنے بدن کو Move کرتے ہوئے زوردار پنچ کرم الٰہی کے جبڑے پر رسید کیا۔ یہ کسی عام انسان کا گھونسہ نہیں تھا بلکہ مارشل آرٹ کے ماہر حسین کے شاگرد کا فولادی پنچ تھا۔ کرم الٰہی کے سامنے کے چار دانت ٹوٹ کر باہر آ گرے اور منہ سے خون بہنے لگا۔

اسی وقت تابش کی نظر جھونپڑی میں ایک طرف پڑے بیلچے پر پڑی اس نے دوسرے ہاتھ میں بیلچہ اٹھا لیا۔ یہ بیلچہ اس جھونپڑی میں حسین کے ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دیکھ چکا تھا۔ اس نے بیلچہ کرم الٰہی کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ ”اس گڑھے کی طرف چلو جہاں تم لوگوں نے لاشیں دفن کی ہیں۔“ اس نے بیلچہ اٹھایا اور مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا جھونپڑی کے عقب میں جا پہنچا۔ یہاں زمین قدرے نرم تھی۔ ”وہ یہاں دفن ہیں۔“ کرم الٰہی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”اب احتیاط سے زمین کھودو۔“ تابش نے نیا حکم صادر کیا۔ ”کیوں؟“ کرم الٰہی گڑھا کھودنے کے تصور سے ہی لرز اٹھا۔ ”تم لوگوں نے راشی پولیس اہلکاروں کے ساتھ بابا مدثر جیسے نیک انسان کو دفن کیا ہے۔ ان کی لاش باہر نکالنی ہے چلو بیلچہ چلاؤ۔“ اس نے گولی چلائی جو کرم الٰہی کے قدموں کے قریب زمین میں لگی۔ ڈر اور خوف سے اس کی حالت پہلے ہی پتلی تھی۔ ویسے بھی حرام کی کمائی اور شراب نے اسے کھوکھلا کر دیا تھا۔ اس نے ہمیشہ عہدے اور اسلحے کے بل بوتے پر ظلم و ستم کا بازار گرم کیا تھا۔ اب یہ دونوں چیزیں ہی اس کے پاس نہ تھیں۔ اس لئے وہ کسی حقیر کیچوے کی طرح بے بس تھا۔

وہ کھدائی کرتے کرتے تھک کر رکتا تو تابش کے ہوائی فائر پر دوبارہ شروع ہو جاتا۔ بالآخر ایک گھنٹے کی انتھک محنت سے وہ گڑھا کھود چکا تھا۔ لاشیں ایک دوسرے پر پڑی تھیں۔ پھر اس نے تابش کے حکم پر بابا

مدثر کی لاش گڑھے سے باہر نکالی، ہڈحرام کرم الٰہی کا جسم پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ بابا مدثر کی تین روز پرانی لاش اسی طرح تر و تازہ تھی۔ جیسے وہ آج ہی مرا ہو۔ ''چلو اب اس لاش کو اٹھاؤ۔'' بابا مدثر کی لاش کرم الٰہی نے اٹھائی اور کچھ فاصلے پر واقع بابا مدثر کی بیٹی کی قبر تک لے آیا اور تابش کے اشارے پر لاش کو ایک طرف لٹا دیا۔

''اب اس قبر کے برابر بھی قبر تم ہی کھودو گے۔''

تابش نے حکم دیا کرم الٰہی جھجکا تو تابش نے اس کے قدموں میں گولی چلائی۔ وہ ہانپتے کانپتے قبر کھودنے لگا۔ گڑھے کے بعد مسلسل قبر کی کھدائی سے اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ چکے تھے اور بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی بھی محنت طلب کام نہیں کیا تھا عمر بھر حرام کی کھاتا رہا۔ مگر اب وہ گن پوائنٹ پر مجبوراً کھدائی کر رہا تھا۔ قبر کھد جانے کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر ایک طرف گر گیا اور ہانپنے لگا۔ ''چلو اب بابا مدثر کو احتیاط سے قبر میں اتارو۔'' اور پھر تابش کے کہنے پر قبر میں مٹی بھر دی۔

''اب چلو اس گڑھے کی طرف جس میں تمہارے پیٹی بھائیوں کی لاشیں پڑی ہیں۔'' تابش نے اس کی پشت پر لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ وہ کراہتا ہوا بیلچہ سمیت گرا بمشکل اٹھا بیلچہ اٹھا کر لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا گڑھے کے قریب آ گیا۔ ''خدا کے لئے اب مجھے یہ گڑھا بھرنے کے لئے مت کہنا۔ بیلچہ چلا چلا کر میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ چکے ہیں اور بدن کا جوڑ جوڑ دکھ رہا ہے۔'' اس نے ہانپتے ہوئے فریاد کی۔

''مجھے علم ہے۔ رشوت کی کمائی اور شراب نوشی نے تمہیں کھوکھلا کر دیا ہے۔ مگر گھبراؤ مت اب گڑھا بھرنے کا کام میں خود کروں گا۔'' تابش کے ان الفاظ سے جیسے وہ جی اٹھا۔ مگر اس کے آگے کے الفاظ سنتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ تابش کہہ رہا تھا۔ ''تم ڈیوٹی کے دوران اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مجرموں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ اور بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے۔ نہ جانے کتنے بے گناہوں کو تم نے انکاؤنٹر کے نام سے دنیا سے رخصت کیا۔ عامر اور حسین کا تو مجھے علم ہے مگر دوسروں کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ آج میں تمہارا انکاؤنٹر کروں گا اور اس گڑھے میں تمہیں تمہارے ساتھیوں کی لاش کے ساتھ زندہ دفن کروں گا۔ تم روز حشر تک اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہو گے۔''

''نہیں تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' کرم الٰہی نے بے اختیار ایک قدم آگے بڑھا دیا تو تابش نے ٹریگر دبا دیا۔ گولی اس کی دائیں ٹانگ کے گھٹنے میں لگی۔ وہ کربناک انداز میں چیختا ہوا گرا۔ ''اٹھو اب حرام خور تم عمر بھر اسی طرح بے گناہوں پر گولیاں برساتے رہے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کرم الٰہی پر ایک بار پھر گولی چلائی۔ اس بار گولی اس کے بائیں گھٹنے میں لگی۔ اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ تابش آگے بڑھا اس کا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گڑھے کے کنارے لے گیا۔ ''خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔'' وہ زندگی بچانے کے لئے اس کی منت سماجت کرنے لگا۔

''عامر نے بھی تمہارے آگے گڑگڑاتے ہوئے زندگی کی بھیک مانگی تھی۔'' تابش نے اسے گڑھے میں دھکیلا۔ پسٹل اپنے لباس میں رکھ کر بیلچے سے مٹی گڑھے میں ڈالنے لگا۔ کرم الٰہی نے اٹھ کر باہر نکلنا چاہا تو اس نے بیلچے کے کنارے سے کرم الٰہی کے شانے پر بھرپور وار کیا۔ اس کے شانے سے خون بہنے لگا اور وہ چیختے ہوئے دوبارہ گڑھے میں گر گیا تو تابش دوبارہ گڑھے میں مٹی بھرنے لگا۔ اس دوران وہ کراہتا ہوا تابش کے آگے گڑگڑاتا رہا۔ مگر تابش اس کی التجا سے بے نیاز اس پر مٹی پھینکتا رہا۔ مٹی کرم الٰہی کے سینے تک پہنچ چکی تھی۔ اب وہ تابش کو گالیاں دے رہا تھا۔ پھر مٹی اس کے منہ پر پڑی تو وہ بری طرح کھانسنے لگا۔ مگر بالآخر گڑھے میں مٹی بھر جانے سے اس کا چہرہ بھی دکھائی دینا بند ہو گیا۔

تابش نے گڑھا بھرنے کے بعد بیلچے کی پشت سے زمین ہموار کی۔ اب اس گڑھے کا نام و نشان تک دکھائی

نہیں دے رہا تھا۔ تابش نے بیلچہ جھونپڑی میں رکھا۔

منہ ہاتھ دھو کر بابا مدثر کی قبر پر پہنچا۔ فاتحہ خوانی کی اور تھکے تھکے قدموں سے واپس پلٹ پڑا۔ وہ جس وقت ثناء اللہ کے گھر پہنچا تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ جس خاموشی سے گھر سے نکلا تھا، اسی خاموشی سے اندر داخل ہوا اور اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

ثناء اللہ صبح ناشتہ کرنے کے بعد دکان پر چلا گیا۔ آٹھ بجے کے قریب تابش اٹھا۔ تو نازش نے دیسی گھی سے بنا پراٹھا اور چائے اسے دی۔ جسے نوش کرنے کے بعد وہ دکان پر گیا اور باتوں ہی باتوں میں ثناء اللہ سے کہا۔

''شکرا اور اس کے کارندے فیروز پور کے باسیوں پر ظلم ڈھاتے ہیں اور دن دیہاڑے لوگوں کی بہو بیٹیوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ تم سب مل کر اس کے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کرتے۔''

''تابش بابو شکرا کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ پولیس اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔ جبکہ گاؤں والوں کی ہمت ہی نہیں کہ شکرا اور اس کے کارندے جدید ہتھیاروں سے لیس ہیں۔'' ثناء اللہ نے کہا۔

''تم ایک بار فیروز پور کے نوجوانوں کو کہیں اکٹھا کرو۔ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔'' تابش بولا۔

اسی روز شام کو دکان بند کرنے کے بعد ثناء اللہ نے گاؤں کے اہم افراد کو اکٹھا کیا۔ یہ کوئی چالیس پچاس افراد تھے۔ جو فیروز پور کے گورنمنٹ اسکول کے احاطے میں بیٹھے تھے۔ تابش کہہ رہا تھا۔ ''تم لوگ برسوں سے شکرا کے ظلم سہتے آئے ہو۔ شانی، شکرا اور اس کے کارندے تم لوگوں کی جان اور عزت سے کھیلتے رہے۔ مگر تم بجائے اسے روکنے کے خاموشی سے یہ ظلم سہتے رہے ذرا غور کرو شکرا اور اس کے کارندے درجن بھر ہوں گے۔ جب کہ فیروز پور کی آبادی سیکڑوں افراد پر مشتمل ہے۔ اگر تم سب ہمت کرو تو شکرا کے مظالم کا منہ توڑ جواب دے سکتے ہو۔ دراصل مظلوم کی خاموشی اور کمزوری ہی ظالم کی طاقت ہوتی ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ شکرا اور اس کے کارندے جب گاؤں کے کسی فرد پر ظلم ڈھاتے ہیں تو دوسرے یہ سب خاموشی سے دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ سب دوسرے پر بیت رہا ہے ہم پر تو نہیں بیت رہا۔

لیکن کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ ایک روز اس کی باری بھی آئے گی اس کی مثال بابا مدثر کا بیٹا عامر ہے جسے دن دیہاڑے شکرا کے حکم پر کرم الٰہی نے بے گناہ گرفتار کیا اور انکاؤنٹر کے نام پر مار ڈالا پھر اس کی بیٹی کو اغوا کرنے کے بعد ان درندوں نے اسے نوچ کھسوٹ کر قتل کر دیا۔ تب بھی تم لوگ خاموش رہے۔ اس طرح نہ جانے ان لوگوں نے کئی لڑکیوں کی عزت برباد کی مگر تم لوگ آنکھیں بند کئے خاموش رہے۔ بلی کو سامنے دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر کے سمجھتا ہے کہ وہ بلی کو نہیں دیکھ رہا تو وہ بھی اسے نہیں دیکھ رہی ہو گی۔ اسی طرح شتر مرغ خطرے کو سامنے دیکھ کر ریت میں منہ چھپا لیتا ہے۔ تم لوگ کب تک شکرا کا ظلم و ستم سہتے رہو گے۔ ایک بار ہمت کر کے اٹھو پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' پھر اس نے شعر پڑھا۔

اٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

وہ کافی دیر تک ان لوگوں کو سمجھتا رہا۔ مگر ان کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ وہ مایوس ہو کر ثناء اللہ کے ساتھ گھر لوٹ گیا۔

رات کے وقت جب سب محو خواب تھے پانچ مسلح افراد ثناء اللہ کے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوئے۔ اور اس کمرے میں جا گھسے جس میں تابش اور ثناء اللہ دو الگ الگ چارپائیوں پر محو خواب تھے۔

ان میں سے ایک نے رائفل کی نال تابش کے پہلو میں چبھوئی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ ''کون ہو تم لوگ؟'' مسلح افراد کو سامنے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

''تمہیں راجہ شکرا نے یاد کیا ہے۔'' ان میں سے ایک نے سفاک لہجے میں کہا۔

ثناء اللہ بھی آواز سن کر جاگ چکا تھا۔ مگر ڈر اور خوف سے اپنی چارپائی پر دبکا رہا۔ مسلح افراد نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور تابش کو رائفلوں کی زد میں

لئے ہوئے باہر نکلے جہاں شکرا کی پراڈو موجود تھی۔ فرنٹ سیٹ پر کالیا بیٹھا تھا جو اسے دیکھ کر زہریلے انداز میں مسکرایا۔

تابش کو شیش محل کے احاطے میں آدم خور شیر کے اسی پنجرے کے قریب دوسرے پنجرے میں دھکیل کر باہر سے تالا لگا دیا گیا۔ جہاں وہ پہلے بھی قید رہ چکا تھا۔ کالیا اور کارندے واپس لوٹ گئے۔ ساتھ والے پنجرے میں موجود شیر اسے دیکھتے ہی غرانے لگا۔ اور دھاڑ کر اس تک پہنچنا چاہا۔ مگر بیچ کے دروازے پر تالے کی وجہ سے اس تک پہنچنے سے قاصر تھا اور پھر پنجرے کی سلاخیں بھی مضبوط تھیں۔ تابش ساری رات جاگتا رہا اور شیر کو غراتے اور دھاڑتے دیکھتا رہا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب شکرا، کالیا، پانچ رائفل بردار کارندوں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ شیر کے پنجرے سے کچھ فاصلے پر دو کرسیاں پڑی تھیں۔ شکرا ایک شاہانہ طرز کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور پانچوں مسلح اہلکار اس کی پشت پر رائفلیں تان کر کھڑے ہوئے۔ ''تابش میں نے فیروز پور کے تمام باسیوں کو یہاں آنے کا حکم دیا ہے۔ تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ شکرا سے ٹکرانے اور بغاوت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ میں نے گاؤں والوں کو تنبیہ کردی ہے کہ جو یہاں نہیں آئے گا اسے اور اس کے گھر کے تمام افراد کو زندہ جلا دیا جائے گا۔ تابش تمہارے جرائم کی فہرست طویل ہے تم میرے بیٹے شانی کے قاتل ہو۔ تمہارا ساتھی حسین تو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے اور اب تمہاری باری ہے۔''

تابش نے اپنا رخ اس کی طرف کیا اور للکار کر کہا۔ ''شکرا میں نے حسین کے قاتل انسپکٹر کرم الٰہی کو تو اسی گڑھے میں زندہ دفن کردیا ہے۔ جس میں اس کے چار ساتھی دفن ہیں۔ رہ گئے تم تو تم میرے والدین کے قاتل ہو۔ تمہارے ہاتھ میرے دوست کے خون سے بھی رنگے ہوئے ہیں۔ تم نے دھوکے سے غلام حسین پر وار کیا ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھنا تمہاری موت میرے ہی ہاتھوں لکھی ہے۔ تمہارا گرو بدری نارائن بھی جہنم رسید ہوچکا ہے۔ جس کے ساتھ مل کر برسوں پہلے تم نے میرے ماں باپ کے خون سے ہاتھ رنگے تھے۔''

''تابش جتنا بولنا ہے بول لے۔ ابھی کچھ دیر بعد آدم خور شیر کا پنجرہ کھل جائے گا اور تو کتے کی موت مرے گا۔'' شکرا نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

فیروز پور کے باسی ایک ایک کرکے آتے رہے۔ اور شکرا کے کارندوں کے اشارے پر احاطے کے گرد بنی اسٹیڈیم کی طرز کی سیڑھیوں پر بیٹھتے رہے۔ یہ کوئی تین چار سو افراد تھے جو خاموشی سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں جو شکرا کے حکم پر مجبوراً آئے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شکرا کے حکم کی خلاف ورزی پر ان کے خاندان پر ظلم وستم کی انتہا کردی جائے گی۔ کالیا سمیت شکرا کے بیس پچیس مسلح افراد احاطے میں چوکس کھڑے تھے۔ پھر ایک طرف سے شلپا آتی دکھائی دی۔ اس کے ساتھ کالیا کا ایک مسلح کارندہ بھی تھا۔ جس نے اس کے پہلو سے رائفل کی نال لگا رکھی تھی۔ شلپا کو ایک طرف بٹھانے کے بعد رائفل بردار اس پر رائفل تان کر کھڑا ہوگیا۔

اس ہجوم میں تابش کو شانا اللہ کہیں بھی نظر نہ آیا البتہ اس کی بیوی نازش ایک طرف سر جھکائے بیٹھی تھی اس کے چہرے پر خوف وہراس کے تاثرات تھے۔

شکرا اپنی کرسی سے اٹھا اور بلند آواز میں کہنے لگا۔ ''فیروز پور کے باسیو! آج فیروز پور میں تابش نامی اس نوجوان کو موت کی سزا دی جائے گی۔ یہ میرے بھائی راجہ منیر احمد کا بیٹا یعنی میرا بھتیجا بھی ہے۔ اس کا جرم شانی کا قتل اور مجھ سے غداری ہے۔ میں راجہ شکرا راجہ مہاراجوں کی روایات کو برقرار رکھوں گا۔ کیونکہ میں اس ریاست کا راجہ شکرا ہوں۔

تابش کو ایک نیزا دیا جائے گا۔ اور پھر دونوں پنجروں کے بیچ موجود دروازہ کھول دیا جائے گا۔ اگر تابش نے آدم خور شیر کو مار ڈالا تو میں اسے معاف کردوں گا۔'' وہ دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

تابش ہنسا اور گرجدار آواز میں اسے للکارا۔

''شکرا۔ گیدڑ شیر کی کھال اوڑھنے سے شیر نہیں بن جاتا۔ اسی طرح تم اپنے نام کے آگے راجہ لگانے سے راجہ نہیں بن سکتے۔ تم ہیجڑوں سے بھی بدتر ہو۔ تم نے دھوکے سے میرے ماں باپ اور بھائیوں جیسے دوست غلام حسین کا خون کیا ہے لیکن میرا وعدہ ہے تمہیں للکار کر ماروں گا۔'' تابش کے الفاظ سنتے ہی شکرا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ اس نے کالیا کے کان میں کچھ کہا۔

کالیا نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک طرف چل دیا۔ جب وہ واپس لوٹا تو اس کے ہاتھ میں نیزا تھا۔ جو اس نے پنجرے کی سلاخوں سے تابش کو تھمایا اور پھر اپنی جیب سے دو چابیاں نکال کر تابش کو دیں۔ ''ان میں سے ایک چابی شیر کے پنجرے کی ہے۔ جب کہ دوسری چابی اس پنجرے کے تالے کی ہے جس میں تم قید ہو۔ تم شیر کے پنجرے کا تالا کھولو گے۔ اور شیر کو مارنے میں کامیاب رہے جو کہ ناممکن ہے تو دوسری چابی سے سلاخوں سے ہاتھ باہر نکال کر اپنے پنجرے کا تالا کھول کر باہر آجانا، تمہیں معاف کردیا جائے گا۔ اور ہاں تمہاری معشوقہ گن پوائنٹ پر ہے کسی کی خلاف ورزی یا کوئی چالاکی دکھانے کی صورت میں اسے گولی ماروی جائے گی۔ اور بچے گے تم بھی نہیں!''

تابش آہستگی سے درمیانی دروازے کی طرف بڑھا شیر بے چینی سے ٹہلتے ہوئے غرا رہا تھا۔ خود تابش کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور کنپٹیاں سائیں سائیں کررہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ محض ایک نیزے سے شیر جیسے درندے کو ہلاک کرپائے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ ناممکن نہیں ہے۔ اسی وقت اس کی سماعت میں حسین کے الفاظ گونجنے لگے۔ اس نے کہا تھا۔ ''دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں۔ اگر انسان ہمت اور حوصلے سے کام لے تو ہر مشکل ہر مصیبت کا مقابلہ کرسکتا ہے۔'' وہ نئے عزم اور حوصلے سے بڑھا اور درمیانی دروازے کا تالا کھولنے کے بعد کنڈی کھول کر سرعت سے پیچھے ہٹا۔

شیر نے دھاڑتے ہوئے درمیانی دروازے پر پنجہ مارا تو دروازہ کھل گیا۔ شیر غراتا ہوا تابش والے پنجرے میں داخل ہوگیا۔ اس کی انگاروں کی طرح دہکتی آنکھیں تابش پر جمی ہوئی تھیں اور دم تیزی سے گردش کررہی تھی۔ سیکڑوں افراد کا مجمع خاموشی سے انسان اور شیر جیسے درندے کا یہ حیرت انگیز مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ جس کا انجام سب ہی جانتے تھے۔

تابش کا اس جسیم شیر سے ایک نیزے کے بل بوتے پر جیتنا ناممکن تھا۔ شلپا کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے محبوب کو دیکھ رہی تھی۔ پورا مجمع پر سکوت طاری تھا۔ اس خاموشی میں صرف آدم خور شیر کے غرانے اور دھاڑنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پھر شیر نے دھاڑتے ہوئے جست لگائی۔ تابش نے نیزا سنبھال کر برقی سرعت سے ایک طرف چھلانگ لگائی۔ اور بمشکل شیر کے خونی پنجوں سے جان بچائی۔ شیر نے دھاڑتے ہوئے ایک بار پھر چھلانگ لگائی۔ تابش نے دائیں طرف چھلانگ لگا کر جان بچانا چاہی۔ مگر اس بار شیر کا اگلا پنجہ اس کے شانے پر لگا۔ اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اس کا شانہ جسم سے الگ کردیا ہو۔

درد اور اذیت کی کسیلی لہریں اس کے جسم میں سرایت کرگئیں۔ تابش کے شانے سے خون بہہ رہا تھا۔ شیر نے دھاڑتے ہوئے ایک بر پھر چھلانگ لگائی۔ اس بار تابش نے چابک دستی سے ایک طرف ہٹتے ہوئے نیزے والے ہاتھ کو حرکت دی۔ نیزا شیر کی پسلیوں میں جا گھسا۔ اس زخم سے شیر کو کوئی خاص نقصان تو نہیں پہنچا۔ مگر زخمی ہوتے ہی وہ پہلے سے بھی زیادہ بپھر گیا۔ اور دھاڑتے ہوئے جست لگائی اس بار تابش تیزی سے بائیں طرف ہٹا اور انتہائی مہارت سے نیزے کو تاک کر شیر کے چہرے پر وار کیا۔ نیزے کی نوکیلی اور تیز نوک شیر کی دائیں آنکھ میں جا گھسی۔ آدم خور شیر کی دھاڑوں سے میدان گونج رہا تھا۔ تابش کی نظریں زخمی شیر پر جمی ہوئی تھیں۔ شکرا کے چہرے پر غور وفکر کے تاثرات تھے۔

تابش لوہے کا چنا ثابت ہوا تھا اور خلاف معمول

شیر کو زخمی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک آنکھ سے بھی محروم کر دیا تھا۔ تابش کو نیزا دینے کے فیصلے پر بھی شکرا پچھتا رہا تھا۔ شکرا اس کی رہائی کا وعدہ تو کر چکا تھا۔ مگر یہ ایک جھوٹا وعدہ تھا۔ اگر جیت تابش کی ہوتی تو اس کے کارندے تابش کو گولیوں سے بھون ڈالتے۔

سب کی نظریں درندے اور اس بہادر انسان پر جمی ہوئی تھیں۔ ایک طرف آدم خور زخمی شیر تھا جو زخمی ہوتے ہی بپھر کر مزید خطرناک ہو چکا تھا۔ دوسری طرف غلام حسین جیسے استاد کا لائق ترین شاگرد جو بے جگری سے اس درندے کا مقابلہ کر رہا تھا۔ درحقیقت یہ مقابلہ شیر اور غلام حسین کی تربیت کا تھا۔ اس بار شیر نے دل دہلا دینے والی دھاڑ سے چھلانگ لگائی تو تابش نے ایک طرف ہٹتے ہوئے نیزے والا ہاتھ گھمایا اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ نیزا شیر کی گردن کے آر پار ہو گیا۔ خون کا فوارا بلند ہوا اور شیر نیچے گر کر تڑپنے لگا۔

تابش نے تڑپتے ہوئے شیر کی گردن سے کھینچ کر نیزہ باہر نکالا اور دوبارہ سر سے بلند کر کے اس کے سینے میں گھسیڑ دیا۔ غلام حسین جیسے شیر دل کا تربیت یافتہ شاگرد شیر جیسے خونی درندے کو دست بدست لڑائی میں شکست دینے میں کامیاب ہو کر ثابت کر چکا تھا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔

شکرا تلملا کر نشست سے اٹھا۔ اس کے اشارے پر اس کے اہلکاروں نے رائفلوں کا رخ تابش کی طرف کر دیا۔

اچانک ایک طرف سے شور و غل کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ یہ فیروز پور کے سینکڑوں افراد کا ہجوم تھا۔ جن کی قیادت ثنا اللہ دکاندار کر رہا تھا۔ نوجوانوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، خنجر، بیلچے، ڈنڈے غرض جس کے ہاتھ جو لگا تھا گھر سے اٹھا لایا تھا۔ رائفل بردار اس اچانک افتاد سے گھبرا گئے تھے۔ انہوں نے مڑ کر اس ہجوم پر گولیاں بھی چلائیں۔ مگر جب تک بپھرے ہوئے افراد کا غول ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ چند افراد گولیوں کا نشانہ بھی بنے۔ مگر اس سے ان کے حوصلے اور جوش و خروش میں کوئی کمی نہ آئی۔ انہوں نے سامنے آنے والے مسلح اہلکاروں کو پچھاڑ کر رکھ دیا۔

اب شکرا کے کارندوں اور فیروز پور کے باسیوں میں دست بدست لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

تابش نے چابی سے پنجرے کا دروازہ کھولا اور باہر نکلا، شلپا بے اختیار اٹھی اور اس کی طرف بڑھی، شلپا سے محض چند قدم پر کھڑے شکرا کے کارندے نے رائفل کا رخ تابش کی طرف کر کے ٹریگر دبا دیا رائفل سنگل موڈ پر تھی۔ فائر کی ہولناک آواز سے گولی چلی تابش کو خطرے میں دیکھ کر شلپا سامنے آ گئی۔ گولی شلپا کے کندھے میں لگی تو وہ دلدوز انداز میں چیخی اور گر پڑی۔

شلپا کو گولی کھا کر گرتا دیکھ کر نوجوانوں کا ایک جتھا مسلح کارندے پر پل پڑا۔ ادھر کالیا اچانک تابش کے سامنے آ گیا اس نے رائفل کا رخ تابش کی طرف کیا ہی تھا کہ تابش نے رائفل کی نال پر ہاتھ ڈالتے ہوئے اسٹریٹ کک اس کی ٹانگوں کے درمیان رسید کی۔ وہ کراہتا ہوا جھکا رائفل پر ہاتھوں کی گرفت کمزور ہوئی۔

تابش نے رائفل جھپٹی اور رائفل کے بٹ کا وار اس پر کیا اور پھر تابش نے رائفل کا رخ کالیا کی طرف کیا او برسٹ موڈ پر کر کے ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑاہٹ کی گونجدار آواز سے کالیا کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا۔ ادھر سینکڑوں افراد کا مجمع شکرا کے درجنوں افراد کو موت کے گھاٹ اتار چکا تھا۔

بساط کا رخ پلٹتا دیکھ کر شکرا بھاگتا ہوا شیش محل میں جا گھسا اور دروازے بند کرنے لگا۔ اب سینکڑوں افراد کا مجمع شیش محل کی طرف جا رہا تھا۔ ان میں سے بہت سے افراد کے ہاتھوں میں شیشے کی بوتلیں اور کین تھے جن میں مٹی کا تیل اور پیٹرول تھا۔

اب شیش محل کو گھیرے میں لے کر انہوں نے شیش محل کو پیٹرول اور مٹی کے تیل سے بھگو دیا۔ پھر ان میں سے کسی نے ماچس نکالی، تیلی جلا کر شیش محل پر پھینک دی۔ شیش محل میں آگ بھڑک اٹھی۔ جو رفتہ رفتہ

پھیلتی چلی گئی۔

شیش محل آگ کے شعلوں میں گھر چکا تھا۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی۔ تابش نے شدید زخمی شلپا کو اٹھایا اور احاطے سے باہر بھاگا۔ اب فیروز پور کے باسی بھی احاطے سے نکل رہے تھے۔

شکرا نے شیش محل کو شعلوں میں گھرا دیکھ کر جان بچانے کے لئے دروازے کی طرف دوڑنا چاہا۔ مگر سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ آگ کے شعلے دروازوں اور دیواروں تک کو چاٹ رہے تھے۔ تڑخ تڑخ کی گونجدار آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ایک بھاری بھرکم فانوس آگ کے شعلوں میں گھرا عین اس جگہ گرنے لگا جہاں شکرا موجود تھا۔ فانوس تلے دبتے ہوئے شکرا کی آخری چیخ بلند ہوئی۔

شیش محل شکرا کا مدفن بن چکا تھا۔

فیروز پور پولیس کا عملہ شیش محل پہنچ چکا تھا۔ شلپا کو فیروز پور تھانے کی جیپ میں سرکاری اسپتال پہنچا دیا گیا۔ تابش اس کے ساتھ تھا۔

آپریشن کے بعد شلپا کے جسم سے گولی نکال دی گئی۔ مگر اس کی زندگی ہنوز خطرے میں تھی۔ اسے آکسیجن ماسک لگا کر شہر کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ ایمبولینس میں تابش شہر کے اسپتال پہنچنے تک اس کا ہاتھ تھامے آنسو بہا رہا۔ اسے شلپا کی محبت بھری باتیں یاد آ رہی تھیں۔

ایشال بھی یہ خبر ملتے ہی عثمان صاحب کے ساتھ اسپتال پہنچ چکی تھی۔ آٹھ گھنٹے بعد ڈاکٹرز نے خبر سنائی کہ شلپا اب خطرے سے باہر ہے۔ باری باری وہ اس سے مل سکتے ہیں۔ سب سے پہلے ایشال ICU میں داخل ہوئی۔ جو نصف گھنٹے تک اندر ہی رہی جب وہ باہر آئی تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی وہ سرگوشی میں عثمان صاحب سے کچھ کہہ رہی تھی اور وہ مسکرا رہے تھے۔

تابش جب ICU میں داخل ہوا تو شلپا بیڈ پر لیٹی تھی۔ خون ڈرپ کے ذریعے اس کی رگوں میں منتقل ہو رہا تھا۔ وہ تابش کو دیکھ کر ہولے سے مسکرائی۔

''شلپا تم نے میری خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی۔ تم واقعی مجھ سے سچی محبت کرتی ہو۔

اور اب میری دھڑکنوں میں بھی دھڑکنے لگی ہو۔ لیکن میں ایشال سے۔'' شلپا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور آنکھیں موند لیں۔

شلپا فی الحال اسپتال میں ہی تھی۔ تابش اور ایشال عثمان صاحب کے ساتھ واپس لوٹ گئے۔

تابش فیروز پور کا اصل مالک تھا۔ شیش محل جل کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس نے فیروز پور کی زمین وہاں کے باسیوں میں تقسیم کر دی۔ اپنے لئے صرف اتنی زمین رکھی جس میں ایک چھوٹا سا گھر وہ اپنی ہونے والی بیوی کے لئے بنا سکتا تھا۔ اور گزاری کے لئے تھوڑی سی زمین۔

عثمان صاحب نے 30 دن بعد ہی تابش کی شادی کا اعلان کر دیا۔ ایک ماہ بعد شادی ہال میں اسٹیج پر موجود کرسیوں میں سے ایک پر ایشال گھونگھٹ نکالے تابش کے پہلو میں موجود تھی۔ قاضی صاحب رجسٹر تھامے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ گواہ بھی تھے باراتی بھی تھے دولہا دلہن بھی موجود تھے۔ اور دونوں کی شادی ہو گئی۔ ادھر عثمان صاحب نے ایشال کی اجازت سے اسی روز اعلان کیا۔ ''بھائیو! دوسری شادی ٹھیک چوتھے روز ہو گی۔'' اور یہ سن کر سارے لوگ ہکا بکا تھے اور سوچ رہے تھے کہ ''چوتھے روز اب کس کی شادی ہو گی؟''

اور چوتھے روز شلپا اور تابش کی رسم نکاح ادا کر دی گئی۔ تمام لوگوں میں ایشال بہت ہی خوش و خرم نظر آ رہی تھی۔ عثمان صاحب نے شلپا کا مسلمان نام عائشہ رکھا تھا۔ شادی کے بعد ایشال اور عائشہ دونوں نے پیار و محبت کی وہ مثال قائم کی کہ لوگ دنگ رہ گئے۔ دونوں سوکن نہیں بلکہ بہن بن کر رہنے لگیں۔ اور تابش خود کو دنیا کا خوش نصیب شوہر سمجھتا تھا کیونکہ اسے ایک نہیں بلکہ دو بیویوں کی خوشیاں ملی تھیں۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے
نہ دانا خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے
(انتخاب: ثناء.....کراچی)

رسوائیوں کے ڈر سے چھوڑ دیا جلنا ہم نے
اپنے ہونٹوں پہ اب کوئی بھی شکایت نہیں
کس کو سناؤں جا کے میں داستان غم
بے درد زمانے میں اب کوئی چاہت نہیں
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

حسن والوں کو سنورنے کی ضرورت کیا ہے
سادگی میں بھی قیامت کی ادا ہوتی ہے
(اظہر علی مغل.....نصیر پور کلاں)

انتظار طویل کے بعد بھیجا قاصد کو ان کی طرف
قاصد پلٹ کر خوب رویا کہ تعارف پوچھتے ہیں وہ
(نعیم اللہ.....خوشاب)

شوق اشعار کو مزاج عشق نہ سمجھو
لفظوں سے عکس بیان کررہا ہوں
اسے لکھا ہوا فرض افسانہ نہ سمجھو
زمانے کی طرح تجھ میں بھی خامیاں ہیں بے شمار
لیکن پھر بھی میں تعریف بیان کرتا ہوں
یہ جذبہ محبت ہے اسے نزاکت نہ سمجھو
(عبدالعزیز بلوچ.....کراچی)

کسی نے پوچھا کہ کوئی چھوڑ کر چلا جائے تو کیا کرو گے
اپنا کبھی چھوڑ کر جاتا نہیں اگر جائے تو اپنا نہیں ہوتا
(خضر حیات.....روڈہ تھل)

عمر بھر لکھتے رہے پھر بھی ورق سادہ رہا
جانے کیا لفظ تھے ہم سے جو تحریر نہ ہوئے
(احسن عزیز.....کوٹھا کلاں)

بس اک ذرا سی بات تھی لیکن تمام عمر
وہ مجھ کو جاگنے کی سزا دے کر سوگیا
(محسن عزیز.....کوٹھا کلاں)

وہ اس ناز سے بیٹھے ہیں لاش کے پاس
جیسے روٹھے ہوئے کو منارہا ہے کوئی
(شہریار عزیز.....کوٹھا کلاں)

وہ بات بات پر میری تربیت کو کوستا ہے
اسے کیا پتہ کہ عشق اچھے اچھوں کو بیکار بنادیتا ہے
(عبدالعلیم بھٹی.....کوٹھا کلاں)

میں بہار کا اک مہکتا ہوا گل تھا
محبت نے بنادیا مجھے محض خزاں کا سوکھا پتا
(انتخاب: مختار عالم.....آزاد کشمیر)

رخ ہوا کے ساتھ چلتے ہیں کچھ لوگ
دو قدم ساتھ چل کے راہ بدلتے ہیں کچھ لوگ
کیا کرو گے رومی بند ہاتھوں میں مقدر کی کرنیں لے کر
جو نصیب میں ہی نہ ہوں، تو نہیں ملتے کچھ لوگ
(عبدالجبار رومی انصاری.....چوہنگ لاہور)

سب ہی ہیں اپنے اپنے خیالات میں سرگرداں
نہ ہم نے کوئی ہمدرد دیکھا نہ کوئی ہم خیال پایا
(انتخاب: شاہد علی راجپوت.....ڈرگ روڈ کراچی)

نہیں آتی تو ان کی یاد مہینوں نہیں آتی
مگر جب یاد آتے ہیں تو اکثر یاد آتے ہیں
(انتخاب: ذکا اللہ بھٹی.....کراچی)

سب کو ہم بھول گئے جوش جنوں میں لیکن
اک تیری یاد تھی ایسی جو بھلائی نہ گئی
(انتخاب: محمد عباس.....کھڈرو سندھ سے)

وابستہ میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں
اچھا کیا جو مجھ کو فراموش کردیا
(انتخاب راشد انور.....کھڈرو سندھ سے)

☆☆

منظر تمہارے شہر کے سارے چرالئے
پلکوں پہ تیری یاد کے تارے سجالئے
میں نے تمہارے واسطے کیا کچھ نہیں کیا
جو غمگسار تھے مرے دشمن بنالئے
دل کے چمن میں کھل نہ سکا پھول جب کوئی
پھر گلشن حیات میں کانٹے اگالئے!
مطلب سمجھ سکا نہ کبھی ان کے پیار کا
یاروں نے آستین میں خنجر چھپالئے!
جس وقت تو نے مجھ سے بچھڑنے کی بات کی
آنکھوں میں تیری دید کے منظر بنالئے
دیکھا جب اس گلی میں تو بے ساختہ حکیم
ہاتھوں میں اہل شہر نے پتھر اٹھالئے
(حکیم خان حکیم.....اٹک)

اب تو لگتی ہیں بہاریں بھی خزاں تیرے بغیر
وہ مزہ اب زندگی میں ہے کہاں تیرے بغیر
خون کے آنسو رلائے فیملی کو ہر گھڑی
تیری اس دائم جدائی کا سماں تیرے بغیر
لے گئی ہو چھین کر اس گھر کی ساری رونقیں
زندگی اب بن گئی ہے امتحان تیرے بغیر
گھر کی ہر اک چیز سے ہے یاد وابستہ تیری
اب یہ سب یادیں ہیں غم کی ترجمان تیرے بغیر
تیرے ہونٹوں کی حلاوت تھی گھلی ہر بات میں
پھیکی پھیکی سی لگے ہر داستاں تیرے بغیر
کس قدر خوشیوں بھرا تھا کاروان زندگی
اب تو بے منزل ہے جیون کا کارواں تیرے بغیر
زندگی کو تو بسر کرنا ہے باحکم خدا
لیکن اجڑا سا لگے سارا جہاں تیرے بغیر
تو قمر کی زندگی تھی تو قمر کی جان تھی
زندگی کیسے گزارے جان جاں تیرے بغیر
(ریاض حسین قمر.....منگلا ڈیم سے)

جن سے تھی امید وفا کی وہ بدل گئے
نفرتوں کے دیپ پھر پیار میں ڈھل گئے
چار سو تاریکیاں اور ایسے میں تنہائیاں
زندگی کے کارواں آج روشنی میں جل گئے
ان سے ملی نظریں ہماری دل کو سکون ملا
کسی کے اداس ہونٹوں پہ پھول خوشی کے کھل گئے
ملنا ہو تو آجاؤ دل پھر بھی سمندر ہے اپنا
گلشن گلشن گلاب مہکے آنکھ بچا کے نکل گئے
ہاتھوں کی لکیروں میں مقدر ڈھونڈتا رہتا ہوں
نصیب میں تھی تنہائی کچھ لوگ وفا کے لئے مچل گئے
تو بھی نہ سوچ لوگوں کی طرح اب جاوید
چپ چاپ رہ کے بھی آنکھوں سے آنسو نکل گئے
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

غم سے خوشی تک، خوشی سے غم تک کتنے موسم آتے ہیں
موسم پر کیا تکیہ کرنا، موسم تو آتے جاتے ہیں
دامن اپنا بھر لیے ہیں، پھول سمجھ کر کانٹوں سے
کتنے نادان آج بھی ہیں جو جان کے دھوکا کھاتے ہیں
قحط وفا کی رت اب آئی مہر و وفا کے خواب نہ بن
دنیا داری کی خاطر جذبوں کے چمن جل جاتے ہیں
بھولی ہوئی یادوں کے سہارے بیٹھے رہو بس سائے میں
جو بھی گزر جاتے ہیں زمانے کب وہ پلٹ کر آتے ہیں
عہد وفا کو بھول گئے ہیں شمع محبت گل کردی
جنہیں یقین گل پاشی تھا وہ پتھر برساتے ہیں
جن سے تقدس رشتوں کا کانٹا بن کر چبھ جاتا ہے
اپنے کرم فرماؤں سے کچھ ایسے بھی نام آتے ہیں
(پروفیسر واجد نگینوی.....کراچی)

دل مرا پیش بارگاہ میں ہے
فیصلہ سارا دل کے شاہ میں ہے
دے دیا ہے صبا نے اس کا پیام

ورنہ قاصد ابھی تو راہ میں ہے
ترک الفت سے پہلے جانتے تو
کیا چھپا اس دل تباہ میں ہے
تیری صورت اگر حسین ہے تو
حسن سارا مری نگاہ میں ہے
ایسی رحمت ہوئی ہے خانم پر
دیکھ اللہ کی پناہ میں ہے
(فریدہ خانم.....لاہور)

اپنی بستی کے سب ہی کچے مکاں اچھے تھے
ان یقینوں سے تو وہم و گمان اچھے تھے
چھوڑ آئے تو یہ محسوس ہوا شدت سے
ہم جہاں بھی تھے بہرحال وہاں اچھے تھے
نامور ہیں تو ہر اک گام سے دل ڈرتا ہے
بات تو یہ ہے کہ بے نام و نشاں اچھے تھے
جب جوانی تھی تو ہر بات بھلی لگتی تھی
اب یہ معلوم ہوا ہم بھی کہاں اچھے تھے
ان کی خاطر تو یہ انجام ہوا ہے اپنا
کون کہتا ہے کہ وہ شیریں بیاں اچھے تھے
(ایس امتیاز احمد.....کراچی)

محبت کی اسیری سے رہائی مانگتے رہنا
بہت آساں نہیں ہوتا جدائی مانگتے رہنا
ذرا سا عشق کرلینا، ذرا سی آنکھ بھرلینا
عوض اس کے مگر ساری خدائی مانگتے رہنا
کبھی محروم ہونٹوں پر دعا کا حرف رکھ دینا
کبھی وحشت میں اس کی نارسائی مانگتے رہنا
وفاؤں کے تسلسل سے محبت روٹھ جاتی ہے
کہانی میں ذرا سی بے وفائی مانگتے رہنا
عجب ہے وحشت جاں بھی کہ عادت ہوگئی دل کی
سکوت شام غم سے ہم نوائی مانگتے رہنا
کبھی بچے کا ننھے ہاتھ پر تتلی کے پر رکھنا
کبھی پھر اس کے رنگوں سے رہائی مانگتے رہنا
(انتخاب: ایس حبیب خان.....کراچی)

سراسر ظلم ڈھایا جارہا ہے
غریبوں کو ستایا جارہا ہے
مداری کا تماشہ ہے سیاست
نیا کرتب دکھایا جارہا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کسی کو
عجیب چکر چلایا جارہا ہے
بظاہر چھوٹے فتنوں کو دبا کر
بڑا فتنہ اٹھایا جارہا ہے
ذرا ہم خواب سے چونکے تھے اے دل
تھپک کر پھر سلایا جارہا ہے
طلب روٹی کی ہے بھوکوں کو یارب
انہیں گانا سنایا جارہا ہے
یہ ذلت اور آزادی کی نعمت
عوام کو بہلایا جارہا ہے
بصیرت ہے تو چشم دل سے دیکھو
مسلمانوں کو مٹایا جارہا ہے
(رقیہ عباس.....بستی فتے والی)

ہمیں نہ ستاؤ ہم پہلے ہی ستائے ہوئے ہیں
آج کل پھر ان کی نگری میں آئے ہوئے ہیں
کہاں جان من ہر پل پہلو میں رہنا
اور کہاں اب دامن چھڑائے ہوئے ہیں
یہ بے رخی کہاں سے سیکھ لی آپ نے
اور یہ زیور کہاں کے پائے ہوئے ہیں
ہم تو تھے تہی دامن جان من!
آپ کہاں سے یہ چمک لائے ہوئے ہیں
بے وفائی کبھی نہ کریں گے ہم دونوں
سنہرے اصول یہ آپ کے بنائے ہوئے ہیں
(اسحاق انجم.....کنگن پور)

پلٹ کر آئے گا وہ انتظار کرتا ہوں
قسم خدا کی اسے اب بھی پیار کرتا ہوں
اس کے جانے سے زندگی ادھوری سمجھتا ہوں
وہ کب آجائے گا، پس بے تاب سا رہتا ہوں
وہ ساتھ تھا تو وقت کی رفتار تھی تیز

اب تو بس ہر پل گھڑی کو تکتا رہتا ہوں
اس کا یوں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا نہ لگا
شاید اس لئے صبح شام اب اداس رہتا ہوں
پلٹ کر آئے گا وہ انتظار کرتا ہوں
قسم خدا کی اسے اب بھی پیار کرتا ہوں
(نعیم اللہ.....خوشاب)

تیری مخمور آنکھوں کے اشارے
مری توبہ کو پھر بہکا گئے ہیں
طبیعت یوں بھی پوچھی ہے کسی نے
مری آنکھوں میں آنسو آگئے ہیں
تیرے الجھے ہوئے پر پیچ گیسو
میرے حالات کو سلجھا گئے ہیں
کسی قرب اور اس چاندنی میں!
یہ لمحے اتفاقاً آگئے ہیں
یہ اہل دل بھی کتنی سادگی سے
فریب زندگی کھاگئے ہیں
بڑے پر نور چہرے تھے وہ قمر
جو غم کی دھوپ میں کملا گئے ہیں
(چوہدری قمر علی جہاں پوری.....ملتان)

میرے خواب بھی
میری طرح
کسی منزل کی
تلاش میں
کھو سے گئے
نہ منزل ملی
اور نہ وفا کی
خوشبو جیسے دور
کسی باغیچے میں کھڑے
کسی اجنبی
مسافر کی طرح
کوئی سایہ دار
درخت مل جائے
تو زندگی کی
تپتی دوپہر
کی طرح
کٹ ہی جاتا ہے
سفر بغیر
سائے کے بھی
اور سائبان
کے بھی
(گلاب خان سولنگی.....کشمور)

غم یوں دل میں آئے بیٹھے ہیں
اپنا ہی گھر بنائے بیٹھے ہیں
فلک پر نہ ہونگے نجوم اتنے
اشک جتنے بہائے بیٹھے ہیں
ڈوب جائیں نہ خود خود میں
خود کو دریا بنائے بیٹھے ہیں
اثر کھوگیا ہے دعاؤں سے
ہاتھ پھر بھی اٹھائے بیٹھے ہیں
یاد بھی ہے تیری فہد کی طرح
جارہا ہے بھلائے بیٹھے ہیں
اب نہ ہوگا یہ عشق رضا
بہت خود کو جلائے بیٹھے ہیں
(قاسم رضا.....چنیوٹ)

خیال ہے کہ بجھادو یہ روشنی کے چراغ
کہ مستیوں نے جلائے ہیں بے خودی کے چراغ
چلو نگاہ کی مشعل کو ساتھ لے کے چلیں
فراز شوق پہ روشن ہیں آگہی کے چراغ
روش روش پر ہراساں ہیں چاند کی کرنیں
قدم قدم پہ سلگتے ہیں بے کسی کے چراغ
مچل رہے ہیں بہت سانپ آستینوں میں
بھڑک رہے ہیں ابھی شام راستی کے چراغ
چمک رہی ہے بڑی موتیوں کے سینے میں
جلائے کس نے یہ گلہائے شبنمی کے چراغ
اچھا ساغر مے دل یہاں ہوں ساقی
کہ روشنی کو ترستے ہیں زندگی کے چراغ
(انتخاب: عبدالجبار رومی انصاری.....لاہور)

☆☆

اے زندگی!
کاش تو بھی بے وفا ہوتی
میرے دوستوں کی طرح
پھریوں میں
در بدر نہ ہوتا
خون کے آنسو
کبھی نہ روتا
سب تفکرات سے آزاد
موت کی آغوش میں سوتا
(انتخاب: ذیشان...... کراچی)

ایک سہانی صبح، میں نے تمہیں دیکھا تھا
سیاہ پیرہن میں ملبوس
جیسے اجالے میں کوئی کالی گھٹا
جانے کس کومن میں سموئے ہوئے
انتظار کی گھڑیاں آنکھوں میں سجائے ہوئے
شاید تمہیں میرا ہی انتظار تھا
کیونکہ بے ساختہ تم نے مجھ کو دیکھا
ایک تبسم ہونٹوں پر لئے
کچھ بجلیاں آنکھوں میں نمودار ہوئیں
میں بھی تمہارے سحر میں کھنچتا ہوا
بار بار مڑ مڑ کر تمہارے ہی طرف
دکھتا ہی چلا گیا
وہ کونسی دل آویز گھڑی تھی
جب تم میرے دل میں سما گئی
ایک خط تمہاری طرف دیا
ایک جواب تمہارا آیا
عہدو پیاں ہوئے
زندگی نبھانے کا وعدہ پورا ہوا
اور میری زندگی نکھر آئی
کتنے سالوں کے بعد بھی
میں وہ سہانا منظر
وہ یادیں نہ بھلا سکا
(سلیم بیگ ہمدانی...... کراچی)

کیسے کٹے گی زندگی پھر اپنی
دکھ اپنا کسی کو ہم سناتے ہیں
دور ہیں منزل سے راہیں میری
فاصلے وفا میں اور بڑھاتے ہیں
جو ساتھ چلے تھے کبھی میرے
وہ آج پھر سے یاد آتے ہیں
آملتے ہیں اپنے بھی پرائے بھی
جب داغ دل کے ہم جلاتے ہیں
دوستی کرکے لوگ دغا دیتے ہیں
پیار میں ہم پھر ٹھوکریں کھاتے ہیں
اپنے نصیب کے چراغ بجھ گئے ہیں جاوید
زندگی میں ہم اپنے آنسو بہاتے ہیں
(انتخاب: عارف...... نواب شاہ)

اداس موسم اور تنہائی
ساحل کے سنگ
سمندر کنارے
چلتا گیا بس
چلتا گیا
یاد کسی میں
نین جو بھیگے
شاید اس کو
یاد بھی ہوگا
عشق کا وہی
بھولا افسانہ
اپنی منزل
بھولی بسری
ویران وہ راہیں
ساگر کی ہو جیسے
خاموش سی لہریں
برسوں بعد
نظر جو آیا
مرجھایا سا
گلاب چہرہ
(انتخاب: عامر...... ٹنڈو آدم)

ہزاروں ہی خواہشیں لے کر ہر بار
تیرے آنگن میں اترے عید کا چاند
ہر چہرہ ہی شادماں ہوتا ہے
چھوڑتا ہے رنگ گہرے عید کا چاند
ہزاروں خواہشیں جنم لیتی ہیں دل میں
جب آنکھوں میں ٹھہرے عید کا چاند
پیار کی باتیں ہوتی ہیں چار سو
دکھاتا ہے خواب سنہرے عید کا چاند
ہر کوئی روٹھا سا لگتا ہے ابراہیم
جب بھی ہم سے بچھڑے عید کا چاند
پھول اپنی چاہت کے ضرور کھلیں گے
زندگی نے وفا کی تو پھر ملیں گے
یاد آئیگا جب تیرا گلابی مکھڑا
اشک مری آنکھوں سے اکثر بہیں گے
(انتخاب: رخسانہ حمید...... دیپالپور)

فاخرہ تو پاگل تھی
فیشنوں کے چکر میں
یوں فریب کھا بیٹھی رنگ گورا کرنے کی
مہنگی دوا بیٹھی
تھی دوا جو کھانے کی
وہ دوا لگا بیٹھی
جو دوا لگانی تھی
اس دوا کو کھا بیٹھی
اور اسی حماقت میں
اپنی جان گنوا بیٹھی
فاخرہ تو پاگل تھی
(انتخاب: محمد علی...... کراچی)

نظروں سے وہ دور ہوگیا ہے
ہائے کتنا وہ مغرور ہوگیا ہے
ملتا نہیں وہ اب ہم سے
حادثہ کوئی ضرور ہوگیا ہے
جو میرے بنا اک پل نہیں رہتا تھا
کیسے مجھ سے وہ دور ہوگیا ہے
اس کی دوریوں کو بے پروائی نہ سمجھو
لگتا ہے وہ مجبور ہوگیا ہے
آکے دیکھ لے تیرے انتظار میں جمشید
کتنا کوئی چور ہوگیا ہے
(انتخاب: ہما نصیر...... کراچی)

☆☆

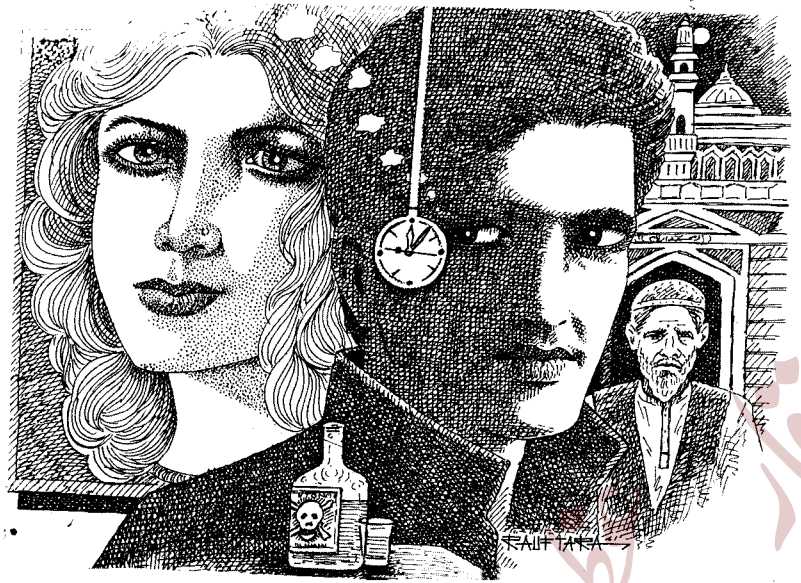

خضر راہ

ایس حبیب خان۔کراچی

مسجد میں نوجوان نے نماز شروع کی، مسجد بھری پڑی تھی اچانک بے شمار لوگ کہاں سے آگئے تھے، نوجوان سمجھنے سے قاصر تھا اور جب نوجوان نے سلام پھیرا تو پوری مسجد خالی ہوچکی تھی اور پھر......

ٹھوکریں لگتی ہیں تو انسان سنبھل جاتا ہے اس کے مصداق دلکش و دلنشین...... حقیقی روداد

"**ماریہ!** یار ناشتہ بنادو، میں پہلے ہی لیٹ ہورہا ہوں۔" شایان نے ماریہ کو آواز لگائی۔

"جناب دیر میں نے نہیں آپ نے کی ہے۔ نہانے ہی اتنی لیٹ گئے تھے آپ! میں تو یہ جاننے کے لئے رکی ہوئی ہوں کہ آپ۔" بوچڈ ایگ لیں گے یا اسکریمبلڈ ایگ؟" ماریہ نے کہا۔

"پوچڈ ایگ بنادو!" شایان نے ناشتے کی ٹیبل پر آتے ہوئے کہا اور موبائل میں مصروف ہوگیا۔ ماریہ ناشتہ بنا کر لائی تو شایان نے موبائل رکھ دیا اور ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ "شایان! رات نبیل سے چیٹ کی تھی وہ لوگ پوچھ رہے تھے ہم کب آئیں گے؟" ماریہ نے سلائس پر جیم لگاتے ہوئے کہا۔

اتنے میں شایان کا موبائل بجا تو شایان نے اسکرین چیک کی۔" آفس سے کال تھی۔ شایان نے

کال ریسیو کی دوسری طرف سے کچھ کہا گیا تو شایان نے گھڑی گھڑی دیکھی سوا آٹھ بج رہے تھے۔ ''اوہ شٹ! یار کا ی انچکولی رات کی پارٹی میں، میں نے اپنا فون دیکھا ہی نہیں اور لیٹ آنے کی وجہ سے ایسے ہی سو گیا اسی لئے مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ میٹنگ کا ٹائم چینج ہوگیا ہے۔ پریزنٹیشن تو ریڈی ہے بس ناشتہ کرکے نکلتا ہوں۔'' شایان نے کہا اور موبائل ٹیبل پر رکھ دیا اور جلدی جلدی ناشتہ کرنے لگا۔

''شایان وہ......'' ماریہ نے کہنا چاہا۔

'ہنی! ابھی بالکل ٹائم نہیں ہے، رات کو بات کرتے ہیں۔'' شایان نے اٹھتے ہوئے کہا اور تیزی سے جوس کا گلاس خالی کرکے ٹیبل پر رکھا اور چلا گیا۔ ماریہ سر جھکا کر ناشتہ کرنے لگی یہ تقریباً روز کا معمول تھا۔

رات کو شایان آفس سے لیٹ آیا، ماریہ اس وقت فون پر بات کررہی تھی۔ اس نے گیٹ کھولا تو شایان اندر آکر سیدھا صوفے پر گر گیا۔ ماریہ نے جلدی سے فون پر بات ختم کی اور شایان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ''کس کا فون تھا؟'' شایان نے ٹائی کی ناٹ لوز کرتے ہوئے پوچھا اور پھر صوفے پر پڑے ریموٹ سے ٹی وی آن کردیا۔

''طیبہ پھوپھو تھیں، پوچھ رہی تھیں کہ پاکستان کب آؤ گی؟ اب ان سے کیا کہوں، جب آپ ہی کچھ نہیں بتا رہے ہیں جانے کا!'' ماریہ نے شایان سے کہا جو کہ اب ٹیبل پر پیپر رکھے ہاتھ میں ریموٹ لئے آرام سے ٹی وی دیکھ رہا تھا۔

''اوہ کم آن یار! اس وقت میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے تمہاری گھسی پٹی ریکارڈنگ سننے کا۔'' شایان نے جھنجھلا کر کہا اور چینل چینج کرنے لگا۔ ماریہ خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی اور بالکونی میں آگئی۔ اس کی نگاہیں تاروں بھرے آسمان کو تکنے لگیں پھر وہ سوچنے لگی۔ ''یہی تارے پاکستان میں بھی نظر آرہے ہوں گے جہاں اس کے اپنے رہتے ہیں۔''

ایک دم پیچھے سے آئے ہاتھوں نے ماریہ کو تھام لیا، ماریہ نے مڑ کر دیکھا تو وہ شایان تھا۔

''آئی ایم سوری ہنی! یونو آج آفس میں بہت ورک لوڈ تھا، جس کی وجہ سے تھکن فیل ہورہی تھی اور میں تم سے ہارش بی ہیو کر گیا۔'' شایان نے اس کے شانے پر ٹھوڑی رکھ کر کہا۔

''اٹس اوکے!'' ماریہ نے مسکرا کر کہا اور مڑ کر شایان کا ہاتھ پکڑ لیا اور پیار سے بولی۔ ''آپ فریش ہوجایئے میں کھانا گرم کرتی ہوں۔''

شایان نے ناں میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''ہم ڈنر باہر کریں گے۔ ویٹ صرف ڈنر نہیں ہم مووی بھی دیکھیں گے۔''

ماریہ نے حیرانی سے شایان کو دیکھا اور بولی۔ ''مووی!'' تو شایان نے ایکسائیٹڈ ہوکر اپنی طرف گھمایا اور بولا۔ ''ہاں! ابھی لگی ہے بیوٹی اینڈ دی بیسٹ۔''

''شایان! اف آئی ایم ناٹ رانگ، یہ نام میں پہلے بھی سن چکی ہوں، یہ نیو مووی تو نہیں ہے۔'' ماریہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! تم کہاں بیس پچیس سال پیچھے ٹی وی سیریز کی بات کررہی ہو، یہ بگ اسکرین مووی ہے اور اس کی ہیروئن ہے ایما واٹسن، یونو! ہیری پورٹر فیم اور ہنی! اس مووی کا ساؤنڈ ٹریک ابھی تک کے مہنگے ترین میں شمار ہورہا ہے۔ ایک کروڑ ڈالر!!'' شایان نے تفصیل بتائی تو وہ سر ہلانے لگی۔

ماریہ شایان کی چچازاد تھی، شایان کے ماں باپ نے ماریہ کا انتخاب کیا تھا۔ شایان جب 4 سال کا تھا تب ماں باپ کے ساتھ امریکہ سیٹلڈ ہوگیا تھا اور اس طویل عرصے میں ماریہ کے والدین اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے، ماریہ کے ساتھ اس کی بیوہ پھوپھو اور ان کا بیٹا رہتے تھے، تین سال پہلے شایان اپنے والدین کو لے کر پاکستان آیا تھا اسے کام کے سلسلے میں آفس والوں نے بھیجا تھا۔ شایان کے والد نے بھتیجی کو پسند کرلیا تھا۔ کافی خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھی لکھی تھی اور سائیکالوجی میں ماسٹرز کرچکی تھی۔ مگر شایان کے والدین کی پسند کی وجہ ماریہ کا دین کو فالو کرنا

تھا۔ ورنہ ان کا بیٹا تو بنا بنایا انگریز تھا۔ ان کا ماننا تھا کہ ان کے بعد ماریہ ان کی نسل کو یہاں کے رنگ میں رنگنے نہیں دے گی۔ انہوں نے شایان سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو شایان کو کوئی وجہ نظر نہ آئی کہ وہ انکار کرے کیونکہ اس نے ماریہ سے ملاقات کی تھی وہ اسے اچھی لگی تھی۔ بس پھر ان لوگوں نے جانے سے پہلے سادگی سے نکاح کرلیا اور ماریہ کو رخصت کرکے امریکہ لے آئے۔

شادی کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزرا تو وقفے وقفے سے شایان کے ماں باپ بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب ماریہ کو ماں باپ کے جانے کی کمی کا احساس زیادہ ہوا کیوں کہ یہاں وہ بالکل اکیلی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماریہ تنہائی کا شکار ہونے لگی۔

شایان صبح آفس چلا جاتا۔ شام کو واپس آکر ٹی وی، فرینڈز، کلبس، بیس بال، میچز، پارٹیز...... ان سب میں اس کا وقت گزرتا۔ ایسا نہیں تھا کہ شایان اسے گھر میں بند کردیتا تھا ساتھ لے کر نہیں جاتا، بلکہ ماریہ کو خود یہ سب پسند نہیں تھا۔ وہ اس طرح کی گیدرینگس کو آوائیڈ کرتی تھی۔ شایان اس کا مذاق اڑاتا کیونکہ وہ اسی ماحول میں آزادی کے ساتھ بڑا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سب روٹین لائف کا حصہ تھا۔ شایان بالکل مغربی رنگ میں ڈھلا ہوا تھا۔ نماز، روزے سے اس کا نہ کوئی واسطہ تھا اور نہ اسے اس کی اہمیت تھی۔ ماریہ اکثر اسے آرام سے سمجھاتی کہ ''باقی کچھ نہیں صرف نماز کا اہتمام کرلیں کیونکہ یہ کسی حال میں بھی معاف نہیں ہے!'' مگر شایان ٹال دیتا کیونکہ اس پر ماریہ کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ بس یہاں کی رنگینیوں میں مگن تھا۔

دوسری طرف ماریہ شدت سے تنہائی محسوس کررہی تھی اور دعا کرتی رہتی کہ ''جلد پاکستان جانا ہوجائے!'' پھر اس کی دعا قبول ہو ہی گئی، شایان کے باس پاکستان میں نئی کمپنی لاؤنچ کررہے تھے اور اسی کی تیاری کے سلسلے میں شایان کو پاکستان میں معاملات دیکھنے بھیج رہے تھے۔ ماریہ کے قدم خوشی سے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ اس کی نگاہوں میں طیبہ پھوپھو کا

ماں

ماں کیلئے سب کو چھوڑ دینا لیکن سب کے لئے ماں کو مت چھوڑنا کیوں کہ ماں جب روتی ہے تو فرشتوں کو بھی رونا آجاتا ہے۔

باپ

باپ کی موجودگی سورج کی طرح ہوتی ہے سورج گرم ضرور ہوتا ہے لیکن ماں اگر نہ ہو تو اندھیرا چھا جاتا ہے۔

میری ماں کی دعائیں

اپنی بیمار ماں سے، فون پر بات کرتے ہوئے اکثر میں سوچتا ہوں ان کی دعاؤں کی یہ تسبیح کبھی نہ ٹوٹے۔

ذرا سی بات

ذرا سی بات کہنے کو ذرا سی بات ہوتی ہے مگر اکثر لوگوں کی زندگی میں ہلچل مچا جاتی ہے کوئی اپنی زندگی ذرا سی بات کے لئے ختم کرلیتا ہے تو کوئی ذرا سی بات سننے کے لئے برسوں انتظار کرتا ہے۔

(شرف الدین جیلانی۔ٹنڈوالہ یار)

مسکراتا چہرہ بار بار آرہا تھا۔ ساتھ اپنے چھوٹے پھوپی زاد بھائی نبیل کی چھیڑ چھاڑ جو بالکل اس کے سگے بھائیوں کی طرح تھا۔

''شایان! ہم اتنی دور کا سفر کررہے ہیں۔ آپ نماز پڑھ لیں، ابھی ایئرپورٹ کے لئے نکلنے میں کافی وقت ہے۔'' ماریہ نے جائے نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

''ارے یار! ذرا کمر سیدھی کرلینے دو، اتنا لمبا سفر ہے۔'' شایان نے بہانہ بنایا اور بستر پر پڑے دبیز کشن میں منہ دے دیا۔ ماریہ نے ندامت سے سر ہلایا اور نیت باندھ لی۔ نماز مکمل کرکے اس نے ضروری کام نمٹائے اور گھڑی دیکھ کر شایان کو اٹھایا اور کیب کال کی۔ شایان بے دلی سے اٹھا اسے پاکستان جانے سے کوفت ہوئی تھی ماریہ سے شادی سے پہلے جو اس کا ٹرپ تھا اس کی کوفت ابھی تک یاد تھی اسے، کیب آگئی تو وہ لوگ ایئرپورٹ کے لئے روانہ ہوگئے۔

طویل سفر کے بعد جب وہ پاکستان پہنچے تو ایئرپورٹ پر نبیل انہیں ریسیو کرنے آیا ہوا تھا، ماریہ اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ ''ارے آپی! اب تو آپ آگئی ہیں ناں، تو رو کیوں رہی ہیں؟'' نبیل نے بھرائے ہوئے لہجے میں اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔

''اور ینگ مین! کیا حال ہے؟'' شایان نے نبیل کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے پوچھا۔

''گریٹ!'' نبیل نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر وہ لوگ گھر کے لئے روانہ ہوگئے۔

☆.....☆.....☆

''شایان! سنئے کیا ہم پاکستان میں اپنا اسٹے بڑھا نہیں سکتے؟'' ماریہ نے چند روز بعد پوچھا۔ ''نو! ناٹ ایٹ آل، ہماری واپسی کی ٹکٹس کنفرم ہیں، ہم صرف بیس دن کے لئے آئے ہیں، یہ آفس ٹرپ ہے اور مجھے ان ہی بیس دنوں میں کام ختم کرکے واپس جاکر رپورٹ کرنی ہے۔'' شایان نے لیپ ٹاپ پر انگلیاں موو کرتے ہوئے کہا تو ماریہ بجھ سی گئی۔

ماریہ کو یہاں آکر بہت مزہ آرہا تھا۔ شایان زیادہ تر کمپنی کے کام میں لگا رہا جبکہ ماریہ سب ملنے والوں سے ملاقاتیں کررہی تھی۔ تین سال بعد وہ سب سے مل رہی تھی۔

ایک روز ماریہ بولی۔ ''شایان! اب تو ہمارے جانے میں چند ہی روز رہ گئے ہیں۔ یہ دن کتنی جلدی گزر گئے ناں؟''

''جلدی گزر گئے؟ ماریہ تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ یہاں وقت کاٹنا کتنا مشکل ہے، اتنی بورنگ لائف ہے یہاں کی کہ بس!!!'' شایان نے کافی کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''بورنگ؟ شایان اصل زندگی تو یہاں کی ہے، اور وہاں کی لائف تو مصنوعی ہے، یہاں کے لوگ دیکھئے کتنے زندہ دل ہیں، بڑے دل کے مہمان نواز، ملنے ملانے والے، ایک دوسرے کے دکھ درد میں کام آنے والے، گھومیں پھریں انجوائے کریں آپ، تو بورنگ کہاں سے ہوگئی یہاں کی لائف؟'' ماریہ نے کہا۔

''یومسٹ بی گڈنگ! رائٹ؟ یہاں تو سب ڈر ڈر کر جی رہے ہیں، یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں بندہ بے خوف ہوکر گھوم سکے، اور کیا کہا زندہ دل لوگ؟ ہنہ! یہاں تو بندے کی کوئی پرائیویسی ہی نہیں ہے، جسے دیکھو جب چاہے منہ اٹھا کر چلا آتا ہے، سب ایک دوسرے کے پرسنل معاملات میں انٹرفیئر کرنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔'' شایان بری طرح پک گیا تھا۔ ''اور یہ تم کیا پڑھ رہی ہو؟'' شایان نے ماریہ کے ہاتھ سے کتاب چھینی اور ناک چڑھا کر اس کی گود میں دوبارہ پھینک دی۔

''کیا کہہ سکتی ہوں شایان! لگتا ہے آپ مائیکل اور جولیا کو مس کررہے ہیں، خاص کر پارٹیز کی جان جینیفر کو!'' ماریہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو شایان جلدی سے بولا۔ ''واؤ! کیا یاد دلایا ہے، ذرا میں جینیفر سے وہاں کا حال تو پوچھوں، میں تو کمپنی کے کام میں بالکل ہی الجھ کر رہ گیا ہوں۔'' پھر شایان اٹھا اور لیپ ٹاپ لے کر صوفے پر بیٹھ گیا اور ماریہ نے سر ہلا کر کتاب اٹھالی۔

شایان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اڑ کر امریکہ پہنچ جائے۔ یہاں اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا تھا، آفس ورک کے بعد وہ بس کمرے میں گھسا انٹرنیٹ استعمال کرتا رہتا، شاپنگ، گھومنا اس کے لئے فضول تھا، نہ وہ رشتے داروں کی دعوت اٹینڈ کرتا اور ماریہ معذرت کرکے اکیلے ہی ہر جگہ جاتی۔

ایک روز ماریہ، نبیل اور طیبہ پھوپھو ارسلان چچا کے گھر گئے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا رات وہیں رکنے کا پروگرام تھا کیونکہ ارسلان چچا کی بیٹی ندا کی منگنی تھی۔ نبیل نے آفر کی تھی کہ وہ شایان کے ساتھ رک جاتا ہے مگر شایان نے شکریہ کے ساتھ اسے منع کردیا اور بولا۔ ''ارے یار جاؤ! میری وجہ سے کیوں تقریب مس کرو گے وہاں تو کافی خوب صورت لڑکیاں بھی آئیں گی، انجوائے کرو!'' شایان نے نبیل کو چھیڑا۔

وہ لوگ چلے گئے تو شایان لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا وہ اپنے دوستوں سے چیٹ کررہا تھا پھر اس کے فرینڈز چیٹ سے چلے گئے تو شایان نے لیپ ٹاپ بند کردیا۔ چیٹنگ کے چکروں میں اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شان نے چابی اٹھائی اور گاڑی لے کر باہر نکل گیا۔ گھر سے تھوڑے فاصلے پر ایک غیر ملکی فاسٹ فوڈ ریسٹوران تھا، جہاں وہ نبیل اور ماریہ کے ساتھ آچکا تھا۔ اس نے گاڑی پارک کی اور اندر جاکر ڈنر کرنے لگا اور سافٹ ڈرنک لے کر ڈنر کرکے آگیا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ سافٹ ڈرنک پی رہا تھا۔ گھر کے آگے پہنچ کر اس نے گاڑی پارک کی اور کین سے لاسٹ سپ لیا اور کین خالی ہوجانے پر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ماریہ کے گھر کی بلڈنگ کے سامنے ایک بہت بڑا پارک تھا جس کی گرل کے ساتھ ہر تھوڑے فاصلے پر ڈسٹ بن لگے ہوئے تھے۔ شایان نے آگے بڑھ کر خالی کین ڈسٹ بن میں ڈالا اور مڑنے لگا تو اسے سامنے گرل کے اس پار اندر پارک میں ایک لڑکی نظر آئی، لڑکی درخت کے نیچے بنے بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی، جبکہ پورا پارک خالی تھا۔ شایان نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو سوئیاں 2 بجکر چار منٹ بجا رہی تھیں۔ پارک کی چند ایک لائٹ ہی جلی ہوئی تھی۔

شایان کو یاد آیا کہ نبیل تو کہہ رہا تھا کہ پارک گیارہ بجے بند ہوجاتا ہے تو اگر پارک بند ہوجاتا ہے تو ایک تنہا لڑکی پارک میں کیا کررہی ہے؟ کہیں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گئی؟ ''مجھے اس کی مدد کرنی چاہئے!'' شایان نے سوچا اور پھر چلتا ہوا پارک کے گیٹ پر آگیا وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ شایان گرل پر چڑھ کر اندر کود گیا اور چلتا ہوا اس بنچ کی طرف چلا گیا جہاں وہ لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ شایان قریب گیا اس نے دیکھا کہ لڑکی منہ جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ''ایکسکیوزمی!'' شایان نے اس لڑکی کو مخاطب کیا تو اس لڑکی نے چہرہ اوپر کیا۔ شایان لمحہ بھر کو تھم گیا۔ لڑکی بے انتہا خوب صورت تھی اور سب سے نمایاں اس کے چہرے پر موجود بڑی بڑی نیلی آنکھیں تھیں جو خلاف معمول کچھ زیادہ ہی کھنچی ہوئی تھیں۔ اس نے نظر اٹھا کر شایان کی آنکھوں میں دیکھا تو شایان وہیں کھڑا رہ گیا۔ ان آنکھوں میں جانے کیسی مقناطیسی کشش تھی کہ شایان نظریں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ ''جی کہیئے!'' لڑکی نے کہا اس کی آواز کچھ ناک میں بولتی تھی۔

''وہ، وہ آپ.....'' شایان سٹپٹا گیا پھر سنبھل کر بولا۔ ''میں گھر جارہا تھا آپ پر نظر پڑی، رات کے اس وقت آپ یہاں اکیلی، میں نے سوچا کہ آپ کسی مصیبت میں نہ ہوں پارک بھی بند ہے۔''

اس کی بات سن کر لڑکی نے ایک دم زور سے قہقہہ لگایا۔ ''ہاہاہا!!!'' پھر بولی۔ ''مجھے تو آپ مصیبت میں نظر آرہے ہیں!'' اس کی نگاہیں معنی خیز تھیں۔

''واٹ ڈو یو مین بائے دیٹ؟'' شایان نے چونک کر پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ آپ رات کے اس وقت باہر؟ کیا کوئی پریشانی ہے؟ ویسے آپ مجھے یہاں کے تو نہیں لگ رہے ہیں، نئے آئے ہیں آپ یہاں؟ ورنہ اس وقت پارک میں کوئی نہیں آتا!'' لڑکی نے کہا۔

''آپ نے صحیح گیس کیا، میں ابروڈ سے آیا ہوں،

مگر آپ کی پہلی بات غلط ہے کہ میں پریشان ہوں، میں پریشان نہیں ہوں بلکہ یہاں آ کر بور ہوگیا ہوں، انفیکٹ پھنس گیا ہوں!'' شایان نے منہ بناتے ہوئے کہا تو لڑکی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ''اف یوڈونٹ مائنڈ؟ تو کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' شایان نے پوچھا۔

''آف کورس! وائے ناٹ؟'' لڑکی نے کہا تو شایان فوراً بینچ پر بیٹھ گیا پھر چونک کر بولا۔ ''جب کوئی اس وقت یہاں نہیں آتا تو آپ اس وقت یہاں وہ بھی اکیلی؟'' شایان نے پوچھا۔

''میں یہیں رہتی ہوں اور روز یہاں آ کر بیٹھ جاتی ہوں بوریت دور کرنے اور انتظار کرتی ہوں شاید کوئی یہاں آ جائے۔'' لڑکی نے مسکرا کر کہا۔

''دیکھئے آج میں آ گیا۔'' شایان نے کہا تو وہ زور سے ہنسی اور اس کے سفید دانت نظر آنے لگے۔ شایان کو وہ کچھ عجیب سی لگی۔ ''آپ اپنے بارے میں بتایئے آپ کے کیا مشاغل ہیں جو آپ یہاں بوریت محسوس کررہے ہیں۔'' لڑکی کے پوچھنے پر شایان نے اسے بتانا شروع کیا۔

ابھی شایان بول ہی رہا تھا کہ وہ لڑکی ایک دم پریشان ہوکر کھڑی ہوگئی۔ ''اچھا ابھی تو میں چلتی ہوں وقت ہورہا ہے!'' اس نے جلدی سے کہا۔

''کس چیز کا وقت ہورہا ہے؟'' شایان نے پوچھا۔ ''آپ جلدی آیئے گا، کل ملیں گے۔'' لڑکی نے کہا۔ شایان نے گھڑی دیکھی تو صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ''اوکے وین!'' شایان نے کہہ کر منہ اٹھایا مگر سامنے کوئی نہ تھا۔ شایان نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا اور شانے اچکا کر اٹھا اور گیٹ پھلانگ کر گھر کی طرف چل دیا۔

فضا میں اللہ اکبر! اللہ اکبر کی صدا گونجی اور جب شایان اپنی بلڈنگ کے مین گیٹ پر پہنچا تو ایک سفید داڑھی والے بزرگ اسے جاتے دکھائی دیئے۔ غالباً وہ نماز فجر کے لئے جارہے تھے۔ شایان کو دیکھ کر وہ بزرگ رک گئے اور گھور کر دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مت جا وہاں، ورنہ نقصان اٹھائے گا!'' شایان نے نہ سمجھنے والے انداز میں سر ہلا کر کہا۔ ''ایکسکیوز می!'' مگر وہ بزرگ تیز تیز قدم اٹھاتے آگے بڑھ گئے۔

شایان بلڈنگ کی سیڑھیاں طے کرکے گھر میں آیا اور بستر پر اوندھا گر کر سوگیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کسی نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ شایان نے آنکھ کھولی تو وہ ماریہ تھی۔ ''یار! کیا مسئلہ ہے؟'' شایان نے نیند میں دھت ہوتے ہوئے کہا۔

''شایان! اوندھے نہیں سوتے یہ جہنمیوں کو لٹانے کا طریقہ ہے بات سنئے! وائیں کروٹ سے سویئے۔'' اسے ماریہ کی آواز سنائی دی تو اس نے بڑبڑاتے ہوئے دائیں کروٹ لے لی اور سوگیا۔

☆......☆......☆

ڈور بیل جانے کب سے بج رہی تھی مگر شایان سویا پڑا تھا۔ ماریہ، نبیل اور طیبہ پھوپھو باہر کھڑے تھے، ماریہ نے شایان کے موبائل پر بھی بیل دی مگر شایان گہری نیند میں تھا۔ ''یا اللہ خیر!'' ماریہ نے کہا۔ ''رکو یاد آیا! عباسی صاحب کے پاس ایک چابی ہوگی میں نے انہیں دے رکھی تھی۔'' طیبہ پھوپھو نے کہا۔

طیبہ پھوپھو کے شوہر اور عباسی صاحب پڑوسی ہونے کے ساتھ گہرے دوست بھی تھے اور دونوں کے پاس ایک دوسرے کے گھر کی چابی احتیاطاً ہوتی تھی۔ طیبہ پھوپھو عباسی صاحب کے گھر سے چابی لے آئیں۔ پھر ان لوگوں نے دروازہ کھولا، ماریہ تیر کی طرح اندر گئی تو شایان آرام سے سویا پڑا تھا۔ ماریہ نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھایا اور بولی۔ ''کیا ہوگیا ہے آپ کو شایان، اس سے پہلے تو آپ کبھی اتنی گہری نیند نہیں سوئے؟''

''یار! تمہیں چین نہیں ہے رات کو بھی تم وعظ کررہی تھیں اوندھے مت مت سو یہ جہنمیوں کو لٹانے کا طریقہ ہے......'' شایان بڑبڑاتے ہوئے اٹھا۔

''شایان مجھے لگتا ہے آپ امریکہ کو کچھ زیادہ ہی مس کررہے ہیں جو ایسی باتیں کررہے ہیں، میں تو ابھی

آئی ہوں!'' ماریہ ہنسنے لگی۔ ''خیر چھوڑو تم میری بلیک کافی بنادو، دماغ پھٹا جارہا ہے درد سے!'' شایان نے باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ شاور لینے کے بعد شایان سب کے ساتھ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔

''شایان بھائی! اب تو صرف دو دن رہ گئے ہیں آپ لوگوں کے واپس جانے میں، بیس دن یوں گزر گئے۔'' نبیل نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار! شکر ہے بیس دن گزر گئے۔'' شایان نے کہا۔

''ماریہ بیٹا! پیکنگ کرلی؟'' طیبہ پھوپھو نے پوچھا۔ ''جی پھوپھو!'' ماریہ نے کہا۔

''یار نبیل! یہ جو سامنے پارک ہے اس میں رات میں بھی لوگ آتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کافی رات گئے تک؟'' شایان نے پوچھا۔

''ہاں شایان بھائی! لیٹ بھی آتے ہیں مگر گیارہ بجے تک، اس کے بعد پارک بند ہوجاتا ہے۔'' نبیل نے بتایا۔

''اور اگر کوئی گیارہ بجے کے بعد جانا چاہے تو؟'' شایان نے سوال کیا۔

''نہیں بیٹا! ایسا نہیں ہوتا اور تم تو ایسا سوچنا بھی مت کیونکہ تمہاری عادت ہے ایڈونچر کی!'' طیبہ پھوپھو جلدی سے بولیں۔

''مگر کیوں پھوپو؟ آخر کوئی تو وجہ ہوگی!'' اس بار ماریہ نے پوچھا۔

''پتہ نہیں بیٹا کیا وجہ ہے! پر تمہارے دادا جی بتایا کرتے تھے کہ پہلے یہ پارک رات بھر کھلا رہتا تھا۔ پھر جانے ایسا کیا ہوا کہ رات گیارہ بجے کے بعد لوگوں کا داخلہ اس پارک میں بند کردیا گیا اور گیارہ بجتے ہی اسے تالا لگادیا جاتا ہے، کہیں کوئی چھپ کر نہ چلا جائے۔'' طیبہ پھوپھو نے بتایا۔

''مے بی سیکورٹی فیکٹر ہو؟ مگر پھوپھو! جانے والے تو کود کر بھی اندر جاسکتے ہیں۔'' شایان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو جو کہ ان کے ساتھ ہو، وہ ان کا اپنا کیا ہوگا، جو بڑوں کی بات رد کرتے ہیں وہ نقصان اٹھاتے ہیں، اگر ایسا کیا گیا ہے تو بیٹا ضرور کوئی وجہ ہوگی ناں؟'' طیبہ پھوپھو نے کہا، پھر سب ادھر ادھر کی باتوں میں لگ گئے۔

شایان اس لڑکی سے ملنے کے لئے بے قرار ہورہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ بالکونی سے کود کر پارک میں چلا جائے۔ وہ بار بار بالکونی سے جا کر دیکھتا مگر وہ بینچ خالی تھی اور دوسرے لوگ پارک میں چہل قدمی کررہے تھے، بچے کھیل رہے تھے، شایان نے رات کا کھانا بھی ٹھیک طرح سے نہیں کھایا سب اپنے کام کرنے میں لگے تھے ماریہ تھکی ہوئی تھی وہ سونے کے لئے لیٹ گئی۔ شایان نے سگریٹ سلگائی اور لائٹر جیب میں رکھا اور بالکونی میں آ کر کھڑا ہوگیا۔ بارہ بجنے والے تھے پارک بند ہوچکا تھا۔ شایان نے اپنی گھڑی دیکھی بارہ بجنے میں ایک منٹ تھا۔ شایان نے ایک سگریٹ ختم ہونے پر دوسری جلانے کے لئے لائٹر نکالا ہی تھا کہ اس کی نظر سامنے بینچ پر پڑی وہ لڑکی اب وہاں موجود تھی شایان نے دروازے کی چابی اٹھائی اور آہستہ سے گیٹ کھول کر باہر آ گیا۔

ابھی شایان ایک فلور کی سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ سامنے اسے ایک چودہ سال کا لڑکا نظر آیا۔ سیڑھیوں پر، شایان اس زاویے سے کھڑا تھا کہ لڑکے کا چہرہ اسے واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''السلام علیکم! شایان بھائی'' اس لڑکے نے کہا۔

''جی کون؟ میں نے پہچانا نہیں!'' شایان بولا۔

''میں ماریہ باجی کے وہیں رہتا ہوں۔'' لڑکے کی آواز کافی بھاری تھی۔ ''اچھا! اچھا کیسے ہیں آپ؟'' شایان ہنستے ہوئے بولا۔

''میں تو بالکل ٹھیک ہوں پر آپ غلط سمت جارہے ہیں واپس چلے جایئے!'' لڑکے نے کہا، شایان کے ہاتھ سے چابی نیچے گر گئی وہ اسے جھک کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھا نہیں!'' مگر سامنے سیڑھیاں بالکل خالی تھیں شایان نے اوپر جاتی سیڑھیاں دیکھیں وہ

بھی خالی تھیں پھر شایان نے شانے اچکائے اور انگلی میں چابی گھماتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔

اور پھر وہ پارک میں پہنچ گیا۔ ''مجھے صبح سے آپ سے ملنے کا انتظار تھا، آپ دن میں کیوں نہیں آتیں؟'' شایان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''نہیں آسکتی!'' لڑکی نے صرف اتنا کہا۔ ''دو دن بعد میں واپس ابرو ڈ چلا جاؤں گا، مگر آپ سے ملاقات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی!'' شایان نے خوش اخلاقی سے کہا۔

''بہت دیر سے ملے ہیں آپ، کل بھی وقت ہو گیا تھا جو ملاقات ادھوری رہ گئی۔ یقین جانئے آپ کو اندازہ نہیں میں کتنی تڑپی ہوں آپ کے لئے!'' لڑکی نے اپنی گنگنی آواز میں کہا۔

''پر کیوں یہ تو صرف وقت گزارنے کی ملاقات ہے۔ ورنہ ہم دونوں تو بالکل اجنبی ہیں۔ انفیکٹ ہم تو ایک دوسرے کے ناموں سے بھی واقف نہیں ہیں رائٹ؟'' شایان نے کہا۔

''آپ کے لئے یہ صرف ایک ملاقات ہے، میری تو کئی دنوں کی پیاس بجھے گی!'' لڑکی نے پہلو بدل کر کہا۔ ''پارڈن!'' شایان نیچے گرا اپنا لائٹر اٹھاتے ہوئے پوچھا اسے لڑکی کا مطلب سمجھ نہیں آیا تھا۔ لائٹر پکڑتے ہوئے اس کی نظر بینچ کے نیچے گئی اور لڑکی کے پیروں پر جا کر ٹھہر گئی۔ ''لڑکی ننگے پیر تھی اور اس کے پیر الٹے تھے اور انگلیاں مڑی ہوئی تھیں بڑے بڑے ناخن۔

شایان سن سنا ہو گیا اس نے لائٹر مٹھی میں پکڑا اور سیدھا ہو گیا۔ ''میرے خوب صورت پیر آپ کو پسند آئے؟'' لڑکی نے بھیانک انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ شایان نے جو لڑکی کی طرف دیکھا تو اس کی سٹی گم ہو گئی۔ ''گنجے سر کی، سرخ آنکھوں والی، بڑے بڑے نوکیلے دانتوں کی نمائش کرتی وہ اپنی لجلجی سی کھال والے ہاتھوں کی انگلیاں اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔'' جن کے سروں پر سیاہ بے حد نوکیلے مڑے ہوئے ناخن اگے ہوئے تھے، اس مخلوق سے آتی غلیظ سڑاند کے بھبکے شایان کے معدے کو حلق میں لے آئے اور اس نے الٹی کر دی، وہ مستقل قہقہے لگا رہی تھی۔

پھر اچانک شایان کو ہوش آیا اور اس نے سر پر پیر رکھ کر دوڑ لگا دی۔ مگر گیٹ تک پہنچنے سے پہلے شایان نے مڑ کر دیکھا تو وہ ''پچھل پیری'' لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ شایان نے گیٹ پر چڑھنا شروع کر دیا، ابھی وہ آدھے گیٹ پر ہی چڑھا تھا کہ پچھل پیری نے اسے پیچھے سے دبوچ لیا۔ شایان کا دم نکلنے لگا، وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر پچھل پیری کی گرفت بہت مضبوط تھی، شایان کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ایک دم اسے گیٹ کے دوسرے طرف وہی بزرگ دکھے جو فجر میں اسے بلڈنگ کے باہر ملے تھے۔

انہوں نے بلند آواز میں کہا۔ ''کلمہ پڑھو!'' تو شایان نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ کلمہ زبان سے ادا ہونا تھا کہ پچھل پیری نے چیخ ماری اور اس کی گرفت چھوٹ گئی اور شایان گیٹ پھلانگ کر باہر کود گیا۔

''آؤ میرے ساتھ!'' بزرگ نے شایان سے کہا تو شایان گھبرا کر ان کے پیچھے چل دیا۔ چلتے چلتے وہ مسجد کے سامنے آ گئے اور مسجد کے صحن میں بیٹھ گئے۔ ''برخوردار! تم کو پہلے بھی کئی بار سمجھایا تھا کہ وہاں مت جاؤ مگر تم باز نہ آئے!'' بزرگ نے کہا تو شایان نے نا سمجھ آنے والے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ کون ہیں جناب؟'' شایان نے سوال کیا۔

''ہم اسی جگہ رہتے ہیں اپنے پورے خاندان کے ساتھ جہاں ذوالفقار علی رہتے تھے (ماریہ کے دادا) ان کے گھرانے نے ہمیشہ اس جگہ کو پاک صاف رکھا، نماز کی پابندی کی اور ہمیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچائی، ذوالفقار علی سے تو ہماری ملاقات ہوتی تھی باقی گھر والے لاعلم ہیں، مگر ان لوگوں نے بھی کبھی کوئی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ ماریہ کی وجہ سے ہم نے تمہاری مدد کی ہے۔'' بزرگ بولے۔

شایان نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا اور بولے۔ ''ابھی ہماری بات پوری نہیں ہوئی ہے۔ یہ بتاؤ کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'' شایان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''نماز مومن کا ہتھیار ہے! باوضو انسان بہت طاقتور ہوتا ہے، آج تم جو اس مخلوق کی گرفت میں آئے تھے اسی وجہ سے آئے تھے، تم جیسے شکار آسان ہوتے ہیں، جو نماز پڑھتا ہے وہ بہت طاقتور ہوتا ہے۔'' بزرگ نے کہا۔

''آپ کس گھر میں رہتے ہیں؟'' شایان نے پوچھا۔ ''فلیٹ نمبر 13'' بزرگ بولے۔ ''اللہ اکبر! اللہ اکبر!'' کی آواز فضا میں گونج اٹھی۔ ''چلو اٹھو! ابھی سے ہی نماز شروع کرو۔'' اب کی بار بزرگ کی آواز میں حکم تھا۔

شایان سر جھکائے جھکائے اٹھا اور وضو کیا اتنے میں اور نمازی بھی آ گئے۔ بزرگ امامت کر رہے تھے۔ شایان بھی اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ نماز ختم کر کے شایان نے دائیں طرف سلام پھیرا، پھر بائیں طرف سلام پھیر کر آنکھیں کھولیں تو دھک سے رہ گیا!

''پوری مسجد خالی تھی۔'' شایان وہیں جم گیا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں، پھر کسی نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ ''جناب صفیں درست کر لیجئے۔ نماز ادا کرنی ہے!''

''وہ کوئی صاحب تھے۔'' شایان سب سے کونے میں چلا گیا۔ وہ ایسا ہو رہا تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں! پھر شایان سجدے میں گر گیا اور رونے لگا۔ ''اے اللہ! مجھے میری غفلت کے لئے معاف فرما، پوری زندگی بے راہ روی میں گزارتا رہا، اب بس مجھے سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرما اور مجھے اپنے پسندیدہ بندوں میں شامل کر لے۔ (آمین)'' شایان نے ہتھیلی سے آنسو صاف کئے اور اٹھا، وہ مسجد کے دروازے تک آیا تو آنسو پھر سے جاری ہو گئے۔

اس گزری رات نے شایان کو ہلا کر رکھ دیا۔ شایان سوچ رہا تھا کہ وہ تو مسلمان ہو کر بھی مسلمان نہ تھا۔ اللہ نے کیا کچھ عطا نہیں کیا اور وہ اپنا فرض ادا کرنے سے غافل تھا۔ مگر آج اس پارک میں رب کے کلام نے ہی اس گنہگار کی زندگی بچائی اور خضر راہ بنایا اپنی ہی آگ سے بنی مخلوق کو!

شایان کی آنکھوں سے جاری آنسو اس کے چہرے کو تر کر رہے تھے اس نے آنسو صاف کئے اور مسجد سے نکل آیا باہر ہلکی ہلکی روشنی نمودار ہو رہی تھی۔ شایان چلتا ہوا گھر آیا اور لاک میں چابی لگائی تو اس کی نظر سامنے لگی ''نیم پلیٹ'' پر پڑی جس پر لکھا تھا۔ ''ذوالفقار علی فلیٹ نمبر 13'' شایان نے رک کر ادھر ادھر دیکھا پھر اندر آ گیا۔ اندر سب پریشان تھے۔

ماریہ نے سوال کیا۔

''شایان! آپ اس وقت کہاں گئے تھے؟''

شایان نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''مسجد!'' شایان کی بات سن کر ماریہ کے گال خوشی سے دمکنے لگے۔ اسی روز شایان نے نماز کی پابندی کا عہد کر لیا تھا۔

ماریہ اور شایان ایئرپورٹ پر تھے۔ شایان کے آفس سے کال آئی تو وہ ایک طرف جا کر بات کرنے لگا، ماریہ، نبیل اور طیبہ پھوپھو کے ساتھ تھی جو انہیں سی آف کرنے آئے تھے۔ شایان بات ختم کر کے پلٹا تو دو نوجوانوں کی آواز پر رک گیا۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''بھائی جن ہوتے ہیں!'' جبکہ دوسرے کا اصرار تھا کہ ''جن نہیں ہوتے!''

شایان ان کی بات سن کر دل میں بولا۔ ''کیوں نہیں ہوتے! میری تو انہوں نے جان بچائی ہے اور میرے ساتھ نماز بھی ادا کی ہے۔ جن ہوتے ہیں نیک بد دونوں اور میرے لئے تو وہ خضر راہ ہیں۔'' اور تیز قدم اٹھاتا ماریہ کی طرف چل دیا۔

طاق راتیں

محمد شعیب۔فیصل آباد

اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ قبر درمیان سے پھٹ پڑی اور قبر سے ایک کفن پوش مردہ نمودار ہوا، اس کی انگارہ برساتی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکل رہی تھیں اور دیکھتے ہی دیکھتے.....

جادوئی عمل کی اپنی نوعیت کی بے مثال کہانی، اس کہانی کو پڑھنے والے عش عش کر اٹھیں گے

جنوری کی پہلی طاق رات تھی۔ سردی کی شدت اتنی تھی کہ بند گھر میں بھی زندگی کی ڈور تھامے رکھنے کے لئے آتش دان کی ضرورت تھی۔ ایسے میں گھر سے باہر نکلنا اگرچہ بے وقوفی تھی مگر ضرورت موسموں کی شدت بھلا کب دیکھتی ہے؟ بھوک انسان کو موت کی دہلیز پر بھی لا کھڑا کرنے میں ذرا سی جھجک محسوس نہیں کرتی اور ایسی ہی ضرورت اس وقت جنیکسن کو تھی۔ جو ایک بنیان پر شرٹ اور پھر سویٹر کے اوپر ایک موٹا سا اوورکوٹ پہنے برف پر چل رہا تھا۔ ہوائیں اتنی یخ بستہ تھیں کہ یکے بعد دیگرے تماچے اس کے رخسار پر مار رہی تھیں مگر اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ بس چلتا جا رہا تھا۔ سردی کی ایک لہر نے اس کے جسم میں سرایت کی تو اس نے ایک جھرجھری سی لی مگر قدم رکے نہیں۔ وہ چلتا رہا۔ اپنی منزل کی طرف۔ شہر کی روشنیاں آہستہ آہستہ دور ہوتی گئیں اور وہ ایک تاریک راستے پر آپہنچا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے مگر اس کی آنکھوں میں خمار نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ جب انسان کے دل میں ایک خواہش جنم لے لے تو رات کی نیندیں تو ویسے ہی کنارا کشی اختیار کر لیتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ جنیکسن کے ساتھ ہوا تھا۔ ایک خواہش۔۔۔ ایک ضرورت اس کو اس سرد رات میں گرم لحاف سے یخ بستہ ہواؤں کے درمیان لے آئی تھی۔ ہاتھوں پر اگرچہ موٹے دستانے تھے مگر وہ اپنے ہاتھوں کو سردی کی شدت کی وجہ سے سن ہوتا محسوس کر سکتا تھا۔ ایک درخت کے پاس پہنچ کر اس نے اپنے گردونواح میں نظر دوڑائی۔

"راستہ تو یہی معلوم ہوتا ہے۔۔" اس نے سوچا اور پھر دائیں جانب جنگل کے بیچ و بیچ چلنے گا۔ ہاتھوں کو سردی کی شدت سے بچانے کے لئے اس نے اوورکوٹ کا سہارا لیا مگر جب پارہ منفی سات سے بھی نیچے گرا ہو تو اوورکوٹ بھلا کہاں تک ساتھ دیتا؟ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ رات کے الو اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہے تھے مگر وہ چلتا گیا اور ایک پرانے کھنڈرات کے بالکل سامنے جا کر سانس لیا۔

"Wandering Souls Church"

اس کے چہرے پر ایک طمانت نمودار ہوئی۔ وہ یک ٹک اس بوسیدہ کھنڈرات پر مبنی چرچ کو دیکھنے لگا جو بصارت والوں کے لئے واقعی روحوں کا چرچ معلوم ہوتا تھا۔ صدیوں پرانا کتبہ، سالہا سال سے صفائی ستھرائی کا انتظام نہ کیا گیا مگر اسے کیا؟ اسے تو بس اپنا کام چاہئے تھا۔ گردن جھٹکتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ چاروں اطراف کے جنگل سے فقط الو اور جنگلی جانوروں کے بولنے کی آوازیں اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں۔ اس نے کھنڈرات نما عمارت کے اندر داخل ہونے کی غرض سے پہلے قدچے پر ابھی قدم ہی رکھا تھا کہ اندر سے چمگادڑوں کا ایک غول اس کے استقبال کے لئے آوارد ہوا۔ اس نے جھک کر اپنی جان بچائی مگر اس کے چہرے پر زرا بھی وحشت نے جنم نہ لیا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ان سب کا عادی ہو یا پھر عادی بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ خیر وجہ جو بھی تھی وہ آگے بڑھا۔ دوسرا قدم اٹھایا تو دروازوں کے کھلنے کی آواز نے سناٹے سے بھرپور رات میں دہشت ڈالنا چاہی مگر اس کا دل مچلا نہیں اور نہ ہی اپنے ارادے سے پیچھے ہٹا۔ اس نے گہری نگاہ اندر ڈالنا چاہی جہاں ہر طرف تاریکی تھی اور اسی تاریکی میں اس کے

سوالوں کا جواب تھا۔ وہ آگے بڑھا تو ایک دھندلکا آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ہاتھ سے ہاتھ سوجھائی نہ دیا۔ وہ کھنکارتا ہوا آگے بڑھا تو دل دہلا دینے والی آواز اس کی سماعت کو چیرنے لگی۔

"وہیں رک جاؤ۔۔۔" اس کے قدم منجمد ہوگئے

"مجھے آپ کی مدد چاہئے۔۔۔" اس نے قدرے اطمینان سے کہا تو ایک سیاہ دھواں نمودار ہوا

"مدد۔۔۔ ہاہاہا" ایک کھسیانی ہنسی فضا میں گونجی۔ اس دھوئیں نے اس کو اپنے حصار میں لینا چاہا مگر ناکام رہا شاید اس لئے کہ اس دھوئیں سے وہ نمٹنا جانتا تھا۔ اپنے لبوں کو مسلسل حرکت میں رکھا۔ شاید کوئی منتر پڑھ رہا تھا۔

"بولو۔۔ کیا چاہئے؟" جب دھواں اس کو اپنے حصار میں نہ لے سکا تو ایک بار پھر وحشت ناک آواز سماعت میں گونجی۔

"مجھے اپنے بھائی جنوری سے ملنا ہے۔" اس نے جھٹ جواب دیا۔ "وہ مر چکا ہے۔۔"

"میں جانتا ہوں مگر مجھے اس سے بات کرنی ہے۔۔۔ اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے وہ یہیں ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ آنکھوں میں ذرا سا بھی خوف نہیں تھا۔

"تم نہیں مل سکتے اس سے۔۔۔" وہ دھواں دور جاتا دیکھائی دیا تو جیکسن نے ایک بار پھر کچھ منتر پڑھا۔ وہ دھواں وہیں ساکت ہوگیا۔ اب اس کے لب پہلے سے زیادہ تیز متحرک ہوئے۔ جیسے وہ اس دھوئیں کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر شیطانی طاقتیں اتنی جلدی کہاں کنٹرول ہوتی ہیں؟ جھٹ ایک طمانچہ اس کے رخسار پر لگا۔ سرد رات میں جہاں ایک معمولی سی خراش بھی پہاڑ معلوم ہوتی ہیں وہاں اس لوہے کے راڈ سے لگی ضرب کے مشابہہ طمانچے نے اس کے رخسار کو سرخ کر دیا مگر وہ رکا نہیں۔ منتر پڑھتا رہا۔ یخ بستہ ہوائیں شائیں شائیں اس کے کان کے پردوں کو پھاڑنے کے لئے تیار تھیں۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اتنا شور برداشت نہ کر پاتا مگر وہ رکا نہیں۔ اپنا منتر جاری رکھا اور پانچ منٹ تک اس دھوئیں کی طرف سے دی گئی تکالیف کو سہنے کے بعد آخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ دوسری جانب سے اس کی مدد کرنے کی یقین دہانی کرادی گئی۔

"تو بتاؤ۔۔۔ میں کیسے مل سکتا ہوں اپنے بھائی جنوری سے؟" "منتر پڑھنا بند کر دیا مگر اپنی مٹھیاں نہ کھولیں شاید اس دھوئیں کو کنٹرول کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا اگر اس نے ذرا سی بھی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تو یہ دھواں اس کے جسم کو یہیں گاڑ دے گا اور یخ بستہ رات میں کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوگی۔ برف اس کی لاش کو بھی ڈھک کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کفن سے بھی محروم کر دے گی۔ وہ ایسا کوئی بھی رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔

"اس سے ملنے کے لئے تمہیں اس کے نام کی پہیلی کو سلجھانا ہوگا۔ جنوری کی طاق راتوں میں سات شیطانی اشیاء کو سات شیطانی جگہوں سے اکٹھا کرنا ہوگی اور یاد رہے۔ یہ سب کچھ تمہیں جنوری کی طاق راتوں میں کرنا ہوگا۔ اگر ذرا سی لاپرواہی سے طاق رات جفت میں ضم ہوگئی تو تم وہیں دھنسا دیئے جاؤ گے۔ تمہارا جسم انہیں شیطانوں کی خوراک بن جائے گا جن سے تم وہ چیزیں چرانا چاہتے تھے۔" وہ دھواں اس سے مخاطب تھا اور وہ بڑے ہی دھیان سے اس کی باتوں کو سن رہا تھا

"یہ شیطانی جگہیں کہاں ہیں اور کون سی شیطانی چیزیں اکٹھا کرنی ہیں؟"

"یہ سب تمہارے بھائی کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ اس کا نام۔۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ تمہاری مدد کریں گی۔۔۔" یہ کہتے ہی وہ دھواں غائب ہوگیا۔ دھوئیں کے غائب ہوتے ہی اس نے اپنی مٹھیاں کھول لیں۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن جیسے ہی اس کی آنکھ کھلی تو سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دن کے بارہ بج رہے تھے۔ رات کی باتیں اب بھی اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں

"مجھے ذرا بھی دیر نہیں کرنی چاہئے۔۔۔ مجھے آج سے ہی اپنے کام پر لگ جانا چاہئے۔۔" اس نے سوچا اور بیڈ سے اٹھ کر الماری کی طرف بڑھا۔ بلیو جینز اور گرے شرٹ نکال

کر واش روم کی طرف بڑھا۔ دس منٹ بعد وہ غسل کے بعد اپنے کمرے میں موجود تھا۔ رات میں اس دھوئیں کا لگایا گیا طمانچہ اب بھی اس کے رخسار پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کا بائیں طرف ابھی بھی ہلکا سا سرخ نشان تھا۔

"توبہ۔۔۔ آوارہ روحیں کتنی بے رحم ہوتی ہیں۔" آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اس نے تبصرہ کیا۔ تبھی اس کے ذہن میں پہیلی کا لفظ گونجا

"اوہ۔۔۔ ابھی تو میں نے پہلی ڈھونڈنی ہے۔۔ ان چیزوں کو جاننا ہے جو مجھے حاصل کرنی ہیں۔۔" اس نے آئینے کے ساتھ ہی لٹکی جیکٹ پہنی اور ایک نظر پلٹ کر بیڈ کے ساتھ والی ٹیبل کی طرف دیکھا۔ جہاں ایک فوٹو فریم تھا۔ اس کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری۔ وہ خراماں خراماں اس کی طرف بڑھا اور بیڈ پر بیٹھ کر اس تصویر کو اٹھا کر ہاتھ پھیرنے لگا

"جنوری۔۔ میرے بھائی۔۔۔ تجھے مجھے سب کچھ بتانا چاہئے تھا۔ دیکھ۔۔ اب تیری وجہ سے مجھے ان روحوں سے لڑنا پڑے گا۔" اس نے تبصرہ کیا اور فریم واپس رکھ کر اپنے کمرے کو مقفل کرتے ہوئے باہر آگیا۔ تاریکی سے بھرپور رات گزارنے کے بعد اس نے روشن دن کو دیکھا تو چہرے پر ایک بار پھر مسکراہٹ ابھری۔ لیکن قدم ایک بار پھر متحرک رہے۔ وہ کہیں جا رہا تھا۔ کہاں؟ اسے خود معلوم نہیں تھا۔ اسے تو بس جنوری کے نام سے جڑی پہیلی جاننا تھی اور یہ پہیلی صرف اس کی گرل فرینڈ مسٹی ہی سلجھا سکتی تھی۔ جنوری اور مسٹی کی ملاقات تقریباً سات سال پہلے ہوئی تھی اور ان سات سالوں میں مسٹی جنوری کو جانتی تھی۔ اتنا وہ خود بھی اپنے بھائی کو نہیں جانتا تھا۔ شاید اس لئے اس کے قدم خود بخود اس کے گھر کی طرف بڑھنے لگے۔ اس کے گھر پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کسی کام سے دوسرے شہر گئی ہوئی ہے اور شام تک لوٹے گی۔ یہ سنتے ہی اس کے چہرے پر اضطراب کی کئی کیفیات نمودار ہوئی۔ شام کو لوٹنے کا مطلب تھا کہ آج کی رات ضائع ہو جائے گی مگر اس کے پاس کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ وقت گزارنے کی خاطر وہ پاس کی مارکیٹ چلا گیا اور کھانے پینے کی اشیاء خریدنے لگا۔

"ہیلو۔۔ جیکسن۔۔ کہاں تھے تم اتنے دن؟" یہ اس کی گرل فرینڈ لارا تھی۔ گرمجوشی کے ساتھ اس نے لارا کو اپنے سینے سے لگایا اور رسمی بات چیت کے بعد اصل جواز بیان کیا جسے سن کر وہ یکا بکا رہ گئی

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔۔۔ آوارہ روحوں کے چکر میں پڑ کر تم اپنی جان کیوں گنوانا چاہتے ہو؟" لارا کو جیکسن کی پرواہ تھی اس لئے وہ اسے کسی بھی خطرے میں نہیں دیکھ سکتی تھی مگر جیکسن وہ تو جیسے اس خطرے کو اپنا مقصد حیات بنا چکا تھا

"ایسا کچھ نہیں ہوتا لارا۔۔ مائی ڈیئر۔۔ تم یقین مانو۔۔" وہ اس کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"لیکن۔۔۔ ایسا کرنا ضروری تو نہیں۔۔ تمہارے پاس سب کچھ تو ہے۔۔۔ اور تم۔۔۔" لارا کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے مداخلت کی

"نہیں لارا۔۔ سب کچھ نہیں ہے۔ مجھے وہ چاہیے جو صرف جنوری کو معلوم تھا۔ اگر وہ مجھے اپنی زندگی میں بتا دیتا تو شاید میں یہ سب کچھ نہ کرتا لیکن مجھے معلوم ہی بعد میں ہوا۔ اور اب جب مجھے حقیقت معلوم ہو ہی چکی ہے تو پھر بھلا میں اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھاؤں؟" ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی

"لارا۔۔ بس ایک بار مجھے اس چابی کا پتا چل جائے تو پھر میں ان روحوں کی دنیا میں کبھی داخل نہیں ہونگا۔۔ بس ایک بار وہ چابی مل جائے۔۔" اس کی آنکھوں میں ایک چمک ابھری۔ وہ چابی حاصل کرنا اب اس کا جنون بن چکا تھا تبھی پچھلے ایک ماہ سے وہ دنیا سے کٹ کر کالی طاقتوں کے بارے میں علم حاصل کر رہا تھا۔ ان کے بارے میں پڑھ رہا تھا۔ تبھی گذشتہ رات وہ اپنے سیکھے گئے منتر کے ذریعے ہی ان سے بات کرنے میں کامیاب ہو سکا تھا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔ اس مہم میں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے جیکسن کے ہاتھوں کو تھامتے ہوئے کہا۔

"نہیں لارا۔۔۔ تم میرے ساتھ نہیں چل سکتی۔۔ تمہیں بس یہاں رہ کر دعا کرنی ہے۔ بس ایک ماہ۔۔۔ اس ایک ماہ میں میں اپنا کام مکمل کر لوں گا۔ پھر اس کے بعد ہم اپنی ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔۔" وہ اسے یقین دلا رہا تھا مگر وہ بے یقینی کے ساتھ اس کے

چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ ایک حسرت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ وہ اس پرخطر راہ میں جیکسن کو اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی مگر جیکسن کی بات کو رد کرنا اس نے کبھی سیکھا ہی نہیں۔ وہ جیکسن کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ اس لئے پرنم آنکھوں سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ جیکسن نے آگے بڑھ کر اپنے لبوں کو اس کی پیشانی پر نقش کیا اور اس کے سر کو سینے سے لگا کر اس کی اضطرابی کیفیت کو کم کرنا چاہا۔

''آئی لو یو جیکسن۔۔۔'' لارا نے کہا

''آئی لو یو ٹو سویٹ ہارٹ۔۔۔'' اس کی کمر تھپکی دیتے ہوئے کہا مگر لارا کا دل ابھی بھی بے چینی کا شکار تھا اور ایسا ہونا ایک یقینی امر تھا۔ جیکسن نہ صرف اس کی محبت تھا بلکہ اس کی زندگی تھا۔ اس کی سانسوں کی روانی کا سبب تھا اور بہت جلد وہ دونوں شادی کرنے والے تھے کیونکہ ایک نئی زندگی ان کے درمیان اس تعلق کی مضبوطی کا سبب بن رہی تھی۔

لارا کو یقین دلانے کے بعد وہ شام تک دوبارہ مسٹی کے گھر پہنچ گیا۔ مسٹی آچکی تھی۔ اس نے غیر ضروری باتوں سے اجتناب کیا اور مدعا سے اپنی بات کا آغاز کیا

''مجھے جنوری کے نام کی پہیلی جاننی ہے۔۔'' یہ سن کر وہ بری طرح چونکی۔

''کیا مطلب ہے جیکسن۔۔۔ مجھے تو کچھ معلوم نہیں ایسی پہیلی کے بارے میں۔۔۔'' اس نے جیکسن کے ہر سوال کا جواب نہ میں دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے یا تو وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے یا پھر واقعی جنوری نے کبھی اس کو اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

''تمہیں کچھ تو معلوم ہوگا۔۔ وہ کیا کرتا تھا؟ کہاں جاتا تھا؟ کن لوگوں سے اس کا میل جول تھا؟ یا پھر تم سے کس قسم کی باتیں کرتا تھا؟''

''مجھے ایسا کچھ معلوم نہیں جیکسن۔۔ باتیں تو ہماری عموماً رسمی ہوتی تھیں جیسے کسی بھی کپل کے درمیان ہوا کرتی ہیں۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ جیکسن کے چہرے پر اضطرابی کیفیت ابھری۔

''اب کہاں سے وہ پہیلی ڈھونڈے؟'' وہ بڑبڑایا۔ تبھی مسٹی نے ایک جھرجھری لی شاید اسے کچھ یاد آیا تھا۔

''ہاں۔۔ ویسے تو وہ نارمل گفتگو کرتا تھا مگر جنوری کی طاق راتوں میں اس کا رویہ کچھ عجیب سا ہوتا تھا۔'' اس نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔

''عجیب سا؟؟؟؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ مجھے صاف صاف بتاؤ۔۔ اور ذرا تفصیل سے۔۔۔'' وہ پورے انہماک سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''بات یہ ہے کہ۔۔۔ تقریباً تین سال پہلے جب ہم نیو ائیر نائیٹ منانے شہر سے باہر گئے تو رات کے گیارہ بجتے ہی اس نے مجھ سے اجازت چاہی تھی۔ جس پر میں خاصا ناراض ہوئی کیونکہ اس نے نیو ائیر نائیٹ اکٹھے منانے کا وعدہ کیا تھا اور ایک گھنٹہ پہلے ہی اس نے واپس جانے کا مطالبہ کر دیا۔'' اس کے چہرے پر ذرا سی خفگی ابھری۔۔ جیسے وہ آج بھی جنوری سے اس بات پر ناراض ہو۔

''اچھا پھر۔۔۔'' جیکسن نے کہا

''اس کے بار بار اصرار پر بھی میں اپنی ضد پر اڑی رہی اور واپس جانے کو تیار نہ ہوئی تو بالآخر اس نے وہ رات میرے ساتھ گزارنے پر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ میں اس وقت بہت خوش ہوئی لیکن وہ خوشی زیادہ دیر تک قائم نہ رہی۔ سال نو کے شروع ہوتے ہی جنوری کا رویہ تبدیل ہونا شروع ہو گیا۔ اس کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔۔۔''

''تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کیا بڑبڑا رہا تھا؟'' جیکسن نے پورے انہماک سے سوال کیا

''پوچھا تھا مگر اس نے نفی میں گردن ہلا دی اور پھر میں نے زیادہ توجہ بھی نہ دی کیونکہ میں آسمان پر آتش بازی کو دیکھ رہی تھی۔ رنگ برنگی روشنیاں آسمان پر آویزاں تھیں اور میں اپنا سر اس کے سینے پر رکھے کار کے ساتھ پشت لگائے سڑک پر بیٹھی تھی۔ تبھی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا جسم حد سے زیادہ گرم ہو رہا ہے۔ اس کے لمس میں مجھے عجیب سی بو آنے لگی مگر میں نے اپنا وہم سمجھ کر جھٹک دیا۔ جب آتش بازی کا مظاہرہ ختم ہوا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جو حد سے زیادہ سیاہ تھا۔ ہیلووِن نائیٹ کی تاریکی سے بھی زیادہ سیاہ۔۔۔ میں ٹھٹک کر رہ گئی۔ پلک جھپک کر دوبارہ اس کی طرف دیکھا تو وہ اپنی پرانی شکل میں لوٹ آیا

تھا۔ وہی سرخ و سفید، خوبرو، پرکشش چہرہ۔۔۔ جس پر میں فدا ہوئی تھی۔ میرے سامنے تھا۔ میں نے اپنا وہم سمجھ کر جھٹلا دیا اور اس سے کوئی سوال نہیں کیا یا شاید اس نے موقع ہی نہ دیا۔ فوراً اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیا اور۔۔۔'' اب وہ خاموش ہو چکی تھی۔ جس کا مطلب وہ سمجھ چکا تھا۔ اس لئے آگے کچھ نہ پوچھا لیکن یہ سب معلومات بھی اسے اُس پہیلی تک پہنچانے تک ناکافی تھیں۔

''یہ سب تم نے بس ایک بار ہی محسوس کیا؟'' جیکسن نے سوال کیا۔

''نہیں۔۔۔ کئی بار اور ہر بار صرف جنوری کی طاق راتوں کی خاص گھڑیوں میں۔۔۔'' اس بار اسے کچھ سراغ ملا تھا۔۔۔ خاص گھڑیاں۔۔۔ وہ مزید جاننا چاہتا تھا

''خاص گھڑیاں؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''ہاں۔۔۔ مخصوص حصوں میں۔۔۔ لیکن وہ کون سے مخصوص حصے تھے، اب مجھے اچھی طرح یاد نہیں۔۔'' اس نے اگلا سوال پوچھنے کے قابل نہ چھوڑا مگر جیکسن کے دماغ میں ایک ہلچل تھی اور وہ اتنی جلدی تھم نہیں سکتی تھی۔ ایک پل کی خاموشی کے بعد اس نے دوسرا سوال داغا

''اُس رات تو تم نے وہم سمجھ کر جھٹلا دیا مگر بعد میں۔۔۔ بعد میں تو اس سے سوال پوچھ سکتی تھی؟'' وہ باریکی میں جانا چاہتا تھا

''میں نے کئی بار کوشش کی مگر ہر بار میرے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ مجھے اپنی بانہوں میں لے لیتا اور میں کچھ کہنے کے قابل نہیں رہتی۔ اس کی بانہوں کی خوشبو میں بہک کر سب کچھ بھول جاتی۔۔۔'' اس کی آنکھیں جھکی تھیں مگر وہ سچ سے کام لے رہی تھی

''اور بعد۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ صبح بیدار ہونے کے بعد؟'' اس نے بات کو نیا موڑ دیا۔ سوال وہی رہا بس رخ تبدیل کر دیا تاکہ وہ جواب دیتے ہوئے جھجک محسوس نہ کرے۔

''تب تک میں بھول جاتی۔۔۔ شاید وہ یہ سب کرتا ہی اسی لئے تھا کہ میں اس سے کوئی سوال نہ کروں۔۔'' اس نے ہر بات کی وضاحت کر دی مگر جیکسن کو اپنے سوالوں کا جواب نہ ملا۔ پہیلی وہیں کہ وہیں رہی۔ وہ اب مایوسی کے ساتھ لوٹنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف بڑھا تبھی مسٹی نے آواز دی۔

''رکو جیکسن۔۔۔'' وہ پلٹا۔

''شاید براؤن تمہیں اس کے بارے میں مزید کچھ بتا سکے۔۔۔ وہ اکثر اس کی شاپ پر جاتا تھا۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور براؤن کی شاپ کی راہ لی۔ باہر نکلتے ہی ایک بار پھر سرد ہواؤں نے اس کو آن گھیرا مگر یہ شدت گذشتہ رات جیسی نہیں تھی۔ پچھلی رات تو واقعی اس کے ہاتھ ٹھٹھر گئے تھے لیکن آج اسے جیکٹ میں ہاتھ ڈال کر سکون محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ آج دن میں برفباری نہیں ہوئی۔ وہ بیس منٹ چلنے کے بعد اس کی شاپ پر پہنچ گیا مگر ایک بار پھر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ بھی شہر سے باہر تھا اور اسے کل لوٹنا تھا۔ اس کا مطلب ہے جنوری کا پہلا دن بے معنی ثابت ہوا۔ اب صرف تیس راتیں جن میں سے پندرہ طاق راتیں تھیں، باقی تھیں۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اس نے شاپ پر فون کیا مگر براؤن ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ اس کی واپسی شام تک ممکن تھی یعنی طاق رات میں لیکن وہ اس دن کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے سارا دن گھر میں گزارنے کا فیصلہ کیا کیونکہ دس بج چکے تھے مگر سورج کا نام و نشان نہیں تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے جو شدید برفباری کی پیشین گوئیاں کر رہے تھے۔ اب گھر رہ کر اس نے انٹرنیٹ سے کالی طاقتوں کے بارے میں مزید آگاہی حاصل کی اور ساتھ ہی جنوری کی بک شیلف میں موجود کتابوں کا مطالعہ کیا۔ جنوری کی موت کے بعد اس کمرے کی چابی اسی کے پاس تھی۔ اگرچہ اس کے مرنے کے بعد کئی دنوں تک یہ کمرہ بند ہی رہا کیونکہ اپنی زندگی میں وہ کسی کو اپنے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

جیکسن اور جنوری کے والدین تو بچپن میں ہی ایک کار حادثے میں مر چکے تھے اس لئے گھر میں صرف جیکسن اور جنوری کا ہی قیام تھا۔ ایک ملازمہ تھی جو دن میں ایک

گھنٹے کے لئے گھر کی صاف ستھرائی کے لئے آتی مگر اسے بھی جنوری کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ فقط جیکسن اور کچن کے ساتھ ساتھ ٹی وی لاؤنج کو صاف کرتی اور چلی جاتی۔ کبھی کبھار رات سپینڈ کرنے مسٹی آتی گھر آتی لیکن وہ عموماً اسے اپنے کمرے میں ٹھہرانے کی بجائے جیکسن کے کمرے میں لے جاتا کیونکہ ایسا تب ہی ہوتا تھا جب جیکسن کو کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑتا تھا۔ اس لئے وہ باآسانی اس کا کمرہ استعمال کرسکتا تھا۔ جنوری کی طرح اس نے کبھی اپنے کمرے کو مقفل نہیں رکھا۔ جنوری جب چاہے اس کے کمرے میں آسکتا تھا۔ والدین کی موت کے بعد وہ جنوری کو ان کی کمی کا احساس نہیں دلانا چاہتا تھا اسی لئے اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتا اور فیکٹری میں بعض اوقات ڈبل شفٹ میں کام کرتا۔

جیکسن ایک میڈیکل کمپنی میں ایک عام سا ورکر تھا۔ جس کا کام ادویات کی سپلائی تھا۔ اگرچہ ایک شفٹ میں بھی وہ اپنی تمام ضرورتوں کو پورا کرسکتا تھا مگر جنوری کی خواہشات کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک شفٹ کی اجرت ناکافی تھی۔ ڈبل شفٹ میں کام کرنے کی وجہ سے ہی وہ جنوری کو زیادہ ٹائم دینے سے قاصر تھا۔ اسی لئے وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ہفتوں بعد ملتے تھے۔

لارا سے ملاقات دس سال قبل ہوئی تھی۔ وہ بھی اس کے ساتھ اسی کمپنی میں ایک عام سی ورکر تھی۔ وہ اکیلی رہتی تھی۔ اس لئے بس سنگل شفٹ میں ہی گزارا ہوجاتا تھا۔ شروع میں ہی لارا جیکسن کو دل دے بیٹھی مگر جیکسن جیسے پریکٹیکل آدمی کے لئے یہ سب کچھ نیا تھا۔ ایسا نہیں اس نے کبھی لڑکی کے ساتھ بات چیت نہیں کی بس وہ سب سے ایک حد میں رہ کر بات کرتا تھا مگر لارا کے آگے وہ اپنے آپ کو کنٹرول نہ کرسکا۔ دونوں نے آگے جاکر ایک دوسرے کو اپنا ہم سفر چننے کا فیصلہ کیا لیکن جیکسن جنوری کے ہوتے ہوئے اپنی خواہشات پوری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پہلے جنوری اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے۔ کچھ بن جائے پھر وہ لارا کے ساتھ اپنا رشتہ آگے بڑھائے گا مگر لارا ہمیشہ سے جلد باز واقع ہوئی تھی۔ اب بھی شادی کا فیصلہ لارا کے بنائے گئے پلان کی وجہ سے ہوا تھا۔ لارا اچھی طرح جانتی تھی کہ جیکسن اس سے سچی محبت کرتا ہے اور کبھی اس کو اکیلا نہیں چھوڑے گا اور نہ رسوا کرے گا بس اس لئے اس نے ایک رات اس کی ڈرنک میں نیند کی گولیاں ملادیں اور اسے اپنے بیڈروم میں ہی سلایا اور صبح کو ایسے ری ایکٹ کیا جیسے سب کچھ بائے چانس ہوا ہے۔ جیکسن کو لارا پر یقین تھا۔ اس لئے لارا کو کچھ نہ کہا مگر جلد ہی اسے شادی کے بارے میں سوچنا پڑا۔

''وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے۔۔۔ جو ہم چاہیں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔۔'' ماضی کو یاد کرتے ہوئے اس کے ذہن میں یکا یک ایک ہلچل مچی۔ اس نے فوراً اپنے خیالوں کو جھٹکا۔

''مجھے ابھی ان خیالوں میں نہیں کھونا۔۔۔ یہ مہینہ بس مجھے اپنے پلان پر لگانا ہے۔۔۔'' اس نے سوچا اور کھڑکی سے باہر دیکھا تو ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ رات ہونے میں وقت تھا بس موسم کی خرابی کے باعث جلد اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے برادن کو فون کیا تو وہ شاپ پر ہی موجود تھا۔ اس نے ٹائم لیا اور بس تیس منٹ میں اس کی شاپ پر جا پہنچا۔

''وہ میرے پاس اکثر پین لینے آتا تھا یا پھر سیاہی۔۔'' یہ معمولی سی بات تھیں جو کسی بھی اسٹوڈنٹ کے ضروری ہے۔

''اور کچھ۔۔۔'' اس نے افسوس کے ساتھ کہا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تبھی اسے کچھ یاد آیا۔

''ہاں ایک بار جب میرے پاس سیاہی ختم ہوگئی تو میں نے جنوری کو نیلی روشنائی دینا چاہی مگر اس نے انکار کردیا اور اس نے کہا کہ مجھے بلیک سیاہی چاہیئے۔ میں نے اسے اگلے دن آنے کو کہا مگر اس نے کہا کہ اسے آج ہی چاہیئے۔۔۔''

''اچھا تو پھر اسے مل گئی سیاہی؟''

''ہاں۔۔۔ اس کے لئے اسے شہر سے باہر جانا پڑا تھا'' فقط ایک سیاہی کے لئے شہر سے باہر جانا اس کے لئے حیران کن بات تھی مگر وہ مزید جاننا چاہتا تھا۔ اس کے لئے علاوہ برادن کو کچھ یاد نہیں تھا۔

''وہ دن بتاسکتے ہیں، جس دن آپ کے پاس سیاہی ختم ہوگئی تھی؟'' جیکسن نے استفسار کیا۔

''یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتا۔۔۔ شاید جنوری کی آخری تاریخ تھی۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ جنوری کی آخری تاریخ ہی تھی کیونکہ اگلے دن مجھے گلاب لینے گاؤں جانا تھا۔۔'' ایک سراغ اور مل گیا اسے۔۔ جنوری کی آخری تاریخ کا مطلب آخری طاق رات۔۔۔ لیکن وہ تو گزر چکی تھی۔۔۔ وہ اپنے ہی سوالوں میں الجھ کر رہ گیا۔ طاق تاریخ مگر طاق رات نہیں۔۔ دھویں نے کہا تھا کہ طاق راتوں میں وہ چیزیں ڈھونڈنی ہیں۔۔۔ وہ کڑی سے کڑی ملاتا، الجھی ڈوری کو سلجھانے کی کوشش کررہا تھا مگر ایسا کچھ نہ ہوسکا۔ گھر پہنچنے تک وہ کئی سوالوں سے گھر چکا تھا جن کا جواب شاید کسی کے پاس نہیں تھا۔ اگر کوئی جواب دے سکتا تھا تو وہ خود جنوری تھا مگر اس سے ملنے کے لئے ہی تو یہ سوال پیدا ہوئے تھے۔ تبھی اس کے ذہن میں سیاہی کا لفظ گونجنے لگا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے آج تک کبھی جنوری کو سیاہی استعمال کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ سرخ روشنائی استعمال کرتا تھا۔

''سرخ روشنائی۔۔۔'' اس نے ذہن میں گھنٹی بجی۔ مسٹی کا جنوری کی زندگی میں آنا۔۔۔ اور پھر فقط بانہوں میں کھو کر سب کچھ بھول جانا۔۔ سب اتفاق تو ہو نہیں سکتا۔ اپنی زندگی کی کوئی بات اس نے مسٹی کو نہیں بتائی فقط۔۔۔ وہ سوچ رہا تھا اور شاید کسی نتیجے پر پہنچ ہی چکا تھا۔ عجلت کے ساتھ وہ اپنے روم کی طرف بڑھا اور ہر شے کو بغور دیکھا مگر ہر شے معلوم کے مطابق تھی۔

''جنوری۔۔۔ یہ بیڈ پر چادر کیوں نہیں ہے؟'' اپنا ہی سوال اس کے ذہن میں گونجنے لگا۔ ایک بار جب وہ دوسرے شہر سے واپس آیا تو اپنے کمرے میں موجود بیڈ کو بنا بیڈ شیٹ کے پایا۔

''بھائی۔۔۔ رات مسٹی آئی تھی۔ اب آپ کی چادر پر ہی سلاتا تو وہ خراب ہوجاتی، اس لئے اپنے کمرے سے بیڈ شیٹ لے آیا تھا اور صبح کو واپس لے گیا مگر آپ کی بیڈ شیٹ بچھانا بھول گیا۔'' اس نے سچ سے کام لیا اور جیکسن نے بھی معمولی جانا اور کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔

''اس کا مطلب ہے وہ بیڈ شیٹ۔۔۔'' ایک جھماکے سے اس کا ذہن اس بیڈ شیٹ کی طرف پلٹنی کھانے لگا۔ بھاگتا ہوا وہ جنوری کے کمرے کی طرف بڑھا اور کمرے کی ہر شے کو ٹٹولا مگر ایسی کوئی بیڈ شیٹ نہ ملی جس پر اسے شبہ ہوسکے۔ سب بیڈ شیٹ وہی تھیں جو وہ اپنے بیڈ پر بچھاتا تھا۔

''ہونا ہو۔۔۔ اس بیڈ شیٹ سے کچھ نہ کچھ پتا ضرور چلے گا۔۔۔'' اس نے سر پکڑتے ہوئے باہر کی طرف دیکھا تو جنوری کا دو سرا دن بھی ڈھل چکا تھا۔ آتیس دن بقایا تھا۔ اس کی فکر میں اضافہ ہوا۔ کیونکہ اگر وہ کچھ نہ کرپایا تو بقول دھویں کے وہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس نے آنکھیں بند کرکے ریلکس ہونے کی کوشش کی کیونکہ اکثر چیزیں ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہیں کیونکہ ہم پریشان ہوتے ہیں اور اپنی پریشانی میں عام سی جگہ پر دھیان ہی نہیں کرتے۔ ہر اہم چیز کسی خاص جگہ پر ہو یہ ضروری تو نہیں۔ وہ بھی اسی عام جگہ کو مسلسل اگنار کررہا تھا۔ آنکھیں کھولیں تو اس کی نظر الماری کے نچلے حصے کی طرف گئیں جو عموماً جوتے رکھنے کے لئے مخصوص تھا۔ اس نے بے یقینی کے ساتھ وہ حصہ کھولا تو وہاں پر ایک چادر دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ سیاہ چادر۔۔۔ مٹی کا ایک ذرہ بھی نہیں۔۔ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ وہ چادر اٹھائی اور اسے بغور دیکھنے لگا۔ نرم۔۔ گرم احساس۔۔ جو چھوتے ہی انسان مدہوش ہوجائے۔ ایک ایسا جادوئی تاثر سمیٹے ہوئے۔۔۔

''شاید اس لئے مسٹی کچھ سمجھ نہ سکی۔۔۔'' وہ اب نتیجہ پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ جب اس چادر کا جادو جیکسن جیسے پریکٹیکل آدمی پر چل سکتا ہے تو مسٹی پر کیوں نہیں؟ وہ تو تھی ہی صنف نازک۔۔۔ اس نے اپنے خیالوں کو جھٹکا اور اسے ایک جھٹکے سے ہوا میں لہراتے ہوئے بیڈ پر بچھایا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ دیکھنے میں ایک معمولی سی چادر۔۔۔ وہ اپنے بیڈروم میں واپس آگیا اور اس چادر کو بھی ساتھ لے آیا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔

جب بھی ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی سراغ ملنے لگا ہے تو کیے کرائے پر پانی پھر جاتا۔

''اب کیا کروں۔۔۔'' اس نے چادر کو بیڈ پر دے پھینکا پھر جو ہوا اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس کی اوپر کی سانسیں اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اسے ایسے لگا جیسے وہ اب سانس نہیں لے سکے گا۔ اگرچہ اس نے اس جادوئی دنیا میں داخل ہونے کے لئے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کیا تھا مگر ایسا کچھ ہوگا۔ یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ چادر دیکھتے ہی دیکھتے پورے بیڈ پر خود بخود بچھ گئی۔ کمرے کی لائٹیں خود بخود آف ہوگئیں۔ اندھیرے نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔ چادر۔۔۔ جو کچھ دیر پہلے سیاہ تھی اب آہستہ آہستہ سرخ ہونے لگی۔ اس نے اپنے گردونواح میں نظر دوڑائی تو اسے ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔

''یہ میرا کمرہ نہیں ہے۔۔۔'' وہ بڑبڑایا۔ شاید صحیح تھا۔ وہ واقعی اس کا کمرہ نہیں تھا۔ اس کے کمرے میں سفید پینٹ کیا گیا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے کمرے کی دیواریں رات کی سیاہی میں نہا گئیں۔ کچھ دیر پہلے جن کھڑکیوں سے یخ بستہ ہواؤں کے جھونکے آرہے تھے اب دھوئیں کے بادل داخل ہونے لگے۔ گرمی بڑھنا شروع ہوگئی۔ جیکٹ میں وہ اپنے آپ کو بھیگا ہوا محسوس کرسکتا تھا۔ یہ گرمی کی شدت تھی یا خوف کا اثر۔۔۔ فی الحال کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا۔ وہ یک ٹک دیکھتا رہا۔ سرخ چادر پر ایک عکس دیکھائی دیا۔ شاید کسی لڑکی کا تھا۔ اس نے بغور دیکھنے کی کوشش کی تو وہ اس عکس کو پہچان گیا۔ وہ مستی تھی۔ جنوری کی گرل فرینڈ۔ تب اگلے ہی لمحے اس نے کسی لڑکے کو مستی کے ساتھ لیٹے ہوئے دیکھا۔ شاید وہ جنوری تھا۔۔۔ مگر وہ قریب گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔۔۔ وہ جنوری نہیں تھا۔ جنوری نے کبھی وائیٹ گاؤن نہیں پہنا۔ وہ لڑکا وائیٹ گاؤن پہنے سویا ہوا تھا۔ اس کو جیسے ایک کے بعد ایک دھچکا لگ رہا تھا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔۔۔'' وہ اب پیچھے ہٹنے لگا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ جنوری اس کے ساتھ ایسا کچھ کرسکتا ہے۔ وہ کیوں مستی کو اس کے کمرے میں سلاتا تھا۔ کڑی سے کڑی ملنا شروع ہوگئی۔ پہیلی کا پہلا حصہ جیسے بہت قریب تھا۔ طاق راتوں کا راز جیسے اب سمجھنے لگا تھا۔ وہ کیوں اپنے آپ کو فراموش کرگیا؟ کیوں اس نے خود اپنے اوپر نگاہ نہیں دوڑائی۔ کیوں اس نے اس درد کو محسوس نہ کیا جو وہ اکثر طاق راتوں میں اٹھنے کے بعد محسوس کرتا تھا۔ کیوں اس نے اس کمزوری کو محسوس نہ کیا جو وہ جنوری کی طاق راتوں میں کیا کرتا تھا؟ چاہے اپنے بیڈ پر لیتے ہوئے یا پھر میڈیسن کی ڈلیوری کے سلسلے میں کسی اور شہر میں ہو۔ جب کب جنوری کی طاق رات آتی، ایک پہر کے لئے اس کی آنکھ ضرور لگتی۔ وہ جتنا ہی جاگنے کی کوشش کرتا مگر خماری اس کو آدبوچتی اور جب اٹھتا تو اپنے آپ کو بوجھل محسوس کرتا۔ پاؤں سے چلا نہ جاتا۔ ایک عجیب سا زخم ظاہر ہوتا جو جنوری کے ختم ہوتے ہی خود بخود ٹھیک ہوجاتا مگر جنوری کا مہینہ اس کے لئے کسی عذاب سے کم نہ ہوتا۔ وہ ان سب کو کیسے بھول گیا؟ کیسے اس رات کو بھول گیا جس رات وہ کار ڈرائیو کرتے ہوئے سوگیا۔ اس وقت اس کے جسم پر کوئی خوشبو نہیں تھی مگر جیسے ہی آنکھ کھلی تو کار درخت سے ٹکرا چکی تھی۔ ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے جسم سے بولڈ باڈی سپرے کی مہک آرہی تھی اور جب وہ گھر آیا تو وہی مہک اس کے بیڈروم میں بھی تھی۔ یہ سب اتفاق نہیں تھا۔ اس کا بھائی۔۔۔ جنوری اس کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا۔ اپنی طاقتوں کو بڑھانے کے لئے اس کا استعمال کررہا تھا۔

اس نے پلٹنا چاہا مگر دروازہ غائب تھا۔ ایک اور دھچکا لگا۔ اب وہاں پر رکنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اب ساری رات اسے یہ منظر دیکھنا تھا۔ جو کچھ ہورہا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو ایک اور عکس نمودار ہوا۔ وہ عکس اس کے چھوٹے بھائی جنوری کا تھا۔ جو بیڈ کے سرہانے کے مخالف سمت کھڑا تھا۔ وہ اور مستی سیدھے لیٹے تھے۔ تبھی جنوری نے کچھ پڑھنا شروع کیا۔ اسے سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ شیطانی منتر۔۔۔ منتر کے ختم ہونے تک بیڈ پر لیٹے ہوئے عکس نے مستی کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔ وہ جسم اب بالکل ایک ہوچکے تھے۔ جیکسن کو

اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ جنوری کے عکس کو حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے جتنی اپنے آپ سے نفرت ہورہی تھی اتنی ہی جنوری سے ہورہی تھی۔ جنوری نے اس کی پرخلوص محبت کو داغ دار کردیا۔ اسے رہ رہ کر لارا کا خیال آنے لگا۔ اس نے اس کے ساتھ دھوکہ کیا۔ وہ اب لارا کو کیا منہ دیکھائے گا؟ اپنی محبت کو خالص نہ رکھ سکا۔ آنکھوں سے ایک قطرہ ابھرا اور کہیں غائب ہوگیا۔

تبھی جنوری نے اپنا منتر مکمل کیا۔ دونوں عکس یکجا تھے۔ رائی کے دانے کے برابر بھی فاصلہ نہیں تھا۔ تبھی وہ آگے بڑھا اور دونوں کے انگوٹھوں کو باندھ کر ایک پین اٹھالایا اور ساتھ ہی سیاہی بھی۔ جیکسن سمجھا کہ وہ اب سیاہی کو پین میں ڈال کر کچھ لکھے گا مگر اس کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اس نے سیاہی کو کتاب پر پھینک دیا۔ سارے اوراق سیاہ ہوگئے۔ وہ ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے کچھ بولنا چاہا مگر آواز تو جیسے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔ اس کی زبان کو کسی نے اپنے شکنجے میں لیا ہوا تھا۔ وہ انہی شیطانی قوتوں کا کام تھا۔ دیکھنے کے علاوہ وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا۔

جنوری نے آگے بڑھ کر پین کی نوک جیکسن کے پاؤں میں چبھائی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ خون تھا۔۔۔؟ نہیں وہ خون نہیں تھا۔ وہ سیاہی تھی۔ اس کے پاؤں کے انگوٹھے سے خون کی جگہ سیاہی نکل رہی تھی۔ جنوری اس سیاہی کو پین میں بھر کر اس کتاب میں کچھ لکھنے لگا مگر کیا لکھ رہا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر دیکھ نہیں پایا۔ وہ لکھتا جاتا اور حروف غائب ہوتے جاتے۔۔۔ اس کے جسم میں خوف کی لہر سرایت کرگئی۔ یہ دنیا کتنی مختلف تھی۔ اسے اب احساس ہوا۔ تبھی لاپروائی کے ساتھ اس نے گردن گھمائی تو اس کی چیخ نکل گئی۔

مستی کے لب جیکسن کے عکس کے لبوں پر تھے اور ان لبوں سے خون نکل رہا تھا۔ جو ادھر ادھر گرنے کی بجائے سیدھا جیکسن کے منہ میں جارہا تھا۔ شاید اسی لئے اس نے دونوں کو اس حالت میں جکڑا تھا مگر یہ چیخ اس پر بہت بھاری ثابت ہوئی۔ اس کی چیخ پر وہ روحیں حرکت میں آگئیں اور جنوری جو کتاب میں کچھ لکھ رہا تھا۔۔۔ یک دم اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیکسن نے ابھی تک جنوری کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ فقط سائے سے اس کا پتا لگایا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر جنوری کے چہرے کی طرف گئی تو اس کے منہ سے خون کی الٹی آئی۔ آنکھوں کا بھی بس نہیں چلا ورنہ نکل ہی جاتیں۔ وہ جنوری کے لبادے میں ایک خوفناک اژدھا تھا۔ انسانی جسم مگر اژدھا کا چہرہ۔۔۔ وہ وہیں پر بے ہوش ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

آنکھ کھلی تو اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو اٹھنے کی سکت باقی نہ رہی۔ تبھی رات کو پیش آنے والا واقعہ اس کے دل و دماغ میں کسی فلم کی ریل کی طرح چلنے لگا۔ وہ یکا یک اٹھ بیٹھا۔ حیرت کے ساتھ کمرے کا جائزہ لیا تو سب کچھ ویسا تھا جیسے ہمیشہ سے ہوا کرتا تھا۔ دیواروں کا رنگ دوبارہ وائیٹ ہوچکا تھا۔ بیڈ کی طرف دیکھا تو وہاں وہ چادر بھی نہیں تھی۔ ایک کے بعد ایک جھٹکا لگا۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو دن نکل آیا تھا۔ وہ ساری رات بے ہوش پڑا رہا۔ چلنے کی کوشش کی تو اس سے اپنا قدم اٹھایا نہ گیا۔ پاؤں کی طرف دیکھا تو ایک بار پھر نشانِ زخم پایا۔ ایک بار پھر اس کا سر برح طرح ہچکولے کھانے لگا۔ گذشتہ رات بھی اس کے ساتھ وہی ہوا۔۔۔ اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ ایسا کیسے کرسکتا تھا؟ کیا اس کے جسم پر خود اپنا کنٹرول نہیں تھا؟ وہ کیسے جنوری کی کٹھ پتلی بنا رہا۔ مرنے کے بعد بھی وہ اس کو استعمال کررہا ہے۔ اس کے لئے یہ بات حیران کن تھی۔ وہ اپنے پاؤں کو تقریباً گھسیٹتا ہوا بیڈ پر جا بیٹھا۔ رات کا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔

''اب مجھے جتنا جلد ہوسکے۔۔۔ اس پہیلی کو ڈھونڈنا ہوگا۔۔۔ تبھی اس درد سے راحت ملے گی۔'' اب واقعی اس پہیلی کو ڈھونڈنا اس کے لئے زندگی اور موت کے مترادف تھا۔ اسے اس درد سے راحت چاہیے تھی اور ایسا صرف جنوری ہی کرسکتا تھا۔ مگر کیسے؟ وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ تبھی ذہن ایک جھماکے سے اس کتاب کی طرف مائل ہوا جس میں وہ اس کے خون نما سیاہی کے ساتھ کچھ لکھ رہا تھا۔

''وہ کتاب۔۔۔ اسے ڈھونڈنا ہوگا۔۔۔'' وہ

بڑبڑاتے ہوئے اٹھا مگر درد کی ایک ٹیس نے اسے مہلت نہ دی۔ وہ دوبارہ بیڈ پر دھپ سے بیٹھ گیا۔

"لیکن پہلے اس درد کی تلافی کرنا ہوگی۔۔۔" وہ بمشکل بیڈ کے ساتھ ٹیبل کی طرف بڑھا اور دراز سے فرسٹ ایڈ بکس نکال کر مرہم پٹی کی اور پھر چلتا ہوا جنوری کے کمرے میں گیا۔ درد اگرچہ اب بھی جسم میں سرایت کر رہا تھا مگر اس نے مقصد پر دھیان رکھا۔ پہیلی کا مقصد نئے مقصد میں تبدیل ہوگیا۔ پہلے فقط وہ چابی چاہیے تھی اب اسے اس اذیت سے نجات۔۔۔

"کہاں ہوسکتی ہے؟" اس نے تقریباً سارا کمرہ چھان مارا مگر وہ کتاب نہ ملی۔ مسٹی کو فون کیا مگر اس نے بھی لاتعلقی کا اظہار کیا۔ بات کرتے ہوئے اس کی طبیعت بوجھل تھی۔ جسے سمجھنے میں جنیکسن کو ذرا دیر نہ لگی۔ پہلے اس نے سوچا کہ وہ سب کچھ سچ بتادے مگر اس پراسرار دنیا پر وہ کیونکر عمل کرے؟ وہ سب اس کے ذہن کا چھلاوہ سمجھ کر نظر انداز کردیتی مگر سچ تو یہی تھا، جسے بدلا نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے الماری کا کونہ کھدرا چھان مارا مگر بے سود رہا۔ کمرے میں موجود ایک گوشہ بھی ایسا نہ چھوڑا جس کی اس نے تلاشی نہ کی ہو مگر کچھ نہ ملا۔ وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔

پہیلی کا سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ کہیں ذہنی مریض نہ بن جائے۔ اسے خود سے یہ خطرہ لاحق ہوا۔ ایک طرف ذہنی کشمکش تھی تو دوسری طرف پاؤں کا انگوٹھا۔۔۔ ٹھاٹھے مار رہا تھا۔ ایسا پہلے تو نہیں ہوا۔ جب بھی انگوٹھا زخمی ہوتا تو وہ پٹی کرتا۔ سب ٹھیک ہوجاتا لیکن اس بار ایسا کچھ نہ ہوا۔

"اگر ذرا سی لاپرواہی سے طاق رات جفت میں ضم ہوگئی تو تم وہیں دھنسا دیئے جاؤ گے۔" ایک آواز گونجی۔۔۔ اس نے نظر دوڑائی تو کلینڈر پر تین تاریخ تھی۔ ابھی ڈوریں ایک بار پھر سلجھتی دیکھائی دیں مگر بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والا تھا۔

"شاید میں نے جفت رات میں سچائی کو دیکھا۔۔۔" اس نے خود سے اندازہ لگایا اور بیڈ پر جا گرا۔ اس کا جسم خوف کے پسینے سے شرابور تھا۔ اگرچہ باہر اب بھی سرد ہوائیں پورے گھر کو گھیرے ہوئے تھیں مگر اس کے لئے یہ ہوائیں جہنم کے ایندھن سے کم نہ تھیں۔

"یہ سب تمہارے بھائی کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ اس کا نام۔۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ تمہاری مدد کریں گی۔۔۔" ایک بار پھر وہی آواز گونجی

"میں یہ کیسے بھول گیا؟" وہ جھٹ اٹھا۔ اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔

"جنوری کی راتیں۔۔۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہئے تھا۔۔۔" وہ اب اپنے کمرے میں آیا۔ تیزی سے چلنے کی وجہ سے اس کے پاؤں میں درد کی کئی ٹیسیں اٹھیں مگر اس نے پرواہ نہ کی اور الماری سے جینز اور شرٹ نکال کر واش روم میں گیا۔ آج وہ آدھ گھنٹے تک غسل کرتا رہا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے شرٹ پر جیکٹ پہنی کیونکہ غسل کرتے ہی اس پر کپکپی طاری ہوگئی شاید جادو کا اثر زائل ہوچکا تھا۔ موسم کی شدت اسے ایک بار پھر محسوس ہوئی۔ اس بار اس نے ایک مفلر بھی ساتھ رکھا۔ ہاتھوں میں دستانے پہننے کے بعد اس نے گھر کو مقفل کیا اور سیدھا قبرستان کی طرف بڑھا جہاں جنوری کا تابوت تھا۔ جہاں اسے دفنایا گیا تھا

جنوری اکثر راتیں گھر سے باہر گزارتا تھا۔ ایک رات جب اس نے جنوری کا پیچھا کیا تو اسے ایک قبرستان میں پایا۔ رات کے گھپ اندھیرے میں وہ اسے وہاں دیکھ کر بری طرح چونکا تھا۔ وہ ایک قبر کے کنارے بیٹھ کر کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس وقت اس کے علم میں نہیں تھا کہ وہ کالا جادو کرنے یہاں آتا ہے اس لئے اس کے پاس گیا۔

"جنوری تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پلٹ کر دیکھا مگر چہرے کے تاثر نہ بدلے۔ اس کی آنکھوں میں ا سنسو تھے۔

"بھائی موم ڈیڈ کی یاد آرہی تھی۔ اس لئے سوچا کہ قبرستان میں آکر ان سے مل لوں۔۔۔" اس نے پوری ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بولا تھا مگر اُس وقت جنیکسن نے اسی جھوٹ کو سچ سمجھا اور واپس پلٹ آیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی جنوری کا پیچھا نہیں کیا۔ یہی سمجھتا رہا کہ وہ صرف موم ڈیڈ کی کمی کو مٹانے وہاں جاتا ہے مگر حقیقت

کے دروازے کھلے تو ہر پہیلی سلجھتی چلی گئی۔ راتوں کو قبرستان میں آنا۔۔۔ فقط اپنے علم کو بڑھانا تھا نا کہ موم ڈیڈ کی یادوں کو مٹانا۔

"جنوری تم ایسے کیوں بنے؟" اس کا دل بھر آیا تھا۔ سے ابھی تک یقین نہیں ہوا تھا کہ اس کا سگا بھائی اس کے ساتھ ایسا کرسکتا ہے؟ ایک عرصے تک نہ صرف اسے دھوکے میں رکھا بلکہ اس کا ناجائز استعمال کیا۔

وہ اب جنوری کی قبر پر کھڑا تھا۔ ایک ثانیے کے لئے اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی مگر پھر اسے احساس ہوا کہ شیاطین کے مرنے پر آنسو نہیں بہائے جاتے۔ اپنے آنسو انگلیوں کے پوروں سے پونچھے اور اپنے ہاتھوں سے اس کی قبر کھودنے لگا۔ پوری قبر برف سے ڈھکی تھی۔ سردی کی شدت اتنی تھی کہ عقل مند یہاں کا رخ خوابوں میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے اسے اپنا کام کرنے میں دشواری کا سامنا نہ ہوا۔ اس کا اندازہ ٹھیک ثابت ہوا۔

قبر کے اندر ہی وہ کتاب تھی۔ اس نے وہ کتاب اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس کے بھائی جنوری کا تابوت متحرک ہوا۔ شاید اسے علم ہوچکا تھا۔ اس نے جھٹ اپنا منتر پڑھنا شروع کیا۔ اور کتاب نکالنے کے بعد تیزی سے اس پر مٹی ڈالی اور تیز قدموں کے ساتھ واپس گھر آپہنچا۔ اس پوری مہم کے بعد وہ تھک چکا تھا کیونکہ کسی ایسی قبر کو کھودنا جس پر منوں برف کی تہیں ہوں اور پھر کھودنا بھی یخ بستہ ہاتھوں سے۔۔۔ کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ مگر وہ یہ کام سرانجام دے چکا تھا۔

گھر آنے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں کو دس منٹ تک گرم گرم پانی میں دیئے رکھا تاکہ ان کا ٹمپریچر نارمل ہوجائے۔ ایک وقت کے لئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اب اس کے ہاتھ کبھی متحرک نہ ہونگے۔ برف کی مانند ٹھوس ہوچکے تھے۔ دروازے کا لاک بھی اس نے بڑی مشکل سے کھولا تھا۔ رات نے دوبارہ دستک دی۔ اندھیرے کی شروعات سے ہی اس کے جسم میں نہ جانے کیسی ہلچل مچ گئی۔

"مجھے اب کتاب پڑھنے میں ذرا بھی دیری نہیں کرنی چاہئے۔۔۔" اس نے سوچا اور کتاب کو کھولا مگر وہاں کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ فقط سیاہی تھی۔

"اف۔۔۔ اب ایک نئی پہیلی۔۔۔ ان سیاہی کو الفاظ میں کیسے تبدیل کروں۔۔۔" اس کا دماغ اب اس نئی پہیلی میں الجھ گیا۔ ہر پہیلی کو سلجھانے کے لئے ایک نئی پہیلی اس کی منتظر ہوتی۔ وہ کسی کی مدد بھی نہیں لے سکتا تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اس کی جان بھی خطرے میں پڑسکتی تھی۔ جو کہ اسے خود ہی اس پہیلی کو سلجھانا تھا۔ ہوائیں شائیں شائیں کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہورہی تھیں۔ اس نے کتاب کو بیڈ پر رکھا اور آگے بڑھ کر کھڑکی بند کرنے کی غرض سے کھڑا ہوا تو اس کی انگلی کھڑکی کے کنارے سے بری طرح زخمی ہوئی۔ ایسا لگا جیسے کسی نے انگلی پر چاقو سے وار کیا ہوا۔ ایک ثانیے میں ہی انگلی خون سے سرخ ہوگئی۔

"آہ۔۔۔ ایک اور زخم۔۔۔" وہ کراہتا ہوا واپس بیڈ پر آبیٹھا اور دوبارہ کتاب کو اٹھایا تو خون کی بوندیں ایک ورق پر گریں۔ جہاں جہاں بوند گری تھی وہاں الفاظ آویزاں ہوگئے۔ پہیلی سلجھ چکی تھی۔ کتاب کو پڑھنے کا واحد ذریعہ اس کا اپنا خون تھا۔ اسے اپنا خون بہانا ہوگا۔ تبھی وہ کتاب کو پڑھ سکے گا۔

"شیطان خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور یہی ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔۔۔" اس نے پہلے دن ہی پڑھا تھا اور یہی پہلی پہیلی کا جواب تھا۔ اس نے اپنی انگلی کا سارا خون کتاب کے پہلے ورق پر بکھیر دیا۔ درد کی ٹیس پورے جسم میں ابھرے لگیں مگر اس نے اپنے درد کو ضبط کیا اور پورا ورق جب پڑھنے کے قابل ہوگیا تو اس پر دوا لگائی اور دوبارہ کتاب اٹھا کر اسے پڑھنے لگا۔

"شیطانوں کو سب سے محبوب ہوتی ہے اپنی زندگی اور ہر زندگی کی ہوتی ہے ایک کنجی اور میری زندگی کی کنجی ہے میری کتاب۔ جسے پڑھ کر کوئی بھی مجھ سے مل سکتا ہے اور مجھ سے بات کرسکتا ہے مگر یہ کام اتنا آسان نہیں۔۔۔ مجھ تک پہنچنے کے لئے اسے میرے نام کی پہیلی کو سلجھانا ہوگا۔ مجھے سات اشیاء لاکر دینا ہوگی۔ وہ اشیاء جو فقط جنوری کی طاق راتوں میں ہی میری من چاہی جگہوں پر ڈھونڈنا ہوگی لیکن سب سے پہلے طاق راتوں کو

سمجھنا ہوگا۔ ہر طاق رات آدھی ہوتی ہے۔ کبھی کسی رات میں پوری داخل نہیں ہوتی۔ طاق رات کا آدھا حصہ طاق تاریخ میں اور آدھا حصہ جفت تاریخ میں ہوتا ہے۔ جیسے ہی سال کی ابتدا ہوتی ہے طاق رات اپنے جوبن پر ہوتی ہے اور ایک وقت تک پوری دنیا کو جکڑے رکھتی ہے۔ بس اسی دوران مجھ سے ملنے والے کو میری من چاہی چیزیں ڈھونڈنا ہوں گی اور پھر اسی رات کا دوسرا دور غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے مگر شیطانی قوتوں کو باہر نکلنے کے لئے ایک وقت چاہیے ہوتا ہے لہٰذا ایک وقت گزرنے کے بعد طاق رات کی انتہا ہوتی ہے اور تاریخ کے بدلنے سے پہلے پہلے ختم ہوجاتی ہے۔'' واضح الفاظ بھی اس مبہم چیزوں کو سموئے ہوئے تھے۔

طاق راتوں کا دو حصوں میں آنا۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔ وقت کی بھی قید تھی۔ جاننے کے لئے شاید اسے ورق پلٹنے کی ضرورت تھی لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں تھی ایک بار پھر اپنا خون بہائے۔ اس نے خود ہی پہیلی کو سلجھانا چاہا۔ اس نے ایک پامسٹ کو فون کیا جس سے بات کرنے کے بعد اس کی پہیلی تقریباً سلجھ ہی چکی تھی

''طاق رات کا دو حصوں میں آنے کا مطلب ہے کہ دو راتوں میں طاق رات کا ظہور ہونا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کلینڈر کی تاریخ رات بارہ بجے بدلتی ہے اور آج تین تاریخ ہے۔ اس کا مطلب ہے رات بارہ بجے نئی تاریخ کا آغاز ہوجائے گا۔ چار چونکہ جفت ہے اس لئے رات بارہ بجے کے بعد جفت رات شروع ہوگی اور سورج نکلنے کے بعد اس رات کا ایک حصہ ختم ہوجائے گا اور جب سورج غروب ہوگا تو بقیہ رات دوبارہ شروع ہوجائے گی یعنی جفت رات کا بقیہ حصہ اور پھر وہ حصہ تب تک باقی رہے گا جب تک اگلی تاریخ نہیں شروع ہوجاتی یعنی رات بارہ بجے تک۔۔۔'' اب جیسے وہ ایک پڑاؤ پار کر چکا تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا صرف ایک گھنٹہ باقی ہے۔ یعنی آج کی طاق رات بھی اس نے ضائع کردی۔ اب فقط چودہ طاق راتیں بقایا تھیں۔

☆.....☆.....☆

صبح اس کی آنکھ موبائل کی رنگ سے کھلی۔ اس نے دایاں ہاتھ لحاف سے نکال کر ٹیبل پر ادھر ادھر مارا۔

''ہیلو۔۔'' اس نے خماری میں کہا۔

''یہ کیا تم ابھی تک سو رہے ہو؟'' یہ لارا کی آواز تھی جو اس سے کچھ خفا معلوم ہو رہی تھی۔

''صبح سونے کے لئے تو ہوتی ہے۔۔۔'' پچھلی چند راتوں سے مسلسل اپنے ذہن کو ایک پہیلی میں الجھائے رکھنے کی وجہ سے اس کا جسم تھکن سے ہلکان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے وقت کا علم تک نہ تھا۔

'' تمہارے لئے یہ صبح ہے۔۔۔ ذرا وقت دیکھو۔۔۔ دو بجے ہیں دن کے۔۔'' دو بجے کا سن کر اس کے جسم میں جیسے کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک ایک چھلانگ لگاتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو واقعی دو بج چکے تھے۔ وہ اتنا سویا۔۔ ایسا کیسے ہوا؟ وہ سوچ رہا تھا۔

''ہیلو۔۔ جیکسن۔۔۔ تم سن رہے ہو؟'' ایک وقت تک وہ لارا کی آواز نہ سن سکا۔ اس کا دل جھماکے سے دوبارہ اس کتاب کی طرف گیا۔

''ہوں۔۔ سن رہا ہوں۔۔ اچھا ہوا تم نے فون کردیا۔۔ میں تم سے بعد میں بات کرتا ہوں۔۔۔'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کردیا اور جلدی سے واش روم میں جا کر غسل کیا اور کچن میں جا کر ایک بریڈ پر ذرا سی جیم لگائی اور ساتھ ہی کافی بنانے کے بعد ناشتہ کمرے میں لے آیا۔ کتاب کو سامنے رکھا اور پہلے ورق کو دوبارہ بغور پڑھنے لگا۔ ذہن شیطان کی من پسند اشیاء کی طرف گیا۔

''سات اشیاء۔۔۔؟؟ کون سی اشیاء؟'' وہ سوچ رہا تھا۔ بریڈ ہوا میں معلق رہا۔ تبھی اس کا ذہن سرورق پر مبنی اشیاء کی طرف گیا۔ وہاں ایک بوتل تھی۔ کچھ واضح نہ تھا سوائے لیموں کے۔

'' اس کا مطلب ہے سب سے پہلے مجھے لیموں ڈھونڈنا ہوگا لیکن یہ تو کسی بھی شاپ سے مل جائے گا۔۔'' وہ سوچنے لگا۔ لیکن پھر اپنے خیالوں کو جھٹکا اور

کتاب بند کرنے کے بعد ایک جھرجھری لی اور کچھ دیر ستانے کے لئے آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔

''بھائی۔۔۔'' جیسے ہی اس نے آنکھیں بند کیں تو ایک سرگوشی ہوئی جیسے جنوری اس کے بالکل پاس ہو۔ اس نے کتاب کی طرف دیکھا تو وہ کھلی ہوئی تھی۔ ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے یہ کتاب بند کیا پھر۔۔۔ کوئی وجود اس کے پاس تھا۔ اس نے فوراً منتر پڑھنا شروع کردیا۔ وہ احساس کچھ لمحوں بعد ختم ہوگیا

''مجھے جلد سے جلد اپنا کام کرنا ہوگا۔۔ ورنہ یہ روحیں مجھے پاگل کردیں گی۔۔'' اس نے سوچا اور اوور کوٹ لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔ شاپ سے کچھ لیموں خریدے لئے اور دوبارہ Wandering Souls Church جا پہنچا۔ رات ہوچکی تھی۔ لیموں لے کر وہ دوبارہ اندر داخل ہوا تو وہیں دھواں ایک کھسیانی ہنسی کے ساتھ نمودار ہوا۔

''میں لیموں لے آیا۔۔۔'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔

'' پاگل انسان۔۔۔ یہ لیموں نہیں۔۔ وہ لیموں جو شیطانی ہیں۔۔۔'' دل چیر دینے والی آواز آئی۔

''شیطانی لیموں کیا مطلب۔۔۔؟''

''اس کا نام۔۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ تمہاری مدد کریں گی''

''اس کا نام۔۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ تمہاری مدد کریں گی'' ایک ہی جملہ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

''شیطانی دنیا کی ہر شے عجیب ہے۔ کچھ بھی سیدھے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاتا۔ ہر شے کے پیچھے ایک پہیلی پوشیدہ ہوتی ہے۔'' یہی پہیلی ان طاق راتوں کے عقب میں پوشیدہ تھی جسے ابھی تک جیکسن سلجھانے میں ناکام رہا تھا۔

''جنوری کا نام۔۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ نام تو اس کا جنوری ہے۔۔ اس کی راتیں۔۔۔ راتیں مطلب؟'' وہ واپسی پر سوچتا رہا۔ بارہ بجنے میں صرف دس منٹ بقایا تھا۔ سنسان راستے سے گزرتے ہوئے اسے مسلسل اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی مگر جونہی وہ پلٹتا، برف کی ختم نہ ہونے والی تہوں کو اپنا منتظر پاتا۔ کوئی انسان نہیں۔۔۔ کوئی قدموں کے نشان نہیں۔۔۔ اس راہ پر چلنے کے بعد پہلی بار اسے خوف کا احساس ہوا تھا۔ اس نے تیز قدموں سے گھر کی راہ لی۔ سوچ بھی مفلوج ہوگئی۔ پیچھے سے قدموں کی چاپ بھی مسلسل تیز ہوتی رہی۔ اسے ایک لمحے کے لئے منتر بھی بھول گیا۔ جن کو پڑھ کر وہ کچھ دیر کے لئے سکون محسوس کرتا تھا۔ گھر پہنچتے ہی اس نے سب سے پہلے گھر کو مقفل کیا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے دوبارہ کتاب کو کھولا۔ اب وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ساتھ ہی رکھے چاقو سے اپنی انگلی کو کاٹا۔ خون کی ایک لکیر کو کتاب کے اگلے ورق پر بکھیر دیا

''دس شیطانی چیزیں دس قبرستانوں سے اکٹھی کرنی ہیں مگر وہ قبرستان نہ عام ہوں نہ خاص ہوں بلکہ متوسط ہوں۔ جن کی قبریں بھلائی جاچکی ہوں۔ جن کا زندوں کے ساتھ کوئی رشتہ نہ ہوں اور روحوں کی وہاں ہلچل ہو۔ قدم رکھتے ہی اندھیرے ملیں۔ آوازوں میں شیطانوں کے ترنم رس گھولیں۔ ہر شے جو جادو ٹونے میں استعمال ہو، مگر ان کا تعلق طاق راتوں سے خاص ہوں یا پھر ان کی ملکیت ہو۔ یہی طاق راتیں اس عام شے کو خاص بنائیں۔ یہی عام شے طاق کہلائیں۔ جنوری کی طاق راتوں میں۔۔۔ جنوری کے قبرستانوں میں۔۔۔ جنوری کی قبروں میں۔۔۔''

''ایک نئی پہیلی۔۔۔'' اس سر چکرانے لگا مگر اس بار پہیلی میں ہی کچھ جواب چھپے تھے۔ یعنی ہر پہیلی قبرستان سے جڑی تھی۔ جنوری کا ان سب سے کچھ خاص تعلق تھا اور سب سے بڑھ کر ہر پہیلی کا جواب اسے جنوری کی انہی طاق راتوں میں ڈھونڈنا تھا۔ اس نے رسٹ واچ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ بارہ بج کر دس منٹ ہوچکے تھے یعنی تیسری طاق رات شروع ہوچکی تھی۔ مگر اسے ڈھونڈنا کیا تھا؟ وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔

''جنوری کی طاق راتوں میں۔۔۔ جنوری کے قبرستانوں میں۔۔۔ جنوری کی قبروں میں۔۔۔'' وہ

اس لائن کو بغور پڑھ رہا تھا۔ ہر جملے پر زور تھا۔ ہر جملے میں جنوری کا ذکر تھا مگر کون سا جنوری؟ اس کا بھائی یا پھر مہینہ۔۔۔؟ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے لیپ ٹاپ پر شہر کے پرانے قبرستانوں کی لسٹ نکالی۔ ایک لمبی لسٹ۔۔ کم وبیش دو سو کے قریب شہر میں قبرستان تھے۔

"اب اتنے سارے قبرستان میں سے کن میں شیطانی چیزیں ملیں گی؟" اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ تبھی اس کے ذہن میں جنوری کا نام آیا۔ جنوری۔۔ کیموں۔۔ شاید وہ اب قدرے سمجھنے لگا تھا۔ اپنے گھر کے قریبی قبرستان کو سرچ کیا۔

"Yellowstone National Cemetery" وہ بڑبڑایا

"اب مجھے جلدی کرنا ہوگی۔۔۔ صرف دو گھنٹے بقایا ہیں۔۔" اس نے ایک بار پھر رسٹ واچ کی طرف دیکھا تو ایک بج چکا تھا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے صلیب پہنی اور منتر پڑھتا ہوا نکل کھڑا ہوا۔ راستہ کچھ بل دار تھا اس لئے ایک بار پھر اسے پیدل ہی نکلنا پڑا۔ برف اگرچہ نہیں پڑ رہی تھی مگر ہواؤں کی تیزی میں کمی نہ آئی۔ ہر جھونکا ایک طمانچہ اس کے رخسار پر دے مارتا۔ قبرستان کے بیرونی دروازے تک پہنچتے پہنچتے اسے کم وبیش پندرہ کے قریب طمانچے لگے تھے۔ اس کا دایاں رخسار سرخ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے قبرستان کے قریب سانس لینا چاہی تو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کو پیچھے جکڑ لیا ہو۔ کالی رات اس کی طرف بڑھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ مصائب اس کا راستہ روک رہے تھے جس کا مطلب واضح تھا۔ وہ منزل کے قریب تھا۔ شیطان آزاد رہنا پسند کرتے ہیں۔ غلامی کرنا ان کو پسند نہیں اس لئے اپنی کمزوری کو چھل کے ذریعے چھپاتے ہیں۔ یہی جنوری کر رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو قبریں پھٹتی دیکھائی دیں۔ ایک لمحے کے لئے پیچھے ہٹنا چاہا تو انجانی آواز نے قدم منجمد کر دیئے

"ایک بار بڑھایا ہوا قدم پیچھے کرنے کا مطلب ہے۔۔۔ موت۔۔۔" یہ آواز دل دہلا دینے والی تھی۔ آواز کا مسکن کیا تھا؟ شاید قبریں۔۔۔ اس نے اندازہ لگایا۔ پیچھے ہٹتا قدم روک لیا۔ اور کوٹ کو مٹھیوں میں بھینچتے ہوئے وہ آگے بڑھا تو ایک قبر سے خوفناک اژدھا نکلا اور اسکی طرف بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو ڈستا اس نے منتر کے ذریعے اس کا راستہ موڑ دیا۔ یہ صرف یہیں بس نہ ہوا۔

ہر قبر پھٹتی گئی اور اژدھے نکلتے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اسے اژدھوں کی ایک بڑی تعداد اپنی طرف بڑھتی دیکھائی دی۔ اس کا سانس حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ پیچھے ہٹ نہیں سکتا تھا اور آگے بڑھ نہیں سکتا تھا۔ خوف کا پسینہ اس کی پیشانی سے ٹپ ٹپ گرتا گیا۔ اس نے منتر پڑھنا شروع کیا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا منتر بے کار ہو چکا تھا۔ ایک منتر پانچ منٹ کے بعد کام کرتا ہے۔ اگر اس منتر کا اثر ایک لمبے عرصے تک چاہیے تو اسے مسلسل اپنے لبوں سے اس کو جاری رکھنا پڑتا ہے یا پھر ایک بار پڑھنے کے بعد اپنی مٹھیاں بھینچ لی جائیں تب بھی شیطانی طاقتیں آپ پر اثر نہیں کرتیں۔ اس نے دونوں چانس گنوا دیئے تھے۔

قبروں کے پھٹنے کی آوازیں اور پھر دس دس فٹ لمبے اژدھے اس کو موت کی طرف بلا رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے بھی ایک اژدھا منہ کھولے اپنے نوالے کا انتظار کر رہا تھا۔ لمبائی کتنی تھی اس اژدھے کی؟ اس کا تو کچھ پوچھو ہی ناں۔۔ چوڑائی کم وبیش بیس فٹ تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اتنے خوفناک اژدھا دیکھا تھا۔ اسے وہ رات یاد آئی جب اس نے اپنے بھائی کو بھی اژدھے کی شکل میں دیکھا تھا۔ ابھی وہ ان سے لڑنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اژدھا پھنکارتا ہوا آگے بڑھا۔ اسکی دل دہلا دینے والی چیخ اس سونے قبرستان میں گونجی۔ اپنی آنکھیں میچ لیں مگر کچھ دیر گذر جانے کے باوجود اسے کچھ نہ ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس نے دیکھا کہ سارے اژدھے اس سے دور جا رہے تھے۔ وہ حیران ہوا۔ تبھی اس کی نظر اپنے سینے پر پڑی جہاں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ روشنی صلیب کی روشنی تھی۔ وہ

سمجھ گیا۔ پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھا۔ اژدھے پیچھے ہٹتے گئے۔

"چلے جاؤ۔۔۔" آوازیں گونجنے لگیں مگر اس کے قدم رکے نہیں۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ ہر قبر کو دیکھا مگر کہیں کچھ نہ ملا تبھی اس کی نظر قبرستان کے بیچ و بیچ ایک قبر پر پڑی۔ جہاں پر گیلی مٹی تھی۔ وہ ذرا پاس گیا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ قبر ابھی تیار کی گئی ہو۔ مگر لاش موجود نہ تھی۔ کتبے کی طرف دیکھا نام ٹریسا تھا۔ اسے یہ نام سنا سنا لگا۔ مگر وقت نے سب کچھ بھلا دیا۔ تبھی اس کی نظر کتبے کے عین نیچے رکھے لیموں پر گئی۔ جس پر سرخ رنگ کی دھاڑیاں تھیں اور ان کا سائز تقریباً سیب جتنا تھا۔ اتنے بڑے سائز کے لیموں اس نے آج تک نہیں دیکھے تھے۔ اس نے انہیں اٹھایا تو ایک چیخ کی آواز گونجی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو کوئی نہ تھا۔ دوسرا دھچکا اسے تب لگا جب اس نے سب قبروں کو بند ہوتا دیکھا۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔۔۔" وہ تیزی کے ساتھ واپس پلٹا۔ پہلی شیطانی شے اسے مل چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

سارا دن آرام کرنے کے بعد بھی تھکاوٹ نہیں اتری تھی مگر آرام سے زیادہ اسے کام عزیز تھا۔ تیسری طاق رات کا دوسرا حصہ شروع ہونے میں بس دس منٹ بقایا تھا۔ آج موسم بھی قدرے نارمل رہا۔ دن بھر سورج چمکتا رہا اور برف بھی کچھ پگھل چکی تھی۔ ہواؤں کی تیزی بھی کم تھی۔ اسی لئے اس نے بس جینز اور شرٹ میں راہ سفر باندھا۔ آج رات اسے Roseburg National Cemetery جانا تھا۔ یہ قبرستان بھی برسوں سے بند تھا۔ شاید اس کی وجہ جگہ کی کم دستیابی تھی۔ خیر اسے ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسے تو بس اپنے کام کی چیزیں لینا تھیں اور واپس آنا تھا۔ اس رات اسے نہ ہی کوئی اژدھا نظر آیا اور نہ ہی کوئی مصیبت اس کی منتظر رہی۔ اس نے بڑی ہی آسانی کے ساتھ دوسری شیطانی چیز حاصل کر لی مگر اس کے دل میں ایک عجیب سی بے چینی رہی۔ ہر قدم پر مشکلات پیدا کرنے والے شیطان آج کہاں چلے گئے؟ کیوں انہوں نے اسے آل پنیں لے جانے دیں۔ باریک آل پنیں جو کہ ایک قبر کے کتبے کے نیچے ہی رکھی تھیں۔ یہ قبر بھی اسے کچھ شناسا سی محسوس ہوئی مگر ایک بار پھر اس نے اپنے خیالوں کو جھٹکا اور وہم سمجھ کر انہیں جھٹلا دیا۔

"لارا تم یہاں؟" جیسے ہی وہ رات بارہ بجے گھر پہنچا تو لارا کو اپنا منتظر پایا

"ہاں میں۔۔ تم ہو کہ مجھ سے بات ہی نہیں کر رہے۔۔۔ آخر اتنی بھی ان روحوں سے کیا دلچسپی جیکسن؟" وہ اس سے پوچھ رہی تھی جبکہ اس نے مقفل کھولا اور اپنی شرٹ اتار کر صوفے پر پھینک دی۔ یہ حرکت دیکھ کر لارا کو کچھ عجیب لگا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو جیکسن۔۔ اتنی سردی میں تم صرف بنیان میں ہو۔۔۔" اسے جیکسن کی پرواہ تھی، اسی لئے وہ ایسے بات کر رہی تھی۔

"سردی۔۔۔ شاید تم بھول رہی ہو ان دنوں میرے لئے موسم سے زیادہ روحیں عزیز ہیں اور وجہ میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔۔ مجھے چابی چاہیے" اس نے آدھا سچ بتایا۔ وہ اسے پورا سچ بتا کر پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"چابی۔۔۔ چابی۔۔۔ چابی۔۔۔ فار گاڈ سیک۔۔۔ بھول جاؤ اس چابی کو اور اس خزانے کو۔۔۔" اس نے لاپرواہی کے ساتھ کہا تو جیکسن نے غصے میں اس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں شعلہ جنوں تھیں۔ جسے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے لارا کچھ نہ کہہ سکی۔ اس نے جیکسن کو پہلی بار اس روپ میں دیکھا تھا۔ شاید وہ جیکسن نہیں تھا۔ ماحول کا اس پر اثر ہونے لگا تھا۔ اس نے خود سے اندازہ لگایا

"جیکسن۔۔۔ آر یو اوکے؟" اس نے دیکھا جیسے جیکسن بولنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بول نہیں پا رہا تھا۔ اس کے لبوں کو کسی شے میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا قریب ہوئی تو اس کی آنکھیں ٹھٹھر گئیں۔ سانسیں حلق میں اٹک گئیں۔ جیکسن کے لبوں کو آل پنوں سے سیا گیا تھا۔ باریک آل پنیں جو شاید دور سے نظر بھی نہ آئیں۔

"جیکسن۔۔۔" اس نے خوف سے بھرے لہجے

میں کہا تو جیکسن کو بھی اپنی تکلیف کے سبب کا پتہ چلا۔ آئینے میں خود کو دیکھا تو اس کا وجود بھی ایک لمحے کے لئے ساکت ہوگیا۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ آل پنیں اسے اتنی آسانی سے کیوں مل گئیں کیونکہ اصل امتحان تو اب ہونا تھا۔ اس نے بمشکل سے آل پنوں کو ہٹایا۔ ہر پن نکالتے ہوئے خون کی پھواریں پھوٹ پڑتیں۔ آگے پیچھے سات پنیں اس کے ہونٹوں پر لگائی گئی تھیں۔ اس کے لب بری طرح زخمی ہو چکے تھے۔ لارا کا رو رو کر برا حال تھا۔ وہ اسے حوصلہ دینا چاہتا تھا مگر آواز نکلتی تو تب ہی ناں۔۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانوں پر رکھا تو وہ روہانسا اس کے سینے سے جا ٹکرائی۔

''جیکسن۔۔۔ پلیز۔۔ چھوڑ دو ان آوارہ روحوں کو۔۔ میں تمہیں نہیں کھو سکتی۔۔۔ دیکھو ظالم روحوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا؟ تمہارے لب کتنی بری طرح زخمی کردیئے۔۔ پلیز چھوڑ دو۔۔۔'' وہ اس کے آگے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی اس کا دل بھی ایک لمحے کے لئے بھر آیا مگر وہ اسے سچ نہیں بتا سکتا تھا۔ یہ سچ کہ اگر اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی تو وہ روحیں اس کو زمین میں دھنسا دیں گی۔ اس کے جسم کو کسی نوالے کی طرح اپنا نا شتہ بنالیں گی۔ اس کی آنکھوں میں نمی ابھر آئی۔ ہاتھوں سے اس کی پشت کو تھپتھپایا۔

''لارا۔۔۔'' وہ فقط اتنا ہی کہہ سکا۔ درد کی شدت بڑھ گئی۔ لارا نے پیچھے ہٹ کر نفی میں گردن ہلادی۔

''نہیں۔۔ اب تم کچھ نہیں بولو گے۔۔ آج کے بعد میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تمہیں اب کہیں نہیں جانے دونگی۔۔'' یہ کہہ کر وہ بیڈ روم میں گئی تو اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

''اگر لارا یہاں رہی تو اس کی جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ وہ آوارہ روحیں اسے بھی نقصان پہنچا سکتی ہیں۔۔'' اس نے دل میں سوچا۔

''مجھے لارا کو یہاں سے بھیجنا ہوگا۔۔۔''

☆.....☆.....☆

اگلے دو دن تک وہ گھر پر ہی رہا اور لارا کے سامنے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ سب کچھ ترک کر چکا ہے۔ اگرچہ اس دوران اس نے ایک طاق رات گنوا دی۔ کل آٹھ جنوری تھی۔ اس وقت رات کے تین بجے تھے۔ گذشتہ طاق رات کے دونوں حصوں میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا تو اس نے بھی سکون کی نیند لی۔ چند راتوں کی خماری نے ویسے بھی اس کی آنکھوں کو بوجھل کر دیا تھا۔ خون کے مسلسل اخراج سے کمزوری تو پہلے ہی لاحق ہوچکی تھی۔ اسی لئے وہ اب سکون چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا اسے اپنے اندر کی طاقت کو بڑھانا ہوگا کیونکہ ہر گزرتا دن نئے نئے شیطانوں کو متعارف کروائے گا اور ان سے بچنے کے لئے سب سے ضروری چیز ہمت اور ثابت قدمی تھی۔ ان دو دنوں میں اس نے اپنی خوراک پر پورا دھیان دیا۔ ڈاکٹر سے کچھ ادویات لکھوا لیں تاکہ کمزوری کی صورت میں استعمال کرسکے۔

علی الصبح لارا کی فرینڈ کا فون آیا۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس وجہ سے اسے شہر چھوڑ کر کچھ دنوں کے لئے اس کی تیمارداری کرنے جانا تھا۔ جہاں یہ بات پریشان کن تھی وہیں جیکسن کے لئے خوشی کی بات تھی۔ اس طرح لارا اس سے کچھ دنوں کے لئے دور چلی جائے گی اور یہ اپنا کام آسانی سے کرلے گا۔

آٹھ جنوری کا سورج غروب ہوتے ہی وہ گھر میں بالکل اکیلا تھا۔ سب سے پہلے اس نے کتاب کھولی اور تیسرے ورق کو اپنے سامنے رکھا۔ بالمعمول اسے پڑھنے کے لئے خون چاہئے تھا۔ اس نے اپنی انگلیوں کی طرف دیکھا جہاں دو بار کٹ لگ چکا تھا۔ اب تیسرا کٹ لگانا تھا۔ تبھی اسے اپنے ہونٹوں سے بہے خون کا یاد آیا۔ وہ اس نے ضائع کردیا۔ اسے وہ خون استعمال کرلینا چاہئے تھا مگر افسوس صد افسوس۔۔ وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اسے مزید خون بہانا تھا۔ آنکھیں میچتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اپنا خون بہایا۔ تحریر آویزاں ہوگئی۔

''خون بہانا آسان نہیں۔۔۔ مگر خون بہتا رہے گا۔ جب تک طاق راتیں ختم نہ ہونگی۔ خون بہے گا۔ کبھی کسی کا تو کبھی کسی کا۔ پندرہ راتیں پندرہ قبریں۔۔۔ موت کا

کھیل جاری رہے گا۔ کھیلنے والا کھیلے گا۔۔۔ بہانے والا بہائے گا۔۔۔ ہر اٹھتا قدم نئے شیطانوں کو زندہ کرے گا۔ سات چیزوں کو مجھ تک پہنچا کر وہ من چاہی شے پائے گا'' اس بار کوئی کارآمد شے نہ ملی۔ اگلا ورق پلٹا تو وہی سیاہی آنکھوں کے سامنے تھی۔

''مجھے خون بہانے سے بہتر ان اشیاء کو ڈھونڈنا ہوگا تاکہ میں جلد سے جلد ان آوارہ روحوں کے چکر سے باہر نکل سکوں۔۔'' اس نے سوچا اور کتاب کو ایک آواز کے ساتھ بند کیا۔ اگلی شے کیا ہوسکتی ہے؟ وہ سوچ رہا تھا۔ بارہ بجنے میں بس بیس منٹ بقایا تھا۔

''قبرستان۔۔۔ مجھے قبرستان جانا چاہئے۔۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''مگر کونسے؟'' اس کا دماغ بری طرح الجھا۔ ایک بار پھر وہی کشمکش جنم لینے لگی۔ پچھلے دو دن وہ ان کشمکش سے دور رہا مگر جیسے ہی ان روحوں کے بارے میں دوبارہ سوچا، وہی بے چینی اور اضطرابی دوبارہ ٹھاٹھیں مارنے لگی۔

''شیاطین بھی کتنے ظالم ہیں۔۔ خود پاس آنے کی دعوت دیتے ہیں اور راہ میں رکاوٹیں بھی حائل کردیتے ہیں۔۔۔ ہنہ۔۔'' اس نے گردن جھٹکتے ہوئے خیالوں سے جان چھڑائی اور دروازے کی طرف بڑھا۔ باہر آسمان صاف تھا۔ محکمہ موسمیات نے اگلے دو دنوں تک موسم صاف رہنے کی پیشین گوئی کی تھی۔

''چلو آج کی رات سکون سے گزرے گی۔۔۔'' اس نے سوچا اور جینز پر سیاہ شرٹ پہنے وہ نکل پڑا۔ آج وہ صلیب پہننا بھول گیا تھا۔ تقریباً آدھ گھنٹا پیدل چلنے کے بعد اسے یاد آیا وہ غلط سمت جا رہا ہے۔ قبرستان دائیں سمت تھا اور وہ بائیں سمت جا رہا ہے۔ اسے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ وہ اپنے ذہن کی باتوں میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ رستے کی شناسائی بھی حاصل نہ کرسکا مگر خوش قسمتی کہہ لیجیے عین اسی وقت وہاں سے ایک کار گزری۔ وہ کار اسی سمت جا رہی تھی جو اس کی منزل تھی۔ کار کو ایک عورت ڈرائیو کر رہی تھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''آپ کا شکریہ۔۔۔ اگر آپ مجھے لفٹ نہ دیتیں تو شاید میں وقت پر اپنی منزل تک نہ پہنچ سکتا۔۔''

''آپ کو منزل تک پہنچانا ہی تو میرا کام ہے۔۔'' اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔ جس پر اس نے تعجب کا اظہار کیا مگر گردن جھٹکتے ہوئے وہ اگلی شیطانی چیز کے بارے میں سوچنے لگا۔

''لیموں۔۔۔ پنیں۔۔۔ اب تیسری شے کیا ہوسکتی ہے؟'' اس نے باہر جنگل کو دیکھتے ہوئے سوچا

''کھوپڑی۔۔۔'' ڈرائیو کرتے ہوئے عورت نے بنا دیکھے کہا۔ اس جواب پر جیکسن بری طرح چونکا تھا۔ اس کی سانسیں اتھل پتھل ہوگئیں۔

''کک کک کون ہو تم۔۔۔'' اس کی آواز ہکلائی تو اس عورت نے یکدم بریک لگادی اور پیچھے پلٹ کر دیکھا تو جیسے اس کی چیخ نکل گئی۔ وہ عورت کے لبادے میں ایک ممی تھی۔ سفید پٹیوں میں لپٹی ممی۔۔۔ آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ اس نے جیکسن کو پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھانا چاہا مگر جیکسن پہلے ہی ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر باہر نکلا آیا۔ آناً فاناً وہ کار ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ وہ ممی اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ پلٹ کر بھاگنے لگا۔ سامنے USS Arizona Memorial Cemetery تھا۔ وہ بنا کچھ سوچے سمجھے اندر داخل ہوگیا۔ ہر طرف سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے۔ سیاہ رات سرخ انگاروں میں کہیں کھو کر رہ گئی۔

''موت۔۔۔ موت۔۔۔ موت۔۔۔'' دل کو اپنے شکنجے میں لے کر باریک پتھر کی طرح پیس دینے والی آوازیں اس کو اپنے کنٹرول میں کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کی سانسیں بری طرح اکھڑنے لگیں۔ بھاگتے ہوئے اس نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو ایک قبر پھٹی پڑی تھی۔ جس میں ایک کھوپڑی تھی۔ اس نے بنا جانچ پڑتال کے اسے اٹھالیا۔ اسے اٹھانے کی دیر تھی کہ زمین پھٹ گئی اور وہ اندر دھنستا چلا گیا۔

''عام کھوپڑیاں نہیں چاہیے۔۔۔ جنوری کی چاہئے۔۔۔'' آوازیں آتی رہیں۔ اس کا دل بیٹھتا گیا۔

ہر طرف اندھیرا تھا۔ وہ تقریباً پانچ منٹ تک زمین میں دھنستا گیا۔ شروع شروع میں تو وہ سانس لے سکتا تھا لیکن پھر مٹی کی کنکریاں اس کے نتھنوں میں داخل ہونے لگیں۔ سانس اکھڑنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو حرکت دینا چاہی مگر وہ زمین کی تہوں میں کہیں کھو چکے تھے۔ لبوں کو ہلانا چاہا مگر مٹی کا پریشر اتنا تھا کہ وہ بال کے برابر بھی حرکت نہیں دے سکتا تھا۔ موت اس کو قریب سے نظر آئی۔ وہ سمجھا کہ شاید اس کا آخری وقت قریب آچکا ہے۔ آنکھوں میں بھی باریک باریک کنکریاں اٹکنے لگیں لیکن جب زندگی لکھی ہو تو کوئی وسیلہ بن ہی جاتا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ تین منٹ تک اپنا منتر جاری رکھنے کے بعد وہ زمین پر تھا۔ اس کے کپڑے بنا کسی داغ کے بے عیب تھے۔ وہ حیرت کے ساتھ اپنے آگے پیچھے دیکھنے لگا۔ مٹی کا ایک ذرا بھی نہیں۔۔۔ وہ سب حقیقت تھا یا پھر ایک چھلاوا۔۔۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ شیطانی دنیا کتنی عجیب ہے۔ اسے نے ایک بار پھر سوچا مگر شاید وہ ابھی تک ان شیطانوں سے آزاد نہ ہوا تھا۔

تبھی پیچھے سے ممی نے اس کا گلہ دبانا چاہا۔ اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ پٹیوں کو پھاڑنا چاہا مگر وہ تو فولاد تھا۔ اس کی انگلیاں مڑ گئیں مگر پٹیوں کا کچھ نہ بنا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ تبھی اس کا ہاتھ جینز میں لائٹر پر گیا۔ اس نے یک دم لائٹر جلایا تو آگ کو دیکھ کر وہ ممی پیچھے ہٹ گئی۔

"دور کرو اس کو۔۔۔" وہ لائٹر جلائے اپنی سانسوں کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ تقریباً اپنے گھٹنے پر رکھے ہوئے تھے کہ تبھی اسے احساس ہوا کہ لائٹر میں پٹرول ختم ہونے والا ہے۔ آگ کبھی بھی بجھ سکتی تھی جب کہ ممی کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ تو ایک قبر کے کتبے پر J لکھا نظر آیا۔ باقی نام اور تاریخ مٹی کی نظر ہو چکے تھے۔ اس کتبے کے عین نیچے سفید شے تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے زمین کھودنا شروع کی تو لائٹر بجھ گیا۔ ممی کی ایک بڑی تعداد اس کی طرف بڑھنے لگی۔ قبر بھی پھٹ چکی تھی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا مگر اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلسل متحرک رکھا اور مٹی کو ہٹا کر کھوپڑی نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ یک دم پیچھے سے کسی نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ اس کے گلے تک پہنچ کر اس کو وہیں زمین میں گاڑھ دیتا وہ کھوپڑی حاصل کر چکا تھا۔ ایک بار پھر دل دہلا دینے والی چیخ سنائی دی اور سب کچھ غائب ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

گھر پہنچا تو صبح کی کرنیں سونے گھر میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس کا لباس بری طرح مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ اس نے کھوپڑی بقیہ شیطانی چیزوں کے ساتھ الماری کے نچلے حصے میں رکھیں اور گاؤن نکال کر واش روم میں گیا۔ اب وہ سونا چاہتا تھا۔ اس لئے دن کا لباس پہننے کی بجائے اس نے شب خوابی کے لباس کو فوقیت دی۔ گاؤن پہننے کے بعد اس نے کچن میں جا کر ہلکا پھلکا ناشتہ کیا واپس بیڈ روم میں آکر پہلے فرسٹ ایڈ بکس سے اپنی چوٹوں پر مرہم لگائی بعد میں کھڑکیوں پر پردے لگا کر مصنوعی رات کرنے کی کوشش کی اور اگلی مہم سے پہلے اپنے آپ کو ذہنی طور پر فریش کرنے کے لئے نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔

آنکھ کھلی تو دن کمرے میں ابھی تک روشنی داخل ہونے کو بے تاب تھی۔ شاید وہ چند گھنٹے ہی سو پایا تھا۔ رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو ابھی شام کے چار بجے تھے۔ ابھی آج کی رات کا ایک حصہ باقی تھا۔ کچھ دیر پچھلی مہم کے بارے میں سوچنے کے بعد اس نے ایک انگڑائی لی اور اپنے بیڈ سے اٹھ کر بنا گاؤن تبدیل کئے کچن میں جا کر کافی بنانے لگا۔ اس کی سوچ تھی کہ آج کی رات باقی ہے مگر بہت جلد وہ غلط ثابت ہونے والا تھا۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو بادل امڈتے ہوئے اس کے گھر کی طرف آرہے تھے۔

"محکمہ موسمیات والے بھی کتنے عجیب ہیں۔ پہلے کہتے ہیں دو دن تک مطلع صاف رہے گا اور پھر اگلے دن ہی یہ بارش۔۔۔؟؟" اس نے ناک منہ چڑھایا اور کافی کا کپ ہاتھ میں لئے وہ جنوری کے کمرے کی طرف بڑھا۔ جنوری کے کمرے میں جاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس کا انگوٹھے سے درد کی ٹیسیں جنم لے رہی ہیں۔ اس نے جھک کر دیکھا تو وہاں وہی نشان زخم تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ طاق رات بیت جانے کے بعد وہ گھر آیا تھا اور ابھی سورج بھی غروب نہیں ہوا تو پھر یہ نشان زخم۔۔۔ حالانکہ سوتے ہوئے اس کے پاؤں پر ایسا کوئی زخم نہ تھا۔ اس نے تجسس کے ساتھ جنوری کے کمرے کا تالا کھولا۔

"جنوری۔۔۔ مجھے تم سے پہلے جتنی محبت تھی، اب اتنی ہی نفرت ہے۔ تم نے شیطانی دنیا میں قدم رکھ کر بہت غلط کیا۔ پہلے میں سوچ رہا تھا کہ کہیں میں نے اس دنیا کو شیطانی دنیا سے ملا کر کوئی غلطی تو نہیں کی لیکن اب سوچتا ہوں۔۔۔ اچھا ہوا جو میں لالچ میں آکر تم سے ملنے کی چاہ کر بیٹھا۔ تمہارے گھناؤنے چہرے سے پردہ تو اٹھ گیا۔ پہلے میرا مقصد فقط اس خزانے کی چابی حاصل کرنا تھی جو تم نے اس گھر میں کہیں چھپا کر رکھی ہے مگر اب میرا مقصد تمہارے گھناؤنے کام کو روکنا ہے۔ تم مجھے اپنی کالی طاقتوں کے حصول کے لئے استعمال کرو۔۔۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔۔" کافی کا ایک بھی گھونٹ لئے بغیر اس نے سامنے دیوار پر لٹکی جنوری کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم بہت برے ہو جنوری۔۔۔ بہت برے۔۔"

اس نے نخوت کے ساتھ اس کی تصویر کو دیکھا اور آگے بڑھ کر وہ تصویر اتار کر کچن میں لے جا کر آگ لگا دی۔ ایک بار پھر کالی طاقتوں نے اس کے سامنے اپنے آپ کو آشکار کیا۔ آگ لگاتے ہی وہ تصویر راکھ بن کر ہوا میں تحلیل ہو گئی۔

"تم اور تمہارے شیطان۔۔۔" گردن جھٹکتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آیا، ایک گھونٹ کافی پی تو اسے بدمزہ لگی۔ منہ چڑھا کر اس نے الماری سے جینز نکالی اور غسل کرنے واش روم میں داخل ہوا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ اپنے بالوں کو تاول سے صاف کرتا ہوا واش روم سے باہر آیا۔ اس کا جسم دودھ کی طرح صاف و شفاف تھا۔ کہیں کوئی داغ دھبہ نہیں تھا۔ ایک مسکولر جسم۔۔۔ اس نے تاول کو صوفے پر رکھا اور الماری سے ٹی شرٹ نکالی۔ نہ جانے کیوں اسے گرمی لگ رہی تھی۔ شاید گذشتہ طاق رات شعلوں کے درمیان گزارنے کا اثر تھا۔ ابھی وہ ٹی شرٹ پہن ہی رہا تھا کہ موبائل پر میسج کی رنگ ہوئی۔ اس نے بے دھیانی کے ساتھ پلٹ کر میسج دیکھا۔ کمپنی کی طرف سے کیا گیا میسج ابھی وہ ڈیلیٹ کرنے ہی جا رہا تھا کہ اس کو اپنی سانسیں اٹکی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اس نے موبائل کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔ موبائل فون چیک کیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دوڑ کر ٹی وی لاؤنج میں پہنچ کر ٹی وی پر نیوز چینل لگایا۔ وہ واقعی غلط تھا۔ آج جنوری کی بارہ تاریخ تھی۔ اس کی نظریں بارہ کے ہندسے پر جا کر ٹھہر گئیں۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میں دو دن تک سوتا رہا؟" اس کو تو جیسے ابھی بھی یقین نہیں آرہا تھا مگر سچ یہی تھا۔ تبھی اس کا دھیان انگوٹھے کی طرف گیا۔ ایک طاق رات ضائع ہو گئی مگر اس کا استعمال شیطانی طاقتوں نے بھرپور کیا۔ اسے ایک بار پھر سے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ شیاطین کو وہ ابھی تک سمجھ نہیں سکا تھا۔

"میں اتنا کیسے سو سکتا ہوں؟ اور پھر کوئی تھکن بھی نہیں۔۔۔" وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق تھا۔

"مجھے شیطانوں کی چالوں کو سمجھنا ہوگا۔۔۔ ان کا مقابلہ کرنا ہوگا لیکن۔۔۔" اس کے چہرے پر ایک تاسف تھا وہ ایک طاق رات ضائع کر چکا تھا۔ اب صرف دس طاق راتیں بقایا تھیں اور ان دس طاق راتوں میں اسے نہ صرف بقیہ چار چیزوں کو ڈھونڈنا تھا بلکہ جنوری سے بات بھی کرنی تھی۔ اسے بقیہ کام تیزی سے نمٹانا ہوگا۔ اس نے سوچا اور ٹیبلٹ پر کچھ سرچ کرنے لگا۔ دو منٹ کی سرچنگ کے بعد اسے اپنی مطلوبہ شے مل گئی۔ اس نے ڈائری سے ایک کاغذ پھاڑا اور اس پر کچھ لکھا اور جینز کی پاکٹ میں ڈال کر جیکٹ، مفلر اور دستانے اٹھا لئے۔ اسے اب اپنا ہر کام تیزی سے کرنا تھا۔ اس کے ذہن سے لارا اور مستی کا خیال کچھ وقت کے لئے نکل گیا۔ ذہن میں صرف جنوری۔۔۔ طاق راتیں۔۔۔ شیطانی طاقتیں اور ان سے لڑنے کے لئے سات شیطانی چیزیں گردش کر رہی تھیں۔ اس نے کمرے کو مقفل کیا اور قریبی بس سٹینڈ کی طرف بڑھا۔ اسے شہر سے دور کسی کھنڈرات میں جانا تھا۔

موسم نے انگڑائی لینا شروع کی۔ ہلکی ہواؤں نے بے اعتنائی برتی تو اسے اپنی جیکٹ پہننی پڑی۔ آس پاس کے لوگ بھی اس وقت اسی سردی کا مقابلہ کرتے دیکھائی دیئے۔

''ہائے جیکسن۔۔۔'' کسی نے پیچھے سے اس کے شانوں کو چھوا۔ یہ کرسٹوفر تھا۔ جو دو سال پہلے تک اس کے ساتھ کام کرتا رہا مگر پھر اس کی ٹرانسفر قریبی شہر ہوگئی۔

''کرسٹوفر تم۔۔۔ کیا ہی عمدہ سرپرائز ہے۔۔!! تم کب آئے؟'' وہ اس کو دیکھ کر خاصا خوش دیکھائی دیا لیکن کرسٹوفر کے چہرے کو دیکھ کر ششدر تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''یار جیکسن۔۔۔ یہ کیا ہوا تمہیں؟ تم نے اپنا چہرہ دیکھا ہے؟'' کرسٹوفر نے استفہامیہ انداز میں اس کے چہرے کو چھوا۔

''ہاں۔۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو دیکھا ہے۔ کیوں، کیا ہوا؟'' کرسٹوفر کی بات نے اس کو بھی شک میں ڈال دیا۔

''تم اتنے کمزور ہوگئے۔۔۔ تمہارے گال۔۔ ایسے پچک گئے جیسے کسی غبارے سے ہوا نکال دی گئی ہو اور یہ سیاہ حلقے۔۔۔ تم ایسے تو نہ تھے۔ اپنی صحت کا خیال رکھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟'' اس نے تشویش والے لہجے میں کہا۔

''کرسٹوفر۔۔ تم یقیناً جھوٹ بول رہے ہو۔۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔۔'' اسے کرسٹوفر کی کسی بات پر یقین نہیں آیا۔ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے جب اپنی ٹی شرٹ پہننے کے لئے اپنا جسم دیکھا تھا تو ایسا کچھ نہیں تھا۔

''اور تمہارے مسلز۔۔۔!!! تم بیمار رہے ہو کیا؟'' وہ ایک کے بعد ایک انکشاف کررہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔؟'' اس نے کرسٹوفر کی ایک بات پر بھی یقین نہیں کیا بھلا کوئی اپنی آنکھوں کو جھٹلا سکتا ہے؟

''میں جھوٹ کیوں بولوں گا؟ اگر غلط بیانی کروں تو مجھ پر پھٹکار ہو۔۔ اچھا دفن نصیب نہ ہو۔ بری روحیں مجھے کاٹ کھائیں۔۔'' کرسٹوفر کی باتوں سے جیکسن واقعی پریشان ہوگیا۔ اسے یقین نہیں آیا۔ شیاطین نے کس قدر اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ میں خلط ملط کرکے اسے دیکھا رہے تھے۔ اب تو اسے اپنی آنکھوں پر بھی یقین نہیں رہا تھا۔ شیاطین نے اس کے دماغ کو مکمل طور پر کنٹرول حاصل کرلیا تھا۔ اب وہ وہی دیکھتا تھا جو وہ دیکھانا چاہتے تھے۔ اگر ایسا ہی چلتا رہا تو بہت جلد ہی وہ ناکارہ ہوجاتا اور اپنے مقصد تک پہنچنے سے پہلے ہی قبر میں اتر جاتا۔

''مجھے شیطانی طاقتوں سے چھٹکارا چاہئے۔'' وہ ایک عامل کے پاس گیا تھا جس کا آستانہ ایک سنسان گھاٹ میں سیاہ پہاڑی پر تھا۔ وہ بس تہہ بند باندھے ہوا تھا۔ اتنی سردی میں بھی اس کے جسم پر کوئی گرم شال نہ تھی۔ رات دستک دے چکی تھی۔ ہاتھ سے ہاتھ سوجھائی نہیں دے رہا تھا مگر وہ اس عامل کو دور سے ہی پہنچان گیا۔ شاید ایک انجانی طاقت اس کے جسم میں داخل ہوچکی تھی۔

''تم نے خود ان کو دعوت دی تھی اور اب تم خود ہی پیچھے ہٹ رہے ہو؟'' اس عامل نے ابھی تک اس کا چہرہ تک نہیں دیکھا تھا مگر اس کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔

''میں پیچھے نہیں ہٹ رہا۔۔۔ میں بس اپنا جسم ان شیاطین کے کنٹرول سے نکالنا چاہتا ہوں'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ہواؤں کی تیزی بڑھنے لگی۔ سیاہ آسمان بادلوں میں کہیں غائب ہوگیا۔

''شیاطین کی دنیا۔۔ ہماری دنیا سے یکسر مختلف ہے۔ اول تو وہاں کوئی قدم رکھ نہیں سکتا اور اگر کوئی غلطی سے قدم رکھ لے تو واپسی کے سارے دروازے بند ہوجاتے ہیں اور پھر وہی ہوتا ہے جو شیاطین چاہتے ہیں۔ اس کی خواہشات کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ اس کے ڈر کو اس پر حاوی کردیتے ہیں اور انسان اپنے ڈر اور خواہشات کے سمندر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔'' جملہ مکمل کرنے کے بعد عامل نے ایک ثانیے کے لئے جیکسن کی طرف دیکھا تو ایک انجانی سی طاقت اس کے جسم میں سرایت کرگئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم ہوا میں معلق ہے اور انجانی سی شے اس کے جسم سے نکل رہی ہے۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں۔ ہاتھ فضا میں کھلنے لگے۔ بادل اس کے جسم میں گدگدی کا احساس پیدا کررہے تھے۔ تبھی یک دم ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور اسے زمین پر پٹخ دیا۔ اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو کالی گھاٹی میں خود تنہا پایا۔ عامل کہیں غائب ہوچکا تھا۔ ایک ہاتھی نما بھیڑیا اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ وہاں سے بھاگنا چاہا مگر قدم وہیں زمین میں گڑ گئے۔ ایک بار پھر حالات سے بچنے کے لئے منتر کا سہارا لینا چاہا مگر کسی نے اس کے دماغ کو مفلوج کردیا۔ وہ منتر بھول گیا۔

''بب پپ۔۔۔'' اس کا ذہن بری طرح چکرایا۔ ہاتھی نما بھیڑیا اس کی اور بڑھنے لگا۔ سردرات میں بھی اسے خوف کے پسینے سے نہانے میں ایک سیکنڈ بھی نہیں لگا۔ اس کے بالوں سے ٹپ ٹپ پسینے کی بوندیں گرنے لگیں۔

''بب پپ۔۔۔'' وہ منتر پڑھنے کی کوشش کررہا تھا مگر پڑھ نہیں پایا۔ سامنے دیکھا تو شکاریوں کو اپنے سر پر پایا۔ سیاہی میں نہائے ہوئے ہاتھی نما بھیڑیا، ناخن اتنے تیز اور نوکیلے کہ پتھر کو بھی چیر کر رکھ دیں۔ آنکھیں اتنی سرخ کے انگاروں میں بھی پہنچان لی جائیں۔ بھیڑیا نے اپنا دائیاں ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے پر وار کیا۔ جیکسن کی دردناک چیخ فضا میں گونجی۔

☆.....☆.....☆

ہوش آیا تو خود کو زمین پر لیٹا ہوا پایا۔ وہی منظر اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ جھٹ اٹھ بیٹھا۔ عامل بابا سامنے تھا۔

''بابا۔۔۔ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ آپ کو معلوم ہے کہ میں۔۔۔'' وہ سہمے ہوئے ان کو بتانے لگا۔

''مجھے معلوم ہے۔۔۔ وہ سب تمہارا امتحان تھا۔۔'' اس عامل نے طمانے بھرے لہجے میں کہا۔

''امتحان۔۔۔'' وہ بری طرح چونکا۔

''ہاں۔۔۔ تمہاری کمزوری جانتی تھی مجھے۔۔۔ سو وہ پتا چل گئی۔۔ بس تمہاری اسی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں وہ شیاطین۔۔۔'' عامل اب اسے بتا رہا تھا

''تمہیں اپنے ڈر پر قابو پانا ہوگا۔۔ بار بار جس منتر کا تم سہارا لیتے ہو، دراصل وہی شیاطین کی طاقت ہے۔ کچھ لمحے کے لئے تم ان کے وار سے تو بچ جاتے ہو مگر آنے والے حالات میں وہی شیاطین پہلے زیادہ طاقت ور ہوکر تمہارے پاس آتے ہیں اور پھر تمہارے ذہن کو مفلوج کرکے رکھ دیتے ہیں۔ ایک ہی منتر، ہر شیطان پر عمل نہیں کرتا۔۔۔ تمہیں بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔۔''

''بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔۔'' وہ بڑبڑایا۔

''لیکن بابا۔۔ اس میں وقت لگے گا اور میرے پاس وقت نہیں ہے۔ آج کی طاق رات ملا کر فقط ۹ بقایا ہیں۔'' اس نے اضطرابی کیفیت میں کہا

''مجھے معلوم ہے۔۔۔ اور یہ بھی معلوم ہے کہ یہی تمہاری دوسری کمزوری ہے۔۔'' اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''دوسری کمزوری ۔۔۔ مطلب؟'' اس کا انداز استفہامیہ تھا۔

''طاق راتیں۔۔ تمہیں ڈر ہے کہ جنوری کی طاق راتیں تمہارے ہاتھ سے نہ نکل جائیں۔ بس اس لئے تمہارے ذہن میں طاق راتوں کا خمار رہتا ہے اور یہی خمار شیاطین نے تم سے چھین لیا ہے۔ تم پر ایسی نیند مسلط کردی کہ تم خوابوں کی دنیا میں ہی الجھ کر رہ جاؤ۔۔ اب جب تمہاری آنکھ لگے گی شاطین تمہیں اس دنیا میں لوٹنے نہیں دیں گے۔۔'' یہ سن کر جیکسن کو جیسے دھچکا سا لگا تھا۔ اگر اس کی پشت کے پیچھے چٹان نہ ہوتی تو وہ ضرور نیچے گر جاتا۔ اس میں اب کھڑے رہنے کی سکت باقی نہ رہی۔ زندگی کو موت کو دو راہے پر کھڑا محسوس کررہا تھا۔ اسے شاید اس دنیا میں داخل ہوتے ہوئے اس کی ہولناکیوں کا اتنا علم نہ تھا۔ اگر ہوتا تو کبھی لالچ نہ کرتا۔ اپنی دنیا میں خوش رہتا۔

''تت تو میں اپنی نیند پر کیسے گرفت حاصل کروں؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

''چلہ کر کے۔۔'' اس عامل نے طمانے کے ساتھ جواب دیا

"چلہ۔۔۔ کتنے دن کا؟"

"تین راتوں کا۔۔۔" اب وہ عامل اپنی آنکھیں بند کرکے دوبارہ اپنے عمل میں مصروف ہوگیا جبکہ تین راتوں کو سن کر جیکسن کو ایک اور دھچکا لگا۔ تین راتوں کا مطلب تھا، طاق راتیں ایک بار پھر ہاتھ سے نکل جاتیں۔ ابھی تو اس نے چار اشیاء بھی ڈھونڈنی تھیں۔ اس نے رسٹ واچ دیکھی تو بارہ بج کر پانچ منٹ ہو چکے تھے۔ یعنی طاق رات شروع ہو چکی تھی۔ وہ بنا کچھ سوچے سمجھے وہاں سے نکل آیا۔ ہوائیں سرد تھیں۔ راہیں پتھریلی۔ ایک بار تو اس کا پاؤں مڑا اور وہ بمشکل کھائی میں گرتے گرتے بچا۔ اس کا ذہن بری طرح الجھن کا شکار تھا۔

"طاق راتیں۔۔۔ شیطانی چیزیں۔۔۔ جنوری۔۔۔ منتر۔۔۔ نیند۔۔۔ چلہ۔۔۔" وہ انہی لفظوں کو بڑبڑاتا ہوا چل رہا تھا کہ یکا یک آسمان پر موجود بادلوں نے انگڑائی لی۔ ہوا کے جھونکے یخ بستہ ہو کر ہلکی ہلکی برف برسانے لگے۔ سانسوں سے بھاپ نکلنے لگی۔ وہ اس برفباری کے لئے تیار نہ تھا۔ جسم میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی تو اس نے قدموں کو تیزی سے منزل کی طرف بڑھانا شروع کردیا۔

ایک بجے وہ New Bern Cemetery کے دہانے پر کھڑا تھا۔ آنکھیں تو جیسے اس قبرستان کی حالت کو دیکھ کر ششدر تھیں۔ باہر برف پڑ رہی تھی جبکہ قبرستان کی دہلیز کے پار برف کا نام و نشان تک نہ تھا۔ ایسی بنجر زمین جیسے سالہا سال سے پانی کی ایک بوند بھی اس پر نہ گری ہو۔ کٹاؤ کا شکار۔۔۔ تاحد نگاہ دراڑیں نظر آرہی تھیں۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور آگے بڑھا ابھی اس نے اپنا قدم قبرستان کی دہلیز پر رکھنا ہی چاہا کہ بے اختیار وہ پیچھے کی طرف اُچھلا۔

"یہاں تو دروازہ تھا۔۔۔" وہ بڑبڑایا۔ سامنے ایک دیوار تھی۔ سیاہی میں نہائی ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو مسل کر دوبارہ دیکھا مگر دیوار کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے سرسری انداز میں دائیں جانب گردن گھمائی تو دروازہ اس سے دس قدم کے فاصلے پر تھا۔

"یہ۔۔۔" اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ جھرجھری لیتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور ایک بار پھر جیسے ہی اس نے دہلیز پر قدم رکھنا چاہا تو بے اختیار پیچھے اچھل پڑا۔

"دروازہ۔۔۔" اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ سامنے ایک بار پھر دیوار تھی۔ ماورائی قبرستان اس کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ پھر کم سے کم سات بار ایسا ہوا۔ اسے دروازہ نظر آتا اور پھر غائب ہو جاتا۔ وقت بیتتا جا رہا تھا۔ طاق رات کا پہلا حصہ ختم ہونے میں ایک گھنٹہ بقایا تھا۔ اس بار وہ دروازے کی تلاش میں پیچھے نہ ہٹا بلکہ آگے بڑھ کر دیوار پر چڑھ گیا کیونکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ قبرستان اس دیوار کے پار ہے۔ جیسے ہی وہ دیوار سے کودا تو اپانچ منٹ تک وہ نیچے ہی گرتا چلا گیا۔ چڑھتے ہوئے وہ دیوار بمشکل آٹھ فٹ اونچی تھی لیکن اب وہ آسمان سے گرتا ہوا خود کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ تیز ہوا کے جھونکے اس کو طمانچے مار رہے تھے۔ پھر یک دم اسے زمین پر پٹخ دیا گیا۔

"ہیل۔۔۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھا تو اپنے آپ کو دیکھ کر حیران تھا۔ اتنی اونچائی سے گرنے کے بعد بھی اسے کوئی چوٹ نہ آئی تھی۔ بس لباس مٹی سے اٹ چکا تھا۔ باقی جسم پر کوئی خراش تک نہ تھی۔ ماورائی دنیا واقعی عجیب تھی۔ اس نے شانے اچکاتے ہوئے آگے دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ماورائی مخلوق کے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس نے خوف سے تھوک نگلا مگر نگلا نہ گیا۔ پاؤں کو چھوتے سیاہ گھنگریالے بال، ایک ایک انچ لمبے ناخن، اگر ایک بار جسم میں دھنس جائیں تو گوشت پوست ہی نکال ڈالیں۔ نظر مزید اوپر اٹھی تو اس مخلوق کا انھان دیکھ کر تو جیسے دم خشک ہونے لگا۔ کسی بھیڑیے کی طرح کا ٹانگوں کا نچلا حصہ ناف سے اوپر یک دم کسی خوفناک اژدھے سے مشابہہ دیکھائی دینے لگا۔ یکدم وہ پیچھے اچھل پڑا۔ دانت اس کے سینے تک لمبے تھے۔ آنکھیں تو جیسے لاوا اگل رہی تھیں۔ بکریوں کے تھن کی مانند آنکھیں۔ وہ یک دم پیچھے جا گرا۔

"کک کون ہو تم؟" اس نے وحشت بھرے انداز

ں پوچھا۔

"گڑیا۔۔۔" ایک بھدی سی آواز اس کے کانوں ں گونجی۔ اگر وہ وحشت کا شکار نہ ہوتا تو ضرور اس کی ہنسی نکل آتی۔

"کک کیا چاہتی ہو تم؟" وہ پیچھے ہٹنے لگا۔

"تمہارا خون۔۔۔" وہ اب آگے بڑھ رہی تھی مگر اس سے پہلے کہ وہ اس پر جھپٹتی وہ وہاں سے دائیں طرف کو بھاگنے لگا

"رک جاؤ۔۔۔" پیچھے سے وہی بھدی آواز آئی مگر وہ رکا نہیں۔ بھاگتا رہا۔ کب تک بھاگتا رہا، اسے علم نہیں۔ آواز کے لہجوں میں ذرا بھی کمی نہ آئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک ہی جگہ کے گرد چکر لگا رہا ہے۔

"تمہارا بھاگنا کسی کام نہیں آئے گا۔۔۔ سنا تم نے۔۔۔" وہ بھدی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو وہ رک گیا۔ پیچھے پلٹا تو وہ گڑیا اس کے پیچھے ہی کھڑی تھی۔ اس نے ہمت کرکے پوچھا۔

"کیا چاہتی ہو تم؟"

"کہاں۔۔۔ تمہارا خون۔۔۔"

"مگر کیوں؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے میرے قبرستان میں میری اجازت کے بغیر قدم رکھا۔۔۔" وہ اب جواب بتا رہی تھی۔

"مجھے شیطانی شے چاہیے۔۔۔ بس مجھے وہ دے دو۔۔۔ میں چلا جاؤں گا۔" اس نے اپنے آنے کا جواز بتایا تو ایک کھسیانی ہنسی اس کی سماعت کو چیرنے لگی۔ اس نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے وہ اب اس ہنسی کو مزید نہیں سن سکتا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں سے دھواں نکل رہا ہو۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ شیطانی بال تمہیں مل جائیں گے ۔۔مگر اس کے لئے تمہیں مجھے اپنے خون کا ایک کپ دینا ہوگا۔۔۔"

"ایک کپ۔۔۔" ایک کپ خون سن کر اس کا حلق خشک ہوگیا۔ پہلے کم اس کے جسم سے خون نکلا تھا کہ اب ایک کپ اور۔۔۔ مگر اس کے پاس دوسرا کوئی آپشن موجود نہیں تھا۔ چار و ناچار اسے اپنا خون پیش کرنا پڑا۔ گڑیا نے اپنا کشکول آگے بڑھایا تو اس کا دم خشک ہوگیا۔

"اتنا خون۔۔۔!!" وہ بڑبڑایا تو اس کی کھسیانی ہنسی ایک بار پھر فضا میں گونجی

"تم ہنسومت۔۔۔ میں خون پیش کرتا ہوں۔۔۔" اس کے لیے وہ ہنسی برداشت کرنا ناممکن تھا۔ اس کے اصرار پر وہ خاموش ہوگئی مگر اس کی لاوا اگلتی آنکھیں ابھی تک اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک کانٹے دار جھاڑی سے اپنی انگلی کو زخمی کی تو جیسے خون کی پھوار پھوٹ پڑی۔ ابھی اس نے اپنی انگلی کشکول میں ڈالی ہی تھی کہ وہ خون سے بھر گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ایک سیکنڈ کے دسوے حصے میں اس کے جسم سے اتنا خون نچوڑ لیا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں کے گرد اندھیرا نظر آنے لگا۔ اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر اس گڑیا کی طرف دیکھا جو درندوں کی طرح اس خون کو پی رہی تھی۔ اس نے وحشت کے سبب اپنا تھوک نگلنا چاہا مگر نگلا نہ گیا۔

"شش۔۔۔ شش۔۔۔ شیطانی بال۔۔۔" اس نے بمشکل کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی اور سامنے قبر کی طرف اشارہ کیا۔ ایک کتبہ جس کے نیچے تھوڑے سے بال پڑے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر وہ اٹھائے تو جیسے سب کچھ غائب ہوگیا۔ آناً فاناً اس نے اپنے آپ کو اپنے گھر کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا پایا۔ بال اس کے ہاتھوں سے غائب تھے۔ اس کا سر بری طرح چکرایا اور وہ وہی گر کر بے ہوش ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

اس کی آنکھیں کھلیں تو اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔ نظریں سیدھی چھت کی طرف گئیں۔ سفیدی کا لبادہ اوڑھے۔۔۔ وہ کچھ بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی تو سب کچھ آہستہ آہستہ کسی فلم کی ریل کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن دائیں طرف گھمائی تو بیڈ کی ایک لمبی قطار کو دیکھا۔ شاید وہ کسی اسپتال کے ہال میں موجود تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک بری طرح

چکرارہا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ایک آواز اس کی سماعت سے گزری۔

''اٹھنے کی کوشش مت کرو۔۔۔ابھی تمہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔'' اس نے آواز کے ماخذ کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے بائیں بازو کی طرف دیکھا تو وہاں واقعی ایک ڈرپ چڑھی ہوئی تھی۔

''مم۔۔میں یہاں؟'' وہ بڑبڑایا تو ایک نرس سامنے آموجود ہوئی۔

''آپ کے جسم میں خون کی اتنی قلیل مقدار؟ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ آپ نے چوبیس گھنٹے تک survive کیسے کیا اور وہ بھی یخ بستہ ہواؤں کے رحم و کرم پر۔۔۔'' وہ نرس جیسے یہ بات پوچھنے کے لئے بے چینی ہورہی تھی تبھی اس کے ہوش میں آتے ہی پوچھ ڈالا۔ چوبیس گھنٹے کا سن کر تو جیسے اس کو ایک سو بیس واٹ کا جھٹکا لگا۔

''چچ چچ چوبیس۔۔۔گھنٹے؟'' اس نے استفہامیہ نگاہوں میں جیسے تصدیق چاہی تھی۔

''جی ہاں چوبیس گھنٹے۔۔۔آپ چوبیس گھنٹے تک بے یارومددگار اس فٹ پاتھ پر بے ہوش پڑے رہے۔۔'' نرس نے بتایا تو جیسے اس کے حلق سے دوسری آواز ہی نہ نکلی مگر پھر بھی ہمت کر کے اگلا سوال پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے میں چوبیس گھنٹے بے ہوش رہا۔۔'' اس نے مشکوک لہجے میں استفسار کیا تھا۔

''نہیں۔۔۔ میں نے ایسا بھی نہیں کہا۔۔آپ چوبیس گھنٹے تک اس فٹ پاتھ پر بے ہوش رہے اور یہاں اسپتال آئے ہوئے آپ کو تین دن گزر چکے ہیں۔۔۔'' یہ الفاظ اس کی سماعت کو تیر کی طرح چیرتے ہوئے نکل گئے۔ یک دم اس نے اپنے آپ کو بیڈ میں دھنستا ہوا محسوس کیا۔

''تت تین دن۔۔'' اس کے دماغ کی دنیا میں ہلچل مچ گئی۔

''اب جب جب تمہاری آنکھ لگے گی شاطین تمہیں اس دنیا میں لوٹنے نہیں دیں گے۔'' عامل کی باتیں اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔ شیاطین نے واقعی اس کو بری طرح جکڑ لیا تھا۔

جنوری کی طاق راتیں اس کے ہاتھوں سے نکلتی جا رہی تھیں۔ وہ چند ثانیے کے لئے یونہی بے سدھ لیٹا رہا پھر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ دیکھیے۔۔۔آپ ایسا نہیں کر سکتے۔۔!!'' نرس جیکسن کی اس حرکت پر خاصی حیران تھی۔ وہ عجلت کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے ڈرپ نکال رہا تھا۔

''رقم میں آپ کو بعد میں بھیج دوں گا۔۔۔ابھی مجھے جانا ہے۔۔میرا نام جیکسن ہے اور جہاں مجھے بے ہوش پایا گیا تھا اس کے سامنے ہی میرا گھر ہے۔'' وہ اپنے معالجے کا خرچ دینے کی غرض سے انہیں اپنے گھر کا پتہ بتا رہا تھا۔

''لیکن۔۔آپ ابھی نہیں جا سکتے۔۔آپ میں بہت کمزوری ہے۔۔'' نرس نے اسے روکنے کی کوشش کی

''اگر میں یہاں لیٹا آرام کرتا رہا تو جنوری کی طاق راتیں میرے ہاتھوں سے نکل جائیں گی۔۔'' اس نے لاشعوری طور پر کہا

''جنوری کی طاق راتیں۔۔۔'' نرس بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھنے لگی۔

''آئی ایم سوری۔۔لیکن مجھے جانا ہوگا۔۔'' وہ جھٹ اٹھا اور باہر نکل آیا۔ نرس کو اسے روکنے کا موقع تک نہ ملا۔

''آج کی رات کو اگر میں نے ضائع کر دیا تو بس چھ راتیں بچیں گی۔۔۔اس کا مطلب ہے میرے پاس وقت انتہائی کم ہے۔۔'' اس رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو رات کے نو بج رہے تھے۔

''مجھے آج کی رات ضائع نہیں کرنی چاہئے۔۔۔لیکن سب سے پہلے مجھے گھر جا کر کتاب کو پڑھنا ہوگا۔۔'' اس نے کسی بھی قبرستان جانے کی بجائے اپنے گھر کا رخ لیا۔ ابھی وہ مقفل کھول کر ٹی وی لاؤنج میں داخل ہی ہوا تھا کہ اس کے فون کی رنگ ہوئی، جو ٹی وی لاؤنج میں ہی رکھا تھا۔ پہلے اس نے نظر انداز کرنا چاہا مگر بعد میں اس نے اٹھالیا۔ وہ ایک کال میسج تھا۔

''مسٹی کی ڈیتھ ہوگئی ہے۔۔اسے Abraham Lincoln قبرستان میں دفن کیا جا رہا ہے۔'' یہ سن کر جیسے اسے ایک اور دھچکا لگا۔ ایسے کیسے اس کی موت ہوگئی۔ کہیں شیاطین نے تو نہیں۔۔۔۔لیکن خود ہی اس نے اپنے خیالوں کو جھٹک دیا۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس کے ذریعے تو وہ طاقت حاصل کرتے تھے۔ شاید وہ ایک مصنوعی موت مری ہے۔۔ اس نے گمان کیا اور کتاب پڑھنے کی بجائے وہ قبرستان کی طرف بڑھا۔ رات کے سناٹے میں اسے قبرستان میں کوئی نظر نہ آیا۔

''کوئی ہے یہاں؟'' وہ چلایا مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ وہ تقریباً آدھ گھنٹا یونہی گھومتا رہا مگر قبرستان میں کوئی نہ ملا۔

''سنیے۔۔'' تبھی اسے ایک بوڑھا شخص عصا کے سہارے دور جاتا دکھائی دیا۔ اس کی آواز پر وہ رکا۔

''آپ نے یہاں کسی کا جنازہ دیکھا؟'' جیکسن کے سوال نے اس نے دائیں جانب اشارہ کیا۔ جیکسن نے ایک نظر دائیں طرف دیکھنے کے بعد واپس اس بوڑھے شخص کی طرف دیکھا تو وہ بے اختیار پیچھے کی طرف اُچھل پڑا۔ وہاں کوئی نہ تھا مگر شاید اب اسے عادی ہو جانا چاہیے تھا لیکن انسان کا دماغ کبھی ماورائی چیزوں کو آسانی کے ساتھ قبول نہیں کرتا۔ وہ دوڑتا ہوا دائیں طرف گیا اور تقریباً دس منٹ تک چلتا رہا مگر کوئی نہ ملا تبھی ایک بوڑھی عورت ایک قبر کے سہارے بیٹھے ہوئے نظر آئی۔

''آپ نے کوئی عورت کو دفناتے ہوئے دیکھا یہاں؟'' اس بوڑھی عورت نے بائیں جانب اشارہ کیا۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے وہ ابھی آیا تھا۔ اس نے دوبارہ اس عورت کی طرف دیکھا تو وہ عورت بھی اس بوڑھے شخص کی طرح کہیں غائب ہوگئی۔ خوف کے سبب اس کا پسینہ بہنے لگا۔

''یہ بھی شیطان تھی۔ اس کا مطلب۔۔۔یہاں بلانا ان کی کوئی چال تھی۔۔'' اس نے خود اندازہ لگایا۔

''مگر وہ فون تو اس کے گھر سے تھا۔۔۔'' اپنے خیالوں کو جھٹکا اور آگے بڑھا۔ کم وبیش اس نے پانچ چکر لگائے مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ تبھی دور سے کھدائی کی آواز سنائی دی۔

''کہیں مسٹی کی قبر تو نہیں کھودی جا رہی۔۔۔'' اس نے اندازہ لگایا اور آواز کے ماخذ کی طرف چل دیا۔ وہ چلتا رہا مگر اندھیرا اسے ماخذ سے دور دھکیلتا رہا۔ وہ جتنا آگے بڑھتا آواز اتنی ہی دور سے سنائی دیتی۔ اس نے دوڑ کر وہاں پہنچنے کی کوشش کی تو اس کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑ لیے گئے۔ وہ بیڑیاں اس کے پاؤں کے راستے گھٹنوں تک آگئیں۔

''آہ۔۔۔'' وہ کراہا اور ان بیڑیوں سے نکلنے کی کوشش کی مگر وہ تو ماورائی تھیں۔ خود بخود اس کے جسم کو اپنی لپیٹ میں لینے لگیں۔ اس نے اپنے جسم کو دائیں بائیں الٹ پلٹ کیا مگر بے سود۔ نظر سامنے گئی تو سیاہ بچھو کو جو کہ بلی کی مانند جسامت رکھے ہوئے تھا۔ سامنے حاضر ہوگیا۔ اس بچھو کو دیکھ کر اس کا دم خشک ہوگیا۔ وہ بلی نما بچھو اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے نے تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو اس قید سے رہائی دلانے کی کوشش کی مگر سب بے سود رہا۔ وہ بیڑیاں اس کے پیٹ تک بڑھ چکی تھیں تبھی اسے اپنی بیلٹ پر موجود تیز دھار کا خیال آیا۔ وہ اپنے آپ کو تقریباً گھسیٹتا ہوا قریبی پتھر کی طرف بڑھا۔ بچھو نے بھی اس کا تعاقب جاری رکھا۔ اس بازو بری طرح زخمی ہو رہے تھے مگر بچھو کے ڈنگ سے بہتر یہ خراشیں تھیں۔ اس نے جلدی سے اپنی ناف کو پتھر پر رگڑنا شروع کر دیا۔ شروع میں تکلیف ہوئی مگر پھر نگاہیں بچھو پر جا کر ٹھہر گئیں جو اس سے بمشکل ایک فٹ کے فاصلے پر تھا۔ حرکت تیز کر دی۔ مسلسل اپنے پیٹ کو دائیں بائیں حرکت دے رہا تھا۔ بچھو نے اپنا ڈنگ ہوا میں لہرایا تو تلوار کی دھار جتنا تیز اور سوئی سے زیادہ باریک نظر آیا۔ اس کا حلق خشک ہوگیا۔ پیشانی کی رگیں ابھر آئیں۔ اگر وہ صحیح وقت پر وہاں سے کھڑا نہ ہوتا تو وہ ڈنگ اس کی آنکھوں میں ہوتا تھا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس کی بیلٹ کی تیز دھار نے اسے بچالیا۔ اب وہ بھاگتا ہوا بیس قدم ہی

آگے آیا تھا کہ ایک تابوت نظر آیا اور اس کے ساتھ ہی ایک قبر کھدی ہوئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر تابوت کا ڈھکن کھولا تو ہراساں رہ گیا۔ وہ مسٹی کی لاش تھی۔ ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نہ تھا۔

''سب کہاں چلے گئے؟'' وہ بڑبڑایا اور خود ہی اس تابوت کو قبر میں اتارنے لگا۔ بیس منٹ کی محنت کے بعد وہ اسے قبر میں اتارنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے ابھی ڈھکن بند کرنا ہی چاہا تھا کہ مسٹی کا بازو اوپر کو اٹھا، اس کے ہاتھ سے ڈھکن پیچھے جا گرا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ مسٹی کی مٹھی بندھی۔ تابوت کے کنارے تک اپنا بازو اٹھانے کے بعد اس نے اپنی مٹھی کھولی تو اندر کئی ناخن تھے۔ اسے خیال آیا کہ اگلی شے شاید ناخن ہوں۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں کو اس کی طرف بڑھایا اور بڑی ہمت کے ساتھ اس کے ہاتھوں سے ناخن لئے۔ ناخن لینے کی دیر تھی کہ وہ ہاتھ دوبارہ بے جان ہو کر تابوت میں جا گرا اور ڈھکن خود بخود اس کی قبر پر اپنی تہیں جمانے لگیں جبکہ وہ کھڑا ہراساں دیکھتا رہا۔

☆.....☆.....☆

چھے طاق راتوں میں اب اسے مزید شیطانی چیزوں کی ضرورت تھی۔ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ اس کو اونگھ آنے لگی۔ رات کو اتنا بھاگنے کے بعد اب وہ واقعی تھک چکا تھا۔ صبح سے وہ اپنے کمرے میں بھی نہیں گیا تھا اس ڈر سے کہیں کہ وہ سو نہ جائے اور پھر کوئی طاق گنوا نہ دے۔

''نہیں۔۔۔ مجھے سونا نہیں ہے۔۔۔'' وہ بڑبڑایا لیکن نیند نے اپنا اثر جاری رکھا۔ وہ بار بار اونگھتا رہا لیکن وہ بار بار ایک جھٹکے سے نیند کو بھگاتا، تبھی اس کے ذہن میں کتاب کا خیال آیا۔ ''شاید کتاب میں اس کا حل لکھا ہو؟'' اس نے سوچا اور اٹھ کر جنوری کے روم میں داخل ہوا۔

''ہر گزرتی رات نیند میں اضافہ کرتی رہے گی۔۔۔ خوابوں کی دنیا، حقیقت میں ضم ہو جائے گی۔ آخری پڑاؤ پر پہنچنے سے پہلے ہی کچھ واپس لوٹ جائیں گے اور قبر کی تہوں میں اتار دیئے جائیں گے۔ خون کی پیاسی روحیں ان کا خون نچوڑ دیں گی۔ جو جتنا جاگنے کی کوشش کرے گا، شیاطین اس پر اتنا ہی غلبہ حاصل کر لیں گے۔۔۔'' اس کے دماغ کو جیسے بری طرح دھچکا لگا تھا۔ عامل کی باتیں سچ ہو رہی تھیں۔ اسے بس دو اشیاء چاہئے تھیں۔ جس کا مطلب تھا فقط دو راتیں کافی ہیں۔۔ لیکن اگر وہ سو گیا تو دو راتیں کبھی میسر نہ ہونگی۔ اس لئے اس نے چلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عامل کے پاس رات ہونے سے پہلے ہی جا پہنچا تو اس عامل نے ایک منتر دیا اور کہا کہ اسے یہ منتر سامنے کالی پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر اکیلے کرنا ہوگا اور چلہ کرتے ہوئے اس کے جسم پر بس مختصر کپڑے ہوں یعنی اسے تقریباً برہنہ ہو کر ہی یہ چلہ کرنا تھا۔ عامل سے ہدایات لینے کے بعد اس نے پہاڑی پر چڑھنا شروع کیا۔ ہر اٹھتا قدم اسے سرد موسم کی طرف دھکیل رہا تھا۔ یک بستہ ہوائیں خون کو جما دینے والی تھیں۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو برفباری شروع ہوگئی۔ یخ بستہ ہوائیں اس کے جسم کو برفیلے ٹیلے میں تبدیل کر دینے کو تیار تھیں۔ تاحد نگاہ صرف سناٹا تھا اور ایسے میں اس کو اپنے کپڑے اتار کر یہ چلہ کرنا تھا۔

''یہ سردی کا عذاب۔۔۔'' اس کے ہونٹ صرف چند لمحوں میں ہی نیلے پڑ گئے لیکن اسے تو تین راتیں ایسے ہی گزارنی تھیں۔ ابھی اس نے شرٹ ہی اتاری تھی کہ یخ بستہ ہوائیں اس کے جسم میں اترنا شروع ہوگئیں۔ ہاتھ سردی کے سبب کپکپانے لگے۔ جسم کے نچلے حصے کے کپڑے اتارنے کے بعد تو جیسے اس نے اپنے آپ کو برفیلا ٹیلا ہی محسوس کیا تھا۔ پورا جسم سوائے چند حصوں کے برہنہ تھا مگر اس نے ہمت کر کے آلتی پالتی مار لی اور آنکھیں بند کر کے منتر پڑھنا شروع کیا۔ تبھی اس کے جسم میں ایک جھرجھری سی ہوئی۔ اسے اپنی آنکھیں کھولنا پڑیں۔ نظر سامنے رکھی پینٹ شرٹ پر گئیں تو اسے جیسے ایک دھچکا لگا۔ وہ برف کی تہوں میں کہیں کھو گئے تھے۔ رسٹ واچ کا ڈائل بھی مبہم نظر آ رہا تھا۔ اس نے بمشکل وقت اور تاریخ دیکھنے کی کوشش کی تو جیسے اس کی سانسیں اٹک گئیں۔ بائیس تاریخ

صبح کے تین بجے تھے۔ اس کی آنکھیں یک ٹک بس تاریخ کو ہی دیکھتی جا رہی تھیں۔ اس نے منتر پڑھنا بند کیا۔

''تین دن گزر گئے؟'' اسے تو جیسے یقین ہی نہ آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی منتر پڑھنا شروع کیا تھا اور صرف چند سیکنڈ ہی وہ منتر پڑھا۔

''ماورائی و شیاطین کی دنیا میں وقت کتنی تیزی سے گزرتا ہے۔۔۔'' اس نے سوچا اور برف کو ہٹاتے ہوئے کپڑے پہننے کی کوشش کی مگر وہ تو جیسے چٹان بن چکے تھے۔ انہیں پہننے کا مطلب کسی چٹان کو پہننا تھا۔

''اب گھر کیسے جائے؟'' اس نے اپنی حالت کی طرف دیکھا۔ جسم برہنہ تھا اور وہ شہر سے ایک فاصلے پر تھا۔ ایسے میں بازاروں سے گزرنا اس کے لئے شرم کی بات تھی۔ وقت اگرچہ رات کا تھا لیکن ایسے میں پولیس بھی گردش کرتی ہے اور اگر انہوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی تو۔۔۔ وہ بری طرح پھنس چکا تھا۔ اس نے ذہن میں اپنے بیڈروم کا تصور کیا اور آنکھیں کھلیں تو اپنے آپ کو بیڈروم میں پایا۔ اسے ایک اور دھچکا لگا۔ وہ ایسے کیسے یہاں پہنچ گیا؟ اس نے جھرجھری لی اور الماری کی طرف بڑھ کر جینز اور شرٹ نکال کر واش روم میں جا کر غسل کیا۔

''اب مجھے اگلی چیزوں کو ڈھونڈنا ہوگا لیکن اس کے لئے مجھے آج رات بارہ بجے تک انتظار کرنا ہوگا۔۔۔'' واش روم سے باہر آنے کے بعد اس نے سوچا اور کچن میں جا کر کچھ چائے ناشتہ کیا۔ تین دن بغیر کھائے پیئے گزارنے کے باوجود اسے نہ بھوک لگ رہی تھی اور نہ پیاس۔۔۔ اس نے جنوری کے بارے میں سوچا۔ ''جنوری۔۔۔ تم کتنے بڑے شیطان تھے۔۔۔'' اس نے سوچا۔

''اور تم بھی یہی بننے جا رہے ہو۔۔۔'' ایک سرگوشی ہوئی۔ اس نے ماخذ کو ترا شنا چاہا مگر وہ غائب رہا۔

''لیکن میرا مقصد۔۔۔ صرف اپنے جسم کو آزاد کروانا ہے۔۔۔'' اس نے سوچا اور ٹی وی لاؤنج میں آ کر ماورائی کتابیں پڑھنے لگا۔ رات گئے تھے وہ انہی کتابوں کو پڑھتا رہا۔ رات ہوتے ہی اس نے جیکٹ پہنی اور قبرستان جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ خود کو اس قبرستان میں پایا جہاں اس نے جانے کا ارادہ کیا تھا۔

''میں۔۔۔ Andrew Johnson قبرستان میں؟؟؟؟'' وہ بڑبڑایا تبھی اس کے ذہن میں چلے کا خیال آیا۔ ''کہیں اس چلے کی وجہ سے مجھ میں کچھ طاقتیں تو نہیں آ گئیں۔۔۔'' اس نے خیال کیا۔ شاید کسی حد تک درست تھا۔ مگر اسے ڈھونڈنا کیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پایا۔ آج یہاں کوئی شیطان نہ تھا۔ اس نے آدھ گھنٹے میں پورا قبرستان چھان مارا مگر کوئی قابل نظر شے دیکھائی نہ دی۔

''میں کیا ڈھونڈوں؟؟؟'' وہ بڑبڑایا۔

''کتاب۔۔۔ ہاں مجھے کتاب پڑھنی ہوگی۔۔۔'' اس نے سوچا اور اپنے آپ کو دوبارہ گھر میں خیال کیا تو وہ دوبارہ گھر میں تھا۔

''کچھ شیطانی چیزیں انسان کو آسانی سے مل جاتی ہیں اور کچھ پوشیدہ ہوتی ہیں۔ آنکھوں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی آنکھیں دیکھنے سے قاصر رہتی ہیں۔ ناخن۔۔۔ بال۔۔۔ لیموں۔۔۔ کھوپڑی۔۔۔ پنیں۔۔۔'' ورق ختم ہو گیا اگلی دو چیزیں اگلے صفحات پر تھیں۔ اس نے بمشکل اپنا خون اگلے صفحے پر نچوڑا تو دم خشک ہو گیا۔ شیاطین کتنے بے شرم ہیں۔۔۔ وہ بڑبڑایا۔ اسے جھجک محسوس ہوئی۔ اتنی بے ہودہ شے کو وہ کیسے حاصل کرے؟ اس نے سوچا۔ اس نے دوبارہ اپنے آپ کو قبرستان میں خیال کیا تو چوہوں کی ایک فوج کو اپنا منتظر پایا۔ اس کے قدم اٹھانے کی دیر تھی کہ وہ چوہیں اس پر حملے کو تیار ہو گئے۔ سرخ آنکھوں والے خرگوش نما چوہے۔ ایک چوہا اس کے چہرے پر جھپٹا اور اس کو نوچنے لگا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے جھٹک دیا اور تیزی سے قبر تلاش کرنے لگا۔

''Sexual Fluids'' اس کے ذہن میں چھٹی چیز گردش کر رہی تھی۔ اتنی بے ہودہ چیز۔۔۔ مگر اسے وہ حاصل کرنا تھی۔ اس نے ادھر دیکھا مگر چوہوں کے علاوہ کوئی شے نظر نہ آئی۔ گرتا پڑتا، چوہوں سے مقابلہ کرتا وہ ایک قبر کے پاس جا پہنچا جس کی قبر کے کتبے کے نیچے ایک بوتل رکھی تھی۔ کتبے پر کرسٹوفر کا نام تھا۔

''کرسٹوفر مر گیا؟'' اسے جیسے ایک بار پھر اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پہلے مسٹی کی ناگہانی موت اور

اب کرسٹوفر۔۔۔تبھی پیچھے سے ایک چوہے نے اس کی پشت پر وار کیا

''آہ۔۔'' وہ چیخا۔اور ایک انجانی سی دیوار کو اپنے اور چوہوں کے درمیان خیال کیا جو جلد ہی حقیقت بن گئی۔چوہے تمام اس دیوار کے عقب میں رہ گئے مگر ان شیطانی چوہوں نے اس دیوار کو کترنا شروع کردیا۔اس نے جلدی سے بوتل اٹھائی اور گھر کا خیال کیا۔اب وہ گھر تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔اور لاشعوری طور پر بوتل میں دیکھا تو وہ خالی تھی۔اسے ایک دھچکا لگا۔وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔اس نے کتاب اٹھا کر اپنی انگلی پر کٹ لگایا اور ورق کا بقیہ حصہ پڑھا

''باقی شیطانی چیزوں کی طرح اسے بقیہ دو شے خود بخود نہیں ملیں گی۔ اسے وہ چیزیں خود حاصل کرنا ہوگی۔Sexual Fluids کو بھی اس نے اپنے ہاتھوں سے حاصل کرنا ہوگا۔'' اس کو جیسے قے آنے لگی۔اتنی گندگی ہے شیاطین میں۔۔لیکن پھر اسے خیال آیا کہ شیاطین تو پسند ہی گندگی کو کرتے ہیں۔اب چارو ناچار اس نے دوبارہ اپنے آپ کو قبرستان میں خیال کیا۔چوہے ابھی تک دیوار کتر رہے تھے۔شاید انہیں اندازہ تھا کہ جیکسن واپس آنے والا ہے۔اس نے جلدی سے قبر سے مٹی ہٹائی اور تابوت کا ڈھکن کھولا۔ اندر کرسٹوفر کی لاش تھی۔

''آئی ایم سوری کرسٹوفر۔۔۔لیکن مجھے یہ کرنا ہوگا۔۔۔'' اس نے معذرت چاہی مگر کرسٹوفر کے چہرے پر ایک مسکراہٹ چھا گئی۔شاید وہ جانتا تھا۔اس نے پلٹ کر دیکھا تو چوہے اب دیوار کو تقریباً کتر ہی چکے تھے۔اس نے جھٹ کرسٹوفر کے کپڑے معمولی سے اتارے اور آنکھیں بند کرکے Sexual Fluids لیا۔

''جیکسن۔۔۔'' چوہیں چیختے ہوئے آگے بڑھے لیکن اس نے جھٹ اپنے آپ کو دوبارہ گھر میں خیال کیا۔اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔ہاتھوں پر بھی Sexual Fluids تھا۔اسے اپنے آپ سے مزید گھن آنے لگی۔جلدی سے واش روم میں جا کر غسل کیا اور تقریباً ایک گھنٹے تک وہ واش روم سے باہر نہ نکلا

☆.....☆.....☆

چلہ کافی کارآمد ثابت ہوا۔ اس کی نیند اڑ نچھو ہوگئی۔اب وہ چاہ کر بھی سو نہیں پا رہا تھا اور تھکان بھی اتر چکی تھی لیکن پریشان کن بات یہ تھی کہ اس نے بقیہ دو طاق راتوں میں دس سے زائد قبرستان کا دورہ کیا مگر کچھ نہ ملا۔آج انتیس جنوری کا آخری پہر تھا۔یعنی سیکنڈ لاسٹ طاق رات کی آخری گھڑیاں تھیں۔وہ مکمل کتاب پڑھ چکا تھا۔اور آخری شے بھی اس کے علم میں تھی مگر وہ کہیں نہ ملا۔ Sexual Fluids تو حاصل کرنا اس کے بس میں تھا۔وہ جذبات کی کیفیت سے حاصل کرلیا گیا مگر یہ شے وہ کیسے حاصل کرے؟ اس کا دماغ بری طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔اب وہ اپنے گھر میں ہی تھا،کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔

''جنوری کی راتوں میں۔۔۔ جنوری کی قبروں سے۔۔۔'' اس کے ذہن میں ایک خیال امڈ آیا۔اب تک اس نے جتنی بھی شیطانی اشیاء حاصل کیں وہ سب ان لوگوں کی تھی جو جنوری میں پیدا ہوئے تھے۔یعنی جنوری کی قبروں سے۔۔۔جنوری کی راتوں میں یعنی طاق راتیں۔۔یعنی ہر شیطانی شے کا تعلق جنوری سے تھا۔مستی ہو یا کرسٹوفر سب کے سب جنوری میں پیدا ہوئے تھے۔تبھی اس کا خیال اپنی ذات کی طرف گیا۔وہ خود بھی تو جنوری میں پیدا ہوا تھا۔ جنوری کی طاق رات میں۔اکتیس جنوری کی آخری گھڑیوں میں۔۔اس کا دماغ ہچکولے کھا رہا تھا۔

''مستی اور میں۔۔۔'' اسے جیسے اب سب کچھ سمجھ آرہا تھا۔مستی اور اس رات کو اکٹھے ہونا۔اب اس کی سمجھ میں آگیا۔مستی کی برتھ ڈے بھی اکتیس جنوری کی آخری گھڑیاں تھی۔جنوری ان دونوں کو یکجا کرنے کے بعد اپنی طاقتیں بڑھاتا تھا۔منہ کے ذریعے مستی کا اپنا خون جیکسن کے جسم میں داخل کرنا اور پھر جیکسن کے پاؤں کے ذریعے جنوری کا سایا ہی باہر نکالنا سب شیطانی عمل تھا۔وہ اب اس عمل کے پیچھے چھپے راز کو جان چکا تھا۔

''Urine'' اس نے سوچا اور اپنے آپ کو دوبارہ Jacksonville cemetery میں خیال کیا۔وہ

جلد سے جلد اب نئی قبر ڈھونڈنے لگا۔بالآخر اسے ایک قبر مل گئی جس پر اس کا نام کندا کیا گیا تھا۔اسے دیکھ کر ایک دھچکا لگا مگر اپنے آپ کو سنبھال کر آگے بڑھا مگر تبھی چڑیلوں کی ایک لمبی قطار نظر آئی۔وہ سب اس قبر کے آگے کھڑی تھیں

''ہاہاہاہا۔۔۔'' وہ اس پر ہنس رہی تھیں اور وہ اس ہنسی کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔اس نے آگے بڑھنا چاہا اور کتبے کے نیچے رکھی witch bottle اٹھانا چاہی لیکن چڑیل راہ میں حائل ہوگئی۔

''اتنی جلدی نہیں۔۔۔'' وہ چڑیل ایک خوبصورت دوشیزہ کے روپ میں اس کے سامنے آگئی۔اسے دیکھتے ہی اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر سی گئیں۔وہ جانے کیوں اس پر فریفتہ ہونے لگا۔سیاہ رات میں دودھیا جسم رکھنے والی کنواری دوشیزہ۔۔اس کا دل جانے کیوں تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''ابھی کچھ وقت میرے ساتھ تو گزار لو۔۔۔ پیارے'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف بڑھ گئی۔اس کا ذہن جانے کیسے مفلوج ہوگیا۔اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج ہوگئی۔وہ چڑیل اس کو ایک پرانی قبر کی طرف لے گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوبصورت بیڈ میں تبدیل ہوگئی۔ دوسری چڑیلیں بھی اس کی طرف بڑھنے لگیں اور ہر بڑھتا قدم ان کو نئی دوشیزہ کی شکل میں اس کے سامنے پیش کرتا۔وہ ان سب کے حسن میں گھلتا جا رہا تھا۔آنکھیں تو جیسے مدہوش ہونے لگ گئیں۔وہ حسین دوشیزہ جو اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لائی تھی بیڈ پر دھکیل دیا۔ انتہائی نرم و ملائم اور گداز فوم۔وہ تو جیسے اندر دھنستا ہی چلا گیا۔وہ دوشیزہ نما چڑیل اس کے اوپر جھک گئی

''آج بس تم ہمارے ساتھ رہو گے۔۔۔ ہماری خواہشات کو پورا کرو گے۔۔۔'' دوسری دوشیزہ دائیں پہلو سے بیڈ پر آبیٹھیں اور اس کے ہاتھوں کو چومنے لگی۔ایک احساس اس کے جسم میں سرایت کرنے لگا۔مدہوشی بڑھنے لگی۔تبھی اسے احساس ہوا کہ اس کے جسم کے نیچے بھی کوئی جسم ہے۔اس نے پلٹ کر دیکھا تو ایک حسین دوشیزہ کو اپنے نیچے پایا۔وہ اچھل پڑا۔

''ہم سے ڈریے مت۔۔۔ ہم تو اپنی خواہشیں پورا کرنے آئی ہیں آپ کے ساتھ۔۔۔'' سازنما آواز ایک بار پھر مدہوش کرنے لگیں۔ایک دوشیزہ اس کی شرٹ کے بٹن کھول رہی تھی۔نشا بڑھتا گیا کہ آسمان ہر ایک زوردار بجلی چمکی۔اس کی مدہوشی جھٹ غائب ہوگئی۔ وہ ہوش میں آیا تو حسین دوشیزاؤں کو اپنے جسم کو چومتا ہوا پایا۔ایک دائیں طرف اس کا ہاتھ چوم رہی تھی اور ایک اس کا بائیاں ہاتھ۔دو دوشیزائیں اس کے پاؤں میں تھی۔ایک پشت میں اور ایک اس کے سامنے اس کے سینے کو۔۔وہ پوری طرح مسحور کن تھا۔کسی بھی لمحے بھٹک سکتا تھا۔خواہشات جوش مارنے لگی۔عضائے جسم میں ایک لہر سرایت کرگئی مگر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور اپنے اور ان دوشیزاؤں کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار حائل کردی۔

''جیکسن۔۔۔'' وہ دوشیزائیں چیخیں۔

''تم ایسا نہیں کرسکتے۔۔۔'' دل کو چیر دینے والی آوازیں آنے لگیں۔ان کا حسن غائب ہوگیا۔وہی خافناک چڑیلیں اس کے سامنے تھیں

''پھٹکار ہو تم پر۔۔۔'' اس نے کہا اور اس قبر سے witch bottle اٹھائی اور Urine کو اس میں جمع کرنے کے بعد دوبارہ اپنے آپ کو گھر میں خیال کیا۔

☆.....☆.....☆

جنوری کی آخری طاق رات میں وہ دوبارہ Wandering Souls Church میں موجود تھا۔سامنے ایک ہون تھا۔وہ آنکھیں بند کیے منتر پڑھ رہا تھا۔ساری شیطانی اشیا اس کے سامنے تھیں۔تبھی دیکھتے ہی دیکھتے دھویں نے اسے اپنے حصار میں لے لیا۔

''بہت خوب جیکسن۔۔۔ شیطان تم سے خوش ہوا۔۔۔'' ایک کھسیانی ہنسی فضا میں گونجی۔

''مجھے تمہارے شیطان کی خوشی اور ناراضگی سے کوئی واسطہ نہیں۔۔۔ مجھے بس جنوری سے ملنا ہے۔۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا تو اس کی آنکھوں کے سامنے مزید دھواں چھا گیا۔اس نے اپنا کھنکارا اور سامنے دیکھا تو سامنے جنوری کھڑا تھا۔

''بھائی۔۔۔آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔۔۔بولیے۔۔۔میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟'' وہ انتہائی عاجزی کے ساتھ اس سے بات کررہا تھا۔دونوں ہاتھ سینے پر بندھے تھے۔

''جنوری۔۔۔کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیوں شیطانی کاموں کے لئے میرے جسم کا استعمال کیا؟ کیوں؟'' وہ غصے سے دھاڑا۔

''بھائی۔۔۔ایسا کرنا میری مجبوری تھی۔مجھے شیطانی طاقتیں چاہیے تھیں اور اس کے لئے مجھے کسی نہ کسی کی قربانی تو دینی تھی اور پھر آپ تو میرے بھائی تھے۔آپ میرے لئے اتنا تو کرسکتے تھے۔'' اس نے بنا کوئی تاثر دیئے جواب دیا۔

''بکواس بند کرو۔۔۔یہ قربانی نہیں۔۔۔یہ دھوکہ ہے۔۔۔'' وہ غرایا۔

''ہماری دنیا میں اسے قربانی کہتے ہیں۔۔۔'' ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔

''ٹھیک ہے۔۔۔جو ہوا سو ہوا۔۔۔اب میں چاہوں گا کہ تم میرے جسم کو آزاد کرو۔۔۔آئندہ کبھی میری ذات کو اس شیطانی کام کے لئے استعمال نہ کرو۔۔۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے بھائی۔۔۔آپ جیسا چاہیں گے ویسا ہی ہوگا۔۔۔میں آئندہ کبھی آپ کو استعمال نہیں کروں گا۔۔۔آپ آزاد ہیں آج سے۔۔۔'' جنوری کی بات نے اسے سوچنے پر مجبور کردیا مگر پھر یاد آیا اس نے سات اشیاء اپنے بھائی کو لاکر دے دی ہیں جس بنا پر وہ اس کے حکم کا تابع ہے۔جیسا وہ چاہے گا،وہ کرے گا۔

''اس کے ساتھ ساتھ مجھے خزانے کی چابی چاہیے۔۔۔'' اس نے اپنا اصل مقصد بیان کیا۔

''وہ تو آپ حاصل کرچکے ہیں۔۔۔'' جنوری نے طمانت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''کیا؟'' اس کو جیسے جھٹکا لگا۔فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''جی ہاں بھائی۔۔۔!! آپ نے نہ صرف چابی حاصل کرلی ہے بلکہ آپ تو وہ خزانہ بھی پاچکے ہیں۔'' یہ کہنے کے بعد جنوری کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

''یہی تو خزانہ تھا۔۔۔کالی دنیا کا کالا خزانہ۔۔۔ہاہاہا'' اس بار جنوری کی ہنسی کی انتہا نہ رہی۔جنوری آہستہ آہستہ غائب ہوتا دیکھائی دیا جبکہ جینکسن کو ایسا لگا جیسے وہ بری طرح ہار چکا ہے۔طمع نے اس کی سوچوں پر مہر لگادی تھی۔وہ یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہا کہ شیطانی لوگوں کے لئے کالا علم ہی اصل خزانہ ہے۔اس نے خزانے کی تلاش میں کالا علم سیکھا یعنی شیاطین کا خزانہ حاصل کرلیا۔اسے پچھلے ایک ماہ سے اپنی محنت پر پانی پھرتا محسوس ہوا۔جو درد اس نے برداشت کیا سب بے معنی تھا۔وہ شیطانی چیزیں جو اس نے حاصل کی تھیں وہ سب شیطانی راہ پر چل کر شیطانی طاقتوں کے حصول کے لئے۔بال۔۔۔ناخن۔۔۔پنیں۔۔۔کھوپڑی۔۔۔لیموں۔۔۔Urine۔۔۔Sexual Fluids۔اس کے ذہن میں ہلچل مچ گئی۔یہ سب شیاطین کے خزانے ہی تو تھے،جن کے ذریعے وہ کالا جادو کرتے ہیں۔دوسروں کے ذہنوں پر اپنی حکومت کرتے ہیں۔اس کا سر بری طرح چکرایا اور اپنے بیڈ پر جا گرا۔

اس واقعے کے بعد اس نے اپنے گھر کو آگ لگادی۔ہر شے جو اس نے ان طاق راتوں میں حاصل کی تھی۔اس آگ کی نذر کردی۔آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چہرہ ندامت سے سرخ ہوچکا تھا۔

عین اسی وقت وہاں لارا آموجود ہوئی۔اس نے لارا کو دیکھا تو اسے اپنی بانہوں میں لے لیا اور اپنے نئے مستقبل کے لئے ایک نئے سفر پر چل پڑا۔چلتے چلتے اس نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو رات کے بارہ بج کر ایک منٹ ہوچکے تھے۔تاریخ تبدیل ہوچکی تھی یعنی جنوری کی طاق راتیں بیت چکی تھیں۔اس کے چہرے پر ایک طمانیت ابھری اور آئندہ کبھی لالچ میں آکر اپنی زندگی برباد کرنے سے توبہ کرلی۔